سال نو مبارک
خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
سسپنس ڈائجسٹ
جنوری 2020
بانی
معراج رسول
صفحات 290
قیمت 100 روپے
Nisar Library
سلسلے وار کہانی
شہ زور اسما قادری کے قلم سے
اندرونی صفحات پر ملاحظہ فرمائیں

سسپنس ڈائجسٹ

CPNE MEMBER APNS

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

مدیرہ یمنیٰ احمد
نائب مدیر اطہر حسین

مینجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن مینجر
سید منیر حسین
0333-3285269

07 جون ایلیا
انشائیہ
عروس البلاد کراچی میں انسانی خون کی ارزانی پر ایک صاحبِ دل کا نوحہ

08 مدیر اعلیٰ
آپ کے خط
سسپنس کی مجلس مشاورت و قارئین کی تلخ و شیریں باتیں، گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

14 زویا اعجاز
مسیحا
ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

47 نجمہ مودی
گہری نگاہ
موت کی آہٹ سننے والے ایک سچے عاشق کے آخری سنسنی خیز لمحات

57 تنویر ریاض
کارنامہ
اچھی کاوش پر سٹیزن ایوارڈ کے حق دار ایک پادری کا دلچسپ کارنامہ

66 اسما قادری
شہہ زور
اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان

97 غزالہ یاسمین
لاچار
شد کی رضا میں راضی رہنے والی یک عورت کی شکر گزاری

103 شاکر لطیف
راز
عشق کی فسوں گری اور رقیبوں کے انتقام کی دلچسپ روداد

120 مرزا امجد بیگ
معما تہمت
مقدس رشتوں کی دھجیاں اڑانے والے چند مکروہ چہروں کا انجام

157 انجم فاروق ساحلی
آلۂ قتل
جدید دور کے ہتھیاروں سے لیس ایک حسینہ کا انتقام

169 شاہ زین رضوان
خود غرض
محبت کرنے والے والدین کی بے بسی اور خود غرض اولاد کا فسانہ

178 قارئین
محفلِ شعر و سخن
آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ آپ کی پسند، آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

181 اعتزاز سلیم وصلی
طریقہ
خدا کی قدرت کا منفرد اور دلچسپ قصہ

189 صبا مغل
کفارہ
کسی کی چاہت میں دولت سے منہ موڑنے والے ایک عاشق کا ماجرا

194 طاہر عمیر
آتش زیرپا
معاشرے کے ناسوروں کے ہاتھوں جنم لینے والے سرد انتقام کی لرزہ خیز روداد

229 ناہید سلطانہ اختر
اے وطن
غیروں کے درمیان اپنوں کی کمزوریوں کو چھپانے والوں کا جذبہ

233 رضوانہ ساجد
بلعم بن باعور
اللہ رب العزت کی وحدانیت اور اس کی قدرت کا بے مثال واقعہ

247 ایم الیاس
سوا سیر
آرٹ کے نام پر..... فنکاروں کا خون پینے والی بلا کا انجام

257 ماہ وش طالب
آنکھ اوجھل
نئی دنیا کی جستجو اور کامیابی پالینے کی لگن کا احوال

262 طاہر جاوید مغل
پسِ پردہ
انجانی نفرتوں میں پناہ تلاش کرنے والا اس جوڑے کی کتھا جو..... اپنوں کے اصل روپ سے بے خبر تھا

آخری حصہ

مسیحا

زویا اعجاز

میدانِ جنگ میں نام اہم ہوتے ہیں نہ مقام...اس میدان میں تو حوصلہ اور جرأت سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور...نورالدین زنگی کا وجدان اسے مسلسل خطرات سے آگاہ کررہا تھا۔ یہ مردِ مجاہد ذاتی طور پر بہت رحمدل، انسانیت پسند اور مسلم امہ میں محبت و اخوت برقرار رکھنے کا خواہشمند تھا اور اسی خواہش کی تکمیل کے لیے وہ جہدِ مسلسل میں مصروف تھا جب کہ صلیبی فوج ایک طرف تو لوٹ مار میں حاصل ہونے والی اشیا، معصوم بچوں کی خونریزی اور خواتین کی عصمت دری سے کشید ہونے والی لذتوں میں گم تھی مگر دوسری جانب وہ مسلم سپاہ کا نظم و ضبط، دیوانگی اور سکون دیکھ کر بری طرح خوفزدہ بھی تھی بالخصوص نورالدین زنگی کے ایک نڈر امیر مجدد الدین کی شمشیر بے نیام نے صلیبی افواج کی نیندیں اڑا کر رکھ دی تھیں کیونکہ...میدانِ جنگ میں نام اہم ہوتے ہیں نہ مقام... بس حوصلے اور جرأت کی ضرورت ہوتی ہے جو امیر مجدد الدین نے قدم قدم پر ثابت کر دکھایا۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

مجدد الدین کے حلب سے دمشق پہنچتے ہی نورالدین زنگی نے تبھی سالاروں کو اپنے پاس طلب کرلیا۔ شیرکوہ نے مجدد کو مصر سے شادر کی آمد اور موجودہ صورتِ حال کے متعلق تمام تر باریکیوں سے آگاہ کردیا۔ وہ بھی حالات کی سنگینی مکمل طور پر محسوس کررہا تھا۔

''ابن الدایہ! تمہارے ساتھ شمس الدین اور خطلخ موجود نہیں ہیں۔ کیا وہ ابھی تک حلب میں ہی موجود ہیں؟'' سلطان نے پوچھا۔

''سلطان معظم! میں آپ کے قاصد کے ساتھ فوری طور پر دمشق کوچ کر آیا ہوں۔ شمس الدین اور خطلخ دیگر اہل خانہ کے ساتھ کسی بھی وقت یہاں پہنچ جائیں گے۔'' مجدد نے عرض کی۔ نورالدین نے تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دی اور سالاروں کو اپنی نئی حکمتِ عملی سے آگاہ کرنے لگا۔

''شادر کی مدد کے لیے شیرکوہ ایک چھوٹے لشکر کے ساتھ روانہ ہوگا۔ اس وقت ایک اور مہم بھی درپیش ہے جس کی طرف ابھی توجہ نہ دی گئی تو مستقبل میں ہمیں بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ منیطرہ کے صلیبی بعلبک اور جبیل کے درّے پر واقع قلعے میں مقیم ہیں۔ یہ قلعہ اس علاقے میں بلند ترین، فولادی مضبوطی کا حامل اور سب سے ناقابلِ تسخیر خیال کیا جاتا ہے۔ وہاں موجود صلیبیوں کا لشکر قلعے سے نکل کر قرب و جوار کے مسلم علاقوں پر شب خون مارنے لگا ہے۔ وہ بے گناہ مسلمانوں کا مال و متاع چھین کر آبروریزی جیسے قبیح اعمال بھی سرانجام دے رہے ہیں۔ یہ قلعہ دور دراز ہونے کے باعث ہماری فوری توجہ سے محروم رہا ہے لیکن اب پانی سر سے اوپر ہوتا جارہا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ مجدد الدین ایک لشکر کے ساتھ منیطرہ روانہ ہوگا۔ وہاں معمولی ترین مزاحمت پر بھی کڑی سزا دینا۔ ان دو مہمات سے نمٹتے ہی ہم حارم روانہ ہوں گے۔ اہلِ حارم ایک بار پھر فساد انگیزی پر تل گئے ہیں۔'' نورالدین نے ایک توقف کے بعد شیرکوہ کی جانب دیکھا اور سلسلۂ کلام کا دوبارہ آغاز کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''شیرکوہ اور اس کا بھتیجا صلاح الدین آج ہی شادر کے ساتھ مصر روانہ ہوجائیں گے۔ مجدد الدین اگر چاہے تو آج آرام کرکے کل اپنی کمان سنبھال سکتا ہے۔''

''میرے مسلمان بھائی مصیبت میں مبتلا ہیں تو میں آرام کیسے کرسکتا ہوں سلطان محترم! میں بھی آج ہی منیطرہ کے قلعے کی جانب کوچ کرجاؤں گا۔'' مجدد الدین نے عزم سے کہا۔ سلطان نے مسکراتے ہوئے اس کے فیصلے کی تائید کر

دی۔اس کی تیاریاں مکمل ہونے تک شیرکوہ اور صلاح الدین شاور کی مدد کے لیے مصر کا رخ کر چکے تھے جہاں کونٹ ریمنڈ کے مشورے نے ایک نیا ہی فتنہ پیدا کر رکھا تھا۔

کونٹ کی تجویز پر یروشلم کے حکمران نے اپنی مملکت سے حسن ونزاکت کی شاہکار' پری وش' مہ جبینیں بھرپور تربیت کے بعد مصر روانہ کردی تھیں۔انہوں نے اپنے فرائض نہایت ''دیانتداری'' سے سرانجام دینے کا آغاز بھی کر دیا تھا۔ان لڑکیوں میں بہترین رقاصائیں اور مغنیائیں بھی شامل تھیں۔شاور کو اپنی اداؤں سے دیوانہ بنانے کے بعد اب وہ ضرغام پر مکمل طور پر حاوی ہو چکی تھیں۔ضرغام بھی اپنے فرائض اور ذمے داریاں فراموش کیے ان کے ساتھ محفل سجائے بیٹھا رہتا۔ایسی ہی ایک محفل میں وہ اپنے خوشامدی مصاحبین اور وزراء کے ساتھ موجود تھا۔اس نے یروشلم سے آئی ایک مغنیہ سے نغمہ سرائی کی فرمائش جڑ دی۔ اس پری وش نے نزاکت سے سر تسلیم خم کیا اور اپنی ساتھی لڑکیوں کو ساز بجانے کا اشارہ کرتے ہوئے جذبات وجنس سے بوجھل ایک نغمہ چھیڑ دیا۔شاعری کی معنویت' حسن کی تپش' اداؤں کے سحر اور آواز کی خوش کن روانی نے ضرغام کو ہوش وحواس سے بیگانہ کرنا شروع کر دیا۔اس کے سرور میں مزید اضافہ ہوا تو رقص کے لیے بے تاب ہونے لگا۔ چند لڑکیوں نے ساز ایک جانب رکھے اور پہلے شائستہ اطواری سے رقص کا آغاز کیا۔دھیرے دھیرے محفل جوبن پر آنے لگی تو رقاصاؤں کا انداز بھی تبدیل ہو گیا۔انہوں نے پرشہوت انداز میں اپنے بدن کے باریک ملبوسات کو جنبش دیتے ہوئے حاضرین کی وحشت ودیوانگی کو مہمیز کرنا شروع کر دیا۔رقص کے عروج پر پہنچتے ہی وہاں ابلیسیت اور بے حیائی کا بازار گرم ہو چکا تھا۔آدمیت اپنے لبادے سے باہر آ کر شیطانیت میں تبدیل ہو گئی تھی۔کیف وسرور کے عالم میں حاضرین اپنے ہوش وحواس سے بیگانہ ہو چکے تھے۔

اس ماحول کو یکدم ایک خصوصی محافظ کی آمد نے مرتعش کر دیا۔ اس نے نہایت عجلت میں اندر آ کر ضرغام کے کان میں کچھ کہا۔ضرغام کا نشہ پل بھر میں ہرن ہو گیا۔رقاصاؤں کو ہاتھ کے اشارے سے جانے کا کہہ کر وہ متوحش انداز میں اپنے آس پاس بیٹھے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''نورالدین زنگی نے شیرکوہ اور اس کے بھتیجے صلاح الدین کو ہم سے ٹکرانے کے لیے بھیجا ہے۔ابھی اطلاع ملی ہے کہ وہ بڑی تیزی سے ہمارے علاقوں کی طرف بڑھ رہے ہیں۔''

''انہیں یہاں موت کھینچ کر لا رہی ہے۔وہ زندہ بچ کر نہیں جا پائیں گے۔''شراب کے نشے میں مخمور ایک وزیر نے کہا۔وہ رقص کے مشغلے میں خلل پڑنے سے خاصا بدمزہ دکھائی دے رہا تھا۔

''ہاں بالکل! لیکن ابھی تو ان کی راہ روکنے کے لیے کچھ کرنا ہوگا۔''ضرغام عجلت میں مبتلا تھا۔اس نے فوری طور پر اپنے بھائی ناصرالدین کی کمانداری میں لشکر تیار کر کے شیرکوہ اور صلاح الدین کی راہ روکنے کے لیے روانہ کر دیا۔

ناصرالدین اور شیرکوہ کا سامنا بلبیس کے مقام پر ہوا شیرکوہ نے اپنے روایتی انداز میں ان پر دھاوا بول دیا۔ ناصرالدین کو سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ وہ کس سمت سے دفاع کرے اور کس انداز میں حملہ آور ہو۔مصری سپاہ اس کی جرأت مندی اور تکنیکی مہارت کے سامنے زیادہ دیر تک مزاحمت نہ کر سکی۔انہیں راہِ فرار اختیار کرتے ہی بنی۔وہ مکمل بے خبر تھے کہ ضرغام نے اموری سے کمک طلب کر لی ہے۔ناصرالدین اگر مزید کچھ دیر دفاع کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو اموری کی کمک اس جنگ کا پانسا پلٹ سکتی تھی۔اس کی بدقسمتی یہ رہی کہ اموری کے پہنچنے سے قبل ہی شیرکوہ مصری لشکر کی بساط لپیٹنے کے بعد اسے بدترین شکست سے دوچار کر کے مفرور سپاہ کا تعاقب کرتے ہوئے قاہرہ میں داخل ہو گیا۔اس افراتفری اور انتشار کی کیفیت میں ضرغام شیرکوہ کے ایک عام لشکری کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ ناصرالدین کی گرفتاری عمل میں آتے ہی شاور نے اسے بھی قتل کروا کے مسندِ وزارت پر قبضہ کر لیا۔خلیفہ وقت کی بے بسی اور نااہلی کا یہ عالم تھا کہ وہ حکومتی امور سنبھالنے اور ریاستی حالات کو سمجھنے سے ہی قاصر تھا۔شاور نے چابکدستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وزارت سنبھالتے ہی حالات اپنے حق میں ڈھالنے کا آغاز کر دیا۔

''اب وقت آ گیا ہے شاور کہ تم اپنا وعدہ ایفا کر دو۔'' کچھ عرصے بعد شیرکوہ نے اسے یاددہانی کروائی۔

''وعدہ؟ وہ کیا بھلا؟''شاور نے تجاہل عارفانہ برتا۔

''اگر تمہاری یادداشت کسی وجہ سے متاثر ہو گئی ہے تو میں تمہیں یاد کروا دیتا ہوں کہ تم نے جنگی اخراجات اور مصر کی آمدنی کا تیسرا حصہ ادا کرنے کی ہامی بھری تھی۔''اس نے سختی سے کہا۔

''ہاں اچھا! یاد ہے مجھے لیکن ابھی تھوڑے حالات تو سنبھلنے دو۔میں سب ادائیگی کر ہی دوں گا۔''شاور نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''حالات تو سنبھل ہی جائیں گے لیکن اس دوران اپنی نیت بھی سنبھالے رکھنا۔'' شیرکوہ نے معنی خیزی سے کہا۔ ''کسی لالچ اور بدنیتی میں سلطان کو دھوکا دینے کا تصور بھی کیا تو تمہیں نشان عبرت بنا دوں گا۔ کسی بھول میں مت رہنا!''

شادر کی نیت میں حقیقتاً فتور آچکا تھا۔ اس نے کمال احسان فراموشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شیرکوہ سے ہی نجات حاصل کرنے کی راہ تلاشنی شروع کردی۔ شیرکوہ کے سخت ردعمل کے بعد وہ بادل ناخواستہ ایک تہائی حصہ دینے پر آمادہ ہوگیا۔

''نہیں شادر! مجھے صرف اتنی سی رقم دے کر ٹرخانے کی کوشش نہ کرو۔ تمہیں وعدے کے مطابق جنگی اخراجات بھی ادا کرنے ہوں گے۔'' شیرکوہ نے حتمی انداز میں کہا۔

''اور اگر میں ایسا نہ کروں تو؟'' وہ بدنیتی سے مسکرایا۔

''تو پھر ہمارے درمیان فیصلہ تلوار کرے گی۔ تم شاید وہ وقت بھول گئے جب روتے پیٹتے سلطان کے پاس مدد طلب کرنے آئے تھے۔ آج مسند وزارت پر بیٹھتے ہی اپنی اوقات فراموش کردی ہے۔'' وہ صاف گوئی سے بولا۔

''تمہیں اپنے غرور کی سزا بہت مہنگی پڑے گی شیرکوہ!'' شادر یہ واضح سچائی برداشت نہ کرسکا۔

''یہ غرور ہی تو نہیں ہے شادر! لیکن اگر تم نے وعدہ خلافی اور احسان فراموشی پر کمر باندھ ہی لی ہے تو یونہی سہی۔'' شیرکوہ نے بلاخوف جواب دیا۔ شادر نے بھرپور عاقبت نااندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے قاہرہ کے دروازے بند کرکے جنگ کا طبل بجادیا۔ شیرکوہ نے اپنی سپاہ اردگرد پھیلا کر صلاح الدین کو لشکر کا ایک حصہ سونپا اور ضروری آلات حرب لانے کے لیے ہلیس روانہ کردیا۔ قاہرہ کے محاصرے اور صلاح الدین کی ہلیس روانگی نے شادر کی عقل وفہم بالکل ہی سلب کرلی۔ نفرت وخودغرضی میں اپنے انجام سے بیگانہ ہوچکے شادر نے ایک بار پھر کم ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اموری سے مدد طلب کرلی۔ اس نے اموری سے وعدہ کیا کہ صلیبی لشکر کے لیے رسد اور سامان حرب کے علاوہ وہ فی پڑاؤ بھی ایک ہزار دینار ادا کرے گا۔ اموری کے لیے مصر میں داخلے کا یہ بہترین موقع تھا۔ اس نے فوری طور پر ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ مصر کا رخ کرلیا جہاں شادر کی بے حمیتی نے اسے مزید پانچ ہزار لشکری بھی فراہم کردیے۔

اموری اور شادر کے اس مشترکہ لشکر کے مقابلے میں شیرکوہ اور صلاح الدین کی حالت بظاہر بہت خستہ تھی۔ ان کا مختصر لشکر بھی دو حصوں میں تقسیم ہوچکا تھا۔ اموری کی آمد نے شیرکوہ کو فوری اور اہم فیصلے کرنے پر مجبور کردیا۔ اس نے

قاہرہ کا محاصرہ ترک کیا اور اپنی سپاہ کے ساتھ صلاح الدین کے ہمراہ بلبیس میں قلعہ بند ہو گیا۔ شاور نے بھی جوابی کارروائی کرتے ہوئے بلبیس کا محاصرہ کر لیا۔ وہ قلعے پر دیوانہ وار حملے کروانے لگا لیکن اس کی کوئی بھی کوشش کئی ہفتوں بعد بھی کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکی۔ نورالدین زنگی کو ان حالات کی ہر خبر متواتر موصول ہو رہی تھی۔ شاور کی جانب سے اموری کی قدم بوسی اس کے لیے بہت افسوسناک تھی۔ اپنے جری سپہ سالار کو مکھن سے بال کی طرح نکالنے کے لیے نورالدین نے یہ فیصلہ کیا کہ صلیبیوں کے علاقوں پر حملہ کر کے اموری کو مصر سے انخلا... اور اپنے ہم مذہبوں کی مدد کے لیے لوٹ آنے پر مجبور کر دیا..... اس صورت میں شیرکوہ اور صلاح الدین پر محاصرے کا دباؤ بھی کسی قدر کم ہو جاتا..... اس فیصلے پر پہنچتے ہی نورالدین نے فوری طور پر اپنا ایک لشکر حارم روانہ کر کے محاصرے کا حکم دے دیا۔ اس قدم سے وہ ایک تیر سے دو نشانے لے رہا تھا۔ اہل حارم کی بارہا عہد شکنی کی سرکوبی بھی ضروری ہو چکی تھی۔ اس مہم کو مزید پُراثر بنانے کے لیے نورالدین نے چند روز بعد خود بھی ایک لشکر کے ساتھ حارم کا رخ کر لیا۔ اموری کے علاوہ دیگر صلیبی حکمرانوں تک سلطان کی حارم جیسے مضبوط صلیبی گڑھ پر لشکر کشی کی خبر پہنچی تو ان کی تشویش گہری ہو گئی۔ حارم پر نورالدین زنگی کا قبضہ ان کے لیے یقینی تباہی کی ایک نوید تھا۔ اس کی راہ روکنے کے لیے انطاکیہ کے حاکم بوہیمنڈ، طرابلس کے بادشاہ کونٹ ریمنڈ اور جوسلین ثالث نے اپنے لشکر میں کثیر سپاہ بھرتی کرنے کا آغاز کر دیا۔ نورالدین زنگی کے چار ہزار سپاہیوں کے مقابلے میں ''بتیس ہزار'' کا ٹڈی دل لشکر تیار ہو گیا۔ شیرکوہ اور مجدالدین کی عدم موجودگی نے متحدہ صلیبی لشکر کے حوصلے بلند کر رکھے تھے۔ وہ اس سنہری موقع سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے حملے میں پہل کرنا چاہتے تھے تاہم نورالدین نے بہترین جنگی فراست کا ثبوت دیتے ہوئے انہیں الجھا کر رکھ دیا۔ اس نے لشکر کے قلب میں رہنے کے بجائے میسرہ کی کمانداری سنبھال لی اور میمنہ کو ہدایات دیں کہ صلیبیوں کے حملہ آور ہوتے ہی انتشار کے تاثر سے پسپائی اختیار کر کے تعاقب کرنے والے صلیبیوں کو مختلف ٹولیوں میں بٹنے پر مجبور کر دیں۔ اس موقع پر نورالدین اپنے میسرہ کے ساتھ حرکت میں آئے گا اور اس کے بعد قلب لشکر مقدمہ الجیش کے ساتھ حملہ آور ہو جائیں گے۔ حالات و واقعات کی اس تبدیلی کے ساتھ میمنہ بھی اپنا رخ تبدیل کر کے دشمن پر دھاوا بول دے گا۔

نورالدین کی یہ حکمتِ عملی حیران کن طور پر مکمل کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ چار ہزار سپاہ کے ساتھ بتیس ہزار فوج کی بساط لپیٹ کر اس نے دشمن کو ہراساں کر دیا۔ وہ اس افتاد سے گھبرا کر حارم شہر میں داخل ہونے کی کوشش کرنے لگے لیکن نورالدین اس بار انہیں ایسا کوئی بھی موقع فراہم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ذرا سی دیر میں بیس ہزار افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پانچ ہزار سپاہیوں کی گرفتاری میں بوہیمنڈ، کونٹ ریمنڈ، جوسلین ثالث اور روما کا ایک نامور سپہ سالار ڈیوک بھی شامل تھے۔ اپنے سپہ سالاروں کی یہ حالت دیکھ کر باقی ماندہ سپاہ جان بچانے کے لیے جدھر سینگ سمائے چل دی۔ محض چار ہزار سپاہیوں کی انمول بہادری کے بل بوتے پر حارم فتح کر کے نورالدین زنگی بحیثیت حاکم شہر میں داخل ہوا۔ فصیل پر بھی اسلامی علم لہرا دیا گیا تھا۔ اس فتح کے بعد وہ کچھ عرصے تک وہیں قیام پذیر رہ کر ریاستی معاملات کی اصلاح کرتا رہا۔ اس دوران بوہیمنڈ نے ایک کثیر رقم فدیہ دے کر رہائی حاصل کر لی۔ نورالدین نے فدیہ کی وہ رقم جہاد فی سبیل اللہ کے لیے وقف کر دی۔ (کونٹ ریمنڈ اگلے آٹھ برس تک اس کی قید میں رہا تھا جسے بعد ازاں فخرالدین مسعود کی تجویز پر ڈیڑھ لاکھ دینار اور ایک ہزار مسلم قیدیوں کی رہائی کے عوض آزاد کر دیا گیا) اس فتح کے بعد بھی مصر کا معاملہ جوں کا توں برقرار تھا۔ اموری نے ہنوز شیرکوہ اور صلاح الدین کو تین ماہ سے محاصرے میں لے رکھا تھا۔ وہ دونوں ناقابلِ یقین جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کئی گنا زیادہ سپاہ کا مقابلہ کر رہے تھے۔ اس دوران انہوں نے اموری اور شاور کے کسی بھی لشکری کو اپنے قلعے کے نزدیک بھی پھٹکنے نہ دیا تھا۔ انہیں پختہ یقین تھا کہ سلطان ان کی حالتِ زار سے بے خبر نہیں ہوگا۔ وہ اپنی فطری ذہانت اور فراست کے تحت دشمن کو یہ محاصرہ ترک کرنے پر مجبور کر دے گا۔ ان کے اسی یقین کی لاج رکھتے ہوئے نورالدین کے پاس اموری کے علاقوں پر حملے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ اپنے مشیروں اور سالاروں سے مشورہ کرنے کے بعد اس نے سب سے پہلے ''طبریہ'' کا انتخاب کیا۔ یروشلم کے صلیبی سپاہی نورالدین کا مقابلہ کرنے اور طبریہ کا دفاع کرنے کے لیے پوری قوت سے میدان میں اترے لیکن بدقسمتی سے شکست سے دوچار ہو کر طبریہ سے محروم ہو گئے۔ صلیبیوں کے پاؤں تلے زمین کھسکنے کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ شاور کی دی گئی ترغیب کے بدلے میں اپنے علاقوں سے محرومی اموری کے لیے بہت

مہنگا سودا تھی۔ اموری کی ذہنی حالت بہت پراگندہ ہو چکی تھی۔ وہ اس وقت دہری کشمکش میں مبتلا تھا۔ نورالدین زنگی سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ اسی طرح بے باکی سے حارم اور طبریہ کے بعد دیگر قلعوں پر بھی اپنا قبضہ قائم کر لیتا۔ اس کی ذرا سی پیش قدمی یروشلم کو بھی کسی پکے ہوئے پھل کی طرح مسلمانوں کی آغوش میں لے جا کر پھینک سکتی تھی۔ دوسری جانب شیرکوہ اور صلاح الدین سے کوئی معاہدہ طے کیے بغیر محاصرہ اٹھا کر یروشلم کا رخ کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس صورت میں دونوں سالار بلبیس سے نکل کر عقبی جانب سے حملہ کر سکتے تھے۔ شیرکوہ کی جنگی مہارت اور سابقہ تجربات کے پیش نظر اموری کو یقین تھا کہ وہ مختصر سپاہ کے ساتھ بھی اس کے لشکر کو چٹکیوں میں اڑانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اسی ذہنی پراگندگی میں وہ شیرکوہ سے مذاکرات کرنے کے لیے مجبور ہو گیا۔ کافی ردوکد کے بعد یہ معاہدہ طے پایا کہ دونوں فریقین مصر سے اپنے لشکر نکال لیں گے۔ اموری اس معاہدے کی جلد از جلد تکمیل کے درپے تھا۔ اس کے مجبور کرنے پر شاور نے بھی شیرکوہ کو ساٹھ ہزار دینار کی پیشکش کر دی جسے مصلحتاً قبول کرتے ہوئے وہ مصر سے انخلا کے لیے رضامند ہو گیا۔

شرائط نامہ طے پاتے ہی شیرکوہ اپنے مختصر لشکر کے ساتھ قلعہ بلبیس سے نکل آیا۔ لشکر کے آگے گھوڑے پر سوار صلاح الدین نے ایک ہاتھ میں اپنی برہنہ تلوار فضا میں بلند کر رکھی تھی جبکہ دوسرے ہاتھ میں ڈھال تھام کر اپنا بایاں پہلو چھپا رکھا تھا۔ شیرکوہ لشکر کے عقب میں تھا۔ اس نے جنگی کلہاڑا فضا میں بلند کر رکھا تھا۔ اموری کا صلیبی لشکر اور شاور کی سپاہ خاموشی سے ان کی روانگی دیکھنے پر مجبور تھی۔ اسی دوران ایک صلیبی بھاگتا ہوا شیرکوہ کے پاس آیا اور قدرے حیرت سے دریافت کیا۔

"شیرکوہ! تمہاری ہر سمت صلیبی اور مصری سپاہ کا گھیراؤ ہے۔ کیا تمہیں ذرا بھی خطرہ محسوس نہیں ہو رہا کہ وہ کسی فریب کے تحت تمہارا اور اس مٹھی بھر لشکر کا خاتمہ کر دیں۔"

شیرکوہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے اپنا سینہ تان کر غضب اور طیش سے اس لشکری کو جواب دیتے ہوئے کہا۔

"میری شدید خواہش ہے کہ وہ ایسا کرنے کی جرأت کر لیں۔ ان کے حملے کا جواب ہماری تلواریں اس انداز میں دیں گی کہ میرا کوئی بھی۔ ابھی دشمن کے سیکڑوں سپاہیوں کے خون سے اپنی تلوار کی پیاس بجھائے بغیر جان نہ دے گا۔ جب یہ خبر ہمارے سلطان تک پہنچے گی تو اس وقت مشرق سے ایک ایسا طوفان ابھرے گا کہ صلیبی اور مصری خس وخاشاک کی طرح بہتے ہوئے فنا کے گھاٹ اتر جائیں گے۔" اس جواب نے صلیبی سپاہی کو گنگ کر دیا۔ شیرکوہ اپنے لشکر کے ہمراہ بحفاظت دمشق پہنچ گیا۔

☆☆☆

شیرکوہ اور نورالدین زنگی کی ان جنگی مہمات کے دوران منیطرہ میں موجود مجدالدین کے معمولات بھی بہت کٹھن تھے۔ منیطرہ میں صلیبی جنگجوؤں نے طوفان برپا کر رکھا تھا۔ مجدالدین کے لیے سلطان کی جانب سے محض یہی حکم تھا کہ لوٹ مار کرنے والی اقوام سے نمٹا جائے۔ منیطرہ کے جنگجو اس وقت زمینی حقائق دیکھتے ہوئے ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا شکار ہو چکے تھے۔ انہیں بھی علم تھا کہ شیرکوہ مصر میں مصروفِ عمل ہے اور نورالدین زنگی حارم کی جانب کوچ کر چلا ہے۔ اس صورت میں ان کی سرکوبی کے لیے آنے والا لشکر عددی اعتبار سے بے حد کمزور ثابت ہو گا۔ اپنی کثیر تعداد پر بھروسا کرتے ہوئے انہوں نے مجدالدین کی راہ روکنے کا فیصلہ کر لیا۔ مجد نے فوری طور پر اپنے سالاروں کو جنگی حکمتِ عملی سمجھائی اور دشمن کے ارادوں کو عملی روپ اختیار کرنے سے قبل ہی فنا کر دیا۔ صلیبی ان کی راہ روکنے یا کسی بھی قسم کی جارحیت دکھانے میں بالکل کامیاب نہ ہو سکے۔ جانی ومالی نقصان اٹھانے کے بعد صلیبی اپنا مال ومتاع چھوڑ کر فرار ہونے پر مجبور ہو گئے۔ مجدالدین نے مالِ غنیمت پر قبضہ کر کے اگلے کچھ روز احتیاطاً وہیں پڑاؤ ڈالے رکھا اور پھر کسی بھی قسم کا کوئی ردعمل نہ پا کر دمشق لوٹ گیا۔

مجدالدین کی دمشق واپسی تک نورالدین زنگی اور شیرکوہ بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ اس کی مستقر آمد کے وقت دیگر سالار وہیں موجود موجودہ عسکری صورت حال پر تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ مصر سے شیرکوہ کی واپسی اور اموری کو شکست سے تلملاتے دیکھ کر ان سبھی کے اعصاب ونفسیات میں بڑی مثبت تبدیلیاں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کا اعتماد اور یقین پہلے سے کئی گنا بڑھ گیا تھا۔ وہ سبھی عساکر بے چینی سے مجدالدین کی فتح مند واپسی کے بھی منتظر تھے۔ مستقر آمد کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے سالار کا گرمجوشی سے استقبال کیا۔ شمس الدین اور صلاح کی خوشی سب ہی سے منفرد تھی۔ ان کی آنکھوں میں بھائی کو دیکھ کر بہت خوبصورت چمک پیدا ہو گئی تھی جو سلطان کی عقابی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔

"کیا بات ہے ابن الدایہ..... آج ان دونوں

جوانوں کا جوش کچھ مختلف محسوس ہو رہا ہے؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ مجد دجھینپ گیا۔ وہ سلطان کو اپنے متوقع نکاح کے متعلق بتاتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔

"سلطان معظم! میر آپ کو کبھی بھی نہ بتا پائیں گے۔" خطلخ نے کہا۔ "دراصل جس روز قاصد دمشق پہنچنے کا پیغام لے کر آیا تھا اس وقت ہم گھر میں امیر کا نکاح کروانا چاہ رہے تھے۔ فرض کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے ہم نے وہ معاملہ وہیں ملتوی کر دیا تھا۔"

"مرحبا! بہت مبارک ہو ابن الدایہ!" سلطان نے خلوص سے کہا۔ "پروردگار زندگی کا یہ نیا سفر بہت مبارک فرمائے۔"

"مجد الدین! تم تو بہت چھپے رستم نکلے میرے دوست!" شیرکوہ نے بھی ہلکے پھلکے انداز میں اسے مخاطب کیا۔ "ایک وقت تو یہ تھا کہ شادی کرنے کے لیے تیار ہی نہ ہوتے تھے اور اب دوسرے نکاح کی تیاریاں کر رہے ہو۔" امیر العساکر کی شرارت سے وہ مزید جھینپ گیا۔

"سلطان معظم! ہم یہ نیک کام آج ہی کر لینا چاہتے ہیں۔ آپ سب سے بھی میری التجا ہے کہ ہمیں اس مبارک رسم میں شرکت کا شرف ضرور بخشیے گا۔" شمس الدین نے بھی حاضرین سے کہا۔ نورالدین نے باوقار انداز میں مسکراتے ہوئے شمولیت کی ہامی بھر لی۔

شمس الدین اور خطلخ اس سے اجازت لے کر دمشق میں اپنی نئی رہائشگاہ لوٹ گئے۔ مجد الدین کو البتہ کچھ ضروری امور پر گفتگو کے بعد ہی واپس آنا تھا۔ خطلخ نے گھر پہنچتے ہی عبدہ، زہران اور سمرون کو مجد کی مستقر آمد اور سلطان کی شرکت سے آگاہ کر دیا۔ خوشی، جوش اور بے یقینی کی کیفیات نے انہیں سنسنی میں مبتلا کر دیا۔

"سلطان اور دیگر معززین کے شایانِ شان دعوت کا انتظام ہونا چاہیے۔ شمس الدین! تم فوراً بازار سے ضروری سامان خرید لاؤ۔" عبدہ نے کہا۔

"انہوں نے کسی بھی فضول خرچی اور تکلف میں پڑنے سے منع کیا ہے ماں!" شمس اس کی حالت سے محظوظ ہو رہا تھا۔

"ٹھیک ہے! دعوت سادہ ہی سہی لیکن باوقار انتظام تو ہمارا فرض ہے۔ تم بلا تاخیر بازار روانہ ہو جاؤ۔ میں، ازبل اور دونوں لڑکیاں مطبخ سنبھال لیں گی۔ مثال! تم آج کوئی کام نہ کرو گی۔" عبدہ نے مزید ہدایات دیں۔ مثال کو یہ سب کچھ کسی خواب کے مانند محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے ہجر کی گھٹن گھڑیاں امیر کی بخیریت واپسی اور ان لمحات کے متعلق تخیل تراشتے ہی گزاری تھیں۔ اس وقت دل و دماغ میں برپا کیفیات اس کے لیے بالکل انوکھی تھیں۔ اس کی زندگی کا سب سے بڑا اور بظاہر ناممکن خواب شرمندۂ تعبیر ہونے والا تھا۔ اظہارِ تشکر کے لیے اس کی آنکھوں میں نمی ابھرنے لگی۔

"روتی کیوں ہو پگلی!" مرسینہ نے اسے پیار سے گلے لگایا۔ "چلو! میں رسم کے لیے تمہارے کپڑے تیار کر دوں۔"

انہی باتوں اور سرگرمیوں میں سب مہمان اکٹھے ہو گئے۔ مجد الدین خوش دلی اور متانت سے سب کے ساتھ محوِ گفتگو تھا۔ نکاح کی رسم ادا ہوتے ہی مثال کا وجود ہچکیوں اور آنسوؤں کی زد میں آ گیا۔ قسمت نے اس کے کاسہ میں سب سے انمول نعمت ڈال دی تھی۔ وہ شکر ادا کرتے نہ تھک رہی تھی۔ مہمانوں کی تواضع کرتی مرسینہ کی آنکھ سے بھی چپکے سے ایک آنسو نکلا اور دامن میں جذب ہو گیا۔ اس نے فوری طور پر چہرہ صاف کر لیا۔ اسے علم تھا کہ آنے والے وقت میں مجد الدین اس کے دعوؤں کی پرکھ ضرور کرے گا۔ وہ کسی بھی طرح بہن سے اپنی محبت اور شوہر سے کیے گئے وعدوں پر کوئی حرف نہیں آنے دینا چاہتی تھی۔ اس نے ایک نظر مجد الدین اور مثال کے تروتازہ چہروں کو دیکھا اور خوش دلی سے مسکراتی ہوئی مہمانوں کی خاطر مدارت میں مصروف ہو گئی۔

☆☆☆

رسم نکاح سے فراغت کے بعد مجد الدین نے بلا تاخیر اپنے پیشہ ورانہ فرائض دوبارہ سنبھال لیے۔ اسے علم تھا کہ منیطرہ کی مہم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا بہت ضروری ہے۔ نورالدین نے کچھ توقف سے ایک بار پھر روانگی کا قصد کر رکھا تھا۔ لشکر کے ساتھ منیطرہ پہنچتے ہی اسے اپنے مخبروں سے اطلاع موصول ہوئی کہ مقامی صلیبیوں کی مدد کے لیے دیگر شہروں سے بھی صلیبی جوق در جوق امڈتے چلے آ رہے ہیں۔ مخبروں سے تمام تر صورتِ حال سے آگاہی کے بعد نورالدین نے اپنا لشکر تین حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اس نے بذاتِ خود صلیبیوں کے اس لشکر سے ٹکرانا تھا جو شہر کے باہر ان کا منتظر تھا۔ شیرکوہ اور مجد الدین کو یہ ذمے داری سونپی گئی کہ دوسرے علاقوں سے آنے والے رضاکار لشکروں کی بہرصورت راہ روکی جائے۔ اس سلسلے میں کچھ مخبر بھی ان کے ہمراہ روانہ کر دیے گئے جو آنے والے لشکروں کی طرف ان کی راہنمائی کرتے۔ چھوٹے سالاروں کو بھی تین ہی حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ اس ترتیب و تنظیم میں دشمن نے منیطرہ کے نواح میں اپنی صفیں مرتب کر لی تھیں۔ نورالدین نے صلیبیوں کی کثیر تعداد دیکھ

کر جارحانہ حکمتِ عملی اپنانے کا فیصلہ کرلیا۔ لشکر کی تنظیم درست کرتے ہی اس نے بھرپور قوت سے مقابل کو رگید کر رکھ دیا۔ تہ تیغ ہوتے ہی ان سپاہیوں کے لیے اپنی جانیں بچا کر شہر میں محصور ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ نورالدین نے حیران کن سختی کا مظاہرہ کرتے ہوئے منیطرہ کا محاصرہ کرلیا۔ دوسری جانب مختلف صلیبیوں کے متحدہ لشکر نے بھی ایک جم غفیر کی صورت اختیار کرلی تھی۔ وہ اہل منیطرہ کی مدد کے لیے تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ ان کی راہ میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہیں آئے گی۔ اس یقین اور اعتماد میں پہلی ضرب مجدالدین نے لگائی۔ وہ گھات لگائے بے تابی سے ان کا منتظر تھا۔ اچانک حملے میں سیکڑوں صلیبیوں کی زندگی کا چراغ گل ہوگیا۔ ان کے سنبھلنے سے قبل ہی شیر کوہ کسی ناگہانی آفت کی طرح دوسری جانب سے برآمد ہوا اور بھوکے عقاب کی طرح دشمن پر ٹوٹ پڑا۔ کچھ ہی دیر میں صلیبی تتر بتر ہوگئے۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے منیطرہ کی جانب گامزن تھے۔ انہیں اب بھی یہی گمان تھا کہ وہ مقامی لشکر سے مل کر نورالدین زنگی کو شکنجے میں جکڑنے پر مجبور کردیں گے لیکن اس روز تقدیر کسی بھی صورت ان پر مہربان ہونے کو تیار نہ تھی۔ ان کے منیطرہ پہنچنے سے قبل ہی سلطان نے سخت محاصرے کے بعد شہر فتح کرکے اپنے علم لہرا دیے۔

اپنی ناتمام آرزوؤں پر ماتم کرتے صلیبی مختلف علاقوں میں منتشر ہوگئے۔ نورالدین نے چند روز منیطرہ میں قیام کرکے شہر کا نظم ونسق درست کیا اور اپنا والی مقرر کرنے کے بعد دمشق لوٹ گیا۔

☆☆☆

منیطرہ کی مہم سے کامیاب واپسی کے بعد مجدالدین بہت سرشار تھا۔ وہ اہل خانہ کے ساتھ بھرپور اور فرحت بخش وقت گزارنا چاہتا تھا۔ حویلی میں داخل ہوتے ہی وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس کے حواس نے فضا میں طاری افسردگی اور بوجھل خاموشی واضح طور پر محسوس کی تھی۔

''الٰہی خیر! سب کو اپنی حفظ وامان میں رکھنا۔'' وہ دل ہی دل میں گڑگڑاتا اپنا گھوڑا اصطبل میں باندھ کر صحن میں آیا تو جمارا سے سامنا ہوگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پیالہ تھا جس میں عرق نما محلول موجود تھا۔

''ارے امیر! آپ کب آئے؟ ہمیں علم ہی نہ ہوا۔'' اس کی آواز گریہ وزاری کے سبب بوجھل تھی۔

''بس ابھی ابھی آیا ہوں۔ کیا ہوا، سب ٹھیک تو ہے؟'' وہ تشویش سے بولا۔ جمارا کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ اسی اثنا میں مرسینہ بھی عجلت میں باہر نکل آئی۔ اس کا چہرہ بھی متورم دکھائی دے رہا تھا۔

''جمارا! تایا جان کو دوا پلا آؤ۔ میں امیر کو حقائق بتا دیتی ہوں۔''

مجدالدین سمرون کی علالت سے آگاہ ہوگیا تھا۔ مرسینہ نے مختصر لفظوں میں اسے بتادیا کہ منیطرہ کی مہم پر روانہ ہونے کے بعد ہی سمرون کی جسمانی نقاہت اور تکلیف بڑھتی گئی۔ کوئی بھی دوا کارگر ثابت نہیں ہورہی تھی۔

''تم فکر نہ کرو مرسینہ! ہم شاہی طبیبوں سے رجوع کریں گے۔ انشا اللہ وہ بالکل صحت یاب ہوجائیں گے۔'' مجد نے اس کا سر تھپتھپایا۔

''امیر! ہم نومسلم اپنے کن اعمال کا واسطہ دے کر پروردگار سے التجا کریں۔ آپ تو مجاہد ہیں۔ رب کائنات کے مقرب بندے ہیں۔ آپ ہی دعا کیجیے کہ میرے تایا کو کامل شفا اور طویل عمر عطا ہو۔ اگر انہیں کچھ ہوگیا تو ہم ایک بار پھر یتیم ہوجائیں گے۔ جمارا کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ جائے گا۔ یہ کرب ہم تو ایک دفعہ جھیل چکے ہیں، وہ کیسے سہہ پائے گی۔ میں نے اپنی والدہ کے بعد دیکھا تھا کہ شریکِ حیات سے محرومی انسان کو کس طرح قطرہ قطرہ پگھلا دیتی ہے۔ خالہ ازبل یہ بار کیسے اٹھا پائیں گی۔ ہم ٹوٹ جائیں گے امیر! ہمارا گھر ایک بار پھر بکھر جائے گا۔'' وہ اس کے کندھے سے سر ٹکائے بلک اٹھی۔

''یہ کیسی باتیں کررہی ہو تم مرسینہ! اللہ کی نظر میں نومسلم یا پیدائشی مسلم کا کوئی امتیاز نہیں۔ وہ تو اپنے بندے کا خوبصورت دل، صاف نیت اور نیک اعمال دیکھ کر بے تحاشا نوازتا ہے۔ رب کائنات قادر مطلق ہے۔ وہ اگر چاہے تو کسی شخص کو نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اور اگر وہ نہ چاہے تو دنیا کی کوئی بھی طاقت انسان کو مزید سانسیں عطا نہیں کرسکتی۔ اس طرح منفی سوچوں سے تم باقی اہل خانہ کو بھی مایوسی میں مبتلا کروگی۔ انسان بیماری سے لڑنے کی پوری کوشش کرسکتا ہے۔ میں ان کے لیے بہترین طبیبوں کا بندوبست کروں گا۔ اللہ نے چاہا تو وہ بالکل ٹھیک ہوجائیں گے۔'' مجدالدین کے سمجھانے پر اس کے آنسوؤں میں کمی آگئی۔

اس کے بعد مجد، شمس اور لطیف نے سمرون کی تیمارداری اور علاج میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ وہ دن رات اس کے ساتھ مصروف رہتے۔ اس کے باوجود سمرون کی حالت میں کوئی بہتری نہیں آرہی تھی۔ مجد نے اپنے منطقی مزاج کے تحت اہلِ

خانہ کو حقیقت تسلیم کرنے کے لیے تیار کرنے کا فیصلہ کرلیا۔
ایک روز وہ باجماعت نماز کی ادائیگی کے بعد مسجد سے لوٹا تو سمرون نے کراہتے ہوئے اسے اپنے پاس طلب کرلیا۔ اس کی نقاہت پہلے سے کئی گنا بڑھ چکی تھی۔ الفاظ کی ادائیگی بھی بہ مشکل ہو پاتی۔
''مجدد بیٹے! مجھے تم سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔'' اس کا سانس ایک جملے کی ادائیگی میں کئی بار غیر متوازن ہوا۔
''باتیں بھی ہوتی ہی رہیں گی محترم! آپ آرام کیجیے۔ طبیعت سنبھل جائے تو میں آپ کی سب گفتگو سنوں گا۔'' مجدد نے کہا۔
''نہیں! اب آرام ہی تو کرنا ہے..... دائمی آرام۔'' سمرون نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ مجدد مزید اصرار کے بجائے اس کے پاس بیٹھ گیا۔
''میرے بیٹے! تم میری کس نیکی کا صلہ ہو مجھے خود بھی نہیں علم۔ گمراہی کی زندگی بسر کرنے کے بعد ہدایت کی روشنی نصیب ہوئی تو مجھے یہی خدشہ تھا کہ میرے سابق ہم وطن اور ہم مذہب مجھ پر وہی اندھیرے مسلط کرنے کی کوشش کریں گے۔ مجھے جمارا کے مستقبل کی فکر ستاتی تھی۔ میرے بھائی کارلوس کا خاندان اجڑ گیا تو مرسینہ اور مشال کی ذمے داریاں بھی فکرمند رکھتی تھیں۔ میں قربان جاؤں اپنے پروردگار کی رحمت کے! اس نے میری تمام مشکلیں ایک ہی در سے آسان کردیں۔ مرسینہ اور مشال کے لیے تم سے بہتر شریک حیات کون ہوسکتا تھا بھلا؟ میری تم سے ایک ہی التجا ہے بیٹے! اسے میری آخری خواہش سمجھ لو۔ مرسینہ اور مشال ایک دوسرے سے بہت محبت کرتی ہیں۔ اگر وہ رشتے کے تقاضوں سے مغلوب ہوکر کوئی غلطی کر بیٹھیں تو انہیں نادان سمجھ کر درگزر کردینا۔ ان کی کوتاہیوں کی محبت سے نشاندہی کرو گے تو وہ راضی خوشی اپنی اصلاح کریں گی۔ میری بیٹی جمارا کا بھی یونہی خیال رکھنا جیسے عبیرہ کا رکھتے ہو۔ اسے باپ کی کمی کا احساس نہ ہونے دینا۔'' سمرون نے اکھڑتے سانس میں بدقت بات مکمل کرتے ہوئے مجدد کے سامنے اپنے ہاتھ جوڑ دیے۔
''مجھے گناہ گار مت کریں محترم! میں اپنی بساط کے مطابق یہ ذمے داریاں نبھانے کی پوری کوشش کروں گا۔'' وہ تڑپ گیا۔
''مجدد بیٹے! دمشق میں کب تک قیام جاری رکھنا ہے؟'' زہران نے سمرون ہی کے سوال کو گویائی دی۔
''جب تک سلطان معظم کوئی اگلا حکم صادر نہ فرمائیں۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔
''حلب کی حویلی کا کیا سوچا ہے؟'' عبدہ قدرے افسردہ تھی۔ ''اس حویلی سے بہت سی خوشگوار یادیں وابستہ ہیں۔ اسے کھنڈر بھی تو نہیں بنایا جاسکتا۔''
''بالکل نہیں بنائیں گے ماں!'' مجدد نے رسان سے جواب دیا۔ ''اس حویلی کو کسی ضرورت مند اور مستحق کے حوالے کردیتے ہیں۔ مستقبل کے متعلق کوئی بھی فیصلہ سلطان کی آئندہ حکمتِ عملی سے ہی وابستہ ہوگا۔'' اس کے فیصلے پر زہران اور عبدہ نے سر کی اثباتی جنبش سے توثیق ثبت کر دی۔ جمارا اور مشال سمرون کے لیے دوا لیے چلی آئیں۔ مرسینہ آگے بڑھ کر تایا کی ٹانگیں دبانے لگی۔ ازبل نم آنکھوں سے شوہر پر قرآنی آیات پھونکتی رہی۔ ان سبھی اہلِ خانہ کی کوششوں، علاج، خدمت اور دعاؤں کو موت نے ایک ہی وار میں پچھاڑ دیا۔ اس رات سمرون کی روح بدن کے قفس سے آزاد اپنے اصل مقام کی طرف لوٹ گئی۔ ازبل، جمارا، مرسینہ اور مشال غم سے نڈھال ہوگئی تھیں۔ مجدد، شمس الدین، عبیرہ، عبدہ اور زہران محبت و شفقت سے ان کا ساتھ نبھاتے رہے۔ صلاح بھی اپنے مخصوص ہلکے پھلکے انداز میں ان کا غم غلط کرنے کی کوششوں میں مگن رہتا۔ اسی کشمکش میں ایک ہفتہ بیت گیا۔ اس بوجھل اور خاموش فضا میں ارتعاش اس وقت پیدا ہوا جب مجدد الدین کو سلطان کی جانب سے طلب کیا گیا۔ وہ بلا تاخیر دربار روانہ ہوگیا جہاں شیرکوہ اس سے پہلے ہی موجود تھا۔ نورالدین کی کشادہ پیشانی پر سوچ کی گہری سلوٹیں تھیں۔
''آؤ ابن الدایہ! ہم تمہارے ہی منتظر تھے۔ مجھے تمہارے قرابت دار سمرون کی وفات کا بہت افسوس ہے۔ تاہم اس وقت ملک و ملت کو تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔'' نورالدین نے کہا۔
''ارضِ شام اور دینِ اسلام کے لیے میری زندگی بھی قربان!'' مجدد الدین نے سر تسلیم خم کیا۔
''میں تم دونوں سے مصر کے متعلق گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ اس وقت عالم اسلام میں مصر کی حیثیت بہت نازک ہے۔ صلیبی بار بار اس کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کی تاک میں رہتے ہیں۔'' وہ ایک توقف کرتے ہوئے خاموش ہوگیا۔
''جی ہاں سلطانِ معظم! مصر میں اب اتنا دم خم نہیں رہا کہ وہ اپنی آزاد حیثیت برقرار رکھ سکے۔ اگر ہم نے اسے

اسی صورت حال پر چھوڑ دیا تو صلیبی اسے کسی بھی لمحے اپنے پنجوں میں دبوچ لیں گے۔'' شیرکوہ نے دکھ سے کہا۔

''میرا ذاتی خیال بھی یہی ہے کہ سرزمین مصر پر قبضہ بے حد ضروری ہو چکا ہے۔ ہماری ان ساری جنگوں کا مرکزی نقطہ ہی یروشلم، فلسطین اور شام کے ان علاقوں کی واپسی ہے جو نصرانیوں نے گزشتہ صلیبی جنگوں میں مسلمانوں سے چھین لیے تھے اور ایک بات تو روز روشن کی طرح عیاں ہے، اگر خدانخواستہ اموری مصر پر لشکر کشی اور قبضے کے بعد اپنا اقتدار مستحکم کرنے میں کامیاب ہو گیا تو مزید مسائل پیدا ہونے کا خدشہ ہوگا۔ فلسطین کے کئی علاقے تو پہلے ہی ان کے قبضے میں ہیں۔ مصر کے گرد و نواح میں، اہم ترین شہروں کا وجود بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔'' سلطان نے تجزیہ کیا۔

''سلطانِ معظم! میں پہلے بھی یہ عرض کر چکا ہوں اور آج بھی یہی التجا کروں گا کہ اگر اموری کا کانٹا صاف نہ کیا گیا تو شام سے مصر جانے والے تمام راستے مسلمانوں کے لیے غیر محفوظ ہو جائیں گے۔ عالم اسلام ایک نئے فساد کی لپیٹ میں آ جائے گا۔'' شیرکوہ بے حد مضطرب تھا۔ مصر میں بسر کیے گئے وقت نے اسے بہت سے بھیانک حقائق سے روشناس کروا دیا تھا۔

''اس سلسلے میں میرے ذہن میں ایک تجویز موجود ہے۔'' مجد الدین نے اجازت طلب نظروں سے سلطان کی جانب دیکھا اور مثبت عندیہ پا کر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''ہمیں صلیبیوں کے دو شہروں حصن الاکراد اور ہونین کی جانب متوجہ ہونا چاہیے۔ حصن الاکراد میں سابقہ ہزیمت کا بدلہ چکائے بغیر ہمارا ملی وقار بحال نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک ہونین کا تعلق ہے تو یہاں مقامی صلیبیوں کے علاوہ تقریباً بیس ہزار فرانسیسی ہیں..... ان کا جنگی تجربہ بے حد وسیع اور فی الوقت ناقابل تسخیر ہے۔ حصن الاکراد اور ہونین پر ضرب لگا دی جائے تو صلیبی ہمارے دباؤ میں آ جائیں گے۔''

''مجھے تم دونوں کی گفتگو اور تجاویز سے اتفاق ہے۔ مصر پر گرفت مضبوط کرنے کا یہی مناسب وقت ہے۔ شیرکوہ! اس مہم کے سربراہ تم ہی ہو گے۔ اپنے ساتھ کن سالاروں کو لے جانا چاہتے ہو؟'' سلطان نے پوچھا۔

''سلطان محترم! میں صلاح الدین، شرف الدین برغش اور عزیز الدین جرویک کے ساتھ یہ مہم سر کرنا چاہتا ہوں۔''

''بس! تو پھر طے ہوا۔ تمہاری روانگی کے بعد ہم کچھ عرصہ انتظار کریں گے۔ اگر صلیبیوں نے کسی قسم کی انتقامی کارروائی کرنی چاہی تو ہم بھی فوری طور پر حصن الاکراد اور ہونین کی طرف کوچ کر جائیں گے۔ اس کے بعد بھی اگر صلیبیوں نے مصر میں دخل اندازی کی کوشش کی تو جوابی طور پر اموری کی سلطنت پر یلغار کی جائے گی۔ اپنی حکومت خطرے میں نظر آتے ہی وہ مصر سے نکلنے پر مجبور ہو جائے گا۔'' نورالدین نے حتمی انداز میں کہتے ہوئے وہ اجلاس ختم کر دیا۔ اگلے روز شیرکوہ اپنے لشکر کے ساتھ مصر روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

شیرکوہ کی روانگی کی اطلاع شاور تک پہنچی تو اس نے حسب سابق بے حمیتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یروشلم کے بادشاہ اموری کو کسی بھی طرح اس کی راہ روکنے کا پیغام بھجوا دیا۔ اموری ایک مدت سے اسی موقع کی تاک میں تھا۔ شاور کی استعداد اور اہلیت اس سے ڈھکی چھپی نہ تھی۔ اسے یقین تھا کہ مصر پر قابض ہوتے ہی دیگر علاقوں میں صلیبیوں کی حیثیت مستحکم ہو جائے گی۔ اس نے فوری مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شیرکوہ کی راہ روکنے کے لیے ایک کثیر لشکر تیار کر لیا۔

دوسری جانب شاور اپنی ذاتی انا کی تسکین اور جاہ پرستی میں دیوانہ ہو چکا تھا۔ مصر کے فاطمی خلیفہ العاضد کا کردار ہنوز کٹھ پتلی جیسا ہی تھا۔ اس کی کوئی حیثیت اور وقعت نہ تھی۔ ذاتی حیثیت میں بھی اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ حق کا ساتھ دے سکتا۔ شیرکوہ فرانسیسی مقبوضات کو دائیں طرف چھوڑ کر مصر میں داخل ہوا تھا۔ وہ اطنج کے مقام پر دریائے نیل کے کنارے آیا اور دریا عبور کر کے مغربی کنارے جیزہ کے مقام پر تقریباً '54' روز تک پڑاؤ جاری رکھا۔ شیرکوہ نورالدین زنگی کے مخبروں کے ذریعے اموری اور شاور کے لشکر کا جائزہ لیتا رہا۔ شاور کی بے حمیتی میں ہر گزرتے دن کے ساتھ شرمناک حد تک اضافہ ہو رہا تھا۔ اس نے اموری سے تحریری معاہدہ کر لیا جس کی رو سے وہ یروشلم کے حکمران کو جنگ سے قبل دو لاکھ اشرفیاں ادا کرنے کا پابند ہو گیا تھا۔ مزید حیران کن اور قابلِ افسوس امر تو یہ تھا کہ اس معاہدے پر خلیفہ العاضد نے خود اپنے ہاتھ سے دستخط کیے۔

شیرکوہ دشمن کی ہر نقل و حرکت سے مکمل طور پر آگاہ ہو رہا تھا۔ صلیبی لشکر کے جیزہ کا رخ کرنے کی خبر سنتے ہی وہ یابین کے مقام پر خیمہ زن ہو گیا۔ مخبروں کی دی گئی اطلاعات کے مطابق یروشلم اور مصر کے متحدہ لشکر کی تعداد بارہ گنا زیادہ تھی۔ شیرکوہ ذاتی طور پر ایک نڈر اور بلند حوصلہ سالار تھا۔ اس نے اپنی عسکری زندگی میں کئی گنا کثیر لشکروں

کا نہ صرف سامنا بلکہ کامیابی سے دفاع بھی کیا تھا۔اس کی لغت میں خوف یا گھبراہٹ کا کوئی لفظ ہی نہ تھا۔اس بار خدشہ صرف اس بات کا تھا کہ دیگر سالار حوصلہ نہ ہار جائیں۔ اسے دلی طور پر مجدد الدین کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔لشکر میں پھوٹ کے خدشات سے نجات کے لیے اس نے تمام تر سالاروں کو طلب کر کے مکمل صورت حال سے آگاہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''عزیزانِ دیرینہ! ایک سپاہی کی زندگی میں یقین اور عدم یقین کی کیفیت سب سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔جب وہ اپنے بدن پر ہتھیار سجائے میدانِ جنگ میں روانہ ہوتا ہے تو اسے بالکل علم نہیں ہوتا کہ تقدیر نے اس کے لیے اپنے ترکش میں کیا چھپا رکھا ہے۔اس موقع پر صرف اس کا حوصلہ اور ہمت ہی مشکل سے مشکل حالات کو اپنے حق میں ڈھال سکتے ہیں۔'' وہ اتنا کہہ کر دانستہ طور پر خاموش ہو گیا۔

''امیر محترم! لگتا ہے آپ کے ذہن میں کوئی خدشہ پنپ رہا ہے۔'' شرف الدین برغش مضطرب ہوا۔

''خدشہ تو نہیں، میں آپ سب کو چند حقائق سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔یہ مہم سب کے لیے بے پناہ اہمیت کی حامل ہے۔دوسری جانب مصری حکومت بھی اپنے تمام وسائل جھونکنے پر تل چکی ہے۔ہماری کسی بھی پیش قدمی کے جواب میں وہ خاموش تو بیٹھے نہیں رہ سکتے تھے۔'' شیر کوہ نے رسان سے بتانا شروع کیا۔''اس بار بھی وہ ہم سے بارہ گنا زیادہ لشکر میدان میں لا رہے ہیں۔'' اس انکشاف پر سالاروں کی رنگت متغیر ہو گئی تاہم شیر کوہ کے احترام میں وہ اگلے ہی لمحے سنبھلنے پر مجبور ہو گئے۔

''میں آپ لوگوں کی کیفیات سمجھ رہا ہوں۔یہ خبر اس قدر آسانی سے نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔آپ بلا تامل اپنی رائے دیجیے۔'' اس نے تحریک دی۔

''امیر! میری رائے میں ہمیں سلطان سے مزید مدد طلب کر لینی چاہیے۔'' ایک سالار نے کہا۔

''میرا خیال تو یہ ہے کہ اس قدر مختصر لشکر کے ساتھ میدان جنگ میں اترنا ہی حماقت ہو گی۔بہتر یہی ہو گا کہ دریائے نیل مشرقی سمت سے عبور کر کے شام واپس چلے جائیں۔'' دوسرے سالار نے رائے دی۔

''یہ سرزمین ہمارے لیے اجنبی ہے۔خدانخواستہ شکست کی صورت میں کہیں کوئی جائے امان نہیں ہو گی۔'' تیسری رائے جان کر شیر کوہ کا دل تاسف سے بھر گیا۔ابھی جنگ کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا اور سالاروں کی زبان پر شکست کے خدشات مچلنے شروع ہو گئے تھے۔

''یہاں کے سپاہی اور کسان بھی ہمارے دشمن ہو جائیں گے۔وہ ہمارے لشکریوں کو چن چن کر قتل کریں گے۔'' ایک اور صدا آئی۔

اسی لمحے شرف الدین برغش اٹھا اور اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔''میں نہیں جانتا کہ امیر شیر کوہ اس وقت کیسے جذبات محسوس کر رہے ہیں لیکن مجھے ذاتی طور پر آپ سب کے خیالات سے بہت حیرانی بلکہ دکھ زیادہ ہوا ہے۔آپ سب ایک ہی بات پر زور دے رہے ہیں کہ دشمن کی تعداد ہم سے زیادہ ہے۔کیا آپ یہ بات بھول گئے ہیں کہ ہم نے ماضی میں ایسے ان گنت معرکے سر کیے ہیں جن میں دشمن کا لشکر ٹڈی دل سے بھی کہیں زیادہ خطرناک تھا۔اس وقت بھی تو فتح ہمارا مقدر بنی تھی۔'' اس نے توقف کیا اور پھر قدرے بلند آواز میں کہنے لگا۔

''میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا! فتح یا شکست کبھی تعداد پر منحصر نہیں ہوتیں۔اتفاق اور باہمی تعاون ایسے ہتھیار ہیں جن کی مدد سے بڑے سے بڑا لشکر بھی زیر کیا جا سکتا ہے۔اس وقت جو سالار عددی خوف سے حلب اور دمشق لوٹنے کا سوچ رہے ہیں، میں انہیں ایک بات واضح کر دوں کہ یہ عمل پیٹھ پھیر کر بزدلی سے فرار اور اپنے وطن و دین سے نمک حرامی ہو گی۔جو لشکری قید یا موت سے خوفزدہ ہوتا ہے اسے فوج میں شامل رہنے کا کوئی حق ہی نہیں۔ایک سپاہی کو دلیر اور موت کے خوف سے بے نیاز ہونا چاہیے۔جو سپاہی ایسے اوصاف کا مالک نہیں ہوتا اسے میرے نزدیک مخنثوں میں شامل ہو جانا چاہیے یا خواتین کے ساتھ زیور پہن کر گھر سنبھال لینے چاہئیں۔انہیں سپاہ میں شامل رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔آج اگر ہم یہاں سے پیٹھ پھیر کر لوٹ گئے تو پروردگار دو عالم سے روزِ قیامت کس منہ سے رحمت و معافی کے طلبگار ہوں گے؟ اس ذات اقدس نے اپنی الہامی کتاب میں ہمیں کتنی بار سینہ تان کر دشمن کا مقابلہ کرنے کی ترغیب دی ہے۔اس کا وعدہ ہے کہ اس کے دین کی سربلندی کے لیے بہادری سے لڑنے والوں کے لیے نصرت الٰہی اور انعامات یقینی ہیں۔یہ کیوں بھول رہے ہو کہ ہم اپنے مسلمان بھائیوں کے مال سے تنخواہیں پاتے ہیں۔ہم ان کی حفاظت کے ذمے دار ہیں۔ ایک مسلم سرزمین کو کفار کے حوالے کر کے کیونکر لوٹ سکتے ہیں؟ اس نمک حرامی کا روز آخرت کیا جواب دیں گے؟'' شرف الدین برغش کی آنکھوں میں نمی اور لہجے کی

حدت وگداز نے وہاں موجود سبھی افراد کے دل دہلا دیے۔ وہ اپنے وجود میں ایک عجیب ولولہ اور منفرد گداز پنپتا ہوا محسوس کر رہے تھے۔ شرف الدین کے خاموش ہوتے ہی شیرکوہ کا بھتیجا صلاح الدین اپنی نشست سے اٹھ کر کہنے لگا۔

''میں واپس نہیں جاؤں گا۔ خدا کی قسم! اگر یہاں سے ہر سالار اور سپاہی اپنا پڑاؤ اٹھا کر لوٹ جانے کے لیے آمادہ ہو بھی جائے تو میں ان کا ہم رکاب نہیں بنوں گا۔ میں تن تنہا اپنی تلوار اور ڈھال کے ساتھ لاکھوں کے لشکر میں گھس جاؤں گا۔ اپنے جسم میں لہو کے آخری قطرے تک لڑتا رہوں گا لیکن واپس نہیں جاؤں گا۔ میرے سامنے لشکر بیسیوں کا ہو یا ہزاروں لاکھوں کا' میرے اطمینان کے لیے یہی بات کافی ہے کہ ان سے مقابلے کی صورت میں مجھے شہادت نصیب ہوگی۔ روزِ آخرت جب میں اپنے پروردگار کے سامنے حاضری دوں گا تو میرے زخموں سے بہتا لہو ویسے ہی تروتازہ ہوگا اور قیامت تک میرا شمار ان لوگوں میں ہوگا جن کے بارے میں رب کائنات نے فرمایا ہے کہ وہ زندہ ہیں' اپنے رب کے پاس رزق پاتے ہیں لیکن تم ان کی زندگی کا شعور نہیں رکھتے۔'' صلاح الدین کے الفاظ و انداز نے بھی حاضرین کا دل گرما دیا۔ ان کا خوابیدہ جوش' جذبہ' جنون اور ہمت نے ایک ہی پل میں پژمردہ وجود میں برق پیدا کر دی۔ عزیز الدین جرویک اپنی نشست سے اٹھا اور نم لہجے میں بولا۔

''اللہ اکبر..... اللہ اکبر..... اللہ اکبر..... صلاح الدین میرے بھائی! تم اکیلے نہیں ہو۔ میں بھی تمہارے ساتھ شانہ بشانہ میدانِ جنگ میں کھڑا رہوں گا۔ میری اولین کوشش ہوگی کہ شہادت سے خود بغلگیر ہو جاؤں۔''

لشکریوں کا ولولہ آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ وہ اپنی برہنہ تلواریں فضاؤں میں بلند کر کے یک زبان ہو چکے تھے۔

''ہم سب میدان جنگ میں اترنے کے لیے تیار ہیں۔ فتح نہ ہوئی تو دین کی سربلندی کے لیے شہادت سے بڑھ کر انعام بھلا کیا ہوگا؟ ہم شہادت کو اپنی دلہن بنانے کے لیے تیار ہیں۔ ہم دشمن کو بھسم کرنے کے لیے بے تاب ہیں۔''

یہ صورت حال اور جذبات دیکھ کر شیرکوہ کے چہرے پر ایک خوشگوار مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے مزید وقت ضائع کیے بغیر صلاح الدین' شرف الدین برغش اور عزیز الدین جرویک کو اپنے پاس بلایا اور جنگی حکمتِ عملی سے آگاہ کرنے لگا۔

''اس بار میں لشکر کی ترتیب میں چند تبدیلیاں پیدا کر کے دشمن کو غفلت میں ضرب لگاؤں گا۔ قلب کا کماندار صلاح الدین ہوگا۔ میمنہ کی قیادت خود میں عزیز الدین جرویک کے ساتھ سنبھالوں گا۔ شرف الدین کے پاس میسرہ کی کمانداری ہوگی۔ اب تمہارے ذہنوں میں فوری طور پر یہ سوال اٹھ رہا ہوگا کہ میں نے اپنے بجائے قلب کی ذمے داری صلاح الدین کو کیوں سونپی ہے؟ اس بات کے جواب میں ہی میری اس جنگی چال کی اصل حکمت پوشیدہ ہے۔ میں سلطان عمادالدین کے دورِ حکومت سے صلیبیوں کے ساتھ نبرد آزما رہا ہوں۔ وہ میرے نام اور فتوحات سے اپنے ہاتھ کی لکیروں سے بھی زیادہ واقف ہیں۔ انہیں یہی گمان ہوگا کہ حسبِ سابق قلب کا لشکر میرے پاس ہے لہٰذا وہ اسی جھے پر اپنا بھرپور دباؤ ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ اس موقع پر صلاح الدین دانستہ طور پر پسپائی اختیار کرنا شروع کر دے گا۔ وہ دھیرے دھیرے پیچھے ہٹتے ہوئے صلیبیوں کو آگے بڑھنے کا موقع دے گا۔ صلیبی یہ تصور کریں گے کہ شیرکوہ نے پسپائی اختیار کر لی ہے۔ اس گمان کے ساتھ ہی ان کے ذہن میں یہ خیال بھی ابھرے گا کہ اگر شیرکوہ ہمت ہار رہا ہے تو میمنہ اور میسرہ کی جانب سے مزاحمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صلاح الدین کے پیچھے ہٹتے ہی میں اور شرف الدین برغش بھی اپنا لشکر پیچھے دھکیلنا شروع کر دیں گے تاکہ دشمن کے زیادہ سے زیادہ لشکری آگے بڑھ سکیں۔ صلیبیوں کے اس جال میں قدم رکھتے ہی میں تکبیریں بلند کر دوں گا۔ میرا عندیہ ملتے ہی شرف الدین بھی فوری طور پر اپنی جانب سے دشمن پر حملہ کر دے گا۔ ہم ان کے پہلوؤں پر دور تک یلغار کرتے چلے جائیں گے۔ اس کے بعد صلاح الدین فوری طور پر قلب میں آگے بڑھے ہوئے لشکر پر پلٹ کر حملہ کر دے گا۔ اگر ہم اس منصوبہ بندی پر عمل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو صلیبیوں کی تباہی یقینی ہے۔''

شیرکوہ کا یہ تجزیہ اور حکمتِ عملی بالکل درست ثابت ہوئی۔ صلیبی اس گمان میں تھے کہ لشکر کی کمانداری شیرکوہ کر رہا ہے لہٰذا اس پر دباؤ ڈالنے سے میمنہ اور میسرہ بھی منتشر ہو جائیں گے۔ انہوں نے اپنی تمام تر توانائی قلب پر صرف کر دی۔ نوجوان صلاح الدین نے چچا کی حکمتِ عملی اور اپنی فراست کو بھرپور انداز میں استعمال کیا۔ اس کے پیچھے ہٹتے ہی دشمن کو اپنی فتح کا یقین ہو گیا۔ انہوں نے بلا سوچے سمجھے اس جال میں قدم رکھ دیا۔ شیرکوہ اسی لمحے کا منتظر تھا۔ اس نے تکبیریں بلند کرتے ہوئے صلیبیوں کے پہلوؤں پر یلغار کر دی۔ شرف الدین برغش نے بھی اس

کا بھرپور ساتھ دیا۔ صلاح الدین نے بھی امیر کی ہدایات پر بھرپور عمل کیا۔ لمحہ بھر میں ہی صلیبیوں کا لشکر لاشوں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ نصرانی اور مصری سالار پینترے بدلتے ہوئے بازی اپنے حق میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن اس روز ایک چھوٹے سے لشکر کے ہاتھوں بارہ گنا کثیر فوج کی تباہی مقدر ہو چکی تھی۔ اس فتح کے بعد شیرکوہ اپنی مختصر سپاہ کے ساتھ صعید سے سکندریہ تک قابض ہو گیا۔ سکندریہ میں انتظامی امور کی درستی کے لیے صلاح الدین کو مامور کر کے وہ بالائی مصر کا مالیہ وصول کرنے کے لیے صعید کے علاقے کی طرف کوچ کر گیا۔

دوسری جانب صلیبی اور مصری لشکر شکست سے دلبرداشتہ قاہرہ پہنچ چکا تھا۔ آتشِ انتقام میں سلگتے ہوئے انہوں نے جنگ کے لیے ساز و سامان کی تیاری کا آغاز کر دیا۔ اس تیاری کے ساتھ انہوں نے حالاتِ حاضرہ پر بھی گہری نظر رکھی ہوئی تھی۔ صلاح الدین، شرف الدین برغش اور عزیز الدین جرویک کے سکندریہ میں قیام اور شیرکوہ کی بالائی مصر روانگی نے ان کی شرانگیزی از سرِ نو بیدار کر دی۔ مختصر مسلم لشکر کی مزید دو حصوں میں تقسیم ان کے لیے انتقام کا بہترین موقع تھا۔ انہوں نے ایک بھرپور لشکر تیار کر کے تین ماہ تک سکندریہ کا محاصرہ کیے رکھا۔ اس صورتِ حال کے بعد صلاح الدین اور اس کے لشکریوں کے پاس اشیائے خورونوش کا خاتمہ ہو گیا۔ لشکر کی قلت سے انتظامی امور... بہ مشکل چلائے جا رہے تھے۔ شہر سے باہر نکل کر دشمن کے مقابلے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنی فطری جرأت مندی، حوصلے اور تحمل سے اس متحدہ لشکر کے سامنے ڈٹا رہا۔ اس محاصرے کی سختیاں اسے اندرونی طور پر مزید مضبوطی فراہم کر رہی تھیں۔ اس کی مشکلات سے قطع نظر شیرکوہ بھی سخت اذیت میں مبتلا ہو چکا تھا۔ مصر میں مالیہ وصول کرنا بھی بے حد ضروری تھا۔ اس کا مسلح لشکر اس قدر کم تعداد میں تھا کہ سکندریہ کے محاصرے پر مامور فوج پر ضرب لگانے کے قابل ہی نہ تھا۔

وقت کچھ مزید آگے سرکا تو شیرکوہ نے بالآخر ایک رستہ تلاش کر ہی لیا۔ اس نے اپنے لشکر کے ساتھ شمالی مصر سے کوچ کیا اور قاہرہ شہر کا محاصرہ کر لیا تھا۔ قاہرہ کے دفاعی انتظامات اس قدر مضبوط تھے کہ مختصر سپاہ کے ساتھ اس کا محاصرہ اور قبضہ برقرار رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے محض ایک نفسیاتی داؤ کھیل کر صلیبیوں کو ذہنی دباؤ میں مبتلا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی یہ چال توقع سے بھی زیادہ کامیاب رہی۔ شیرکوہ کی آمد نے جہاں سکندریہ میں محصور صلاح الدین اور اس کی سپاہ کے جذبے توانا کیے، وہیں دوسری جانب شاور اور اموری کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اس آمد کے پیچھے ضرور کوئی طوفان پوشیدہ ہے۔ شیرکوہ کے سابقہ کارناموں کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ خوفزدہ ہو رہے تھے کہ ماضی کی طرح کوئی مافوق الفطرت چال چلتے ہوئے یہ بازی نہ پلٹ دے۔ ایسے نورالدین زنگی کی جانب سے کمک مل جاتی تو تباہی یقینی تھی۔ اس صورت میں صلیبی افواج اور شاور سکندریہ اور قاہرہ کے درمیان ہی بری طرح پھنس کر رہ جاتے۔ اس خوف اور ذہنی دباؤ میں وہ شیرکوہ سے مذاکرات کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اموری کے قاصدین کے پہنچتے ہی وہ قاہرہ کا محاصرہ ترک کر کے سکندریہ روانہ ہوا اور شرائط نامہ طے کر لیا گیا۔

۱۔ شاور شیرکوہ کو پچاس ہزار دینار دے گا۔

۲۔ مصر سے حاصل شدہ مالیہ شیرکوہ کے پاس ہی رہے گا۔

۳۔ صلاح الدین کو سکندریہ سے بھیج کر شہر مصریوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔

۴۔ اموری اور شیرکوہ دونوں اپنی افواج کے ساتھ مصر سے کوچ کر جائیں گے۔

اس شرائط نامے کے بعد شیرکوہ نے مصری حکومت سے پچاس ہزار دینار وصول کر کے سکندریہ مقامی انتظامیہ کے حوالے کیا اور اپنے لشکر کے ساتھ شام کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کی روانگی کے بعد اموری کی عیاری اور فریب ایک بار پھر اس پر غالب آ گئے۔ وہ اس عہدنامے پر قائم نہ رہ سکا۔ اس نے شاور پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ وہ اپنے لشکر کے ہمراہ اس صورت میں کوچ کرے گا جب شاور اسے کم از کم ایک لاکھ دینار خراج کے ساتھ مصر میں ایک صلیبی نائب اور کچھ صلیبی دستوں کے قیام کی رضامندی دے گا۔ شاور کی ذاتی کمزوریاں اور نااہلی انکار کی مجاز ہی نہ تھیں۔ اس میں اتنی اخلاقی سکت ہی کہاں تھی کہ اموری کے سامنے کسی بھی بات پر مزاحمت کر سکتا۔ اس نے بے چون و چرا شرائط تسلیم کر لیں۔ اموری اور شاور کے درمیان ہونے والا معاہدہ اس قدر خفیہ رکھا گیا تھا کہ فاطمی خلیفہ العاضد کو بھی اس کی بھنک نہ لگ سکی۔

☆☆☆

شیرکوہ، صلاح الدین، شرف الدین برغش، عزیز الدین جرویک اور دیگر سالاروں کی مصر میں مصروفیات کے دوران نورالدین زنگی بھی نئی مہمات میں الجھا رہا تھا۔ صلیبیوں پر دباؤ

ڈالنے کے لیے اس نے حصن الاکراد اور ہونین کا انتخاب کیا تھا۔ حصن الاکراد میں ملی ہزیمت کا داغ کسی بھی صورت میں دھونا ضروری تھا۔ دوسری جانب ہونین میں مقیم فرانسیسی ..... اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے وہاں سے نکل کر مسلم علاقوں پر یلغار کیا کرتے تھے۔ نورالدین نے اپنی مدد کے لیے موصل سے قطب الدین زنگی کو بھی طلب کر کے حصن الاکراد کا رخ کر لیا جہاں موجود صلیبیوں کا جوش و ولولہ آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ سابقہ فتح نے انہیں احساسِ برتری میں مبتلا کر رکھا تھا۔ سلطان کی آمد کی خبر ہوتے ہی انہوں نے ایک بار پھر انہی میدانوں میں صف آرائی شروع کر دی۔ اس جنگ میں شرکت کے لیے ہونین میں یورپ سے آنے والے صلیبیوں کے علاوہ طرابلس اور انطاکیہ سے بھی رضا کاروں کے جتھے حصن الاکراد پہنچ گئے تھے۔

نورالدین اور صلیبیوں کے لشکر آمنے سامنے ہوتے ہی نصرانیوں نے جنگ کی ابتدا کرنے کے لیے طبل، نقارے اور نفیریاں بجوا دیں۔ مسلم لشکر میں حسبِ روایت طبل کے بجائے تکبیریں بلند ہو رہی تھیں۔ نورالدین نے فوری طور پر اپنی سپاہ کو حتمی صفوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ اس بار لشکر چار حصوں میں منقسم ہوا۔ وسطی اور قلبی حصے نورالدین نے اپنے ماتحت رکھے تھے۔ اس کے ساتھ نجم الدین اور اسامہ بن مرشد نائبین تھے۔ میمنہ کی کمانداری مجدالدین کے پاس تھی۔ اس کی مدد کے لیے شمس الدین اور ضلع ہمراہ تھے۔ میسرہ کی ذمے داری قطب الدین زنگی نے سنبھال رکھی تھی۔ اس کے نائبین میں بیٹا زین الدین اور فخرالدین مسعود شامل تھے۔ چوتھے حصے کی کمانداری ایک اور سالار شہاب الدین عمود حارمی کے ذمے تھی۔ اس کے ہمراہ عین الدولہ باروقی، خطب الدین منیجی، سیف الدین ہلکاری تھے۔ ان کے ذمے سلطان کے پڑاؤ کی حفاظت تھی۔ حصن الاکراد میں سابقہ شکست کے بعد انہیں ایک بھرپور جواب دینا بہت ضروری ہو چکا تھا۔ اپنی اس فتح کے بعد صلیبیوں کا برتاؤ اور سرگرمیاں ناقابلِ برداشت ہو چکی تھیں۔ نورالدین انہیں بہرصورت باور کروانا چاہتا تھا کہ مسلمان اتنے کمزور نہیں ہیں کہ اپنے دینی بھائیوں پر ظلم و ستم برداشت کرتے رہیں۔ نورالدین کی جنگی مہارت کا یہ عالم تھا کہ اس نے طبل بجنے کے دورانیے میں ہی جنگ کی ابتدا کر دی۔ نتیجتاً طبل بجانے والوں کو لشکر کے عقبی حصے میں روانہ ہوتے ہی بنی۔ نورالدین بھرپور قوت اور وحشت سے دشمن پر ٹوٹ پڑا۔ اس حملے کے کچھ ہی وقفے بعد مجدالدین نے بھی اپنا لشکر آگے بڑھا دیا۔ قطب الدین زنگی بھی اپنے بیٹے زین الدین کے ساتھ بھرپور انداز میں پیش قدمی کر چکا تھا۔ صلیبی ابھی تک اسی گمان میں تھے کہ سلطان کا لشکر عددی لحاظ سے ان کے پائے کا نہیں لہٰذا وہ ماضی کی طرح اس بار بھی بہ آسانی فتح حاصل کر لیں گے لیکن نورالدین کی جنگی فراست اور حکمت عملی اس قدر غیر معمولی تھی کہ وہ لمحہ بہ لمحہ ان پر حاوی ہوتا دکھائی دینے لگا۔ مسلم سپاہ بڑی تیزی سے اگلی صفوں کو چیرنے کے بعد لشکر کے وسطی حصے میں تباہی برپا کرتے ہوئے پچھلی صفوں کے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ صلیبی اس صورت حال پر بوکھلا کر رہ گئے۔ مایوسی کے عالم میں وہ شہر میں محصور ہونے کے لیے بھاگ کھڑے ہوئے۔ نورالدین انہیں پسپا ہونے کا کوئی بھی موقع فراہم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے لشکر کے ساتھ، ان کا تعاقب جاری رکھا اور برق رفتاری سے شہر پناہ کے محافظوں کو ٹھکانے لگاتا ہوا شہر میں داخل ہو گیا۔ لمحہ بھر میں ہی وہاں گھمسان کا رن پڑ گیا۔

نورالدین مزاحمت کاروں پر تیزی سے غلبہ حاصل کر رہا تھا۔ صلیبیوں نے انتشار کے عالم میں شہر پناہ کے دوسرے دروازوں کی طرف سے فرار ہونا شروع کر دیا۔ حصن الاکراد سے نکلتے ہی انہوں نے ہونین کے مضبوط قلعے کا رخ کر لیا۔ ان کا غرور اور عسکری اعتماد نورالدین کے سامنے سرنگوں ہو چکے تھے۔ اس فتح کے بعد سلطان نے چند روز شہر میں قیام کیا اور انتظامی امور میں اصلاحات کے بعد قرب و جوار کے اکثر چھوٹے قلعوں اور شہروں پر بھی قبضہ کر لیا۔ رمضان المبارک کے بابرکت مہینے کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس بار نورالدین کی عاجزی، تشکر اور بندگی کا عالم ہی نرالا تھا۔ ماہِ مقدس اور عیدالفطر حمص شہر میں گزارنے کے بعد اس نے بانیاس سے ہوتے ہوئے فرانسیسیوں کے قلعہ ہونین کا رخ کر لیا۔ حصن الاکراد سے مفرور صلیبی بھی اسی قلعے میں جمع تھے۔ سابقہ شکست نے ان کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ وہ نفسیاتی طور پر مسلمانوں سے دہشت زدہ ہو چکے تھے۔ نورالدین کی آمد کے وقت قلعے میں تقریباً انیس ہزار فرانسیسی ..... اور صلیبی موجود تھے۔ مقامی سپاہ کی تعداد اس کے علاوہ تھی لیکن ان میں سے کسی کو بھی شہر سے باہر نکل کر مسلم لشکر کا سامنا کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ وہ شہر میں ہی محصور ہو کر رہ گئے۔ نورالدین کی جانب سے یہ محاصرہ تقریباً تین ہفتے جاری رہا۔ اس دوران دونوں لشکروں کی باہمی سنگ باری اور آتش باری بھی متواتر جاری رہی۔

چوتھے ہفتے کا آغاز بہت دھماکا خیز تھا۔ مسلم سپاہی ایک سرنگ کے ذریعے راتوں رات قلعے کے شمالی برج میں داخل ہوئے اور اپنا علم لہرا دیا۔ صلیبی یہ کارروائی دیکھ کر اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھے۔ اپنی ناک تلے ہونے والی یہ کارروائی ان کے لیے ذلت اور رسوائی کی انتہا تھی۔ انہوں نے بلا سوچے سمجھے مسلم لشکر پر حملہ کر دیا۔ سلطان اس ردِعمل اور جوابی کارروائی کے لیے پہلے ہی تیار تھا۔ اس نے بھرپور وار کرتے ہوئے پہلے ہی ہلے میں پانچ ہزار صلیبیوں کو انہی کے خون میں نہلا کر رکھ دیا۔ ہونین کے صلیبی دہشت زدہ ہو کر سر پر پاؤں رکھے فرار ہونے لگے لیکن نورالدین نے اس بار بھی ان کی ایک نہ چلنے دی۔ چار ہزار افراد کو گرفتار کر کے قیدی بنا لیا گیا اور سلطان کسی بھی رکاوٹ کے بغیر ایک فاتح کی سی شان سے ہونین میں داخل ہو گیا۔ حسبِ سابق یہاں بھی نظم ونسق کی درستگی کے بعد اس نے اپنا ایک والی مقرر کیا اور ایک قریبی قلعے ''آکاف'' پر بھی۔۔ بہ آسانی قبضہ کر لیا۔ نورالدین اور اس کے لشکر کے حوصلے اس قدر بلند ہو چکے تھے کہ وہ مزید پیش قدمی کر کے دیگر صلیبی مقبوضات پر بھی اپنا تسلط جمانا چاہتے تھے۔ اس دوران مخبروں کے ذریعے شیرکوہ اور صلاح الدین کی حمص آمد کی

میں اضطراب جھلکنے لگا۔ جعبر کے قلعے پر قبضے کی خواہش تو ایک طویل عرصے سے اس کے دل کی مکین تھی۔ وہ ایک مضبوط لشکر کے ساتھ صلیبیوں کے سامنے وہاں دفاع کا ایک مضبوط بند باندھنا چاہتا تھا لیکن بنومسیب اس بات کے لیے قائل ہی نہ ہوتے تھے۔ نورالدین کے لیے اس قلعے کی اہمیت اس لیے بھی ناگزیر تھی کہ اسی مقام پر چند سال پہلے اس کے والد عمادالدین کو شہید کیا گیا تھا۔ سلطان ملک شاہ سلجوقی کے عہد سے ہی یہاں بنومسیب حکمران تھے۔ اس قلعے کا اصل فاتح بھی ملک شاہ سلجوقی ہی تھا۔ نورالدین نے فوری طور پر اپنے ذہن میں کچھ جمع تفریق کی اور شہاب الدین کو اپنے پاس بطور مہمان ٹھہرا لیا۔ جعبر سے وابستہ والد کی یادیں اسے مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے چکی تھیں۔ کچھ روز بعد اس نے شہاب الدین کو خصوصی طور پر اپنے پاس طلب کر لیا۔

''شہاب الدین! میں چاہتا ہوں کہ جعبر کو اسلامی سلطنت میں شامل کر لیا جائے۔''

''اسے پہلے ہی اسلامی سلطنت کا حصہ سمجھیے سلطان! قلعے کا حاکم الحمدللہ مسلمان ہی تو ہے۔'' اس نے مکاری سے کہا۔ نورالدین اس کے جواب پر جز بز ہو کر رہ

نے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ اس مستحکم قلعے کو اپنی مملکت کا حصہ بنا کر ہی دم لے گا تاکہ اسے صلیبیوں کے خلاف ایک مضبوط حصار کے طور پر استعمال کیا جاسکے۔ دمشق واپسی کے بعد نورالدین نے مزید کچھ ماہ انتظار کیا اور فخرالدین کی قیادت میں ایک لشکر مرتب کر کے جعبر پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کر دیا۔ شہاب الدین بھی سلطان کی ان سرگرمیوں سے بے خبر نہیں تھا۔ اس کے ذہن میں اپنی روانگی کے وقت سے ہی یہ خدشہ موجود تھا کہ نورالدین اپنی ضد پوری کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی قدم ضرور اٹھائے گا۔ اسی خدشے کے تحت شہاب الدین نے اپنے مخبروں کو مستعد رہنے کی ہدایات دے رکھی تھیں۔ فخرالدین مسعود کی آمد کی خبر سنتے ہی اس نے شہر میں موجود تمام لشکریوں کو فصیل کے اوپر چڑھا دیا۔ شہاب الدین نے قلعے کی حفاظت کے لیے چھوٹی چھوٹی منجنیقیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس کے حکم پر منجنیقوں کو بھی برجوں کے اندر نصب کر کے پتھروں کے ڈھیر لگا دیے گئے۔ اس کے علاوہ فصیل کی اندرونی سمت میں موجود بڑے بڑے شہ نشینوں میں پانی گرم کرنے کا خصوصی اہتمام کیا گیا۔ فخرالدین مسعود اور مسلم لشکر کے قلعے کے نزدیک آتے ہی سنگ باری کے ساتھ کھولتا ہوا پانی اور انگارے پھینکے جانے کی تیاریاں بھی مکمل ہو چکی تھیں۔ ان تیاریوں کے بعد کسی بھی حملہ آور کا فصیل کے قریب پھٹکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

فخرالدین نے فصیل کا کمزور حصہ تلاش کر کے اس پر حملہ آور ہونے یا کسی رخنے سے شہر میں داخل ہونے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا لیکن کامیابی مل کے ہی نہ دے رہی تھی۔ شہر پناہ کے دروازے خلاف معمول بہت تھوڑے اور استحکام میں لاثانی تھے۔ فخرالدین کے پاس ان دروازوں کو توڑنے کا کوئی سامان موجود نہ تھا۔ اس کے وسائل بھی محدود تھے۔ وہ رسوں کی سیڑھیاں بنا کر فصیل کے اوپر چڑھتے ہوئے کسی نزدیکی برج پر قبضہ کرنا چاہتا تھا تاکہ اپنے تسلط کو وسعت دے کر شہر کی فصیل کے کسی حصے کی جانب پیش قدمی کر سکے۔ اس کے علاوہ فخرالدین شہر میں قیام کی کوششیں کر رہا تھا تاکہ شہاب الدین کے لشکر پر ایسی ضرب لگائی جائے کہ وہ خود قلعہ ان کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہو جائے لیکن کوئی بھی کوشش بارآور ثابت نہ ہو سکی۔ جعبر کا قلعہ اس قدر وسیع تھا کہ فصیل ہی غیر معمولی رقبے پر محیط تھی۔ فخرالدین کے پاس اتنا لشکر بھی نہ تھا کہ وہ اپنی سپاہ کو چاروں سمت پھیلا دے۔ وہ قلعے کی ایک ہی جانب رہنے پر مجبور تھا۔ شہاب الدین کو اس کے حواری اشیائے خورونوش اور دیگر جنگی ساز و سامان کسی نہ کسی طریقے سے پہنچا دیا کرے۔ محاصرہ طول پکڑتا جا رہا تھا۔ نورالدین زنگی کو جب فخرالدین مسعود کی ناکامی کی خبر ملی تو اس نے مجدالدین کو جعبر روانہ کر دیا۔

☆☆☆

مجدالدین کے جعبر پہنچنے کے بعد فخرالدین مسعود اور اس کی سپاہ نے والہانہ انداز میں ان کا استقبال کیا۔ مجدالدین کے ساتھ طغ اور شمس الدین بھی شامل تھے۔ مجد نے اپنے چند دستوں کے ساتھ فصیل کے اردگرد چکر لگانے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ قلعے کے جغرافیے کا بھرپور جائزہ لینا چاہتا تھا۔ اس سرگرمی سے فراغت پاتے ہی مجد نے فخرالدین، طغ اور شمس الدین کو خصوصی اجلاس کے لیے طلب کرلیا۔

''فخرالدین میرے عزیز! میں یہ جاننا چاہوں گا کہ قلعے پر حملہ ایک ہی سمت کرتے رہے ہو یا رخ بدل کر لشکر کو پھیلایا بھی تھا؟'' مجد نے پوچھا۔

''جعبر کا مشرقی دروازہ ہی سب سے بڑا ہے۔ آمدورفت بھی زیادہ تر یہیں سے ہوا کرتی ہے۔ باقی دروازے چھوٹے ہیں اور وہاں شہاب الدین کے لشکری بھی قدرے کم ہوتے ہیں۔ شہاب کی زیادہ سپاہ فصیل کے اوپر تعینات ہے۔ وہیں سے حملہ آوروں پر منجنیقوں کے ذریعے پتھر، تیر، گرم پانی اور انگارے پھینکے جاتے ہیں۔ میں جب بھی قلعے کے نزدیک گیا انہی وجوہات کی بنا پر الٹے قدموں واپس لوٹنا پڑا۔ اسی لیے تو یہ قلعہ اب تک فتح نہیں ہو سکا۔''

''یہی تو تم نے غلطی کی میرے بھائی!'' مجدالدین نے کچھ لمحے سوچ بچار کے بعد کہا۔ ''تم مشرقی دروازے کو قوت کا سرچشمہ سمجھ کر ضرب لگاتے رہے اور انہیں چھوٹے دروازوں سے بیرونی جانب سے رسد اور کمک ملتی رہی۔ اسی وجہ سے وہ محاصرے کو طول دینے میں کامیاب رہا ہے۔''

مجد کا تجزیہ سن کر فخرالدین کی رنگت متغیر ہو گئی۔ اسے اپنی فاش غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔

''آپ نے کوئی لائحہ عمل تیار کرلیا ہے کیا؟'' وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔

''ہاں! دونوں لشکروں کی یکجائی کے بعد اس کے چار حصے کر لیے جائیں گے۔ یہ سبھی حصے میری، تمہاری، طغ اور شمس الدین کی کمان میں رہیں گے۔ مشرقی دروازے پر میں رہوں گا۔ بقیہ تین دروازے تم تینوں سنبھالو گے۔ تمہیں فصیل سے اس قدر فاصلے پر رہنا ہوگا کہ تیراندازی

سے کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اس دوران تمہیں دو امور کا دھیان رکھنا ہوگا۔ دن کے اوقات میں ہم چاروں اطراف سے پیش قدمی کرتے ہوئے برجوں کے اندر محافظوں پر تیراندازی کریں گے۔ ہمارے سامنے ڈھالوں کی آڑ بنائی جائے گی تاکہ جوابی تیراندازی کے نقصانات سے بچاؤ ہو سکے۔ ہم نے ہر ممکن طور پر شہاب الدین کے تیراندازوں میں کمی کو اپنا ہدف بنانا ہے۔ دوسرا اہم اور فوری کام جعبر کا سخت ترین محاصرہ ہے۔ اس بار کھانے پینے کی کوئی بھی چیز یا ہتھیار اہل شہر کے پاس نہ پہنچ سکے۔ اگر کوئی شخص باہر نکلنے کی کوشش کرے تو اس پر فوراً تیر برسائے جائیں۔ قلعے کی مشرقی جانب رہتے ہوئے میں جنوب اور شمال میں تم لوگوں سے رابطے میں رہوں گا۔ اس رابطے کا طریقہ یہ ہوگا کہ دونوں سمت کے درمیانی حصے میں کچھ سپاہی گھات لگا کر بیٹھے رہیں گے۔ کسی بھی دروازے سے نکل کر شہاب الدین حملہ آور ہونا چاہے تو وہ سپاہی ہمارے لشکروں کو آگاہ کردیں گے۔ شہاب الدین کسی بھی دروازے سے نکل کر ہم پر حملہ کرے تو ہمارا لشکر فوری طور پر یکجا ہو جائے گا۔'' مجدد اس تفصیلی تجزیے کے بعد حاضرین کے تاثرات کا بغور جائزہ لینے لگا۔

''بہترین! اگر یہ لائحہ عمل کامیاب ہو گیا تو شہاب الدین زیادہ دن محصور رہنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔'' فخرالدین نے بے ساختہ کہا۔ اس کے چہرے پر توصیف اور مرعوبیت تھی۔ سیف اور شمس الدین نے بھی بڑے بھائی کی اس تجویز سے مکمل اتفاق کیا۔ مجدد نے لشکریوں کو چار حصوں میں تقسیم کر کے شہر کے چاروں جانب تعینات کر دیا۔ مجدد الدین مشرقی، فخرالدین مغربی، شمس الدین شمالی اور سیف جنوبی لشکر کا کماندار تھا۔

اگلے روز کارروائی کا آغاز کر دیا گیا۔ دن کے اوقات میں تھوڑی پیش قدمی کے بعد لشکر کے سبھی حصے برجوں پر تیراندازی کیا کرتے۔ شہاب الدین کی سپاہ کو خاطر خواہ نقصان پہنچا کر شہر میں ہر قسم کے داخلے پر پابندی تھی۔ اس حکمت عملی کے بعد شہاب الدین کے پاس اشیائے خورد و نوش ختم ہونے لگیں۔ مجدد الدین نے محاصرے میں مزید تنگی اور شدت پیدا کی تو اسے جان کے لالے پڑ گئے۔ دہشت اور بے بسی کے عالم میں اس نے شہر سے نکل کر حملے کا فیصلہ کر لیا۔ مجدد الدین اس ردعمل کے لیے ذہنی طور پر پہلے ہی تیار تھا۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ شہاب الدین اپنے حملے کی ابتدا بھی اسی کو ہدف بنا کر کرے گا۔ اس کے حملہ آور ہوتے ہی مجدد نے تکبیریں بلند کیں اور اپنے لشکر کے ساتھ جوابی کارروائی کے لیے تیار ہو گیا۔ اس کے بہترین لائحہ عمل کی بدولت انہیں حملے کی اطلاع مل گئی۔ انہوں نے سہ اطراف سے اس پر دھاوا بول دیا۔ شہاب الدین ہر جانب سے بری طرح گھر گیا۔ شہر واپس جاتا تو فاقوں بھری سسکتی موت اس کا استقبال کرتی۔ مقابلے کی صورت میں ایک خون ریز کربناک موت اسے اپنی آغوش میں لینے کے لیے تیار تھی۔ کچھ دیر مزاحمت کے بعد اسے ناکامی اپنی جانب بڑھتی ہوئی نظر آئی تو اس نے لشکریوں کو ہتھیار ڈالنے کا حکم دے دیا۔ مجدد الدین نے بھی اپنی سپاہ اور دیگر تین کمانداروں کے حملے رکوا دیے۔ شہاب الدین کو گرفتار کر کے مجدد کے سامنے لایا گیا تو خوف اور وحشت سے اس کے چہرے پر زردی کھنڈ چکی تھی۔

''کہو شہاب الدین! کیسا محسوس کر رہے ہو؟'' اس نے طنزاً استفسار کیا۔

''مجھے امید ہے کہ سلطان نورالدین زنگی کے کماندار جنگی اور اخلاقی اصولوں کا خیال رکھیں گے۔'' وہ اپنے خشک ہونٹوں پر بار بار زبان پھیر رہا تھا۔

''آہاہ! اب تمہیں سلطان کی اعلیٰ ظرفی پر اعتماد ہو گیا ہے۔ اس وقت یہ جذبات کہاں خوابیدہ تھے جب سلطان نے وسیع تر ملی مفاد کے لیے تمہیں یہ قلعہ اپنے تسلط میں دینے کے لیے کہا تھا۔ اگر تمہاری جگہ میں ہوتا تو عجز و انکسار سے سلطان سے دست بستہ عرض کرتا کہ آپ کے سامنے میری حیثیت ایک غلام کی سی ہے۔ میں، میرا خاندان، میرا مال و متاع سب آپ پر قربان..... لیکن تو نے ایک غلط راہ کا انتخاب کیا۔ اب اگر میں چاہوں تو سلطان کے دیے گئے اختیارات کے تحت ابھی تمہارا سر دھڑ سے الگ کر دوں۔ مگر تو مسلمان ہے اور میں یہ گناہ اپنے سر نہیں لینا چاہتا۔ اب تو ہی بتا کہ تیرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟'' مجدد الدین کے بارعب انداز پر شہاب الدین کی سٹی مزید گم ہو گئی۔ اس کی زبان گنگ ہو چکی تھی۔ لرزتے بدن پر قابو پانے یا جھکی پلکیں اٹھانے کی سکت ہی نہ رہی تھی۔

''تیری سزا یہ ہے شہاب الدین کہ اب تو اس قلعے کا حاکم نہیں رہے گا۔ تو میرے ساتھ واپس جائے گا۔ جعبر کے اس قلعے کی حکمرانی شمس الدین سنبھالے گا۔'' مجدد نے نیا حکم جاری کیا۔ اس نے شہاب الدین کو ایک خیمے میں منتقل کر کے سخت پہرا لگا دیا۔ چند روزہ قیام کے بعد مجدد الدین

اسے اپنے ہمراہ لیے سلطان کے پاس چلا آیا۔نورالدین زنگی نے اپنی روایتی رحمدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شہاب الدین کو حلب کے نواح میں منتقل کر کے اخراجات کے لیے بیس ہزار دینار فراہم کر دیے ۔جعبر کی اس فتح سے مجدالدین پر سلطان کے اعتماد میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ مزید تندہی سے مصر کے متعلق حکمتِ عملی مرتب کرنے لگا جہاں حالات ابتری کی طرف مائل تھے۔

☆☆☆

یروشلم کا بادشاہ اموری ایک بار پھر شرانگیزی کی طرف مائل تھا۔

مصر کے اندرونی حالات دیکھتے ہوئے اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہاں بہ آسانی صلیبی حکومت قائم کی جاسکتی ہے۔ اس وسیع وعریض اور زرخیز سلطنت کو فتح کرنے کی خواہش بھی دل میں مچلتی لیکن نورالدین زنگی کا خوف اسے کوئی بھی قدم اٹھانے سے روک لیتا۔ اموری کی یہ تشنہ خواہشات اسے ہر پل کچوکے لگا کر احساسِ بے بسی میں مزید اضافہ کیا کرتیں اور پھر تقدیر نے ایک ایسا موڑ لیا کہ اسے اپنے ارادوں کی تکمیل آسان نظر آنے لگی۔ اموری قسطنطنیہ کے بادشاہ مینوئل کی بھتیجی سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گیا۔ شادی کی رسومات کے موقع پر مینوئل نے اموری سے انجیل پر ہاتھ رکھوا کر حلف لیا کہ وہ مصر پر حملہ آور ہوگا۔ مینوئل نے اسے سامانِ حرب کے علاوہ بھرپور رسد و کمک فراہم کرنے کی یقین دہانی بھی کروائی۔

''آپ کی یہ خواہش سر آنکھوں پر! یہ تمنا تو جانے کب سے میرے دل میں بھی پنپ رہی ہے۔'' اموری نے کہا۔

''ایک بادشاہ کے لیے کوئی بھی تمنا لاحاصل نہیں رہنی چاہیے۔ تم نے ابھی تک کوئی پیش قدمی کیوں نہیں کی؟'' مینوئل نے خفگی جتائی۔

''نورالدین زنگی اس راہ کا سب سے بڑا کانٹا ہے۔ مصر کا رخ کروں تو وہ ایک طوفان کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔'' اس نے نظریں چرائیں۔

''تمہاری معلومات ادھوری ہیں۔ اسی لیے تم دباؤ محسوس کر رہے ہو۔ مسلمان اس وقت تمہارے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر پائیں گے۔ ان کے سپہ سالار مختلف شہروں میں منتشر ہیں۔''

''آپ شاید شیرکوہ اور مجدالدین سے واقف نہیں ہیں۔ وہ کسی بگولے کی طرح نمودار ہوتے ہیں اور مقابل کا لشکر ادھیڑ کر رکھ دیتے ہیں۔'' اموری جھنجلایا۔

''وہ بھی اس بار کچھ نہیں کر سکیں گے۔ شیرکوہ اپنے بھتیجے صلاح الدین کے ساتھ حمص میں مقیم ہے۔ مجدالدین کا پڑاؤ دمشق میں ہے۔ وہ دوسری شادی کے بعد اپنے اہل خانہ کے ساتھ وقت گزار رہا ہے اور خود نورالدین زنگی عارضی طور پر حلب میں ٹھہرا ہوا ہے۔ مصر پر حملے کا اس سے بہترین موقع نہیں مل سکتا۔ ایک بار وہاں ہماری حکومت قائم ہو گئی تو کوئی مسلم حکمران ہمیں وہاں سے نکال نہیں پائے گا۔ مصر پر قبضے کے بعد یروشلم میں تمہاری حکومت کو مزید تقویت ملے گی۔ اگر نورالدین کے دل میں مصر فتح کرنے کا خیال پیدا ہو گیا تو وہ یروشلم سے بھی تمہارے قدم اکھاڑ دے گا۔'' مینوئل نے تفصیلی تجزیہ کیا۔ ''اور یہ کیوں بھول رہے ہو کہ تم نے گزشتہ مرتبہ مصر میں اپنا ایک نائب اور چند مسلح دستے تعینات کیے تھے۔ ان سے رابطہ کر کے موجودہ حالات سے آگاہی کیوں نہیں حاصل کرتے؟''

یہ ترغیب اموری کے لیے کارگر ثابت ہوئی۔ اس نے اپنے مخبروں سے رابطہ قائم کیا تو علم ہوا کہ مصر کی سیاست اور انتظامیہ نہایت ابتری و انتشار کا شکار ہو چکی ہے۔

''فصل پک گئی ہے۔ آپ یہاں پہنچ کر اطمینان سے کٹائی کیجیے۔'' اپنے نائب کے اس پیغام نے اموری کا خوف زائل کر دیا۔ نائب ہی کے توسط سے اسے کچھ حبیت فروش مصریوں کے خطوط بھی موصول ہوئے کہ اموری کی وہاں آمد پر شاور اور خلیفہ عاضد کے خلاف اس کی بھرپور مدد کی جائے گی۔ اموری کا حوصلہ اس قدر بڑھا کہ اس نے فوری طور پر لشکر تیار کیا اور مصر کی فتح کا خواب آنکھوں میں سجائے روانہ ہو گیا۔

اس کے لشکر کی زد میں سب سے پہلے بلبیس آیا۔ اموری نے فوری طور پر شہر کا محاصرہ کر لیا۔ بلبیس میں موجود مصری لشکر کی بزدلی کا یہ عالم تھا کہ وہ بلا تامل قاہرہ منتقل ہو گئے۔ اموری کی سپاہ کے لیے اب بلبیس کا میدان صاف تھا۔ انہوں نے کھل کھیلتے ہوئے شہریوں کے خون سے گلی کوچے رنگین کر دیے ۔تین روز میں بلبیس کا ہر ایک چپا لاشوں سے اٹ گیا تھا۔ زندگی مکمل طور پر نابود ہو چکی تھی۔ خالی گھروں اور بازاروں کو نہایت اطمینان سے لوٹ کر ایک تنکا بھی وہاں نہ چھوڑا گیا۔

بلبیس کے اس تاریخی قتل و غارت کی خبر قاہرہ پہنچی تو شاور کو احساس ہوا کہ قاہرہ بھی بہت جلد اس طوفان کی زد میں آنے والا ہے۔ اسے اپنی وزارت اور عاضد کی خلافت شدید خطرے میں محسوس ہوئی۔ ان خدشات کے تحت

شادر نے شہر کے دروازے بند کر لیے اور صلیبیوں کے سامنے مزاحمت کی تیاری کرنے لگا۔ بلبیس کے راستے میں ''فطاط'' شہر پڑتا تھا جسے ماضی میں مصر کے دارالخلافہ ہونے کی حیثیت حاصل تھی۔ اس تاریخی شہر کو ''حضرت عمرو بن العاص'' نے مصر فتح کرنے کے بعد بسایا تھا۔ فطاط کے دفاعی انتظامات بالکل غیر محفوظ تھے۔ شادر کی نااہلی کے باعث یہاں ایسا کوئی لشکر ہی نہ تھا جو بیرونی حملہ آوروں کا مقابلہ کر سکتا۔ صلیبی بلا روک ٹوک فطاط میں داخل ہوئے اور لوٹ مار کے بعد اس عظیم الشان اور اسلامی روایات کی علامت شہر کو نذر آتش کر دیا.... فطاط کی عمارات لاجواب خوبصورتی کی حامل تھیں۔ شہر میں ان گنت مساجد تھیں جو متواتر '54' روز تک جلتی رہیں۔ فطاط کی یہ آگ بجھانے کے لیے شہر میں کوئی ذی نفس موجود ہی نہ تھا۔ عمارات جل کر خاکستر ہونے کے بعد یہ آگ خود بخود سرد ہو گئی۔

نورالدین زنگی کو وقائع نگاروں اور مخبروں کے توسط سے یہ خبر ملی تو اس کے لیے خاموش بیٹھنا ممکن ہی نہ تھا۔ وہ فوری طور پر حلب سے نکل کر دمشق آیا اور شیرکوہ کو بھی حمص سے دمشق آمد کا پیغام بھجوا دیا۔ اس نے اپنے ان بہترین سالاروں کے ساتھ اجلاس منعقد کرنا تھا لیکن اس سے قبل ہی مصر سے ایک قاصد کی آمد کی خبر ملی۔ سلطان نے اسے فوری طور پر دربار میں طلب کر لیا۔ کچھ لمحوں بعد کھلی آستینوں والے میلے لبادے میں ملبوس عرب جوان ان کے سامنے تھا۔ اس کی ڈاڑھی غبار آلود اور آنکھوں میں صدیوں کی سی تھکن تھی۔

''کس کا پیغام لائے ہو جوان؟'' نورالدین نے اس کی حالت کو تاسف سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ قاصد چند قدم آگے بڑھا اور خاموشی سے ایک پیغام سلطان کو تھما کر دوبارہ پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ نورالدین کا چہرہ متزلزل دکھائی دینے لگا۔ مصر کے فاطمی خلیفہ نے ..... خفیہ طور پر نورالدین زنگی کو اپنی بپتا سنائی تھی۔

''اس عرضداشت میں خواتین کے خون آلود لباس اور بال موجود ہیں سلطان محترم!'' قاصد نے زخمی لہجے میں کہا۔ ''خلیفہ آپ سے مدد اور تعاون کے درخواست گزار ہیں۔ صلیبیوں کی درندگی کے آگے بند نہ باندھا گیا تو مصر میں مسلم اقتدار نیل کی موجوں کا لقمہ بن جائے گا۔ پانی سر سے بہت اوپر ہو چکا ہے۔ انفرادی کوتاہیاں بھیانک اجتماعی تاوان وصول کرنے لگی ہیں۔''

خلیفہ عاضد کے اس پیغام نے دربار میں موجود ہر شخص کا دل خون کر دیا۔ نورالدین کی آنکھوں میں بھی نمی کی جھلک واضح تھی۔ اس کا دل شدت سے چاہا کہ قاصد کو خاموش رہنے کا اشارہ کر دے لیکن وہ اپنی ہی دھن میں کہتا چلا گیا۔

''آپ کو ملنے والے اس پیغام کی تحریر حقیقت کا عشر عشیر بھی نہیں ہے۔ سچائی اس قدر بھیانک ہے کہ کسی بھی حساس دل پر قیامت ڈھا دے۔ صلیبی اس وقت درندوں کا روپ اختیار کر چکے ہیں اور ہم مسلمان کمزور، بے بس چوپائے ہیں جو اپنی جان بچانے کے لیے مزاحمت بھی نہیں کر پا رہے۔ وہ لوٹ مار، آتش زنی، عصمت دری اور قتل وغارت سے اپنی درندگی کو بھرپور تسکین دے رہے ہیں اور ہم کچھ بھی کرنے کے اہل ہی نہیں۔ ہمارے حکمرانوں کی مردہ ضمیری نے ہماری عزت، جان و مال رہن رکھوا دیے ہیں۔ ہم چوراہے میں رکھی ہوئی ایسی ہنڈیا ہیں کہ جس صلیبی کا جب دل چاہے منہ مار لیتا ہے۔ اسے ایسا کرنے کا بھرپور استحقاق حاصل ہے اور ہو بھی کیوں نہ؟ ہمارے چرواہے ہی اپنے ریوڑوں کی اس بربادی کے خریدار ہیں۔''

قاصد کا دلدوز انداز سلطان کی حالت متغیر کرنے لگا۔

''میں اپنے لہو کے آخری قطرے اور جسم کے آخری ریشے تک مصر کا انتقام لوں گا۔ صلیبیوں کو اس جسارت کا تاوان بہت مہنگا پڑے گا۔'' اس نے مٹھیاں بھینچیں اور رخ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

''قاصد کو اپنے ساتھ لے جا کر دمشق کے سرکاری مہمان خانے میں ٹھہراؤ، اس کے قیام وطعام میں کوئی کمی نہیں رہنی چاہیے۔''

قاصد کی روانگی کے بعد وہ اپنے سالاروں کے ساتھ مشاورت میں مشغول ہو گیا۔ صلاح الدین اور شیرکوہ کو مصر بھیجنے کا فیصلہ کرتے ہی نورالدین نے اپنی ذاتی نگرانی میں لشکر تیار کروایا۔ روانگی کے وقت شیرکوہ کو دو لاکھ دینار بطور اخراجات دیے گئے۔ لشکر میں موجود ہر سپاہی کو بیس بیس دینار فراہم کیے گئے۔ عزیز الدین، شرف الدین برغش، عین الدولہ، صلاح الدین کے ماموں شہاب الدین محمود حازمی، قطب الدین، سیف الدین، علی بن فکاری جیسے سالاروں کی موجودگی نے ہر لشکری کا حوصلہ توانا کر رکھا تھا۔ قرائن بتاتے تھے کہ اموری کو اس کے مذموم اعمال کا بھیانک .... تاوان ادا کرنا ہوگا۔

☆☆☆

قاہرہ میں اموری کا محاصرہ اس قدر شدید تھا کہ وہاں

کے وزیر کی جان پر بن آئی تھی۔

بلبیس اور فطاط کی حالت دیکھ کر وہ مزید ذہنی دباؤ میں مبتلا ہو چکا تھا۔ اس نے اموری کا محاصرہ ترک کرنے کے لیے ایک لاکھ دینار کی پیشکش کے ساتھ ڈھکے چھپے لفظوں میں نورالدین زنگی کو بلوانے کا عندیہ بھی دے دیا۔ انہی دنوں شیرکوہ اور صلاح الدین کے لشکر کی اطلاعات ملنا شروع ہوئیں تو اموری کے قدموں تلے سے زمین کھسک گئی۔ خوف کے عالم میں اس نے محاصرہ ترک کرتے ہوئے یروشلم فرار ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ شاور نے اپنی روایتی عیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے شیرکوہ کو صلیبیوں کا تعاقب کرتے یروشلم جانے کا مشورہ دے دیا۔ شیرکوہ کی فراست نے فوراً بھانپ لیا کہ شاور اس بہانے اسے قاہرہ سے دور رکھنا چاہتا ہے۔ اس نے یہ مشورہ رد کرتے ہوئے اپنے لشکر کو قاہرہ میں قیام کا حکم دے دیا۔ سلطان نورالدین زنگی کے لشکر کی آمد نے شہریوں کے ستے ہوئے خوفزدہ چہروں کی رونق بحال کردی۔ اس وقت فاطمی خلیفہ عاضد، شیرکوہ اور صلاح الدین سے ملنے چلا آیا۔ اس نے دونوں سالاروں کو خلعت اور قیمتی تحائف سے نوازتے ہوئے مصر کے متعلق صلاح مشورے کا آغاز کردیا۔

''میں جانتا ہوں کہ شاور تمہاری آمد پر جز بز ہوا ہوگا۔''

''جی ہاں! ایسا ہی کچھ ہوا تھا۔'' شیرکوہ مسکرایا۔

''ماضی میں میری جانب سے بھی بہت کوتاہیاں برتی گئی ہیں۔ میں نے کئی غلط فیصلے بھی کیے لیکن بلبیس اور فطاط کی حالت دیکھنے کے بعد کوئی پل ایسا نہ گزرا ہوگا جب میں نے خود پر نفرین نہ بھیجی ہو۔'' خلیفہ نے آزردگی سے کہا۔

''آپ منفی باتیں سوچنے کے بجائے حالات کے مثبت پہلوؤں پر بھی نظر رکھیے۔ اگر اللہ نے چاہا تو اموری کا انجام بہت بھیانک ہوگا۔ وہ شخص ملتِ اسلامیہ کا ایک ناسور بن چکا ہے۔ اس کی موجودگی میں مصر میں امن وامان قائم رہ پانا ممکن ہی نہیں۔'' صلاح الدین نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

''شاور کی درازی رسی کھینچنے کا وقت آگیا ہے۔ اس کے بوجھ سے مصر کی سرزمین بہت جلد آزاد ہوجائے گی۔'' شیرکوہ کے ارادے حتمی تھے۔ خلیفہ عاضد نے تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دی۔ وہ بہت احتیاطی تدابیر کے بعد ان سپہ سالاروں سے ملنے آیا تھا لیکن اس کے باوجود یہ ملاقات شاور سے خفیہ نہ رہ سکی۔ شاور فطری طور پر ہی بدطینت اور غدار تھا۔ شیرکوہ سے بظاہر خلوص جتانے کے باوجود وہ اس کا خاتمہ کرنے کی منصوبہ بندی کررہا تھا تاکہ مصر پر دوبارہ اپنا تسلط قائم کرسکے۔ شاور کے ان بدعزائم کی خبر صلاح الدین اور اس کے دستِ راست عزیزالدین جروبک کو مل گئی۔ انہوں نے شاور پر نظر رکھنے کے لیے اپنے خصوصی کارندے متعین کردیے۔

اپنی نگرانی سے بے خبر شاور ہولناک چالوں اور سازشوں میں مشغول تھا۔ اس نے شیرکوہ، صلاح الدین اور دیگر سالاروں کی ضیافت کے بہانے اکٹھا کرکے گرفتاری اور قتل کا منصوبہ بنالیا۔ اس کی خرابیٔ قسمت نے یہ سازش اس کے بیٹے پر آشکار کردی۔

''آپ بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کریں گے۔ وہ ہمارے لیے نجات دہندہ اور مسیحا بن کر آئے ہیں۔'' اس نے باپ سے کہا۔

''جذباتی مت بنو احمق انسان! وہ یہاں رہے تو ہماری حکومت کے دن پورے ہوجائیں گے۔'' شاور نے بیٹے کو گھرکا۔

''تو ان کے قتل کے بعد کون سا آبِ حیات حاصل ہوجائے گا۔ یہ سازش بہت بھیانک نتائج برپا کرے گی۔ ان کے لشکری انتقام کے لیے ہم پر ٹوٹ پڑیں گے۔ اگر ان سے بچ بھی گئے تو صلیبی میدان خالی پاکر یہاں بلبیس اور فطاط کی تاریخ دہرائیں گے۔ خدارا! ہوش کے ناخن لیجیے۔''

''میں ان سے بچاؤ کے لیے کوئی نہ کوئی راہ نکال لوں گا۔'' شاور کی ہٹ دھرمی برقرار تھی۔

''اور میں اس سے پہلے ہی آپ کے یہ سب ارادے شیرکوہ اور صلاح الدین کے گوش گزار دوں گا لیکن آپ کو ایسی کوئی بھی حماقت نہیں کرنے دوں گا۔'' بیٹے کی یہ دھمکی سن کر شاور کے ہوش اڑ گئے..... اس نے دانستہ طور پر پشیمانی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے ارادوں سے باز رہنے کا عہد کرلیا۔ خصوصی کارندے ان سبھی حالات وواقعات کی خبریں صلاح الدین اور عزیزالدین تک پہنچا رہے تھے۔ شاور کچھ دن خاموش رہا۔ ایک روز موقع پاتے ہی چند مسلح جوانوں کی معیت میں شیرکوہ کے قتل کے لیے روانہ ہوگیا۔ مخبروں نے اس کی آمد سے فوری طور پر سپہ سالاروں کو مطلع کردیا۔ اس وقت صورت حال کچھ یوں تھی کہ شاور، شیرکوہ کا جبکہ خلیفہ عاضد شاور کا خاتمہ کرنا چاہتا تھا۔ شاور شیرکوہ کے خیمے میں پہنچا تو وہاں کوئی بھی موجود نہ تھا۔ لشکریوں سے علم ہوا کہ وہ امام شافعی کے مزار پر حاضری کے لیے گیا ہے۔

شادر نے سکون کا سانس لیا اور موقع غنیمت جان کر مزار روانگی کا فیصلہ کرلیا۔ وہ صلاح الدین اور عزیز الدین جرویک کے تعاقب سے بے خبر تھا۔ انہوں نے ایک قدرے ویران جگہ پر شادر اور اس کے ساتھیوں کو روک کر شادر کو جھپٹتے ہوئے گھوڑے سے گھسیٹ لیا۔ عزیز الدین اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ مسلح سپاہیوں کا مقابلہ کرنے لگا۔

''یہ کیا حرکت ہے صلاح الدین..... مجھے ایک بہت ضروری کام سے کہیں جانا ہے۔'' شادر گڑبڑا گیا۔

''تمہارے ضروری کام کا مجھے بخوبی علم ہے ابلیس صفت انسان! تو ننگ انسانیت ہے۔ آج اپنے ذاتی مفاد کے لیے ایک ایسے شخص کی جان لینے کے درپے ہے جو صلیبیوں اور مسلم امت کے درمیان چٹان بن کر کھڑا ہے۔ تیری سزا کا فیصلہ بھی امیر شیرکوہ ہی کریں گے۔'' صلاح الدین کے خاموش ہوتے ہی خلیفہ عاضد کا قاصد بھی وہاں آن پہنچا۔

''محترم سالار! خلیفہ نے آپ کے لیے ایک پیغام بھیجا ہے کہ سانپ کی فطرت کبھی تبدیل نہیں ہوسکتی۔ اس شخص کو مزید ڈھیل دینا مصر اور ملتِ اسلامیہ کے مقدر میں تباہی لکھنا ہے۔ اس ملعون کا سر فوری طور پر قلم کردیں۔ خلیفہ عاضد نے اس کا سر اپنے پاس طلب کیا ہے۔'' قاصد کی بات ختم ہوتے ہی صلاح الدین نے اپنی تلوار نیام سے نکالی اور سات برس تک مسلم امت کے لیے دردِ سر بنے رہنے والے شادر کا سر تن سے جدا کیا اور خلیفہ کے پاس روانہ کر دیا۔ خلیفہ عاضد کے لیے شادر سے نجات باعثِ سکون تھی۔ اس نے شیرکوہ کو وزیر مقرر کر کے ''امیر جیوش'' کا خطاب دے دیا۔ شیرکوہ نے وزارت کا قلمدان سنبھالتے ہی اپنی ذہانت و فراست کا عملی ثبوت دینا شروع کردیا۔ اس نے لشکریوں کے روزینے میں اضافہ کیا اور مصر سے شرپسند عناصر کی مکمل بیخ کنی کردی۔ اس کے خوف و دہشت سے اب کوئی بھی مقامی غداری یا صلیبیوں سے سازباز کا تصور بھی نہ کرپاتا تھا۔

مصر کی حکومت سنبھالے... شیرکوہ کو ابھی صرف دو ماہ کا عرصہ ہی بیتا تھا کہ فرشتۂ اجل اپنی خوبصورت رتھ پر سوار اس مردِ مجاہد کو لینے چلا آیا۔ سلطان عمادالدین زنگی کے بعد نورالدین زنگی کے ساتھ ناقابلِ فراموش مہمات سرانجام دیتے ہوئے اس نے سپہ سالاری میں اپنا نام امر کرلیا تھا۔ نورالدین کے لیے اس کی موت ذاتی طور پر بہت بڑا صدمہ تھا۔ حساس دل اور بامروت سلطان یہ خبر سنتے ہی بے اختیار رونے لگا۔ افسردگی اور ملال کئی روز تک اس کے ہم نوا بنے رہے۔

شیرکوہ کی وفات کے بعد وزارت کا قلمدان صلاح الدین کو سونپا گیا۔ خلیفہ عاضد اس باصلاحیت، سرفروش اور مثبت وطن نوجوان سے بہت متاثر تھا۔ اس نے صلاح الدین کو وزارت سونپنے کی رسم کے دوران چند بیش قیمت اور بے شمار دیگر تحائف بھی پیش کیے۔ ان میں ''شمشیر جواہرات'' ایک لازوال شاہکار تھی۔ اس کی قیمت تقریباً پانچ ہزار دینار تھی۔ طلائی کام سے منقش عمامہ اس کے علاوہ تھا۔ اس عمامے کے کناروں پر نفیس اور قیمتی موتیوں کی جھالر لگی ہوئی تھی۔ ایک بیش قیمت جبہ اور جواہرات کا ہار آنکھوں کو خیرہ کرتے تھے۔ اس ہار کی قیمت دس ہزار دینار تھی۔ ان تحائف کے علاوہ اعلیٰ نسل کے گھوڑے بھی صلاح الدین کو عطا کیے گئے۔ ان میں زرد رنگ کا قیمتی گھوڑا قدرت کی صناعی کا شاہکار تھا۔

صلاح الدین کی کارکردگی سے نورالدین زنگی بھی بے حد خوش تھا۔ صلاح الدین کا بڑا بھائی توران شاہ اور والد نجم الدین ہنوز سلطان کے پاس ہی مقیم تھے۔ مصر میں وزارت سنبھالتے ہی توران شاہ نے نورالدین سے درخواست کی کہ وہ مصر میں چھوٹے بھائی سے ملاقات کا خواہاں ہے۔ نورالدین اس التجا پر کچھ دیر کے لیے مخمصے میں پڑ گیا۔

''توران شاہ! تم صلاح الدین کے بڑے بھائی ہو۔ وہ مصر میں میرا نائب ہے۔ عین ممکن ہے کہ تم اس کے پاس پہنچ کر اپنے رشتے کی بڑائی سے مغلوب ہوجاؤ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تم اسے وہاں دیکھ کر وہ وقت یاد کرو جب وہ سلطان کی خدمت میں دست بستہ رہتا تھا۔ مجھے خدشہ ہے کہ اس صورت میں تم اس کا قرار واقعی ادب و لحاظ نہیں کرسکو گے۔ اس وقت صلاح الدین معمولی حیثیت کا مالک نہیں ہے۔ تمہاری ذرا سی بے پروائی اس کے منصب کو ٹھیس پہنچا سکتی ہے۔'' سلطان کے یہ خدشات جان کر توران شاہ بے چین ہوگیا اور ملامت سے گویا ہوا۔

''سلطان معظم! صلاح الدین میرا چھوٹا بھائی سہی لیکن اس وقت وہ مصر میں آپ کا قائم مقام ہے۔ میں ہرگز اسے خود سے چھوٹا یا کمتر نہیں سمجھوں گا۔ میری جانب سے اگر اس کے ادب و احترام میں کوئی بھی کوتاہی ہوئی تو آپ میری گردن اڑا دیجیے گا۔'' توران شاہ کے اس جواب اور انداز نے سلطان کو قدرے مطمئن کردیا۔ اس

نے نجم الدین کی طرف رخ موڑتے ہوئے استفسار کیا۔
''نہیں سلطان معظم! میں فی الحال یہیں رہ کر اپنے فرائض سرانجام دوں گا۔''
نورالدین نے توران شاہ کو مصر روانگی کی اجازت دی تو اس وقت کسی کو بھی اندازہ نہ تھا کہ یہ ملاقات عسکری لحاظ سے کس قدر اہم ثابت ہونے والی ہے۔

☆☆☆

مصر میں صلاح الدین نہایت مشکل حالات کا شکار تھا۔ وزارت سنبھالتے ہی سوڈانیوں نے اس کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ ان دنوں مصر میں سوڈانی حبشیوں کا بہت زور تھا۔ ان حبشیوں کا ''مومن'' نامی ایک سردار مصر میں قصرِ خلافت کے تمام تر انتظامات کا محافظ اعلیٰ تھا۔ یہ طبقہ براہِ راست خلیفہ کا ماتحت تھا لہٰذا ہر وزیر انہیں مختلف طریقوں سے اپنے قابو میں رکھنے کی کوشش ضرور کیا کرتا۔ صلاح الدین نے جب مصر کی وزارت سنبھالی تو وہ لوگوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے مثبت شخصی اوصاف کے تحت امورِ وزارت سنبھالنے لگا۔ مومن کو صلاح الدین کی اس روش سے بہت ہتک محسوس ہوئی۔ اس نے خفیہ طور پر یروشلم کے بادشاہ کو خط لکھ کر صلاح الدین کو مصر بدر کرنے کی مدد طلب کی۔ یہ خط اتفاقی طور پر صلاح الدین کے ایک خیر خواہ کے ہاتھ لگ گیا۔ صلاح الدین کے علم میں یہ بات آئی تو اس نے فوری طور پر مومن کو گرفتار کرنے کا حکم دے دیا۔ مومن کو اپنا انجام اب واضح نظر آ رہا تھا۔ وہ موقع ملتے ہی بھاگ کھڑا ہوا۔ صلاح الدین اس فتنے کا سر کچل کر ہی دم لینا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے سپاہیوں کے ساتھ مومن کی تلاش جاری رکھی اور بالآخر اسے ایک نواحی گاؤں سے گرفتار کر کے جہنم واصل کر دیا گیا۔
مومن کے اس قتل سے سوڈان کے حبشیوں نے ناراضگی کے عالم میں پچاس ہزار افراد کا جتھا تیار کیا اور صلاح الدین کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ یہی وہ مقام تھا جہاں صلاح الدین عسکری لحاظ سے بے بسی میں مبتلا نظر آنے لگا۔ اس کے پاس وہی لشکر تھا جو وہ اور شیرکوہ اپنے ساتھ شام سے لائے تھے۔ اسے مزید سپاہ کی اشد ضرورت تھی۔ شومئی قسمت اسی دوران توران شاہ وہاں پہنچ گیا۔ اس کی مدد سے صلاح الدین نے باغی سوڈانیوں کو شکستِ فاش دے کر یہ فتنہ جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ سوڈانیوں کا قلعہ قمع ہونے کے قلیل عرصے بعد ہی صلیبیوں نے ایک بار پھر سر اٹھا لیا۔ وہ شیرکوہ اور صلاح الدین کی مصر میں کامیابیوں اور وزارت کا انتقام لینے کے درپے تھے۔ وہ بہر صورت صلاح الدین کو مصر بدر کر کے اپنا تسلط دوبارہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ صلیبی اس وقت دہری کشمکش میں مبتلا تھے۔ ایک طرف تو نورالدین زنگی اور دوسری جانب صلاح الدین کی موجودگی یروشلم میں ان کی سلطنت کے لیے بہت بڑا خطرہ تھی۔ اس خطرے کے سدباب کے لیے اموری نے قسطنطنیہ کے بادشاہ مینوئل سے مدد طلب کی۔ مینوئل پہلے ہی ایسے کسی موقع کی تاک میں تھا۔ اس نے اہل یورپ سے ساز باز کر کے کسی سے صلاح الدین کے خلاف ایک ٹڈی دل لشکر اور بحری بیڑا تیار کروا کے روانہ کرنے میں عملی کوششیں جاری رکھیں۔ صلیبیوں کا یہ جم غفیر پوری قوت سے مصر کے شہر دمیاط سے ٹکرا گیا۔
صلاح الدین بھی اپنا لشکر لیے برق رفتاری سے دمیاط کی طرف بڑھا۔ وہ اس دہری کشمکش میں گرفتار ہو چکا تھا۔ اگر زیادہ عرصے تک قاہرہ سے نکل کر دمیاط میں رہتا تو قاہرہ میں فتنہ انگیز عناصر سر اٹھانے لگتے۔ قاہرہ واپسی کی صورت میں دمیاط صلیبیوں کے تسلط میں چلا جاتا۔ اس نے اپنے قاصد کے ذریعے سلطان کو صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے کمک ارسال کرنے کی درخواست کی۔ اسے یقین تھا کہ نورالدین کوئی بہتر راہ نکال کر اسے کمک روانہ کر دے گا۔

☆☆☆

صلاح الدین کا پیغام ملتے ہی نورالدین زنگی نے اپنے سالاروں، عدلیہ، انتظامیہ، شہر کے امراء اور مختلف اہم عہدیداروں کو دمشق کے قصر میں طلب کر لیا۔
''عزیزانِ دیرینہ! مخبروں اور قاصدوں کی جانب سے حاصل ہونے والی خبریں بہت تشویشناک ہیں۔ شاور کے خیر خواہ اور اسی کی فطرت والی باقیات اب بھی مصر میں موجود ہیں۔ وہ ملک وملت کے مفاد کے بجائے انفرادی حیثیت سے سوچتے ہیں۔ یہی لوگ ہمارے اور وہاں صلاح الدین کے سب سے بڑے دشمن ثابت ہوتے آ رہے ہیں۔ انہی کی شہ پر اموری ایک بار پھر اس جنگ میں براہِ راست ملوث ہو گیا ہے۔ اس کے خسر مینوئل نے ایک لشکر بحری جہازوں میں بٹھا کر دمیاط روانہ کر دیا ہے۔ دوسرا حصہ انطاکیہ سے ہوتا ہوا طرابلس اور دمیاط کی جانب گامزن ہے۔ انطاکیہ اور طرابلس کے لشکر اس کے علاوہ ہوں گے۔''
''ہم اس صورتِ حال میں اپنے عزیز صلاح الدین کی دل وجان سے مدد کے لیے تیار ہیں سلطان معظم! آپ

ایک اشارہ کیجیے۔ہم اپنی گردنیں کٹوادیں گے۔'' عسکری انتظامیہ پُرجوش تھی۔

''مرحبا!سب سے پہلے ایک لشکر دمیاط روانہ کرنا ہو گا۔ یہ لشکر صلیبیوں کے خلاف محاذ کھولے گا تاکہ صلاح الدین پر دشمن کا دباؤ کم ہو سکے۔اس لشکر کا سالار قطب الدین ہوگا۔ دوسرا لشکر ہر ممکن تیزی سے طرابلس جانے والے جتھے کو دبوچے گا تاکہ وہ دمیاط پہنچنے کے قابل ہی نہ رہ سکیں۔اس کی کمانداری خطلخ کرے گا اور نجم الدین اس کا نائب ہوگا۔

''تیسری مہم سب سے بڑی اور اہم ترین ہے۔ قسطنطنیہ اور انطاکیہ کا متحدہ لشکر دمیاط روانہ ہونے کا منصوبہ بنائے بیٹھا ہے۔اس لشکر پر ایسے وقت میں ضرب لگانی ہے جب وہ انطاکیہ سے کوچ کر کے اپنی منزل کی جانب گامزن ہوگا۔ یہ لشکر مجد دالدین سنبھالے گا۔اس کا ماتحت اسامہ بن مرشد ہوگا۔فخر الدین مسعود اور شمس الدین میرے پاس ہی قیام کریں گے۔ خدانخواستہ کسی اور لشکر کی روانگی کی نوبت آئی تو میں خود ان کے ساتھ روانہ ہو جاؤں گا۔'' عمائدین اور سالاروں نے اس تجویز پر اعتماد کا اظہار کر دیا۔

سلطان اجلاس برخاست کرتے ہوئے اپنی نشست سے اٹھا تو حاضرین بھی اس کی تعظیم میں اٹھ کھڑے ہوئے۔قطب الدین کا لشکر اسی وقت روانگی کے لیے تیار ہو گیا۔ضروری تیاری کے بعد خطلخ اور مجد دالدین بھی اپنی سپاہ کے ساتھ کوچ کر گئے۔نور الدین نے ہر لشکر کے لیے مخبر بھی روانہ کر دیے۔ خطلخ اور نجم الدین کو خاص طور پر تاکید کی گئی تھی کہ کامیابی کی صورت میں وہ میدان جنگ میں ہی رک کر مجد دالدین کا انتظار کریں گے اور ان کی آمد کے بعد متحد ہو کر دمیاط کا رخ کریں۔

اس نئی جنگ میں صلیبیوں سے پہلا ٹاکرا خطلخ اور نجم الدین کا ہی ہوا۔انہوں نے طرابلس سے روانہ ہونے والے صلیبی لشکر کو راستے میں دبوچ لیا تھا۔صفوں کی درستگی کے بعد مسلم سالاروں نے اپنی پوری مہارت اور طاقت سے ان ابلیس زادوں پر حملہ کر دیا۔چند ہی لمحوں میں وہاں صلیبیوں کی تشنہ آرزوئیں سسکتی دکھائی دینے لگی تھیں۔لاشوں کے ڈھیر دیکھ کر باقی سپاہ کے حوصلے بھی پست ہو گئے اور وہ فرار ہونے کے لیے پر تولنے لگے۔

''نجم الدین!یہ فرار موت میں تبدیل کرنا ہے۔ انہیں کسی بھی قیمت پر زندہ نہیں چھوڑنا۔'' خطلخ نے بھرپور صدا دی۔

لشکریوں نے اپنے کماندار کی خواہش کے احترام میں ایک دفعہ پھر موت کا کھیل شروع کر دیا۔صلیبی خزاں رسیدہ پتوں کی طرح جھڑتے زندگی کی بازی ہارتے رہے۔نجم الدین اور خطلخ نے ان کی تعداد میں اس قدر کمی کر دی کہ وہ اپنے ہم مذہب عسکریوں کی مدد کے لیے دوبارہ دمیاط کا رخ نہ کر سکیں۔میدان جنگ میں لوٹتے ہی مال غنیمت پر قبضہ کر لیا گیا۔اب انہیں شدت سے مجد دالدین کی آمد کا انتظار تھا۔

☆☆☆

مجد دالدین اور اسامہ بن مرشد کی مہم کٹھن ترین تھی۔ انہیں سلطان کے مخبروں نے اطلاع دی کہ انطاکیہ کا متحدہ لشکر دمیاط کی جانب گامزن ہو چکا ہے اور ان کی تعداد مسلم سپاہ سے تقریباً چار گنا زیادہ ہے۔مجد دالدین نے یہ خبر سنتے ہی اسامہ بن مرشد کی جانب دیکھا اور افسردہ مسکراہٹ سے گویا ہوا۔

''آج ہمارے امتحان کا وقت آ گیا ہے ابن مرشد!آج ہمیں یہ ثابت کرنا ہوگا کہ ہم اسد الدین شیرکوہ کے شاگرد اور عسا کر رہے ہیں۔شیرکوہ کی دلیری اور ذہانت کا تو یہ عالم ہوا کرتا تھا کہ وہ بارہ گنا کثیر سپاہ کو بھی رگید کر رکھ دیا کرتے تھے۔اس حساب سے چار گنا تعداد تو بہت معمولی ہے۔آج تقدیر نے ہمارا ساتھ دیا تو قسطنطنیہ اور انطاکیہ کو زندگی بھر کے لیے ایک یادگار مزہ چکھائیں گے۔''

''امیر!آپ کا یہ خادم ہر لمحہ آپ کے ساتھ کھڑا ہے۔ اپنی ملت کی حفاظت کے لیے میں ایسی سو زندگیاں بھی قربان کرنے کے لیے تیار ہوں۔ہمارے لشکر کے حوصلے بلند اور توانا ہیں۔ ہر ایک سپاہی بیسیوں صلیبیوں کو قتل کر کے ہی اپنی جان آفرین کے سپرد کرے گا۔'' وہ پُرعزم تھا۔

''طلایہ گردوں کی اطلاعات کے مطابق میں نے ایک لائحہ عمل ترتیب دیا ہے۔سورج غروب ہونے میں ابھی کچھ ہی وقت باقی ہے۔مناسب مقام پر پڑاؤ کے بعد لشکریوں کو طعام مہیا کرو۔اس کے بعد ہم رات کے پچھلے حصے میں دشمن پر حملہ کر دیں گے۔'' مجد دکی اس تجویز سے اسامہ بھی متفق تھا۔انہوں نے نہایت خشوع وخضوع سے مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد گریہ وزاری سے فتح کی دعائیں مانگیں اور لشکر کو کھانا کھلانے کے بعد اس مقام کی جانب کوچ کر گئے جہاں قسطنطنیہ اور انطاکیہ کا متحدہ لشکر اپنے تئیں محفوظ ترین مقام پر پڑاؤ ڈالے موجود تھا۔

رات اپنے اختتامی سفر کی جانب گامزن تھی۔احتیاط

کے طور پر متحدہ لشکر کا ایک حصہ پہریداری پر مامور تھا۔ مجد دالدین اور اسامہ بن مرشد کی آمد کے ساتھ ہی ان کے اوسان خطا ہو گئے۔ رات کے اس پہر میں انہوں نے مسلمانوں کی جانب سے حملے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سنتے ہی انہوں نے چیخ و پکار شروع کر دی۔ خوابیدہ لشکر کی ہڑبڑاہٹ بھی دیدنی تھی۔ بہر طور انہوں نے اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے جوابی کارروائی کا آغاز کر دیا۔ مجد دالدین اور اسامہ نے اپنی طے شدہ حکمت عملی کے مطابق پہلے شب خون کو خوب گرمایا پھر یکدم لشکر دو حصوں میں بٹ کر علیحدہ ہو گیا۔ دونوں سالاروں نے مختلف پہلوؤں سے حملوں کا آغاز کر دیا۔ ان کی جنگی مہارت کے سامنے قسطنطنیہ اور انطاکیہ کے اس متحدہ لشکر کا تین چوتھائی حصہ موت کی وادی میں جا اترا۔ سپاہ کا یہ حال دیکھ کر باقی ماندہ لشکریوں میں لڑائی اور مزید مزاحمت کی تاب نہ رہی۔ وہ اپنا مال و متاع چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ رات کے بقیہ حصے میں زخمیوں کی دیکھ بھال کے بعد ایک جتھے کو پہرے پر متعین کر کے باقی سپاہ کو آرام کرنے کا حکم دے دیا گیا۔

اگلے روز نمازِ فجر کی ادائیگی کے بعد سپاہ کے کھانے کا اہتمام کیا گیا۔ صلیبیوں کے مال و متاع پر قبضے کے بعد مجد دالدین نے طرابلس کے جنوب کا رخ کر لیا جہاں طغ اور نجم الدین شدت سے ان کے منتظر تھے۔ طرابلس میں مزید پڑاؤ کے بجائے ان سب نے دمیاط کا رخ کر لیا جہاں صلاح الدین نے کسی شیر کے مانند جنوبی جانب سے صلیبیوں کے سامنے بند باندھا ہوا تھا۔ قطب الدین کا لشکر اس قدر قلیل تھا کہ صلیبیوں سے ٹکرانا ممکن ہی نہ تھا۔ تاہم شب خون کے ذریعے وہ دشمن کی توجہ اپنی جانب مبذول کروانے میں کامیاب رہے۔ مجد دالدین، نجم الدین، طغ، اسامہ بن مرشد اور طغ کی دمیاط آمد نے اس جنگ کا پانسا ہی پلٹ دیا۔ صلاح الدین کے حوصلوں نے بھی نئی پرواز اختیار کر لی۔ اس کی مستعدی اور مہارت کی بدولت محصورین کے بجائے محاصرین کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ صلیبی اس کے حملوں سے اس قدر بد دل ہوئے کہ بالآخر محاصرہ اٹھا لینے پر مجبور ہو گئے۔ رومنوں اور لاطینیوں کا عظیم الشان جنگی بیڑا اور طرابلس و انطاکیہ کا متحدہ لشکر بھی بھیانک انجام سے دوچار ہوا۔

اس محاصرے کے دوران نصرتِ الٰہی بھی مسلمانوں کے ہمراہ رہی۔ موسلا دھار طوفانی بارش سے صلیبیوں کی لشکر گاہ پانی میں ڈوب گئی۔ اس کے بعد طوفانی آندھی سے صلیبیوں کے خیمے اکھڑ گئے۔ بحری بیڑا تباہ ہو گیا۔ جانی نقصان اس قدر ہولناک تھا کہ لاشیں انہی شہروں کے قریب بہنے لگیں جنہیں فتح کرنے کا خواب لیے وہ یہاں تک آئے تھے۔ دمیاط کے نواح میں صلیبیوں پر ایک قہرناک صورتِ حال نازل ہو چکی تھی۔ شمال کی جانب سے مجد دالدین نے اپنے سالاروں کے ساتھ صلیبیوں کی صفوں میں گھس کر موت کا کھیل شروع کر دیا اور ہزاروں سپاہیوں کو پل بھر میں ہی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ صلیبیوں کے قلب میں گھستے ہوئے مجد دکی ران اور بازوؤں پر گہرے زخم آئے لیکن اس کے باوجود وہ کسی چٹان کی طرح تن کر دشمنوں کو جہنم واصل کرتا رہا۔ اس کی قوت برداشت کا یہ عالم تھا کہ طغ، اسامہ بن مرشد اور قطب الدین کو اس کے زخمی ہونے کی بھنک بھی نہ لگ سکی۔ وہ ایک جانب ہو کر اپنی سپاہ کے ایک حصے کے ساتھ حیران کن تیزی سے صلیبیوں کی تعداد کم کرتا چلا گیا۔

جنوبی جانب سے صلاح الدین نے اپنے حملوں میں مزید تیزی اور ہولناکی پیدا کر دی۔ بحری بیڑے میں یورپ کی جانب سے آنے والے ہزارہا صلیبی جہاز اور کشتیاں غرق کر دی گئیں۔ اس بدترین شکست کے بعد صلیبی اپنے اپنے علاقوں کی جانب فرار ہو گئے۔ اس موقع پر صلاح الدین خواہش کے باوجود ان کا تعاقب نہ کر سکا۔ اسے قاہرہ کی جانب سے شدید تشویش لاحق تھی۔ اس کی غیر موجودگی میں قاہرہ میں باغی عناصر کے سر اٹھانے کے قوی امکانات تھے۔ انہی خدشات کے پیشِ نظر وہ حتی الامکان تیزی سے قاہرہ لوٹ گیا۔

صلیبیوں کے فرار اور صلاح الدین کی روانگی کے بعد لشکر کو پہلی بار مجد دالدین کے زخمی ہونے کا اندازہ ہوا۔ وہ اپنے زخموں کی شدت سے نڈھال ہو کر ریت پر گر گیا تھا۔ طغ، اسامہ، قطب الدین اور نجم الدین نے بلا تاخیر سرکاری طبیب اس کی جانب روانہ کر دیے۔ وہ سخت تشویش زدہ تاثرات لیے مجد دکی ران اور بازو پر پٹیاں باندھنے لگے۔ اس کی نقاہت اور زخموں کی شدت دیکھ کر طغ کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی۔ وہ افسردگی اور اضطراب کے عالم میں گھٹنوں کے بل نیچے جھکا اور اس کی سرد پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے محض اتنا ہی کہہ سکا۔

"میرے بھائی! یہ کیا.....؟"

مجد دکے ہونٹوں پر مسکراہٹ جھلکنے لگی۔ اس نے باوقار انداز میں ہاتھ کھڑا کر کے طغ کو مزید کچھ بھی کہنے سے

روکا اور ملائمت سے بولا۔

''فکر کی کیا بات ہے بھئی؟ مجھے کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ بس یہ دو معمولی سے زخم ہی تو آئے ہیں اور زخم تو مجاہد کا زیور ہوتے ہیں۔ میری تو روزِ اول سے تمنا ہے کہ میرے بدن پر زخموں کے گہنے سج جائیں۔ قسم پروردگار کی! میں اس معاملے میں بڑا حریص ہوں۔'' اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور سلسلۂ کلام آگے بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔

''تمہاری ذمے داری اب کچھ مزید بڑھ گئی ہے میرے بھائی! تم اپنی نگرانی میں مالِ غنیمت سمیٹو۔ اس کے بعد کچھ قاصد سلطان کی طرف روانہ کرو اور دمیاط کی مکمل صورتِ حال سے آگاہ کرو۔ لشکر کے زخمیوں کی دیکھ بھال اور کھانے کا بھی خصوصی اہتمام کرواؤ۔ لشکر دو دن یہاں قیام کرے تو بہتر ہوگا۔''

''کیا آپ کو خدشہ ہے کہ صلیبی پلٹ کر وار کر سکتے ہیں۔'' خطلخ الجھا۔

''نہیں! میں اس بارے میں پُریقین ہوں کہ وہ دوبارہ یہاں کا رخ نہیں کریں گے۔ میں محض زخمیوں کی بہترین دیکھ بھال اور علاج کی خاطر یہ قدم اٹھا رہا ہوں۔ اس سے البتہ ایک ضمنی فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ان علاقوں میں دشمن کے مخبروں کو یہ تاثر ملے گا کہ ہم نے یہاں پڑاؤ ڈال لیا ہے۔ اس کے بعد تو کوئی بھی صلیبی گروہ ادھر پھٹکنے کا سوچے گا بھی نہیں۔'' مجدد کی تفصیلی ہدایات پر خطلخ نے تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دی اور اپنے ذمے کام نمٹانے میں جت گیا۔ زخمیوں کی دیکھ بھال کے ساتھ تیز رفتاری سے خیمے نصب ہونے کا آغاز بھی ہو گیا۔

☆☆☆

شمس الدین اور نورالدین زنگی کے لشکر کے لیے دشمن پر چڑھائی کی نوبت ہی نہ آسکی۔ صلاح الدین اور مجدد الدین کی کامیابیوں کی نوید نے قصر میں ماحول بے حد گرما دیا تھا۔ نورالدین سجدۂ شکر بجالاتے نہ تھکتا۔ اسی دوران مجدد اور خطلخ کی واپسی اور مجدد الدین کے زخموں نے انہیں تشویش زدہ کر دیا۔ مجدد الدین تاحال بہت پرسکون اور حوصلہ مند تھا۔ اس کی گھر روانگی کے لیے سلطان نے خصوصی سواری کا بندوبست کروانا چاہا لیکن اس نے ادب سے معذرت کر لی۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں سلطان معظم! اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر ہی گھر جاؤں گا۔'' اس کا عزم دیکھتے ہوئے نورالدین نے تینوں کو اہلِ خانہ سے ملاقات کی اجازت دے دی۔

''ارے میرے بھائی! میں تو کسی مجبوری میں گھڑ سواری آہستگی سے کرنے پر مجبور ہوں لیکن تم دونوں تو صحت مند ہو۔ مریلوں کی طرح کیوں گھوڑے بھگا رہے ہو؟'' مجدد نے انہیں گھر کا۔

''اس طرح ہم آپ سے پہلے گھر پہنچ جائیں گے بھائی جان!'' شمس الدین ہچکچایا۔

''تو ایسا پہلی بار تو نہیں ہونے والا میرے بھائی! ماضی میں بھی کئی بار تم دونوں مجھ سے پہلے گھر پہنچتے رہے ہو۔ میں سلطان کے پاس کسی نہ کسی کام کی وجہ سے بعد میں ہی آیا کرتا تھا۔'' مجدد نے گھر کہا۔ خطلخ اور شمس الدین نے بے بس نظروں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور گھوڑوں کی رفتار بڑھا دی۔ حویلی پہنچتے ہی انہوں نے اصطبل کا رخ کر لیا۔ وہ اپنے کشیدہ اعصاب پُرسکون کرنا چاہتے تھے۔

''امیر نہیں آئے آپ دونوں کے ساتھ؟'' صحن میں واپس آتے ہی مرسینہ نے بے تابی سے پوچھا۔

''سلطان کے پاس کسی کام سے رک گئے ہوں گے۔'' عبیرہ شرارت سے مسکرائی۔ خطلخ اس سے نظریں چرا کر رہ گیا۔

''کیا بات ہے میرے بیٹے! تم دونوں کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہو؟'' عبدہ سے ان کی الجھن پوشیدہ نہ رہ سکی۔

''پریشان تو نہیں ماں! البتہ بھائی جان کے ساتھ واپس آنا چاہتے تھے۔'' شمس الدین نے بات کو سنبھالنا چاہا۔

''کیا ہوا ہے مجدد بیٹے کو؟ میں ایک مجاہد کی بیوی اور تین مجاہدین کی ماں ہوں۔ میرا حوصلہ بہت مضبوط ہے میرے بچو!'' عبدہ نے باوقار انداز میں پوچھا۔ اس کی بات پر مرسینہ اور مثال کے چہروں کی رنگت متغیر ہونے لگی۔

''جنگ میں بھائی جان کو بازو اور ران پر زخم آئے ہیں۔ سلطان نے انہیں واپس بھیج کر شاہی طبیب بھی روانہ کرنے کی ہامی بھری ہے۔'' خطلخ نے دھیرے سے بتایا۔ مثال کے وجود پر لرزہ طاری ہو گیا۔ وہ نقاہت زدہ انداز میں وہیں ڈھے گئی۔ مرسینہ البتہ ابتدائی جھٹکے کے بعد کچھ سنبھل گئی تھی۔

''مثال..... مرسینہ! خود کو سنبھالو۔ ایک مجاہد کی بیوی کو بہت باوقار اور باحوصلہ ہونا چاہیے۔ انہیں ایسی کم ظرفی زیب نہیں دیتی۔'' زہران نے انہیں گھر کا۔

''ہاں! تم لوگ شاید بھول گئی ہو کہ تمہاری ایسی ہی ایک جذباتی حرکت کی وجہ سے مجد الدین گزشتہ بار کس قدر خفا ہوا تھا۔'' عبدہ نے نرمی سے یاد دہانی کروائی۔ مثال اور مرسینہ خفت سے سر جھکا کر رہ گئیں۔ مجد الدین نے انہیں عبدہ کے کپڑوں کی دھلائی کے لیے بچوں کی طرح ضد کرتے اور بحث کرتے دیکھا تھا۔ وہ دونوں ہی اس کے کپڑے خود دھونے کے لیے بضد تھیں۔ ہنسی مذاق میں بات بڑھتی گئی اور ان کی آوازیں اس قدر بلند ہوئیں کہ نماز کے بعد گھر میں داخل ہونے والے مجد کو کسی جھگڑے کا گمان ہونے لگا۔ کچھ پل کے لیے اسے یہی محسوس ہوا کہ دونوں بہنوں میں نئے رشتے کی تلخی غالب آگئی ہے۔ وہ ناراضگی کے عالم میں مستقر لوٹ گیا تھا تاہم معاملہ واضح ہونے اور دونوں فریقین کی جانب سے رویے میں توازن قائم رکھنے کے وعدے نے اس کا مزاج بحال کر دیا۔ اس وقت عبدہ کی زبان سے اسی واقعے کا ذکر سن کر وہ پشیمان ہو گئیں۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں ماں! ایک مجاہد کی بیوی کا حوصلہ تو سمندر جیسا گہرا اور ظرف پہاڑوں سے بھی بلند ہونا چاہیے۔'' مرسینہ نے معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں مجد بھی حویلی کے دروازے پر چلا آیا۔ اس کے چہرے پر کھنڈی زردی نے مرسینہ کا دل مٹھی میں بھینچ لیا۔ مثال کی آنکھوں سے ضبط کے باوجود آنسو جاری ہو گئے۔

''لگتا ہے تم دونوں نے آتے ہی میری حالت کے متعلق ہر بات کی قے کر ڈالی ہے۔'' اس نے بھائیوں پر غصہ کیا۔

''ان کے بتانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی بیٹا! ماں کا دل خود ہی سب کچھ سمجھ لیتا ہے۔'' عبدہ آگے بڑھی۔

''میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں ماں! ایسے معمولی زخم تو مجاہدوں کا زیور ہوتے ہیں۔'' وہ اپنی ہمت مجتمع کرتے ہوئے جست لگا کر گھوڑے سے اترا۔

''ہمیں آپ کی بات پر مکمل یقین ہے امیر!'' مرسینہ نے کہا۔ ''آپ کہہ رہے ہیں تو ایسا ہی ہو گا لیکن خدارا یہ بات ثابت کرنے کے لیے ایسی اچھل پھاند نہ کریں۔''

اس کی بات پر تلخ اور شمس الدین بے ساختہ مسکرا اٹھے۔ انہوں نے بھائی کو کندھوں سے سہارا دیتے ہوئے کمرے میں پہنچا دیا۔ خواتین مطبخ میں کھانے کی تیاریوں میں مگن ہو گئی تھیں۔ کھانے سے فراغت پاتے ہی شاہی طبیب مجد کی مرہم پٹی کے لیے چلے آئے۔

''آپ سب اندر چلی جائیں۔'' تلخ نے خواتین کو مخاطب کیا۔

''مرسینہ اور مثال کو یہیں رہنے دو بیٹا!'' عبدہ نے کہا۔ ''ان کے لیے ایسے زخموں سے شناسائی اور انسیت بے حد ضروری ہے۔ میں انہیں ہرگز بزدل اور کم حوصلہ نہیں دیکھنا چاہتی۔ آئندہ زندگی کے لیے انہیں اپنا دل بہت مضبوط بنانا ہے۔'' تلخ خاموشی سے طبیبوں کی جانب متوجہ ہو گیا جو نہایت ماہرانہ انداز میں زخموں پر مرہم لگا کر پٹیاں تبدیل کر رہے تھے۔ مجد کی نظریں اپنے زخموں سے بھٹک کر مرسینہ اور مثال کے چہروں پر جا ٹھہرتیں جہاں منعکس ہونے والے محبت' خلوص اور وفا کے رنگ اسے ایک نئی توانائی عطا کر رہے تھے۔ مجد الدین نے طمانیت سے آنکھیں موند لیں اور زندگی میں ملنے والی ہر نعمت پر اپنے پروردگار کا شکر بجالانے لگا۔

☆☆☆

مصر واپسی کے بعد صلاح الدین مستعدی سے حالات کی درستگی میں مگن ہو گیا۔ اس کے اہلِ خانہ بھی قاہرہ میں ہی موجود تھے۔ تاہم نجم الدین ہنوز نور الدین زنگی کے پاس ہی مقیم تھا۔ وہ دلی طور پر سلطان سے بے حد محبت کرتا تھا۔ اس لیے بیٹے کے بارہا اصرار کے باوجود قاہرہ جانے کے لیے تیار ہی نہ ہوتا۔ نور الدین کو جب اس صورتِ حال کا علم ہوا تو اس نے شفقت وحق جتاتے ہوئے نجم الدین کو دمشق سے قاہرہ روانہ کر دیا۔ صلاح الدین والد کو اپنے سامنے پا کر شکوہ کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''مجھے تو ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ آپ مجھ سے محبت ہی نہیں کرتے۔ اسی لیے تو میرے پاس آ کر رہنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔''

نجم الدین اپنے جری بیٹے کے اس نروٹھے انداز پر مسکرا اٹھا۔ ''جان پدر! اولاد تو والدین کے جینے کا آسرا ہوتی ہے۔ تم بھی مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہو۔ میں ہمہ وقت تمہاری کامیابی اور سرخروئی کے لیے دعا گو رہتا ہوں لیکن سچ بتاؤں تو اس دنیا میں ایک ہستی ایسی بھی ہے جو مجھے اپنی اولاد اور ہر قسم کے مال ومتاع سے زیادہ عزیز ہے۔''

''وہ یقیناً ہمارے سلطان ہی ہوں گے۔'' صلاح الدین نے اعتماد سے کہا۔

''ہاں! ہمارا سلطان پروردگار کی جانب سے ایک انمول تحفہ ہے۔ اس کی بہادری لاثانی ہے۔ ہم اس کے ادنیٰ

غلام ہیں۔ میرے ذہن میں بہت دنوں سے ایک الجھن موجود ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس معاملے کو تمہارے سامنے رکھ کر سلجھا لیا جائے۔ تم نے بلاشبہ مختصر وقت میں بہت کامیابیاں سمیٹی ہیں۔ فتوحات کا نشہ کسی بھی انسان کے حواس کو پرانی شراب سے زیادہ مخمور کر دیتا ہے۔ تم آج یہ بات اپنے ذہن میں اچھی طرح بٹھا لو کہ کبھی سلطان کے احکامات کی حکم عدولی کا تصور بھی ذہن میں نہ لانا۔ اس عظیم مرد مجاہد کے عالم اسلام پر بے حد احسانات ہیں۔ نورالدین زنگی کا میرے دل میں یہ رتبہ ہے کہ اگر کسی موقع پر وہ مجھ سے میری اولاد کا سر مانگے تو بخدا میں تمہارا سر کاٹ کر اس کے قدموں میں دھر دوں گا۔''

''آپ کے یہ خدشات بالکل بے جا ہیں۔ میں بھی سلطان کی عظمت اور کردار کا دلی طور پر قائل ہوں۔'' صلاح الدین نے والد کو یقین دلایا لیکن نجم الدین اپنی ہی لے میں کہتا چلا گیا۔

''نورالدین نے تم پر بھروسا کرتے ہوئے جس طرح اقتدار کی امانت سونپی ہے اسی طرح وہ معزول کر دینے کا بھی مکمل حق رکھتا ہے۔ ایسی کسی بھی صورتِ حال میں اس کے خلاف لشکر کشی اور اپنے اقتدار سے چمٹے رہنے کا خیال بھی دل میں مت لانا۔''

''ایسا ہی ہوگا۔ میں اپنی زندگی کی آخری سانس تک سلطان اور اسلام کا وفادار رہوں گا۔'' صلاح الدین نے عزم ظاہر کیا۔ والد کے ان احکامات وہدایات نے اسے صلیبیوں کے خلاف مزید قہرناک بنا دیا۔ وہ اسے اسلامی مملکت کی سرحدوں سے کوسوں دور رکھنا چاہتا تھا۔ صلیبی حکمرانوں کی ہٹ دھرمی اور شر پسندی کا اب بھی یہ عالم تھا کہ وہ مصر پر اپنا تسلط برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ ان کا گمان یہ تھا کہ یروشلم کی سلطنت چری ہوئی لکڑی کے درمیان پھنس گئی ہے۔ اس چری ہوئی لکڑی کے مانند ان کے ایک جانب نورالدین زنگی ہے تو دوسری جانب صلاح الدین کا وجود ہے۔ ان دونوں میں سے کسی ایک پر کاری ضرب لگانے کی خواہش انہیں اس قدر بے حال رکھتی کہ وہ اپنے مزاج کے تحت کسی بھی وقت مسلم علاقوں میں لوٹ مار اور قتل وغارت کا بازار گرم کر دیتے۔ صلاح الدین کے حالات پر قابو پانے کے باوجود عسقان اور رولہ میں سازشوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوگیا۔ صلاح الدین نے بلا تاخیر ان عناصر کے خلاف لشکر کشی کی اور انہیں فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس مہم سے نمٹتے ہی وہ ایلہ نامی نامور قلعے پر حملہ آور ہونے کی تیاری کرنے لگا۔ یہ قلعہ بحیرۂ احمر کے شمالی سرے سے خلیج عقبہ کے پاس تھا۔ یہاں مقیم صلیبی اسے اپنا مرکز بناتے ہوئے سرزمین حجاز پر حملہ کرنے کی سازشوں میں مصروف تھے۔ صلاح الدین کے بھرپور حملے نے اس مضبوط اور بظاہر ناقابلِ تسخیر قلعے کو مطیع کر لیا۔ اسی برس اس نے اسکندریہ اور قاہرہ کی شہر پناہوں کی مرمت کروانے کے بعد وہاں کے باشندوں کی بھرتی کے عمل کا آغاز بھی کر دیا۔ ان تعمیری سرگرمیوں کے دوران خلیفہ عاضد کی رحلت ہوگئی۔ نورالدین زنگی نے صلاح الدین کو مصر پر عامل کا کلی اختیار دے دیا۔ نورالدین خود بھی ان دنوں ایک ذاتی صدمے میں مبتلا تھا۔ موصل میں قطب الدین زنگی کی وفات نے اسے جذباتی طور پر پژمردہ کر دیا تھا۔ بات صرف یہیں تک محدود نہ تھی۔ اصل معاملہ یہ تھا کہ مذہبی رواداری کے تحت قطب الدین نے عبدل مسیحی نامی عیسائی کو اپنا وزیر مقرر کر رکھا تھا۔ قطب الدین کی وفات کے بعد عبدل مسیحی نے اس کی بیوہ سے ساز باز کر کے جانشینی کے اصل حقدار عمادالدین زنگی کو نظر انداز کر کے چھوٹے بیٹے سیف الدین کو موصل کا والی مقرر کر دیا۔ امورِ حکومت اس کے اپنے اختیارات میں تھے۔ عمادالدین ان دنوں موصل سے باہر تھا۔ وہ اس ناانصافی پر شدید ملول تھا۔ وہ اپنی بپتا لیے نورالدین کے پاس حاضر ہوگیا۔ سلطان کو اس سے قبل بھی عبدل مسیحی کے مسلمانوں سے ناروا سلوک کی شکایات موصول ہوا کرتی تھیں۔ اس نے ایک مختصر لشکر کو عبدل کی سرکوبی کے لیے روانہ کر دیا۔

اس نئی مہم کا آغاز یکم محرم کو قلعہ جعبر کی سمت سے دریائے فرات عبور کرتے ہوئے رقہ شہر کا رخ کرنے سے ہوا۔ رقہ کا والی عجز وانکسار سے نورالدین کا اطاعت گزار بن گیا۔ رقہ سے خابور اور تھسیین ہوتے ہوئے وہ ''سنجار'' پہنچ گیا جو موصل کی ولایت کا ایک اہم ترین عسکری مرکز تھا۔ نورالدین نے یہاں ایک کثیر لشکر کی موجودگی کے باعث شہر کو محاصرے میں لیتے ہوئے منجنیقیں بھی نصب کروا دیں۔ محصور لشکر نورالدین کے اس محاصرے اور بے درپے حملوں کی تاب نہ لا سکا۔ انہوں نے اطاعت قبول کرتے ہوئے شہر اس کے حوالے کر دیا۔ نورالدین اپنے بھتیجے عمادالدین کو سنجار کی حکومت سونپ کر دریائے دجلہ عبور کرتے ہوئے موصل روانہ ہوگیا۔ عبدل مسیحی تک اس کے خطرناک عزائم کی خبر پہنچی تو اس کے سر سے بغاوت کا بھوت ایک ہی لمحے میں تحلیل ہوگیا۔ اس نے فوری طور پر ایک خصوصی ایلچی

روانہ کر کے سلطان کو اپنی اطاعت اور غلامی کی یقین دہانیاں کرواتے ہوئے موصل میں مہمان نوازی کا شرف بخشنے کی دعوت تک دے ڈالی۔

موصل پہنچتے ہی سیف الدین اس سے ملنے چلا آیا۔ نورالدین بہت محبت اور گداز سے بھتیجے سے بغلگیر ہوا۔ اس نے سیف الدین کے بجائے عمادالدین کو موصل کا والی مقرر کر دیا۔ سیف الدین کو اس فیصلے سے کوئی اعتراض نہ ہوا۔ عبدل تیجی البتہ قدرے بے چین دکھائی دینے لگا تھا۔

''سلطان محترم! اس غلام کی التجا ہے کہ اسے یہیں رہنے دیجیے۔ میں آئندہ کبھی آپ کی نافرمانی نہیں کروں گا۔''

''مجھے تمہارے جذبات اور وعدے پر یقین ہے عبدل! لیکن اس وقت شام میں تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔ تمہیں جلد از جلد وہاں منتقل ہونا ہوگا۔'' نورالدین کے دوٹوک انداز کے بعد اس کے لیے کچھ بھی کہنے کی گنجائش ہی نہ تھی۔

نورالدین کا موصل میں قیام بہت یادگار ثابت ہوا۔ اس نے ''جامع نوری'' کے نام سے ایک مسجد کی بنیاد رکھی اور حالات کی مکمل درستگی کے بعد اپنے لشکر کے ہمراہ دمشق لوٹ آیا۔

☆☆☆

برسہا برس سے جاری نورالدین زنگی اور صلیبیوں کی ٹسل ہر گزرتے دن کے ساتھ نیا موڑ لینے لگی تھی۔ صلیبیوں کی شرانگیزی کسی بھی صورت میں ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ موصل سے واپس آتے ہی ایک اور قضیہ اپنی بانہیں کھولے سلطان کا منتظر تھا۔

کچھ عرصہ قبل نورالدین اور صلیبیوں کے درمیان ایک معاہدہ کیا گیا تھا جس کی رو سے دونوں فریقین سمندری حدود میں تجارتی کشتیوں میں دخل اندازی نہ کرنے کے پابند تھے۔ فریق ثانی کی حدود میں ڈوبنے والی یا شکستہ ہو جانے والی کشتی کے مالک کو اس پر قبضے کا حق حاصل تھا۔ اس معاہدے کا پس منظر یہ تھا کہ ''لازقیہ'' کے نزدیک تجارتی کشتیوں میں کچھ مسلمان تاجر سوار تھے۔ یہ کشتیاں مصر سے شام کی طرف آ رہی تھیں۔ ان کے سوار تاجرین کو گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتاری سے محفوظ رہنے والے تاجروں نے نورالدین زنگی سے فریاد کی کہ وہ صلیبیوں سے یہ کشتیاں واپس طلب کریں۔ یہ واقعہ چونکہ طرابلس کی حدود میں پیش آیا تھا اس لیے سلطان نے اپنے قاصد طرابلس روانہ کر دیے۔ وہاں کے حکمران نے نہایت اعتماد سے جھوٹ تراش دیا کہ کشتیوں میں پانی بھر آنے کی وجہ سے ان پر قبضہ کیا گیا ہے۔ اس معاہدہ شکنی کے بعد ان کی سرکوبی لازم ہو چکی تھی۔ نورالدین زنگی نے اپنے عساکر اور عمائدین کو طلب کر لیا۔ وہ کسی بھی تاخیر کے بغیر صلیبیوں کو اس معاہدہ شکنی کا سبق چکھانا چاہتا تھا۔ اس کے ذہن میں مکمل حکمت عملی واضح تھی۔ اس نے اپنے عساکر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''اس وقت ہمیں انطاکیہ، طرابلس، سافیتا، عریمہ اور عرقہ شہر کے حکمرانوں کا مقابلہ کرنا ہے۔ میری اولین ترجیح یہی ہوگی کہ ان چاروں قوتوں کو کسی بھی صورت متحد نہ ہونے دیا جائے۔ ہمارا اصل مجرم طرابلس ہے۔ صلیبیوں کو بھی یہی خدشہ ہوگا کہ ہم صرف انہی کی بیخ کنی کریں گے جس کے نتیجے میں دیگر شہروں کے حاکم اپنے عساکر روانہ کر دیں گے۔ ہمیں بہر صورت انہیں طرابلس پہنچنے سے روکنا ہے۔ اس لیے ہمارے چاروں لشکر بیک وقت حرکت میں آئیں گے۔'' سلطان نے ایک توقف کیا اور مجدالدین کی طرف دیکھتے ہوئے سلسلۂ کلام کا دوبارہ آغاز کیا۔

''ابن الدایہ! لشکر کے بڑے حصے کی کمانداری تم سنبھالو گے۔ تمہارا نائب اسامہ بن مرشد ہوگا۔ تمہیں انطاکیہ کا رخ کر کے انہیں طرابلس کی مدد سے روکنا ہوگا۔ میں نجم الدین کے ساتھ عرقہ کی جانب کوچ کروں گا۔ سافیتا اور عریمہ کے لیے کمانداری بطلخ اور شمس الدین سنبھالیں گے۔ چوتھا لشکر فخرالدین مسعود اور نائب قطب الدین کے سپرد ہوگا۔ یہ دونوں طرابلس کوچ کریں گے۔''

''ہمارے امور اور ذمے داریوں کی نوعیت کیا ہوگی سلطان معظم؟'' نورالدین کی خاموشی کچھ طویل ہوئی تو مجدالدین نے دہکتے ہوئے جوش سے استفسار کیا۔

''بطلخ اور شمس الدین سافیتا اور عریمہ فتح کرنے کے بعد عرقہ میں مجھ سے آملیں۔ ان کی آمد تک نصرت الٰہی کے تحت عرقہ پر ہمارا قبضہ ہو چکا ہوگا۔ ان کی شمولیت کے بعد ہم متحد ہو کر طرابلس کا رخ کریں گے۔ ابن الدایہ! تمہارے ذمے سب سے اہم ذمے داری ہے۔ تم نے اس بار انطاکیہ کا محاصرہ نہیں کرنا۔ انطاکیہ کا لشکر یقینی طور پر تمہاری سپاہ سے بہت کثیر ہوگا۔ تم انطاکیہ سے باہر گھات لگا کر رہنا۔ اس صورت میں انطاکیہ کے لیے روانہ ہو چکے طرابلس کے لشکر سے نمٹنے میں آسانی رہے گی۔'' نورالدین کی اس حکمت عملی پر سالار اش اش کر اٹھے۔ اس نے ایک توقف کے بعد فخرالدین سے مخاطب ہو کر کہا۔

''تم اور قطب الدین طرابلس کے نواح میں رہو گے لیکن ان پر حملہ مت کرنا! تمہارے ذمے صرف یہ کام ہے

کہ اگر ہم تینوں میں سے کسی کا بھی مقابل صلیبی لشکر ہماری آمد سے قبل طرابلس پہنچ جاتا ہے تو انہیں شہر میں داخل ہونے سے روک کر فرار ہونے پر مجبور کرتا ہے۔ ہمارے چاروں لشکروں کے متحد ہوتے ہی ہم طرابلس کا محاصرہ کرلیں گے اور اس طرح دباؤ بڑھائیں گے کہ وہ ہماری کشتیاں اور ان میں بھرا ہوا سامان لوٹا دیں۔ سامان نہ لوٹانے کی صورت میں اس کی کل مالیت اور مسلم قیدیوں کی رہائی کے بغیر ہم وہاں سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹائیں گے۔''

اس بہترین منصوبہ بندی کے بعد کسی بھی سالار کے پاس کچھ بھی کہنے کے لیے الفاظ ہی نہ تھے۔ اجلاس ختم ہوتے ہی لشکر کے چاروں حصے اسی روز اپنے اہداف کی طرف روانہ ہوگئے۔ سب سے پہلے طغتکین اور شمس الدین سافیثا اور عریمہ پہنچے۔ شومئی قسمت جس روز انہوں نے وہاں قدم دھرا، صلیبیوں کا ایک لشکر طرابلس روانہ ہونے کے لیے تیار تھا۔ ان کی عددی برتری خاطر میں لائے بغیر شمس الدین اور طغتکین نے ہر جانب سے انہیں جوش ایمانی اور حدت آمیز جذبوں سے جکڑ لیا۔ صلیبی اس جال سے نکلنے اور اپنا رستہ صاف کرنے کے لیے بہت پھڑپھڑائے لیکن ان کے لیے کہیں کوئی امان نہ تھی۔ کھلے میدانوں میں شکست کا بار اٹھانے کے بعد وہ سافیثا شہر میں داخل ہوگئے۔ طغتکین اور شمس الدین نے وہاں بھی ان کا تعاقب جاری رکھا۔ گھمسان کے رن میں تلواروں، نیزوں اور ڈھالوں کی باہمی کھنکھناہٹ، لہو کے اچھلتے فواروں، زخمی وجودوں کے کٹے پھٹے اعضاء میں سافیثا پر مسلم سپاہ کا قبضہ ہوگیا۔ اس کے بعد وہ فوری طور پر عریمہ کی طرف بڑھے جہاں انہیں کوئی مزاحمت کار نہ ملا۔ عریمہ پر بہ آسانی قبضہ کرلیا گیا۔ شمس الدین اور طغتکین نے کسی بھی جشنِ فتح کے بغیر دونوں شہروں کے انتظامی معاملات اپنے انداز میں ڈھالے اور سلطان کے حکم کے مطابق طرابلس کوچ کر گئے۔

دوسری جانب نورالدین جب عرقہ شہر پہنچا تو عرقہ کا لشکر ابھی طرابلس کی طرف روانہ نہ ہوا تھا۔ انہیں سلطان کی آمد کی خبر ملی تو انہوں نے شہر کے باہر اپنی صفیں مرتب کرلیں۔ وہ نورالدین زنگی کو بے خبری میں دبوچ لینے کے خواہش مند تھے۔ اس موقع پر ایک بار پھر سلطان کے ''محکمہ مخبری'' کی مہارت کام آئی۔ انہوں نے نورالدین کو پہلے ہی اطلاع دے دی تھی کہ صلیبی گھات لگائے اس کے منتظر ہیں۔ نورالدین نہایت اعتماد اور دلیری سے ان کے مقابل چلا آیا۔ اس کے جارحانہ حملوں اور جنگی فراست نے صلیبیوں کے سارے کس بل نکال دیے۔ مسلم لشکر کو پسپا کر کے طرابلس روانہ ہونے سے روکنے کی امیدیں خاک میں مل گئیں۔ وہ اس شکست کے بعد عرقہ میں ہی محصور ہونے پر مجبور ہوگئے تھے۔ نورالدین نے فوری طور پر شہر کا محاصرہ کرلیا۔ اس محاصرے کے دوران طغتکین اور شمس الدین بھی فتوحات کے جھنڈے گاڑ کر اس کے ساتھ شامل ہوگئے۔ ان کی آمد نورالدین کے لیے باعثِ تقویت تھی۔ اس نے محاصرے میں مزید شدت پیدا کردی۔ عرقہ کا قلعہ اور فصیل بے مثال مضبوطی کے حامل تھے۔ نورالدین نے فصیل پر منجنیقوں کے ذریعے سنگ باری کا آغاز کردیا جس کے نتیجے میں فصیل لرزتے ہوئے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگی۔ صلیبیوں کو اندازہ ہو چکا تھا کہ مسلمان عرقہ کو فتح کیے بغیر نہیں ٹلیں گے۔ چاروناچار انہوں نے ہتھیار ڈال کر امان طلب کرلی۔ نورالدین زنگی نے انہیں معافی عطا کرتے ہوئے یہ اجازت بھی فراہم کردی کہ وہ جس قدر چاہے مال واسباب اٹھا کر قلعہ مسلمانوں کے حوالے کردیں۔ صلیبیوں کے پاس قلعہ خالی کیے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ نورالدین نے وہاں سات روز قیام کیا اور انتظامی امور اپنی فراست کے مطابق ڈھالنے کے بعد طغتکین کے متحدہ لشکر کے ہمراہ طرابلس روانہ ہوگیا۔

تیسری جانب انطاکیہ کے حکمران کو مجدالدین کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ اس نے شہر کے باہر کھلے میدانوں میں اپنی سپاہ کو تعینات کردیا۔ مجدالدین کے وہاں پہنچتے ہی اپنی عددی برتری میں مبتلا صلیبی صفیں مرتب کرنے لگے۔ اپنے گھوڑے پر سوار مجدالدین نے گہری نظر سے سپاہ کا جائزہ لیا اور کسی بھی قسم کا ہراس یا اضطراب نہ پاکر مطمئن انداز میں سر ہلا دیا۔ صفوں کی ترتیب درست ہوتے ہی اس نے تکبیریں بلند کردیں۔ لشکریوں کی جوابی تکبیروں نے پل بھر میں ہی ماحول میں ایمان کی حدت رواں کردی۔ مجدالدین کا اشارہ ملتے ہی لشکر حرکت میں آیا اور ہتھیاروں کی کھنکھناہٹ میں زندگی اپنی بقاء کے لیے رقصاں ہوگئی۔ اہل انطاکیہ کے دل تکبیر کی صداؤں سے ہی لرز چکے تھے۔ انہیں سمجھ ہی نہ آرہی تھی کہ وہ یکا یک یہ کیسا خوف اور لرزش محسوس کرنے لگے ہیں۔ وہ اس بات کی توجیہہ جاننے سے بھی قاصر تھے کہ ان کے حملے اور وار غیر مؤثر کیوں ثابت ہو رہے ہیں۔ حملے کے دوران وہ جس سمت کا رخ کرتے، اپنے سامنے ایک ناقابلِ فہم حدت پاکر وجود پگھلتے ہوئے محسوس کرتے۔ ان کیفیات نے

صلیبیوں کو حواس باختہ کر دیا۔ وہ ہر اس کے عالم میں بھاگتے کسی جائے امان کی تلاش میں تھے لیکن پناہ ملتی بھی تو کہاں؟ مسلم سپاہ بلا لحاظ انہیں عدم کا پروانہ تھماتی 'معذوری کا تحفہ عطا کرتی، کسی سیلابی ریلے کے مانند انہیں خس وخاشاک کی طرح بہاتی چلی جا رہی تھی۔ اس جنگ کا اختتام چشم فلک نے صلیبیوں کی لاشوں سے اٹے میدان کی صورت میں دیکھا۔ ان کی بے نور نگاہوں میں بعد از مرگ بھی حسرتوں اور فتح کی ناتمام آرزوؤں کا ایک جہان آباد تھا۔

زخمیوں کی مرہم پٹی اور لشکریوں کے طعام کے بعد مجد الدین اور اسامہ بن مرشد نے اگلی شب بھی لشکر کے ہمراہ وہیں بسر کی اور دوسرے روز طرابلس کی جانب کوچ کر گئے۔ نورالدین زنگی کے تمام لشکر اس کے پاس جمع ہو چکے تھے۔ عجز وانکساری سے سجدۂ شکر بجالاتے ہوئے اس نے طرابلس کا بھرپور اور سخت ترین محاصرہ کر لیا۔ محاصرے کی شدت سے گھبرا کر صلیبیوں نے صلح اور اطاعت گزاری کا پیغام ارسال کر دیا۔ نورالدین نے ایسے کسی بھی موقع کے لیے شرائط نامہ پہلے ہی تیار کر رکھا تھا۔ اس نے مال واسباب سمیت کشتیاں واپس کرنے اور قیدیوں کی رہائی کے مطالبات تسلیم نہ کرنے کی صورت میں شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کی دھمکی دے کر انہیں مزید دباؤ میں مبتلا کر دیا۔ صلیبیوں کو یہ مطالبات تسلیم کرتے ہی بنی۔

اس طویل مہم کے بعد کامیابی کے سجدۂ شکر بجالاتے ہوئے نورالدین نے دمشق واپسی کی راہ لی۔

☆☆☆

کامیابی پر سرشاری ومسرت کا یہ دور نورالدین کے لیے نہایت مختصر ثابت ہوا۔ اس کے بعد پے در پے سانحات نے اسے ذاتی طور پر شدید صدموں میں مبتلا کر دیا۔ دمشق واپسی کے کچھ ہی عرصے بعد مصر میں صلاح الدین کے والد نجم الدین کی وفات ہو گئی۔ نجم الدین کو نورالدین زنگی ہی کی طرح چوگان کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ اس دوران وہ اپنے گھوڑے کو ایسی برق رفتاری سے دوڑایا کرتا تھا کہ دیکھنے والوں کو گھوڑے کی رفتار خوف ووحشت میں مبتلا کر دیا کرتی۔

اس روز بھی وہ چوگان کھیلنے کے دوران گر کر شدید زخمی ہو گیا۔ طبیبوں کی جانب سے بہترین علاج کے باوجود وہ موت کو شکست دینے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اپنے عزیز مقرب کی رحلت کا صدمہ ابھی تازہ ہی تھا کہ نورالدین زنگی اور قونیہ کے سلطان ''قلیج ارسلان'' کے درمیان اختلافات کی دراڑ پیدا ہو گئی۔ قلیج ارسلان نے ''ملطیہ'' اور ''سیواس'' کے مسلم علاقوں پر جبراً قبضہ کر لیا۔ ان علاقوں کے فرماں رواؤں نے نورالدین زنگی سے نالش کی کہ وہ قلیج ارسلان سے یہ علاقے واپس ان کے حوالے کر دے۔ سلطان نے اپنے ایک قاصد کو پیغام دے کر قونیہ روانہ کر دیا لیکن قلیج ارسلان نے اس تحریری پیغام کو نظر انداز کرتے ہوئے قاصد کو بھی شاہی آداب سے محروم رکھے واپس بھیج دیا۔ قلیج کی یہ حرکت سراسر سلطان کی توہین تھی۔ نورالدین نے عالم طیش میں اس کے علاقوں پر حملہ کر کے کیسون' مرعش' مرزبان اور کئی دیگر علاقے بھی اپنے تسلط میں کر لیے۔ اس صورت حال نے قلیج ارسلان کے چھکے چھڑا دیے۔ اس کی ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی نے یہ حقیقت تسلیم کر ہی لی کہ وہ سلطان کا مقابلہ کرنے کا اہل نہیں۔ انجام کار اس نے قاصد کے توسط سے صلح کی درخواست روانہ کر دی' نورالدین زنگی نے اپنی رحمدلی سے مغلوب ہو کر دو شرائط کے عوض قلیج کی یہ التجا تسلیم کرنے کی ہامی بھر لی۔ ان شرائط کے تحت اسے مسلمان فرماں رواؤں کے مقبوضہ علاقوں کی واپسی کے علاوہ صلیبیوں کے ساتھ نورالدین کی مہم جوئی کے دوران اپنی عسکری طاقت سے بہرصورت تعاون کرنا تھا۔ قلیج ارسلان نے یہ دونوں شرائط قبول کر لیں۔

اس مہم سے فارغ ہوتے ہی ابھی سکون کا سانس بھی نصیب نہ ہوا تھا کہ صلیبی ایک بار پھر میدان عمل میں کود پڑے۔ سالہا سال سے نورالدین زنگی سے نبرد آزما صلیبیوں نے شکست کا امرت نوش کرتے رہنے کے باوجود اس سے مقابلہ اور کسی ایک حتمی ضرب کی تمنا اپنے دلوں سے فراموش نہیں کی تھی۔ ان کی آنکھوں میں اپنے مقبوضہ علاقوں کی واپسی کا خواب اس طرح بسا تھا کہ کسی طور چین لینے ہی نہ دیتا۔ انہی دنوں انہیں ایک رومن سالار کی صورت میں امید کی ایک اور کرن دکھائی دینے لگی۔ رومن شہزادہ تصور کیا جانے والا وہ سالار چند یورپی صلیبیوں کے ساتھ ایشیا میں وارد ہوا تھا۔ اس کے ساتھ دنیا کے نامور تیغ زن اور گلیڈی ایٹرز بھی تھے۔ رومن سالار کا اپنے متعلق بھی یہی دعویٰ تھا کہ کوئی دنیاوی طاقت اسے اور اس کے ساتھیوں کو شکست نہیں دے سکتی۔ اسی دعوے نے صلیبیوں کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ انہوں نے اسے نورالدین زنگی کے علاقوں پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دینی شروع کر دی۔ سلطان کی مہمات اور کامیابیوں نے رومن سالار کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ نورالدین زنگی اس کے لیے ایک مافوق الفطرت شے کی حیثیت اختیار کر گیا

جاسوسی ڈائجسٹ

جنوری 2020

Download

www.pklibrary.com

تھا۔ اس کے دل میں مرعوبیت اور خوف کے جذبات اجاگر ہونے لگے تاہم اپنی ذات سے متعلق دعوؤں کا بھرم برقرار رکھنا بھی ضروری تھا۔ مکمل ذہنی منصوبہ بندی کے بعد رومن سالار نے ''حران'' پر حملہ کر کے نواحی علاقوں میں تباہی اور لوٹ مار کا آغاز کر دیا۔ اس آغاز جنگ کے بعد وہ ''سمسکین'' نامی ایک قصبے کے قریب پڑاؤ زن ہو گیا۔

مخبروں کی جانب سے اس نئے قضیے کی خبر ملتے ہی نورالدین اپنے لشکر کے ہمراہ اس نئے فتنے کو کچلنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ سلطان کے کوچ کی خبر ملتے ہی رومن سالار نے اپنا پڑاؤ اٹھایا اور سمسکین سے کچھ ہی فاصلے پر واقع ''عشترا'' میں قیام پذیر ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد وہاں سے بھی فرار ہو کر ''شلامہ'' روانہ ہو گیا۔ نورالدین زنگی کے طلایہ گرد اسے تمام صورت حال سے آگاہ کر رہے تھے۔ سلطان نے اس آنکھ مچولی سے بیزار ہو کر اپنے لشکر کے ساتھ خود عشترا قیام کیا اور ایک سالار کو چھوٹے سے لشکر کے ساتھ ''طبریہ'' روانہ کر دیا۔ اس لشکر کو ہدایات دی گئی تھیں کہ نصرانی علاقوں سے مال و متاع لوٹ کر صلیبیوں کو ایک واضح سبق دیا جائے۔ اس مال سے حران کے متاثرین کی مدد کرنے کا اعلان کیا گیا تھا۔ لشکر کے اس حصے نے طبریہ کے نواحی علاقے میں نہایت کامیاب شب خون مارا اور کثیر مالِ غنیمت کے ساتھ عشترا کا رخ کیا۔ اسی راستے میں ''مخاصد'' کے مقام پر رومن شہزادہ تصور کیا جانے والا سالار ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ غالباً وہ اپنی ذات کے متعلق کیے جانے والے دعوؤں کی صداقت کا یقین دلانا چاہتا تھا۔ نورالدین کے اس قلیل لشکر نے بھی کانٹے کا مقابلہ کیا۔ یہ جنگ متواتر چھ گھنٹے جاری رہی جو بالآخر رومن سالار کی بھیانک شکست پر منتج ہوئی۔ وہ اپنے ہتھیار میدان جنگ میں ہی چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ نورالدین اپنی سپاہ کی کامیابی پر بہت مسرور تھا۔ سلطان کی اس مسرت پر مثبت توانائی اور جذبہ محسوس کرتے لشکریوں کو اندازہ ہی نہ تھا کہ صلیبیوں کے خلاف نورالدین زنگی کی یہ آخری بنفسِ نفیس جنگ تھی۔

☆☆☆

پانچ سو انہتر ہجری کی عیدالفطر بھرپور جوش و جذبے سے منائی جا رہی تھی۔

نورالدین غرباء میں صدقہ و خیرات کے بعد نمازِ عید کی ادائیگی کے لیے روانہ ہو گیا۔ نمازِ عید کی امامت لشکریوں کے قاضی شمس الدین نے ادا کی۔ اپنے احباب سے عید ملنے کے بعد نورالدین دمشق کے میدان احضر میں چوگان کھیلنے چلا گیا۔ احباب اور عمائدین اس کے خوشگوار مزاج کی بدولت بہت آرام دہ محسوس کر رہے تھے۔ کھیل ختم ہونے کے بعد ایک امیر نے نورالدین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''سلطان معظم! آج کا یہ دن کتنا بابرکت ہے۔ پروردگار نے رمضان المبارک کے بعد عیدالفطر کو اپنی مخلوق کے لیے حقیقی خوشی بنایا ہے۔ آج ہم سب یہاں اس میدان میں جمع ہیں۔ اللہ جانے آئندہ برس ہم میں سے کون یہاں ہوگا اور کون نہیں؟''

''میرے عزیز! زندگی بہت بے ثبات ہے۔ اس کی حقیقت پانی کے بلبلے سے زیادہ نہیں۔ ایک برس تو بہت طویل عرصہ ہے۔ ہم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ اگلے ماہ یہاں ملاقات کر پائیں گے کہ نہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے دو خوشیاں بہت انمول بنائی ہے۔ ایک جو تم نے بیان کی اور دوسری اپنے رب سے ملاقات کے وقت۔'' وہ مسکرایا۔

''پروردگار آپ کا سایہ ہمارے سروں پر ہمیشہ سلامت رکھے سلطان محترم! آپ کی زندگی ہمارے لیے بہت قیمتی ہے۔'' دوسرے امیر نے خلوص سے کہا۔

''موت کا ایک وقت متعین ہے۔ اس وقت سے زیادہ ایک پل کی مہلت بھی نہیں مل سکتی۔'' اس نے سادگی سے کہا۔ وہ انہیں بتانے سے قاصر تھا کہ اسے کچھ نادیدہ آہٹیں اپنی جانب بڑھتی محسوس ہونے لگی ہیں۔ چند دن بعد اسے اپنے حلق میں معمولی تکلیف کا احساس ہونا شروع ہوا۔ اگلے کچھ ہی روز میں یہ درد اس قدر بڑھا کہ خناق کی شکل اختیار کر گیا۔ شاہی طبیب مکمل مستعدی سے اس کا علاج کرنے لگے لیکن کوئی بھی افاقہ ہو کے ہی نہ دے رہا تھا۔

نورالدین کی علالت کی خبر صلیبیوں میں مسرت اور جوش کی ایک لہر دوڑا گئی۔ انہوں نے چند ہی روز میں ایک بڑی دل لشکر تیار کیا اور مصر پر قبضے کا دیرینہ خواب آنکھوں میں سجائے منزلیں مارنے لگے۔ بستر علالت پر موجود نورالدین نے ایک لشکر تیار کروا کے مجدالدین کو سونپ دیا۔ تمام بڑے سالار اس کی کمانداری میں جنگ لڑنے کے پابند تھے۔

نورالدین کی ہدایات کے مطابق انہیں صلیبیوں کو مصر میں داخلے سے قبل ہی دبوچ لینا تھا۔ سلطان کی حالت کے پیشِ نظر اس لشکر نے ایسی برق رفتاری سے سفر کیا کہ مصر کی حدود سے پہلے ہی وسیع میدانوں میں صلیبیوں کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑے ہو گئے۔ مجدالدین

کی شعلہ بیانی اور ساحرانہ قیادت نے لشکریوں کے تن میں نئی روح پھونک رکھی تھی۔ وہ اپنے محبوب سلطان کی نظروں میں سرخرو ہونے کے لیے بے جگری سے لڑتے اور دشمن کو گاجر مولی کی طرح کاٹتے رہے۔ دوسری جانب اپنے لشکر کی بہادری اور مجدد الدین کی صلاحیتوں کے متعلق پُر اعتماد ''الملک العادل نورالدین ابوالقاسم محمد ابن عماد الدین زنگی'' کی تکلیف حد سے سوا ہو چکی تھی۔ اپنی آخری منزل کی طرف روانگی سے قبل اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی۔

''پروردگار دو عالم! میں تیرا عاجز اور گناہ گار بندہ ہوں۔ تو نے ہی عمر بھر میرے ہر ارادے کو اپنی رضا سونپ کر میری لاج رکھی۔ تیری ہی مہربانی و کرم سے میں صلیبیوں کو ارضِ شام سے نکالنے میں کامیاب ہوا۔ بس ایک آرزو باقی رہی کہ قبلۂ اول بیت المقدس کو نصرانی قبضے سے آزاد کروالیتا۔ میرے معبود! اس خواہش کی تکمیل کا کوئی وسیلہ بنا دینا۔ کسی مردِ مجاہد کو یہ سعادت بخشنا کہ وہ یہ مقدس فریضہ سرانجام دے کر روزِ آخرت تیری بارگاہ اور نبی کریم ﷺ کی شفاعت کے لیے سرخرو ہو جائے۔'' وہ گڑگڑا کر دعائیں مانگتا موت کی رتھ پر سوار عدم روانہ ہو گیا۔ کچھ روایات میں بوقتِ وفات اس کی عمر چھپن سال جبکہ چند دیگر حوالوں میں اٹھاون سال بتائی گئی ہے۔ مدتِ حکومت کے حوالے سے اٹھائیس سال کا تذکرہ ملتا ہے۔

نورالدین زنگی کی وفات پر دمشق میں قیامت کا سماں تھا۔ عوام و خواص اپنے محبوب سلطان کی دائمی جدائی پر غم سے نڈھال تھے۔ خلیفہ بغداد اور مصر میں موجود صلاح الدین اپنے اشکوں پر قابو نہ پا سکے۔ نورالدین زنگی کی میت کو دمشق کے علماء اور صالحین نے غسل دینے کے بعد کفن پہنایا۔ عوام کی کثیر تعداد میدان اخضر میں نماز جنازہ پڑھانے کے لیے جمع تھی۔ غائبانہ نماز جنازہ کا تو کوئی شمار ہی نہ تھا۔ میت کو نورالدین ہی کی نگرانی میں تیار کردہ مدرسہ نوریہ لا کر ابدی گھر میں پہنچا دیا گیا۔

☆☆☆

مجدد الدین کو سلطان کی موت کی خبر دمشق واپسی کے دوران ایک نامہ کے ذریعے ملی۔ مجدد کے ساتھ ہر ایک سالار اور لشکری کی آنکھیں شدتِ غم سے اشکبار ہو گئیں۔ وہ نہایت بوجھل دل اور تڑپتی روح کے ساتھ دمشق واپس آیا اور سلطان کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے چلا گیا۔ شیرکوہ کے بعد نورالدین کی رحلت ملتِ اسلامیہ کے لیے ایک بہت بڑا دھچکا تھی۔ وہ اس کی قبر کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھا بے آواز آنسو بہاتا رہا اور بھاری قدموں سے گھر لوٹ گیا۔

''امیر! اتنی دیر کہاں لگا دی آپ نے؟'' مرسینہ کا دل بھی اس کی حالت دیکھ کر کٹ گیا۔

''سلطان سے ملاقات کے لیے چلا گیا تھا۔'' اس کا لہجہ نم تھا۔

''پروردگار ان کے درجات بلند فرمائے اور ''الصالح اسماعیل الملک'' کو ان کی جانشینی کا حق ادا کرنے کی سعادت نصیب فرمائے۔'' مرسینہ نے خلوصِ دل سے دعا کی۔

''آمین! ملتِ اسلامیہ بہت بڑے بحران میں مبتلا دکھائی دینے لگی ہے۔ مصر میں تو صلاح الدین سب حالات سنبھالے ہی رکھے گا۔ اس کے علاوہ انتشار و خود غرضی کے اس دور میں مجھے کوئی ایسی راہ نظر نہیں آ رہی، کوئی ایسا شخص دکھائی نہیں دے رہا جو چٹان بن کر صلیبیوں کے سامنے کھڑا ہو جائے۔'' مجدد الدین مضطرب تھا۔

''مایوس کیوں ہوتے ہیں امیر؟ ہم اپنی آئندہ نسل کی تربیت ہی ایسی کریں گے کہ ہر مسلم گھر میں ایک سلطان نورالدین زنگی جیسے اوصاف کا حامل سپوت پیدا ہو۔'' اس کی افسردہ مسکراہٹ میں پوشیدہ اشارہ بھانپتے ہی مجدد چونک گیا۔

''جی ہاں امیر! پروردگار نے آپ کو اپنی نسل بڑھانے کی سعادت بخشی ہے۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ ہم اپنی اولاد کو سلطان کا پرتو بنائیں گے۔ نورالدین زنگی کسی ایک فردِ واحد کا نام نہیں بلکہ کردار اور سوچ کی انتہا کا نام ہے۔ وہ ایک مسیحا تھے۔ ان کی مسیحائی اور پاکیزہ عمل کی انتہا ہم پروان چڑھائیں گے۔'' اس نے ایک عزم سے کہا۔

''آمین..... ثم آمین..... پروردگار ہمیں اس مقصد میں کامیابی عطا فرمائے۔'' مجدد کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے۔

''آمین، یارب العالمین!'' مرسینہ نے مضبوطی سے اس کا تھام لیا۔

(ختم شد)

بختیار حمید نے ہارون ریاض کو فون کر کے کچھ دیر کے لیے اپنے گھر بلایا تھا۔ اس نے ہارون سے کہا تھا کہ کچھ اہم کاروباری گفتگو کرنی ہے۔ اسے یقین تھا کہ یہ سن کر ہارون اس کے ہاں آنے میں تاخیر نہیں کرے گا۔ بختیار فون بند کر چکا تھا لیکن فون ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ پُرخیال انداز میں اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اس کی نظریں فون پر، لیکن ذہن کہیں اور تھا۔ اس کے وجود میں ہلکا سا ہیجان کروٹیں لے رہا تھا۔ شاید اس ہیجان کی وجہ سے ہی وہ فی الحال اپنے سینے کی تکلیف کو بھول گیا تھا، حالانکہ اسے سانس اب بھی کافی وقت سے آ رہا تھا۔

وہ کوئی دراز قد یا جسیم آدمی نہیں تھا۔ میانہ قامت تھا اور خوش حالی آنے کے بعد بھی موٹا نہیں ہوا تھا۔ اب تو بیماری نے اسے بالکل ہی کھوکھلا کر دیا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر کسی کے لیے بھی اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ کوئی چیز اندر ہی اندر اسے کھا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اور رخسار اندر کو دھنس گئے تھے۔ اس کے سراپا پر نظر ڈالنے والوں کو شاید پہلا خیال یہی آتا ہوگا کہ اس شخص کو موت کی آہٹ سنائی دے رہی ہے۔ اس نے فون پر ہارون سے بات کرتے وقت اپنی سانسوں کی خرخراہٹ پر قابو پانے کی پوری کوشش کی تھی اور انتہائی اختصار سے بات کی تھی۔

موت کی آہٹ سننے والے ایک سچے عاشق کے آخری سنسنی خیز لمحات

ازدواجی زندگی میں کامیابی یا ناکامی کے لیے جہاں دولت، آسائش اور دیگر خوبیاں اہم کردار ادا کرتی ہیں وہاں شخصیت کی خوب صورتی یا بدصورتی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ بے شک وہ دل سے اپنی شریکِ حیات کو چاہتا تھا مگر... اس کی حیات میں شریک ہونے کے باوجود ایک فاصلہ بہرحال قائم تھا کیونکہ... اس کی آستین میں ایک ایسا سانپ چھپ کر بیٹھا تھا جو دوستی کے نام پر مسلسل اسے ڈس رہا تھا اور ایک دن... اس کی گہری نگاہوں نے معاملے کی سنگینی کو بھانپ لیا۔

گہری نگاہ

نجمہ مودی

وہ بہترین علاج معالجے کے باوجود چند مہینوں میں ہی اس حال کو پہنچ گیا تھا۔ راتوں کو اسے نیند نہیں آتی تھی اور کھانسی پر قابو رکھنے کے سلسلے میں بہترین دوائیں بھی جلد ہی بے اثر ہوجاتی تھیں۔ کافی دنوں سے اس نے بیوی بچوں سے الگ، دوسرے بیڈروم میں سونا شروع کردیا تھا تاکہ ان کے آرام میں خلل نہ پڑے۔ وہ خود تو کم ہی سوتا تھا اور وہ بھی دواؤں کی مدد سے..... بیماری اور نیند کی کمی سے وہ دن میں بھی بے حد مضمحل رہتا۔ اکثر اسے یوں لگتا جیسے اس کے سر میں دماغ کی جگہ کوئی وزنی سا پتھر رکھا ہوا ہے۔ درد کے باعث اس کی کنپٹیوں کی نسیں پھڑکتی رہتیں۔ اسے یوں لگتا جیسے وہ چند مہینوں سے نہیں بلکہ سالہا سال سے بیمار چلا آرہا ہے۔ اپنی صحت مندی کا زمانہ تو اب اسے ایک دھندلے خواب کی طرح یاد آتا تھا۔

اس کے وسیع بنگلے میں اس وقت موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس کی بیوی ماہرہ اپنے دونوں بچوں کو ساتھ لے کر میکے گئی ہوئی تھی۔ ملازموں کو اس نے خود چھٹی دے دی تھی۔ ماہرہ کو بھی میکے جانے کے لیے اس نے خود ہی تحریک دی تھی۔ ویک اینڈ کے ساتھ اسکول میں ایک چھٹی اور آگئی تھی۔ بچے تین دن نانی کے ہاں گزارنے کے تصور سے ہی خوشی سے اچھلنے لگے تھے۔ وہاں انہیں ماموؤں کے بچوں کے ساتھ خوب کھیل کود کا موقع ملتا تھا۔ ان کی عمروں میں زیادہ فرق نہیں تھا۔

اسے اندازہ تھا کہ ماہرہ جاتے وقت ہچکچاہٹ کا شکار تھی۔ جاتے جاتے بھی وہ یہیں، ڈرائنگ روم میں رک گئی تھی۔ ڈوبتے سورج کی کندنی شعاعیں کھڑکی کے راستے اس کے حسین چہرے پر پڑ رہی تھیں اور اس کی خوبصورتی میں اضافہ کررہی تھیں۔ آٹھ اور دس سال کے دو بچوں کی ماں ہونے کے باوجود وہ اب بھی گلاب کی طرح شگفتہ اور تازہ دم دکھائی دیتی تھی۔ بختیار کو خود بھی احساس تھا کہ ماہرہ کی جوڑی اس کے ساتھ پہلے بھی کچھ زیادہ نہیں جچتی تھی لیکن پچھلے چند مہینوں میں تو بیماری نے جس طرح بختیار کو نچوڑ کر رکھ دیا تھا، اس کے بعد تو ان کی شخصیتوں کے درمیان تضاد حد سے بڑھ گیا تھا۔

''مجھے پتا ہے، میرے جاتے ہی تم ایک بار پھر اپنے آپ کو کاروباری مسائل میں الجھالو گے.....'' ماہرہ نے ڈرائنگ روم میں رک کر کہا تھا۔ ''میں کہتی ہوں، تمہیں اب کاروبار میں سر کھپانے کی ضرورت کیا ہے؟ خدا نے ہمیں جتنا دے دیا ہے، آرام سے باقی زندگی گزارنے کے لیے کافی ہے۔ اب تمہیں صرف اور صرف آرام کرنا چاہیے۔ تم بیمار ہو۔''

''میں اب ایسا بھی بیمار نہیں ہوں کہ ریٹائرمنٹ کی زندگی گزارنے لگوں۔'' بختیار نے اپنے لہجے میں اور چہرے پر حتی الامکان بشاشت لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''یہ بس ایک قسم کی الرجی ہے۔ پچھلے ہفتے لندن سے آتے وقت ڈاکٹر نے جو دوائیں دی ہیں، ان سے مجھے کافی افاقہ محسوس ہورہا ہے۔ اس سے اب میرا مستقل رابطہ رہے گا اور امید ہے کہ اس کے علاج سے میں ٹھیک ہوجاؤں گا۔''

ماہرہ کچھ اس طرح مسکرادی جیسے اسے اندازہ ہو کہ بختیار اسے بہلانے کی کوشش کررہا ہے مگر وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ''خدا کرے ایسا ہی ہو۔ اب اگر کوئی اچھا ڈاکٹر مل ہی گیا ہے تو اسے اپنا علاج کرنے دینا۔ خود ڈاکٹر بننے کی کوشش نہ کرنا۔ ٹھیک ہے، تم ایک بہت اچھے، بہت قابل فارماسسٹ ہو، لیکن ڈاکٹر بہرحال نہیں ہو۔''

''میں نے تو کبھی خود کو ڈاکٹر سمجھا ہی نہیں..... اور نہ ہی کبھی خود اپنا علاج کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں تو صرف اپنے مرض کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔'' بختیار نے دھیمے لہجے میں کہا۔ اب اسے دھیمے لہجے میں بات کرنے کے لیے بھی خاصی طاقت صرف کرنا پڑتی تھی۔ اس نے اپنا بیڈروم بھی ماہرہ سے صرف اس لیے الگ نہیں کیا تھا کہ وہ اس کے آرام میں خلل نہیں ڈالنا چاہتا تھا بلکہ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اب اسے کھانسی کے ساتھ کافی مقدار میں خون بھی آنے لگا تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ ماہرہ کو اس بات کا پتا چلے۔ ابھی تک تو وہ اس بات کو راز رکھنے میں کامیاب رہا تھا۔ اسپتال میں وہ اس لیے داخل نہیں ہوتا تھا کہ اسے معلوم تھا، اس کی جو حالت گھر پر علاج کے دوران ہے، وہی اسپتال میں بھی رہے گی۔

''میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ جوانی میں تم نے لیبارٹریوں میں نہ جانے کن کن کیمیکلز کے درمیان، نہ جانے کیسے کیسے تجربات کرتے ہوئے جو وقت گزارا ہے، اس کے اثرات اب جاکر ظاہر ہوئے ہیں۔'' ماہرہ نے اپنی دانست میں ایک بار پھر بڑی سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہی بات کی جو وہ اس سے پہلے بھی کئی بار کرچکی تھی۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے.....'' بختیار نے ایک بار پھر نہایت تحمل سے اس کی بات کی تردید کی۔ ''میرے بہت سے ٹیسٹ ہوچکے ہیں۔ ایسی کسی چیز کا سراغ نہیں ملا۔ فارما سیوٹیکل لیبارٹریوں میں کام نہایت محفوظ طریقوں سے ہوتا

ہے۔ تمام احتیاطی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ لاکھوں لوگ وہاں کام کرتے ہیں۔''

وہ ماہرہ کو نہیں بتا سکتا تھا کہ اصل وجہ وہ مان چکا تھا۔ ماہرہ قدرے بے چارگی آمیز سے انداز میں سر ہلا کر رہ گئی جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ کیسے بختیار کو اپنی بات سے قائل کرے۔ پھر اس نے گفتگو کا زاویہ بدلا۔ ''میں تو کہتی ہوں تم خوامخواہ ہی انگلینڈ سے اتنی جلدی واپس آ گئے۔ کچھ عرصہ اور وہیں رہتے۔ صحت افزا مقامات پر گھومتے پھرتے، آرام کرتے تو میرا خیال ہے تم دواؤں اور علاج کے بغیر ہی ٹھیک ہو جاتے۔ ہارون کہہ رہا تھا کہ وہ تمہارے پیچھے کمپنی کا سب کام سنبھال لیتا۔ بزنس پر کوئی اثر نہیں پڑنا تھا۔ اب تو اسے بھی فارماسیوٹیکل کمپنی چلانے کی اتنی ہی سمجھ بوجھ ہے جتنی تمہیں ہے۔ دوا ساز کمپنی اور دواؤں کا بزنس اب اس کے لیے بھی نیا تو نہیں ہے۔''

''وہ تو مجھے بھی معلوم ہے۔'' بختیار نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا۔ ''وہ میری طرح فارماسسٹ، کیمسٹ یا دوا ساز تو نہیں ہے لیکن بزنس مین مجھ سے کہیں زیادہ اچھا ہے۔ کمپنی جو اتنی پھلی پھولی ہے، اس کا زیادہ کریڈٹ اسی کو جاتا ہے۔ وہ موقع سے فائدہ اٹھانا اور فائدے کے سودے کرنا بہت اچھی طرح جانتا ہے۔ اس کی یہی خوبیاں دیکھ کر تو میں نے اسے پارٹنر بنایا تھا۔ وہ پہلے اپنے کنسٹرکشن کے کاروبار میں بھی کامیاب تھا۔ میرا پارٹنر بنا تو دوا سازی میں میری قابلیت اور تجربے کے ساتھ ساتھ اس کے سرمائے، بھاگ دوڑ اور مشوروں نے ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ مجھے معلوم ہے کہ اب وہ اکیلا بھی کمپنی کو بہت اچھی طرح چلا سکتا ہے۔ میں سارا کام اس پر چھوڑ کر مزید کچھ عرصہ انگلینڈ میں رہ سکتا تھا لیکن میں اس لیے آ گیا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جو کچھ وہاں ہو سکتا تھا، وہ یہاں بھی ہو سکتا ہے۔''

''چلو خیر..... جیسے تمہاری مرضی.....'' ماہرہ نے گویا بات ختم کر دی۔ ''لیکن اگلی مرتبہ بچوں کی گرمیوں کی چھٹیاں ہوں گی تو میں خود تمہیں اپنے ساتھ انگلینڈ، امریکا یا سوئٹزرلینڈ لے کر چلوں گی۔ ہم ماضی کی یادیں تازہ کریں گے۔''

''ہاں..... ٹھیک ہے۔'' بختیار نے کچھ اور آہستگی سے کہا۔ اتنی دیر کی گفتگو میں اس کے اندر گرمجوشی ظاہر کرنے کی سکت بھی نہیں رہی تھی۔ ''اتنے عرصے میں، میں یہاں ایک بہت ضروری کام نمٹا لوں گا۔ میرا ذہن ہلکا ہو جائے گا اور میں ذرا بہتر طریقے سے تمہارے ساتھ چھٹیاں انجوائے کر سکوں گا۔''

ماہرہ نے جھک کر گرمجوشی سے اس کا ہاتھ دبایا۔ بختیار کو بہت اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ گرمجوشی مصنوعی تھی لیکن اس نے حتی الامکان خوش دلی سے مسکرانے کی کوشش کی۔ بچے پہلے ہی بختیار سے مل کر، باہر جا کے گاڑی میں بیٹھ چکے تھے اور کئی بار ہارن بجا چکے تھے یا پھر شاید ان کی فرمائش پر ڈرائیور ہارن بجا رہا تھا۔

ماہرہ ہارن کی آواز کی طرف توجہ دیے بغیر ڈرائنگ روم کے ایک حصے پر نظر ڈالتے ہوئے بولی۔ ''میرا خیال ہے، میرے جاتے ہی تم پھر کوئی دفتری کام لے کر بیٹھ جاؤ گے۔''

''ہاں، مجھے ایک ضروری کام نمٹانا تو ہے..... لیکن تم بے فکر رہو، زیادہ دیر کا کام نہیں ہے۔'' بختیار نے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کی۔

''کام سے فارغ ہوتے ہی مجھے فون کرنا۔ امید ہے اس وقت تک میں امی کے گھر پہنچ چکی ہوں گی۔'' ماہرہ نے اس کا گال تھپتھپایا اور دروازے کی طرف چل دی۔ جاتے جاتے بھی اس نے ایک بار پھر کشادہ ڈرائنگ روم کے اس حصے پر نظر ڈالی جسے بختیار نے چھوٹے سے آفس کی شکل دے رکھی تھی۔ اس وقت بھی اس کی میز پر کمپیوٹر اور چھوٹے سے پرنٹر وغیرہ کے قریب بہت سی فائلیں رکھی تھیں۔ ضرورت پڑنے پر وہ گھر پر بھی آفس کا کام کرتا تھا، حالانکہ اسے معلوم تھا، یہ بات ماہرہ کو پسند نہیں تھی۔

ماہرہ کے جانے کے بعد بختیار نے اپنا موبائل فون شیشے کی خوبصورت تپائی پر رکھ دیا۔ جب اس نے باہر گاڑی کے رخصت ہونے کی آواز سن لی تو اس نے تپائی کے نچلے حصے میں ہاتھ ڈال کر اخبار کے نیچے چھپی ہوئی ایک چیز ٹشو پیپر سے پکڑ کر تپائی کے اوپر رکھ لی۔ وہ ایک چمکتا ہوا نہایت شاندار خنجر تھا۔ اس کی ساخت کچھ پرانی سی لگ رہی تھی لیکن اپنی چمک دمک کے اعتبار سے وہ بالکل نیا لگ رہا تھا۔ یہ خنجر بختیار حمید کا نہیں، بلکہ اس کے پارٹنر ہارون کا تھا۔ کافی عرصہ پہلے وہ سیر و تفریح کے لیے شمالی علاقہ جات گیا تھا تو نوادر کی کسی دکان سے یہ خنجر خرید کر لایا تھا۔ دکاندار نے اسے بتایا تھا کہ کسی زمانے میں اس علاقے کے حوالے بھیڑ بکریاں ذبح کرنے کے لیے ایسا خنجر استعمال کرتے تھے۔ ہارون کے ڈرائنگ روم میں کافی نوادر سجے ہوئے تھے۔ اس نے یہ خنجر بھی لا کر ان کے درمیان سجا دیا تھا۔ وہاں سے یہ خنجر بختیار لے آیا تھا۔ وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ اس

کی دھار اب بھی ریزر بلیڈ کی طرح تیز تھی۔ ہارون جو نوادر جمع کرتا تھا، وہ کسی حد تک عجیب ہی ہوتے تھے۔

ہارون اور بختیار دونوں اپنی شناسائی کے آغاز سے ہی تھوڑا بہت پینے پلانے کا شغل بھی کرتے آئے تھے جو اب تک جاری تھا تاہم دونوں نے اس پر قابو رکھا تھا اور پینے پلانے کے معاملے میں خود کو بے لگام نہیں ہونے دیا تھا۔ گو کہ ڈاکٹروں نے بختیار کو اب پانی کے سوا ہر قسم کی ڈرنک سے سختی سے منع کیا تھا لیکن بختیار کی جانب سے رازدارانہ طور پر اب بھی اس ہدایت کی خلاف ورزی جاری تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اب وہ اس کی ضرورت پہلے سے بھی زیادہ محسوس کرنے لگا تھا۔ دوسرے اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اب یہ عادت ترک کرنے کا بھی اسے کوئی فائدہ نہیں تھا۔

اس نے ڈرائنگ روم میں ہی ایک خفیہ کیبنٹ میں چند بوتلیں رکھنے کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ ایک کونے میں چھوٹا سا فریج بھی موجود تھا۔ ہارون جب اس سے ملنے آتا تھا تو بعض اوقات ماہرہ کو پتا بھی نہیں ہوتا تھا کہ ان کے درمیان کاروباری گفتگو یا دوستانہ گپ شپ کے ساتھ ساتھ شغل بھی چل رہا ہے۔ اسے ان کے اس شغل کا علم ضرور تھا لیکن اس نے کبھی اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ ایک تو یہ ان کے طبقے میں کوئی انہونی یا انوکھی بات نہیں تھی۔ دوسرے شاید اس لیے بھی اس نے کبھی اسے کوئی اہمیت نہیں دی تھی کہ پینے پلانے کے بعد دونوں میں سے کسی نے کبھی کوئی الٹی سیدھی حرکت نہیں کی تھی۔

ایک بات البتہ بختیار نے محسوس کی تھی کہ ان کے اس شغل کے دوران اگر ماہرہ ڈرائنگ روم میں آجاتی تھی تو ہارون اس کے ساتھ معمول سے کچھ زیادہ بے تکلفی سے بات کرتا تھا اور ماہرہ کے اِدھر اُدھر چلنے پھرنے اور اٹھنے بیٹھنے کے دوران اس کی نظریں ماہرہ کا زیادہ تعاقب کرتی تھیں۔ بختیار کو اب ٹھیک طرح یاد نہیں تھا کہ ہارون کو یہ عادت شروع سے ہی تھی یا گزشتہ چند سالوں کے دوران پیدا ہوئی تھی۔ تاہم اسے خود اپنے بارے میں یہ احساس ضرور تھا کہ اس نے پچھلے چند ماہ کے دوران ہارون کی اس عادت کو خاص طور پر نوٹ کرنا شروع کیا تھا۔

پچھلے چند ماہ سے ہی اسے یہ بات بھی خاص طور پر، رہ رہ کر یاد آنے لگی تھی کہ ہارون نے اب تک شادی نہیں کی تھی، حالانکہ وہ ادھیڑ عمری کی حدود میں قدم رکھ رہا تھا۔ بختیار اس کی وجہ بھی بہت پہلے پوچھ چکا تھا۔ ہارون نے یہی بتایا تھا کہ نوجوانی میں اسے کسی سے بہت زبردست قسم کا ''سچا عشق'' ہوا تھا۔ اس وقت اس کے مالی حالات بھی اچھے نہیں تھے۔ کچھ دوسرے عوامل بھی تھے۔ ''ظالم سماج'' بھی بیچ میں آگیا تھا۔ عشق ناکام ہو گیا تھا۔ اس لڑکی سے ہارون کی شادی نہیں ہو سکی تھی..... اور اس کے بعد اس کا بھی شادی کرنے کو دل ہی نہیں چاہا تھا۔

گو کہ بختیار کی معلومات کے مطابق اب بھی دو تین خواتین سے ہارون کے کافی قریبی تعلقات تھے لیکن اس نے نہایت سادہ دلی سے ہارون کی اس بات کو سچ مان لیا تھا کہ عشق میں ناکامی کے بعد اس کا کسی سے بھی شادی کو جی نہیں چاہا تھا۔ تاہم اب چند ماہ سے اس سلسلے میں بختیار کی رائے بدل چکی تھی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ پچھلے چند ماہ کے دوران بختیار کے دل و دماغ کی دنیا میں بہت بڑا انقلاب آگیا تھا۔ اس کی سوچ، اس کے محسوسات، سب کچھ بدل گئے تھے۔

بختیار کو معلوم تھا کہ ہارون اب پہنچنے ہی والا ہوگا۔ ہارون بھی اسی کی طرح ڈیفنس میں، مگر چند منٹ کی ڈرائیو پر دوسرے فیز میں رہتا تھا۔ بختیار نے اپنے ساتھ ساتھ اس کے لیے بھی اسکاچ کا پیگ تیار کر لیا اور دونوں گلاس لا کر میز پر رکھ لیے۔ پینے کے معاملے میں ان کی پسند ایک ہی تھی۔ پھر اسے خیال آیا کہ ان کی پسند تو اکثر چیزوں کے معاملے میں ایک ہی تھی، بلکہ اب تو شاید عورت کے معاملے میں بھی ان کی پسند ایک ہی ہو گئی تھی۔ ویسے ظاہری طور پر بختیار اور ہارون کی شخصیت ایک دوسرے سے کافی مختلف تھی۔

بختیار اوسط سی شکل صورت کا میانہ قامت آدمی تھا اور اب جبکہ صرف چند ماہ کی بیماری نے اسے نچوڑ کر رکھ دیا تھا، تو وہ بالکل ہی گیا گزرا سا ہو گیا تھا۔ اس کے اچھے لباس اور اچھی گاڑی کی وجہ سے شاید لوگ اس کی طرف ذرا توجہ سے دیکھ لیتے ہوں ورنہ اس کی شخصیت میں اب اپنی طرف توجہ مبذول کرانے والی کوئی چیز نہیں رہی تھی۔

اس کے مقابلے میں ہارون کو کافی ہینڈسم کہا جا سکتا تھا۔ وہ گورا چٹا، دراز قد اور ورزشی جسم کا مالک تھا تاہم اب بڑھتی عمر کی وجہ سے اس میں کچھ بھدا پن آنے لگا تھا۔ کسی قسم کی جسمانی مشقت یا ورزش کا اب اس کی زندگی میں شاید کوئی دخل نہیں رہا تھا۔ پیٹ کچھ نمایاں اور جسم پر فاضل چربی کی موجودگی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ حرکات و سکنات میں پہلے جیسی مستعدی نظر نہیں آتی تھی۔ پُرتعیش زندگی نے اس کے سراپا پر اپنے نقوش ثبت کرنا شروع کر دیے تھے۔

بختیار ڈرنکس کے گلاس میز پر رکھنے کے بعد دوبارہ

صوفے پر بیٹھا تو اس کے سینے میں درد کی خاصی تیز لہر اٹھی لیکن اس نے اپنے آپ کو کراہنے سے باز رکھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں اپنے بارے میں وسوسہ پیدا ہوا کہ اس نے جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا، وہ اسے کر بھی پائے گا یا نہیں؟ وہ بے حد کمزوری محسوس کر رہا تھا لیکن پھر اس نے خود کو یاد دلایا کہ اس کی شخصیت بے شک عام سی سہی لیکن لڑکپن سے وہ غیر معمولی عزم کا مالک تھا، جس کام کا تہیہ کر لیتا تھا، اسے پایۂ تکمیل کو پہنچا کر چھوڑتا تھا پھر اسے یہ بھی امید تھی کہ دو تین ڈرنکس کے بعد اس میں مصنوعی اور عارضی طور پر ہی سہی، لیکن بہرحال ایک قسم کی مضبوطی اور بے خوفی آجائے گی۔

باہر کوئی گاڑی رکنے کی آواز آئی پھر چند لمحے بعد کال بیل بجی۔ بختیار نے بٹن دبا کر گیٹ کا الیکٹرانک لاک کھول دیا۔ اس نے ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے شیشے سے دیکھ بھی لیا کہ آنے والا ہارون ہی تھا۔ گیٹ بند کر کے وہ لان کے پاس سے گزر کر اندر آرہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد وہ اندر آکر دور سے ہی مختصراً سلام دعا کر کے ایک آرام دہ صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے وہ اپنے ہی گھر میں آیا ہو۔

'کہیں واقعی اس نے ابھی سے اس گھر کو اپنا گھر سمجھنا تو شروع نہیں کر دیا؟' بختیار سوچے بغیر نہ رہ سکا۔

''ڈرنکس کہاں ہیں؟'' ہارون نے گہری سانس لے کر کہا۔

''تم نے تو کہا تھا، میرے آنے تک ڈرنکس تیار رکھو گے۔''

''میں نے جو کہا تھا، وہ میں کر چکا ہوں۔'' بختیار نے مسکرانے کی کوشش کی اور اپنی آفس ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔ ہارون اپنی جگہ سے اٹھا اور چند قدم چل کر گلاس اٹھا لایا۔ اپنی چال اور قد کاٹھ کی وجہ سے وہ دور سے پہچانا جاتا تھا۔ ایک گلاس بختیار کو تھما کر اپنا گلاس بلند کرتے ہوئے اس نے ''چیئرز'' کہا اور اپنی جگہ پر واپس جا بیٹھا۔

بختیار نے معمول سے کہیں بڑا گھونٹ لیا۔ وہ چاہتا تھا، اسکاچ جلدی اس کے دماغ کو چڑھ جائے۔ اسے بے خوفی اور مصنوعی خود اعتمادی کی ضرورت تھی۔ ہارون بغور اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں بختیار کو اس کی نظریں کچھ ایسی لگیں جیسی نظروں سے شکاری اپنے شکار کی طرف دیکھتے ہیں۔

''آج تم نے کیوں فون کر کے مجھے بلا لیا؟ آج تو ہمارا ملنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا؟'' ہارون نے ایک گھونٹ بھرنے کے بعد سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

''کئی باتیں یاد آگئی تھیں۔ آج گھر پر تنہائی میسر تھی، ماہرہ میکے گئی ہے، میں نے سوچا، سکون سے بیٹھ کر بات کر لیں گے۔'' اس نے تپائی پر پڑا وہ بڑا سا ٹشو پیپر ہٹا دیا جس کے نیچے ہارون کا خنجر چھپا ہوا تھا۔ ''ایک تو تمہیں اس خنجر کے بارے میں بتانا تھا۔ یہ میں تمہارے گھر سے، یوں سمجھو، مستعار لے آیا تھا۔''

''ارے.....!'' ہارون کی آنکھیں کچھ پھیل گئیں: ''تم نے مجھے بتایا ہی نہیں..... اور نہ ہی مجھ سے پوچھا۔ تمہیں اس کی کیا ضرورت پڑ گئی؟''

بختیار نے اس کا سوال گویا ان سنا کر دیا۔ ''مجھے تم کو بتانا یاد ہی نہیں رہا۔ تم اس وقت اپنے گھر کے گیٹ پر کسی سے بات کرنے گئے ہوئے تھے۔ جب تک تم واپس آئے، میں بھول ہی گیا کہ میں نے اسے اٹھا کر اپنے بریف کیس میں رکھ لیا ہے۔ تمہیں پتا ہے، آج کل میں کچھ غائب دماغ سا ہو گیا ہوں۔''

ہارون نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ ''اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ تمہاری صحت بہت خراب ہو چکی ہے۔ تم بتا رہے تھے کہ تم اب کسی اور ڈاکٹر سے ملے ہو جو بہت قابل ہے۔ اس نے کیا بتایا؟ تمہیں مجھ سے تو کچھ نہیں چھپانا چاہیے۔ ماہرہ کو پریشانی سے بچانے کے لیے پوری بات نہیں بتاتے، یہ تو اچھا ہے لیکن میں تمہارا پارٹنر ہوں۔ مجھ سے تمہیں کچھ نہیں چھپانا چاہیے۔ میرا تمہاری صحت کے بارے میں پوری طرح آگاہ رہنا بہت ضروری ہے۔''

بختیار کے ذہن میں ماضی کے ماہ و سال کی فلم کچھ زیادہ ہی تیزی سے گزر گئی۔ ان کی دوستی کو تقریباً بیس سال اور کاروباری پارٹنر شپ کو اٹھارہ سال گزر چکے تھے۔ پارٹنر شپ میں دونوں کی دواساز کمپنی بہت اچھی چلی تھی۔ دونوں کافی خوشحال ہو گئے تھے۔

''تمہیں میری صحت کی وجہ سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' بختیار نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''مجھے معلوم ہے اب تم میرے بعد بھی بزنس بہت اچھی طرح چلا لو گے۔ اب تو تمہیں ڈگری کے بغیر ہی فارمیسی کا بھی بہت علم اور تجربہ ہے۔ ہمارے پاس بہترین اسٹاف اور ورکرز بھی موجود ہیں۔''

''اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ تم لمبی چھٹی لے کر کسی صحت افزا مقام پر چلے جاؤ اور جتنا عرصہ تمہارا جی چاہے، وہاں رہو.....'' اس نے ایک اور بڑا سا گھونٹ بھرا۔ ''لیکن سچی بات یہ ہے کہ ابھی تک ٹھیک طرح سے میری سمجھ میں نہیں آیا ہے کہ تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔ تمہاری بیماری کی نوعیت کیا ہے؟ تم نے ٹھیک طرح سے کبھی مجھے سمجھانے کی

کوشش ہی نہیں کی۔ البتہ تم نے اتنا ضرور بتایا ہے کہ یہ نہ تو ٹی بی ہے اور نہ کینسر۔''

''دراصل میں نے تمہیں اصل بات ہی بتانے کے لیے یہاں آنے کی زحمت دی ہے۔'' بختیار نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ہارون منتظر انداز میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''میرے پھیپھڑوں میں بیریلیم نامی زہر چلا گیا ہے۔'' بختیار نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

''کیا.....؟'' ہارون ایک جھٹکے سے یوں یکدم سنبھل کر بیٹھا کہ اس کا گلاس چھلکتے چھلکتے رہ گیا۔

''بیریلیم پوائزن کی بہت زیادہ مہلک مقدار میرے پھیپھڑوں میں پہنچ گئی اور پھیپھڑوں میں زخم اتنی تیزی سے پھیلے کہ میڈیکل ہسٹری میں ایسا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ بڑی لمبی چوڑی تحقیق کے بعد مجھے یہ سب باتیں بتائی گئی ہیں۔''

''نہیں..... نہیں..... ایسا نہیں ہوسکتا۔'' ہارون نے تقریباً سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''کئی ماہ پہلے میں ایک اسپرے کئی کئی بار اپنے حلق میں کرتا رہا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس میں بیریلیم پوائزن شامل ہے۔ ایک نہایت ماہر کیمسٹ اور فارماسسٹ ہوتے ہوئے بھی میرا ذہن اس امکان کی طرف نہیں گیا۔ اس کی وجہ صرف اندھا اعتماد تھا۔'' بختیار نے یہ کہتے ہوئے اپنے لہجے کو حتی الامکان پُرسکون رکھنے کی کوشش کی تھی۔

وہ اس دوران اپنا گلاس خالی کر چکا تھا۔ وہ اٹھا اور کیبنٹ کے پاس جا کر دوسری ڈرنک بنانے لگا۔ اب اسے سانس لینے میں زیادہ تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ سینے میں درد بھی کم تھا۔ طویل و عریض کمرے میں بلا کا سکوت تھا۔ صرف گلاس میں اسکاچ اور پھر پانی انڈیلے جانے کی آواز آئی۔ بختیار دوبارہ اپنی جگہ پر آن بیٹھا۔ ہارون یک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کچھ پھیلی ہوئی تھیں۔

''مجھے ایک خاص اسپتال میں داخل ہونے کا مشورہ دیا گیا ہے۔'' بختیار نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ ''لیکن مجھے معلوم ہے، اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میں کچھ دنوں وہاں بستر پر لیٹا رہوں گا۔ اس دوران لاکھوں روپے خرچ ہو جائیں گے لیکن موت بہرحال میرا مقدر ہوگی۔''

''خدا کی پناہ.....! تم پیسوں کا ذکر..... یا ان کی فکر کیوں کر رہے ہو؟'' ہارون آنکھیں مزید پھیلاتے ہوئے بولا۔ ''ہمارے پاس روپے پیسے کی کمی نہیں..... اور اگر تم اپنے پاس سے خرچ کرنا نہیں چاہتے تو سارا خرچ میں اٹھانے کو تیار ہوں۔''

''مسئلہ پیسے کا نہیں ہے۔'' بختیار کے لہجے میں ایک بار پھر تھکن در آئی۔ ''مسئلہ یہ ہے کہ میں گھر سے دور، اسپتال کے بیڈ پر لیٹ کر موت کا انتظار نہیں کر سکتا۔''

ہارون ایک لمحے خاموش رہا پھر ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں یقین ہے، اس نئے ڈاکٹر نے جو کچھ کہا ہے، ٹھیک کہا ہے؟ میرا مطلب ہے..... ہم بھی ایک طرح سے میڈیکل بزنس میں ہی ہیں۔ ڈاکٹروں کو کافی اچھی طرح جانتے ہیں۔ ڈاکٹر تشخیص میں غلطیاں بھی تو کرتے ہیں۔''

''میں خود بھی اپنے ان نئے ٹیسٹوں میں شریک رہا ہوں۔ خون، بلغم وغیرہ کے ٹیسٹ میں پیتھالوجسٹ کے ساتھ رہا ہوں۔ مجھے جو کچھ بتایا گیا ہے، بالکل ٹھیک بتایا گیا ہے۔ البتہ کافی تاخیر سے بتایا گیا ہے۔'' بختیار نے چند سیکنڈ کھانسنے کے بعد کہا۔ ویسے وہ اس وقت خود کو کافی بہتر محسوس کر رہا تھا تاہم اسے اندیشہ تھا کہ کھانسی کے ساتھ اس کے منہ سے خون نہ آنے لگے۔

ہارون نے اپنے گلاس سے بڑا سا ایک گھونٹ بھرا۔ وہ پُرخیال انداز میں بختیار کی طرف دیکھ رہا تھا، گویا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو کہ اس کے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔ چند لمحے کی خاموشی کے بعد بختیار بولا۔ ''میں ہمیشہ ایک غیر جذباتی آدمی رہا ہوں۔ میں ہر چیز کے بارے میں حقیقت پسند بن کر سوچتا ہوں۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس دنیا میں اب میرے وجود کا کوئی مصرف نہیں رہا۔ میں اب مر جاؤں یا تھوڑے دنوں بعد..... اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں جتنی جلدی مروں گا، میری تکلیف کا دورانیہ اتنا ہی مختصر ہوگا۔''

ہارون ذرا چونکا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں اور وہ آنکھیں سکیڑ کر بختیار کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کہیں تم خودکشی کے بارے میں تو نہیں سوچ رہے؟''

''اس امکان کی طرف بھی میرا ذہن گیا تھا۔'' بختیار نے تسلیم کیا۔ ''لیکن ابھی میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اپنے اس خیال پر عملدرآمد کروں گا یا نہیں۔ میں زیادہ سوچ بچار اس پہلو پر کرتا رہا ہوں کہ میرے اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد کیا ہوگا؟ میرے بچے ابھی چھوٹے ہیں۔ میرا کوئی بھائی بہن نہیں ہے۔ ظاہر ہے، بزنس میں میرا حصہ، یہ گھر اور جو دوسرے چھوٹے موٹے اثاثے ہیں، سب ماہرہ

سنبھالے گی لیکن اسے بزنس کی کوئی سمجھ بوجھ نہیں ہے۔ اس لیے یوں سمجھو کہ حقیقت میں تم کو ہی سب کچھ سنبھالنا پڑے گا۔ حتیٰ کہ میرے بچوں کے سرپرست بھی تم ہی ہوگے۔ تم اچھی طرح ان کا خیال رکھو گے نا؟''

''ہاں..... ہاں..... کیوں نہیں.....'' ہارون قدرے مضطرب سے لہجے میں بولا۔ ''میں ضرور ان کا خیال رکھوں گا۔ میں خیال نہیں رکھوں گا تو کون رکھے گا؟''

بختیار نے ایک افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔ ''مجھے تمہاری اس بات پر پورا یقین ہے۔ مجھے معلوم ہے تم کسی اخلاقی ذمے داری یا میری دوستی کی وجہ سے میری بیوی اور بچوں کا خیال نہیں رکھو گے۔ تم اس لیے خیال رکھو گے کہ تم برسوں سے ماہرہ کے عشق میں گرفتار چلے آرہے ہو اور وہ بھی تمہاری محبت کا جواب محبت سے دے چکی ہے۔ وہ دل پر پتھر رکھ کر میرے ساتھ رہ رہی ہے۔ مجھے یقین ہے تمہارے ساتھ وہ حقیقی معنوں میں خوش رہے گی۔ میرے ساتھ رہتے ہوئے وہ جس محبت اور خوشی کا اظہار کرتی ہے، وہ دونوں ہی مصنوعی ہیں۔ میں راستے سے ہٹ جاؤں گا تو اسے حقیقی خوشی مل جائے گی۔ اس کی وجہ سے تم بچوں کا بھی خیال رکھو گے۔ مجھے یقین ہے کہ تم ان کے لیے بہت اچھے سوتیلے باپ ثابت ہوگے۔ میری بیوی، کاروبار، بچے، گھر، سب کچھ تمہیں مل جائے گا۔ یوں سمجھو کہ بیٹھے بٹھائے سب کچھ تمہاری جھولی میں آن گرے گا۔ میرا اندازہ ہے کہ ماہرہ ہی کی وجہ سے..... یا یوں کہو کہ ماہرہ ہی کے انتظار میں تم نے اب تک شادی نہیں کی۔''

''یہ تم..... کیسی باتیں کر رہے ہو؟'' ہارون کے لہجے میں ہکلاہٹ تھی۔ ''ایسا لگتا ہے بیماری نے تمہارے ذہن پر بھی بُرا اثر ڈالا ہے۔ مجھے تم سے ایسی بے ہودہ باتوں کی توقع نہیں تھی۔ اگر تم اتنے زیادہ بیمار نہ ہوتے تو شاید میں تمہارے منہ پر تھپڑ رسید کر دیتا۔''

''نہیں۔ مجھے یقین ہے تم تب بھی ایسا نہ کرتے۔'' بختیار نے اعتماد سے کہا۔ ''گھروں میں نقب لگانے والے ایسا نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ تم بھی میری طرح غیر جذباتی اور حقیقت پسند آدمی ہو۔ سوچ سمجھ کر، ناپ تول کر، اپنا فائدہ نقصان دیکھ کر ہر کام کرنے والے۔ مجھے معلوم ہے تم جذبات کے غیر ضروری اظہار اور بے فائدہ کاموں میں وقت اور توانائی ضائع نہیں کرتے۔''

اس نے ایک بڑا سا گھونٹ بھرا اور ایک لمحے خاموشی سے ہارون کی طرف دیکھا۔ ہارون یک ٹک اسی کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی رنگت کچھ پھیکی پڑ چکی تھی۔ بختیار سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔ ''خیر..... چھوڑو ان باتوں کو..... میں معاملے کے دوسرے رخ کی طرف آتا ہوں۔ اکثر چیزوں کے، اکثر معاملات کے کم از کم دو رخ ضرور ہوتے ہیں۔ ابھی میں نے چند لمحے پہلے توقع ظاہر کی تھی کہ تم ماہرہ کے لیے ایک اچھے شوہر اور میرے بچوں کے لیے اچھے سوتیلے باپ ثابت ہوگے..... لیکن یہ بھی عین ممکن ہے کہ ایسا نہ ہو۔ کچھ بعید نہیں کہ کچھ عرصے بعد ماہرہ سے تمہارا دل بھر جائے۔ مجھے معلوم ہے دو تین دوسری خواتین سے بھی تمہارے قریبی مراسم ہیں۔ ہوسکتا ہے ان میں سے کوئی تمہیں ماہرہ سے زیادہ اچھی لگنے لگے۔ ہوسکتا ہے، پرائے بچوں کو پالنا اور اپنی سرپرستی میں رکھنا تمہیں ناگوار گزرنے لگے اور تم ان کے ساتھ بدسلوکی کرنے لگو.....''

اس نے گہری سانس لے کر فیصلہ کن لہجے میں سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ ''میں خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں، میں رسک لینے والا آدمی نہیں ہوں۔''

بختیار دیکھ رہا تھا کہ ہارون کا چہرہ اب سرخ ہو رہا تھا اور ایک مٹھی بھنچی ہوئی تھی لیکن وہ یقیناً خود پر ضبط کیے بیٹھا تھا۔ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر رہا تھا اور نہ ہی کچھ بول رہا تھا۔ شاید اس نے یہی بہتر سمجھا تھا کہ ایک قریب المرگ شخص کو دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع دے دیا جائے۔

ذرا توقف کے بعد بختیار بولا۔ ''میں زندگی میں اس سے پہلے بھی انسانوں کو پہچاننے میں غلطی کر چکا ہوں۔ اب بھی کر سکتا ہوں۔ تاہم اپنے اسٹاف کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ وہ ہم دونوں کے بغیر بھی کمپنی بڑے اچھے اور ایماندارانہ طریقے سے چلا سکتا ہے۔ تمام آمدنی ماہرہ کو ملتی رہے گی۔ اگر وہ کوئی غلطی نہیں کرے گی تو اس کی اور بچوں کی زندگی شاہانہ انداز سے گزرتی رہے گی۔''

''تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟'' ہارون نے اب آنکھیں سکیڑ کر تشویش زدہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

بختیار نے ایک اور گھونٹ بھرا۔ اب وہ کافی سرور میں تھا اور اس کی خود اعتمادی میں بہت اضافہ ہو چکا تھا۔ اب وہ پہلے سے زیادہ ہموار لہجے میں بولا۔ ''جب مجھے احساس ہوا کہ میری بیماری بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے تو مجھے خیال آیا کہ مجھے اس کی اصل وجہ تلاش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس وقت تک میرا ذہن بیریلیم زہر کی طرف نہیں گیا تھا۔ مجھے بھلا کون بیریلیم استعمال کرا سکتا تھا؟ میں خود بھی ایسی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے معلوم ہے وہ بعض

دواؤں میں استعمال ہوتا ہے لیکن اس کی مقدار نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ وہ بہت ہی احتیاط سے استعمال کیا جانے والا زہر ہے۔ میں نے اپنے پورے نظام تنفس کا نہایت تفصیل اور باریک بینی سے چیک اپ کرایا، لیکن میری غلطی یہ ہے کہ میں نے یہ کام کافی تاخیر سے کیا۔ مجھے جو نقصان پہنچنا تھا، وہ پہنچ چکا تھا اور میں بیریلیم کا استعمال ترک کرنے کے باوجود اس کی بڑھتی ہوئی تباہ کاری کو روک نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ میرے خون میں سرایت کر گیا تھا۔ یہ سب باتیں مجھے دھیرے دھیرے معلوم ہوئیں لیکن میں نے تمہیں کچھ نہیں بتایا۔''

''ہوسکتا ہے لیبارٹری میں کام کرنے کے دوران کبھی بیریلیم حادثاتی طور پر سانس کے ساتھ تمہارے جسم میں چلا گیا ہو۔'' ہارون بولا پھر اس نے بھی بڑا سا ایک گھونٹ لیا۔

بختیار نے بڑے تحمل سے نفی میں سر ہلایا۔ ''ایک عرصے سے مجھے دواؤں کی تیاری کے سلسلے میں خود کوئی کام کرنے کی ضرورت نہیں پڑی اور تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ہماری لیبارٹری میں تیار ہونے والی کسی دوا میں بیریلیم استعمال نہیں ہوتا۔ ہمارے پاس اسے استعمال کرنے کا لائسنس ہی نہیں ہے۔''

''تو پھر وہ کیسے تمہارے جسم میں پہنچا؟'' ہارون نے معصومیت سے پوچھا۔

''میرا ذہن بھی فوری طور پر اس طرف نہیں گیا تھا۔ مجھے بھی وہ بات خاصی تاخیر سے یاد آئی۔'' بختیار نے غالباً ٹھنڈی سانس لینے کی کوشش کی لیکن اس میں خرخراہٹ بھی شامل ہوگئی۔ ''تمہیں یاد ہی ہوگا کہ کبھی کبھار الرجی کی وجہ سے میرا گلا خراب ہوجاتا تھا لیکن آخری مرتبہ کئی ماہ پہلے جب میرا گلا خراب ہوا تو خرابی کافی طول پکڑ گئی۔ کچھ میری بے پروائی بھی تھی۔ اس دوران تم تعطیلات گزار کر امریکا سے واپس آئے تو تم نے بتایا کہ ایک ڈاکٹر سے خصوصی نسخہ لکھوا کر تم ایک بہت بڑے کیمسٹ سے ایک زبردست اسپرے تیار کروا کے لائے ہو۔ خود تمہارا گلا بھی امریکا میں خراب ہوگیا تھا، وہ بھی اسی سے ٹھیک ہوا۔ تم نے اسپرے کا ایک فاضل کین مجھے بھی دیا۔ تم چونکہ میرے دوست تھے، پارٹنر تھے اور میں آنکھیں بند کر کے تم پر اعتماد کرتا تھا، اس لیے میں نے آنکھیں بند کر کے وہ اسپرے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ میں روزانہ بڑے اعتقاد کے ساتھ دن میں تین مرتبہ حلق میں اسپرے کرتا اور سانس کے ساتھ اسے اندر بھی لے جاتا۔ مجھے بڑے سکون کا احساس ہوتا۔ میرے گلے کی خرابی بھی دور ہوگئی جس کی وجہ میرے اور ڈاکٹروں کے خیال میں کسی قسم کی الرجی تھی۔ میں نے احتیاطاً مزید کئی دن اسپرے کا استعمال جاری رکھا۔ اس کے بعد تم نے اسپرے کا کین واپس مانگ لیا۔ تمہارا کہنا تھا کہ تمہیں بھی ایک بار پھر اس کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ تم ان دنوں میرے سامنے بار بار کھنکھار کا گلا صاف کرتے تھے۔ اس وقت میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ تم اداکاری..... یا پھر شاید صداکاری کر رہے تھے۔ میں نے وہ کین تمہیں واپس دے دیا۔''

وہ خاموش ہوا تو ہارون ذرا برہمی سے بولا۔ ''تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟ کیا تم مجھ پر کسی قسم کی سازش کا الزام عائد کرنے کے لیے تمہید باندھ رہے ہو؟''

بختیار نے گویا اس کی بات سنے بغیر سلسلۂ کلام جوڑا۔ ''تم نے بڑی بے تابی اور اشتیاق سے وہ کین واپس لے لیا، حالانکہ وہ تقریباً خالی ہو چکا تھا۔''

بختیار بات کرتے وقت اپنی جگہ سے ذرا بھی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ اس کا ذرا سا بھی ہلنا جلنا ہارون کو اپنی جگہ سے ہلنے کی دعوت نہ دے دے۔ اگر وہ اس پر حملہ کر دیتا تو بختیار چند لمحوں کے لیے بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ خاص طور پر آج کل بختیار کی جو حالت تھی، اس کو دیکھتے ہوئے تو ہارون ایک ہاتھ سے اسے گردن سے پکڑ کر ہوا میں لٹکا سکتا تھا۔

بختیار نے نہایت دھیمی اور قطعی غیر جارحانہ آواز میں بات جاری رکھی۔ ''پچھلے کچھ عرصے کے دوران میں نے تم سے کئی بار دریافت کیا کہ اس امریکی ڈاکٹر کا نام کیا تھا جس سے تم نے اس اسپرے کا فارمولا لکھوایا تھا؟ اس کیمسٹ کا نام پتا کیا تھا جس سے تم نے اسپرے کا کین تیار کرایا تھا؟ لیکن تم نے کبھی بات ٹال دی، کبھی سب کچھ بھول جانے کا عذر کیا۔ اگر تم مجھے اب بھی اس ڈاکٹر اور اس کیمسٹ کا نام پتا دے دو تو میں تم سے اپنی بدگمانیوں پر معذرت کر لوں گا۔''

''اتفاق سے وہ دونوں یکے بعد دیگرے مر چکے ہیں۔'' ہارون نے جواب دیا۔ اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

بختیار مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ میں افسردگی بھی تھی اور کچھ ایسا تاثر بھی جیسے وہ ہارون کی ڈھٹائی سے محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکا ہو۔ وہ پہلے سے زیادہ ملائمت سے بولا۔ ''تم مجھے نام اور پتے تو دے دو۔ وہ چاہے زندہ ہوں یا مُردہ، میرے اتنے ذرائع تو ہیں کہ میں تصدیق کرا سکوں کہ ماضی میں ان دونوں کے توسط سے وہ اسپرے تیار کرایا گیا

تھا یا نہیں؟ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم ایک سچے اور دیانت دار آدمی ہو یا نہیں؟ اب، جبکہ میں خاصی چھان بین کے نتیجے میں یہ جان چکا ہوں کہ برسوں سے تم نے میری بیوی پر ڈورے ڈال رکھے ہیں اور جلد ہی تم اس کے دوسرے شوہر، میرے بچوں کے سوتیلے باپ ہو گے۔ میری بیوی کے توسط سے میرے حصے کا کاروبار بھی تمہارے پاس چلا جائے گا۔ چلو خیر، کاروبار کی تو کوئی بات نہیں، لیکن مجھے کم از کم یہ اطمینان تو ہونا چاہیے کہ میری بیوی اور بچے محفوظ ہاتھوں میں جا رہے ہیں۔ ایک سچا آدمی ان کا نگہبان اور سرپرست بن رہا ہے۔''

ہارون نے یوں اپنا گھونسا اپنے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر مارا جیسے اپنی جھنجلاہٹ کو قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر اس نے گویا کسی گھماؤ پھراؤ کے بغیر بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ آنکھیں سکیڑ کر بختیار کو گھورتے ہوئے بولا۔

''سیدھی طرح بتاؤ، تم کیا سوچ رہے ہو..... کیا چاہتے ہو؟''

''مجھے صرف اس ڈاکٹر اور کیمسٹ کا نام پتا چاہیے جو اس اسپرے کی تیاری کے ذمے دار تھے۔'' بختیار کے لہجے میں کچھ اور تھکن در آئی۔

''میں نے تم سے کسی ڈاکٹر اور کیمسٹ کا ذکر نہیں کیا تھا۔ تم اپنے پاس سے باتیں گھڑ رہے ہو۔ میرا خیال ہے تمہارے دماغ میں بھی کچھ خلل آ گیا ہے۔'' ہارون بولا۔

''حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے تمہیں کوئی اسپرے دیا ہی نہیں تھا۔ میں تو یونہی تمہارا دل رکھنے کے لیے تمہاری ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔ تمہاری حالت کچھ ایسی ہے کہ تمہاری دل شکنی یا تمہاری بات کی تردید تمہارے لیے مزید نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔''

''میری جسمانی حالت خواہ کچھ بھی سہی..... لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میری دماغی حالت بالکل ٹھیک ہے۔'' بختیار کے لہجے میں تھکن کے باوجود بے پناہ خود اعتمادی تھی۔ ''البتہ تم جس قسم کی باتیں کر رہے ہو، انہیں سن کر کہا جا سکتا ہے کہ تمہارا دماغ ٹھکانے نہیں ہے یا پھر تم ایک جھوٹ کو نباہنے کی کوشش میں جھوٹ پر جھوٹ بولے جا رہے ہو۔ کچھ دیر پہلے تم نے کہا تھا کہ وہ ڈاکٹر اور کیمسٹ دونوں ہی یکے بعد دیگرے مر گئے۔ اب تم ان کے وجود سے ہی منکر ہو گئے ہو۔ تم نے یہ ماننے سے ہی انکار کر دیا ہے کہ تم نے کسی ڈاکٹر اور کیمسٹ کا تذکرہ کیا تھا یا مجھے کوئی اسپرے دیا تھا۔''

ہارون نے اب اس سے نظر چرا لی اور اس کے عقب میں اس بڑی سی کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا جس میں خوبصورت سی گرل لگی ہوئی۔ کھڑکی کا شیشہ بند تھا۔ ہارون اب ذرا ڈھٹائی سے بولا۔ ''تمہیں معلوم ہے، اس بات کو ثابت کرنا تقریباً ناممکن ہے۔''

''ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔'' بختیار نے تسلیم کیا۔ ''تم تو ماہرہ کو بھی یقین دلا دو گے کہ پھیپھڑوں کی طرح میرا دماغ بھی ناکارہ ہو گیا تھا۔ میں نہیں چاہتا، وہ اپنے شوہر کو ایک ایسے آدمی کی حیثیت سے یاد رکھے جس کا دماغ، مرتے وقت ٹھیک نہیں تھا۔ اس کے علاوہ یہ احساس مجھے بہت تشویش میں مبتلا کر رہا ہے کہ میرے مرنے کے بعد میری بیوی، میرے بچے، میرا کاروبار، سب کچھ ایک جھوٹے آدمی کے ہاتھوں میں چلا جائے گا۔''

''تم ان باتوں کی فکر میں کیوں پڑے ہوئے ہو کہ تمہارے مرنے کے بعد کیا ہو گا؟'' ہارون ترحم آمیز سے لہجے میں بولا۔ ''تم صرف سکون سے مرنے کی فکر کرو اور اس غم میں اپنی حالت خراب مت کرو کہ تمہارے مرنے کے بعد اس دنیا میں کیا ہو رہا ہو گا۔ اگر تم تسلی ہی چاہتے ہو تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ماہرہ اور بچے تمہارے بعد اس سے کہیں زیادہ اچھی اور خوشیوں بھری زندگی گزاریں گے جتنی وہ تمہارے ساتھ پہلے گزار رہے تھے یا اب گزار رہے ہیں۔ مجبوری یہ ہے کہ تم کسی طرح اس بات کی تصدیق نہیں کر سکو گے۔''

''یہ محض ایک خوش گمانی ہے۔ مستقبل اس کے بالکل برعکس بھی تو ہو سکتا ہے۔'' بختیار نے تاسف زدہ سے لہجے میں کہا۔ ''ایک جھوٹے اور دھوکے باز انسان پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ جو اپنے پرانے دوست اور بزنس پارٹنر کے ساتھ اتنا بڑا دھوکا کر سکتا ہے، اسے قتل کرنے کی منصوبہ بندی کر سکتا ہے، وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ بھی نہ جانے کیا کر سکتا ہے۔ خاص طور پر جبکہ بیوی پہلے اسی شخص کی بیوی رہی ہو جسے اس نے اپنی دانست میں بڑی چالاکی سے ٹھکانے لگایا ہو اور بچے بھی درحقیقت اسی شخص کے ہوں۔ جو لوگ ایسے سفاکانہ کام کر سکتے ہوں، ان کے دل میں پرائی اولاد کے لیے محبت کیسے ہو سکتی ہے۔''

''چلو..... تم اپنے دل کی بھڑاس نکال لو۔ جو تمہارا جی چاہے، کہتے رہو۔ ان باتوں سے اب کیا فرق پڑتا ہے؟'' ہارون نے بے پروائی سے کہا۔ اس نے شاید اب بختیار کو اس کے حال پر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔

''میں چاہتا ہوں، فرق پڑے۔'' بختیار ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ اس کی سانس میں خرخراہٹ بھی شامل تھی۔ ''میں چاہتا ہوں، میرے قاتل کو ان سزاؤں میں

سے کوئی نہ کوئی سزا ضرور ملے جو ہمارے ملک میں قتل کے سلسلے میں مقرر ہیں۔ عمر قید، پھانسی یا پھر کم از کم پانچ سات سال قید کی سزا۔ میرا خیال ہے تمہاری یہ عیش و عشرت کی زندگی خراب کرنے کے لیے تو پانچ سات سال کی قید بھی کافی ہوگی۔ آیندہ زندگی کے بارے میں تم نے جو سہانے خواب دیکھے ہوں گے، وہ سب دھرے رہ جائیں گے۔''

''تم بھلا اس کا بندوبست کیسے کر سکتے ہو؟'' ہارون استہزائیہ سے لہجے میں بولا۔ ''تم کچھ ثابت ہی نہیں کر سکتے۔''

بختیار گویا اس کی بات سنے بغیر، چشم تصور سے مستقبل کا کوئی منظر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اگر تمہیں پھانسی ہوئی تو شاید زندگی کے آخری لمحوں میں اس اذیت سے واقف ہو سکو جو انسان کو اس وقت برداشت کرنی پڑتی ہے جب وہ اپنے پھیپھڑوں سے سانس نہیں لے پاتا۔''

اچانک ہارون کو جیسے کوئی خیال آیا۔ وہ چونک کر اپنے گلاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''تم نے ڈرنک میں زہر تو نہیں ملا دیا؟''

''نہیں.....'' بختیار نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس قسم کی حرکتیں تو تم جیسے بزدل لوگ کرتے ہیں۔ تم چاہے مجھے کچھ بھی سمجھو لیکن میں بزدل نہیں ہوں۔ میں جسمانی طور پر تم سے کمزور ہوں اور اب تو قریب المرگ ہی ہوں لیکن میں ہمیشہ زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جیا ہوں۔ میں نے کبھی چھپ کر کسی پر وار نہیں کیا، کبھی کسی کو سازش کے ذریعے شکست نہیں دی۔ میں نہیں چاہتا کہ ماہرہ مجھے ایک بزدل یا سازشی انسان کے طور پر یاد رکھے.....''

بختیار آہستگی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہارون کو اچانک ہی احساس ہوا کہ بختیار کے ہاتھ میں وہی خنجر تھا جو ہارون کی ملکیت تھا لیکن بختیار اسے بتائے بغیر یا اس سے اجازت لیے بغیر وہ اس کے گھر سے اٹھا لایا تھا۔ وہ یہ نہیں دیکھ سکا کہ بختیار نے اپنی مٹھی میں ایک ٹشو پیپر رکھ کر، اس ہاتھ سے خنجر کا دستہ تھاما ہوا تھا تاکہ اس کی اپنی انگلیوں کے نشان دستے پر نہ آئیں البتہ ہارون کی انگلیوں کے نشان جو یقیناً خنجر کے دستے پر پہلے سے موجود تھے، وہ محفوظ رہیں۔

بختیار کے ہاتھ میں خنجر دیکھ کر ہارون کو یہی گماں گزرا کہ وہ اس پر حملہ کرنے کے لیے آگے آنے والا ہے۔ وہ چوکنا ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے کوئی خاص تشویش نہیں ہوئی۔ بختیار جیسے آدمی کے ہاتھ میں خنجر ہونے کے باوجود اسے قابو کرنا اور اپنے آپ کو خنجر کے وار سے بچانا اس کے لیے قطعی مشکل نہیں تھا مگر دوسرے ہی لمحے جو کچھ ہوا، وہ فوری طور پر ہارون کی سمجھ میں ہی نہ آیا۔

بختیار نے بائیں سے دائیں طرف خنجر سے وار کر کے اپنا پورا پیٹ گہرائی تک کاٹ لیا تھا۔ اس کا معدہ، آنتیں سب کچھ کٹ گیا اور باہر آ گیا۔ خون ایک کراہت انگیز ملغوبے کی سی شکل میں بھل بھل کر کے بہہ نکلا۔ بختیار نے گرتے گرتے خنجر تپائی پر ڈال دیا اور مٹھی میں دبا ہوا ٹشو پیپر اپنے کٹے ہوئے پیٹ پر رکھ لیا۔ گرتے گرتے بھی وہ یہ محسوس کر کے حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ پورا پیٹ کٹ جانے کے باوجود اسے کوئی خاص تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ تکلیف کا احساس بڑھنے سے پہلے ہی اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور اس کا ذہن بے ہوشی کی دلدل میں اترنے لگا۔

ہارون کئی سیکنڈ تک اپنی جگہ دم بخود ہی کھڑا رہا۔ پھر وہ حواس باختہ ہو کر بختیار کی طرف لپکا جو گر کر صوفے اور تپائی کے درمیان آڑا ٹیڑھا ہو کر پھنس چکا تھا۔ ملغوبا نما خون فرش کے خوبصورت ٹائلز پر پھیلتا جا رہا تھا۔ ہارون نے گھبراہٹ میں تپائی سے اپنا خون آلود خنجر بھی اٹھا لیا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اچانک اسے محسوس ہوا جیسے سامنے والی کھڑکی پر کوئی موجود تھا۔

اس کی نظر ڈرائنگ روم کی اس بڑی سی کھڑکی کی طرف گئی جو صوفے کے پیچھے تھی۔ اسے کھڑکی سے باہر بختیار کا پرانا اور وفادار خانساماں نظر آیا۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے اور موبائل فون اس کے کان سے لگا ہوا تھا۔ کھڑکی کا شیشہ بند ہونے کے باوجود اس کی مدھم سی آواز ہارون کو صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''سر جی! آپ ون فائیو سے بول رہے ہیں نا.....؟ ہاں جی..... مجھے ایک بہت ہی بری واردات کی خبر آپ کو دینی ہے..... سر جی، میں ڈیفنس..... بنگلا نمبر..... جی..... جی..... بختیار صاحب کے گھر سے..... میں ان کا خانساماں ہوں جی..... انہیں ان کے دوست اور بزنس پارٹنر ہارون صاحب نے خنجر سے پیٹ پھاڑ کر قتل کر دیا ہے جی..... میں نے ابھی ابھی ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے یہ منظر دیکھا ہے جی..... ہارون صاحب ابھی کمرے میں ہی ہیں..... نہیں جی..... وہ بھاگ نہیں سکتے۔ میں نے ڈرائنگ روم کا دروازہ باہر سے لاک کر دیا ہے..... جلدی سے موبائل بھجوائیں جی.....''

اس کی آواز بھرا گئی پھر وہ رونے لگا اور کھڑکی سے ہٹ گیا۔

ooo

فادر گریگوری ساور تھا اور چیف جولین ہال، لونا بورڈ واک کیفے میں اپنی مخصوص میز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ عبادت کے بعد ناشتا کرنے یہاں آئے تھے۔ یہ ان کا ہر جمعے کا معمول تھا۔ وہ موسم بہار کا ایک خوبصورت دن تھا اور جولین اٹلانٹک کے نظارے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ سمندر کی لہروں نے تقریباً پورے ساحل کو دھو دیا تھا۔ پانی کی نیلگوں سطح پر مرغابیاں تیر رہی تھیں۔

''نمار ایسٹر طوفان نے ساحل کے بڑے حصے کو

کارنامہ

تنویر ریاض

کبھی کبھی چھوٹی سی غلط فہمی بڑی تباہی سے ہمکنار کردیتی ہے مگر... اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جان بوجھ کر درست فہمی کو غلط رنگ دے کر بہت بڑے نقصان سے کسی کو بچا بھی لیا جاتا ہے جیسا کہ یہاں پادری نے کیا... ورنہ دو زندگیاں موت کے منہ میں چلی جاتیں۔

اچھی کاوش پر سٹیزن ایورڈ کے حق دار ایک پادری کا دلچسپ کارنامہ

نقصان پہنچایا ہے۔'' جولین نے توس پر مارملیڈ لگاتے ہوئے کہا۔ ''اور سیاحوں کی آمد سے پہلے اسے اصل حالت میں لانے کے لیے کچھ وقت لگے گا.....''

وہ بولتے بولتے رک گیا جب اس نے دیکھا کہ فادر گریگوری اس کی بات نہیں سن رہا ہے۔ اس کی توجہ کسی اور جانب تھی اور اس کی بڑی بڑی آنکھیں کہیں اور مرکوز تھیں۔

جولین مسکرایا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''لہٰذا میں نے تمام احکامات پر غور کرنے کے بعد سوچا ہے کہ میرے لیے خودکشی بہتر رہے گی۔ تمہارا کیا خیال ہے فادر؟''

''ایسا ممکن ہے۔'' پادری بڑبڑایا۔

''بہت عمدہ۔'' جولین نے جواب دیا۔ ''تب پھر میں اس پر عمل کروں؟ میں سوچ رہا تھا کہ یہ کانٹا اپنے سینے میں گھونپ لوں۔''

اس نے معائنے کی غرض سے کانٹا اٹھایا۔ ''بہت گندا ہے۔''

''کیا؟'' جولین ..... کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا کیا مطلب ہے؟'' پھر اس نے نیپکن منہ پر رکھ کر ہنسنا شروع کر دیا۔

''براہِ کرم ایسی کوئی جلد بازی نہ کرو۔ کم از کم اس وقت جب ہم ناشتا کر رہے ہوں۔''

''مجھے تمہاری پریشانی کا احساس ہے فادر۔'' جولین نے جواب دیا۔ یہ کہہ کر اس نے کانٹا واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔

''مجھے بہت افسوس ہے چیف لیکن میرا دھیان اس میز پر بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف تھا جو تمہارے بائیں جانب دروازے کے قریب ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں اس شخص کو ضرور جانتا ہوں جو وہاں بیٹھا ہے لیکن یہ نہیں معلوم کہ یہ کون ہو سکتا ہے۔ یہی چیز مجھے پریشان کر رہی ہے۔''

جولین نے کن انکھیوں سے اس جانب دیکھا۔ اس وقت وہ سادہ لباس میں تھا لیکن جانتا تھا کہ بہت سے لوگ اسے چہرے سے پہچانتے ہیں۔ اس میز پر تین افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں دو مرد اور ایک بہت ہی پُرکشش جوان عورت تھی۔

بڑی عمر والا مرد طویل قامت اور چوڑے شانوں والا تھا۔ اس کے سر پر گھنے بال تھے۔ اس کا چہرہ چوڑا اور دیکھنے میں سخت لگتا تھا۔ اس کی ناک چپٹی اور توند بڑھی ہوئی تھی۔ جولین کے اندازے کے مطابق دوسرے مرد کی عمر پچیس کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ بھی طویل قامت لیکن دبلا پتلا تھا۔ اس کے بال سنہرے اور وہ دیکھنے میں ہی ہینڈسم لگتا تھا۔ عورت کی عمر بھی بیس اور پچیس کے درمیان ہوگی۔ اس کے لمبے سیاہ بال سیدھے اور چمکدار تھے، چہرہ کتابی اور روشن تھا۔

چیف نے پادری کو بتایا۔ ''بڑی عمر والے کا نام جیک پلور ہے۔ جب وہ پیشہ ور ہاکی کا کھلاڑی تھا تو پلویر ازر، کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ اس کا یہاں رئیل اسٹیٹ کا کاروبار ہے۔''

''اچھا لیکن وہ دوسرا.....؟''

''اس کا نام ٹم مورس ہے۔ ٹم..... ٹموتھی.....'' فادر گریگوری سوچتے ہوئے بولا۔ ''ٹموتھی مورس.....''

''اوہ اب میں سمجھ گیا۔'' وہ چلایا۔ ''جب میں یہاں آیا تو یہ قربان گاہ میں خدمت گار تھا۔ البتہ اسے یہ کام پسند نہیں تھا۔ ایک مرتبہ میں نے اسے شراب چراتے ہوئے پکڑا۔ اس نے بتایا کہ وہ یہ شراب اپنی بیمار ماں کے لیے لے جا رہا تھا۔''

اس نے نیپکن سے اپنا منہ صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''اسے جھوٹ بولنا بھی نہیں آتا لیکن اس نے یہ مشق جاری رکھی۔ اب یہ کتنا خوش شکل شخص بن گیا ہے۔''

''اور یہ عورت.....'' جولین نے کہنا شروع کیا لیکن اسے خاموش ہونا پڑا کیونکہ پادری اپنی جگہ سے اٹھا اور ان تینوں سے ملنے چلا گیا۔

کچن سے آنے والی آوازوں اور دوسری میزوں پر ہونے والی گفتگو کی وجہ سے وہ ان کے درمیان ہونے والے خیر مقدمی کلمات نہ سن سکا لیکن اسے یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ اس میز پر بیٹھے ہوئے تینوں افراد کچھ مضطرب نظر آ رہے تھے۔

چند منٹ بعد فادر گریگوری مسکراتا ہوا واپس آیا۔ اس کا چہرہ روشن ہو رہا تھا۔ ''ٹموتھی کو دوبارہ دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔'' وہ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں یہ ضرور کہوں گا کہ وہ بہت کامیاب اور خوشحال نظر آ رہا ہے اور اس کی بیوی کتنی خوبصورت ہے۔''

جولین ان تینوں کو دیکھ رہا تھا۔ اب ان میں سے کوئی بھی نہیں مسکرا رہا تھا اور نہ ہی وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ٹموتھی اور اس عورت کے چہرے اترے ہوئے تھے اور ان کا کھانا بھی یونہی رکھا ہوا تھا۔ دونوں میں سے کسی نے بھی کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا تھا جیک بھی خاموش بیٹھا ہوا تھا لیکن ان دونوں کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کا اپنا چہرہ بھی سرخ

ہو رہا تھا۔

''وہ اس کی بیوی نہیں ہے۔'' جولین نے تصحیح کی۔

''میں نے اس کے ہاتھ میں شادی کی انگوٹھی دیکھی ہے۔ اس میں ایک بہت بڑا ڈائمنڈ لگا ہوا ہے۔''

''وہ اس دوسرے شخص کی بیوی ہے فادر۔''

فادر گریگوری کا منہ کھلا رہ گیا۔ ''اوہ میرے خدا۔''

''میں نے تمہیں بتانے کی کوشش کی تھی۔''

''اوہ میرے خدا..... مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی۔ میں نے باقاعدہ تعارف سے پہلے اسے مسز مورس کہہ دیا۔ میں بھی کتنا بے وقوف ہوں۔''

''تم ایسا سمجھنے والے پہلے شخص نہیں ہو۔ جیک کی عمر پچاس برس سے زیادہ ہے جبکہ وہ عورت اس سے بہت چھوٹی ہے جبکہ ٹم اور ڈورا کی جوڑی دیکھنے میں بہت اچھی لگتی ہے۔ بدقسمتی سے وہ اس کے شوہر کا ملازم ہے۔''

''میں نے انہیں اس اتوار کو عبادت کے لیے مدعو کیا ہے۔'' فادر نے کہا۔

جولین نے ان تینوں کی طرف دوبارہ دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ وہ آئیں گے۔''

صبح دس بجے کا وقت تھا، جب ٹم نے اس بڑے مکان کا دروازہ کھولا۔ وہ حال ہی میں ان کے پاس رجسٹر ہوا تھا۔ اس مکان اور شہر کے بیچ ایک بہت بڑا جنگل تھا جس کی وجہ سے نیچے کی دو منزلیں چھپ گئی تھیں اور سڑک سے صرف تیسری منزل ہی نظر آتی تھی۔

خاموشی سے مکان کے عقب کی طرف جاتے ہوئے شاندار لکڑی کا کام، کئی ایکڑ پر کی گئی کارپیٹنگ اور ہاتھ سے بنایا ہوا لکڑی کا فرش دیکھ کر اس کا دماغ چکرانے لگا تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ یہ ایک بہت ہی متاثر کن جگہ ہے لیکن ابھی اسے اندر سے دیکھنا باقی تھا۔ یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ اس مکان کے مالکان سردی سے گھبرا کر بہاماس منتقل ہو گئے تھے۔

ٹموتھی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ابھی اس مکان کی تعمیر کو دس سال بھی نہیں ہوئے اور اسے فروخت کیا جا رہا تھا۔ اس کی مالیت کروڑوں میں تھی اور وہ حیران رہ گیا۔ جب جیک نے صبح ناشتے کے بعد یہ اعلان کیا کہ وہ اس پر بھروسا کرتے ہوئے اس مکان کو ہینڈل کرنے کا اختیار دے رہا ہے۔ اس کا کمیشن سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں ڈالرز میں ہوگا اور ٹم کو یوں لگا کہ اس کا دل بند ہو جائے گا۔

جیک نے اسے مکان کا معائنہ کرنے کے لیے بھیجا تھا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم پیدل چل کر جانا اور سامنے کے بجائے عقبی حصے سے داخل ہونا۔ جب تم اندر جاؤ گے تو اس کی وجہ بھی معلوم ہو جائے گی۔''

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ یہ کمرا پورے مکان میں توجہ کا مرکز تھا جہاں سے سمندر کا شاندار منظر دیکھنے میں آتا تھا۔ اس کے سامنے ایک بڑی سی کھڑکی اوپر کی دو منزلوں تک پھیلی ہوئی تھی اور اس کمرے کی چھت نے تیسری منزل کو سہارا دیا ہوا تھا۔ کھڑکی چوڑائی اس وسیع و عریض کمرے کے برابر تھی جس میں کئی درجن شیشے کے دروازے لگے ہوئے تھے۔

اس کے پیچھے بیری کی جھاڑیاں، شاہ بلوط اور دیودار کے درخت تھے جن سے سمندر کی رونق اور بڑھ گئی تھی۔ اس کی لہروں کا شور کھڑکی کے شیشوں سے ٹکراتا اور کمرے کے چاروں طرف نرم کپڑے کی چادر سی لپیٹ جاتی۔

''اوہ میرے خدا.....'' ٹموتھی نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا پھر اس کی نگاہ ایک چیمبر پر گئی جو کسی بال روم کی طرح کشادہ تھا لیکن اس کی ترتیب کسی بڑے اجتماع جیسی تھی۔ وہاں چمڑے اور غلاف چڑھی کرسیاں اور آرام دہ سیٹیں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ اہتمام کسی میٹنگ یا کانفرنس کے لیے کیا گیا تھا۔

ان سب سے بڑھ کر حیرت انگیز مہاگنی سے بنا ہوا وہ منقش گول زینہ تھا جو دوسری منزل کے آخری سرے سے نیچے مرکزی کمرے تک جا رہا تھا۔ ٹم کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے جیک کو آخری سیڑھی پر کھڑے ہوئے دیکھا۔ اس کے چہرے پر وہی مخصوص مسکراہٹ تھی۔

''اوہ میرے خدا!'' ٹم نے اس عمارت میں داخل ہونے کے بعد دوسری بار کہا۔ ''تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم بھی یہاں ہو۔ تم نے گاڑی کہاں کھڑی کی؟''

جیک نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کیا میں نے تمہیں نہیں بتایا تھا کہ یہ پیدل کا راستہ ہے؟''

ٹم ایک بار پھر حیران رہ گیا جب جیک نے دوستانہ انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے اپنی طرف کھینچ کر پہلو میں کھڑا کر لیا۔

''بہت عمدہ۔'' جیک نے گہری سانس لی اور اس کے ساتھ ہی شراب کا بھبکا خارج ہوا پھر اس نے اپنے دوسرے بازو سے اس کے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اور ٹم کی گردن پر دباؤ بڑھانا شروع کر دیا۔

ٹم نے اس کی گرفت سے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ اسے یوں لگا کہ سمندر کا نظارہ تاریک آسمان میں تبدیل ہوگیا ہے اور وہ ایک ٹوٹے ہوئے ستارے کی طرح تیزی سے نیچے آرہا ہے۔

☆☆☆

''بہتر ہے کہ تم کھڑے ہوجاؤ۔'' اسے ایک آواز سنائی دی۔ اس نے آنکھیں کھولے بغیر سر ہلا دیا اور سوچنے کی کوشش کی کہ بولنے والا کون ہوسکتا ہے۔

''جیک.....'' بالآخر اس نے کہا۔ اس کے لب یوں ہلے جیسے انہیں گوند لگا کر بند کردیا گیا تھا۔ یہی کیفیت اس کی پلکوں کی بھی تھی لیکن مسلسل کوشش کے بعد وہ کامیاب ہوگیا۔

''کیا.....؟'' وہ بڑبڑایا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ سارا منظر کیسے تبدیل ہوگیا۔ اسے پانی کی طلب ہورہی تھی کیونکہ اس کا گلا خشک اور سوج گیا تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔

''جیک.....'' اس نے دوبارہ کہا۔ وہ اپنا سر دائیں بائیں گھما رہا تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور وہ اپنے مالک کو تلاش کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

''میں یہاں ہوں۔'' ایک مانوس آواز نے جواب دیا پھر جیک کا سرخ چہرہ اس کے سامنے نمودار ہوا۔ ''کیا مسئلہ ہے؟'' اس نے کہا۔

''میں نہیں اٹھ سکتا۔ مجھے پیاس لگی ہے۔''

جیک نے مشروب کی بوتل کھولی اور اسے ٹم کے ہونٹوں کے قریب لاکر بولا۔ ''اس سے تمہاری پیاس بجھ جائے گی۔'' پھر اس نے تھوڑی سی شراب اس کے منہ میں ڈال دی۔

ٹم کو زور کا پھندا لگا۔ اس نے تھوکنے اور کھڑا ہونے کی کوشش کی لیکن دونوں میں کامیابی نہیں ہوئی۔ جو شراب اس کے حلق سے نہیں اتری وہ اس کی قمیص کے دامن پر گرگئی۔ اس نے اپنا منہ بوتل سے ہٹایا اور دیکھا کہ اسے کسی چیز سے جکڑ دیا گیا ہے۔ جیسے اس کے سینے سے کمر تک کوئی پلاسٹک لپیٹ دیا گیا ہو۔

اسے زور کا جھٹکا لگا اور یاد آگیا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اس نے دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن جیک کے مضبوط ہاتھ اس کے کندھوں پر کسی شکنجے کے مانند جمے ہوئے تھے۔ اس نے اسے کرسی پر بٹھا دیا اور کرسی کو فرش سے باندھ دیا۔ اس طرح ٹم کی جدوجہد بے سود رہی۔

''مدد.....'' ٹم چلایا۔ ''کوئی میری مدد کرے۔'' اس کی التجا گھر کی خاموش فضا میں گونجی۔ اس نے ایک بار پھر تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ''پلیز میری مدد کرو۔''

وہ تھکا ہوا اور دل گرفتہ نظر آرہا تھا۔ تبھی جیک نے اس کے عقب سے کہا۔ ''یہ مکان سب سے الگ تھلگ ہے اور اسے گوشۂ تنہائی بنانے میں کافی رقم خرچ ہوئی ہے۔ یہاں تمہاری آواز سننے والا کوئی نہیں ہے۔''

ٹم اپنے آنسو روکنے کی کوشش کرنے لگا۔ ''یہاں سے منظر زیادہ واضح اور صاف نظر آئے گا۔'' جیک نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

تب ٹم کو محسوس ہوا کہ وہ دوسری منزل کی لینڈنگ پر ہے جہاں سے بڑا کمرا نظر نہیں آرہا، اسی لیے منظر وہی لیکن مختلف تھا۔ یہاں سے وہ بڑی کھڑکی کے باہر جنگل کو دیکھ سکتا تھا اور سمندر اس تصویر کا چھوٹا حصہ لگ رہا تھا اور کھڑکی سے دور ہوگیا تھا۔

''یہ سب کیا ہے جیک؟'' ٹم نے کہا۔ ''یہ تم کیا کر رہے ہو؟''

ایک پتلی سفید ڈوری ٹم کی آنکھوں کے سامنے لہرائی اور اس کے کندھوں سے ہوتی ہوئی گردن تک پہنچ گئی۔ اس سے پہلے کہ ٹم کچھ سمجھتا، جم وہ ڈوری اس کی گردن پر کس چکا تھا۔

''نہیں۔'' ٹم چلایا۔ ''یہ مت کرو۔''

''میں کچھ نہیں کررہا۔'' جیک نے اسے یقین دلایا۔ اس کی آواز پُرسکون اور لہجہ نرم تھا۔ ''پہلے ہم کچھ باتیں کریں گے۔'' یہ کہہ کر وہ اس کے سامنے آگیا۔

ٹم نے اوپر کی جانب دیکھا۔ وہ ڈوری ایک خالی فانوس سے گزر رہی تھی جو اس کے سر کے اوپر تھا۔ اس کا ایک سرا پھندے کی شکل میں اس کی گردن میں پڑا ہوا تھا لیکن دوسرا سرا اس کے پیچھے لٹکا ہوا تھا جو اسے نظر نہیں آرہا تھا۔

اب اس کی سمجھ میں آیا کہ اسے لینڈنگ پر کیوں لایا گیا تھا۔ جیک کا ارادہ اسے پھانسی دینے کا تھا تاکہ اس کا جسم بڑے کمرے کے فرش پر جھولتا رہے۔ اسے صرف ٹم کو جنگلے سے اوپر اٹھا کر چھوڑ دینا تھا۔ اس جیسی جسامت اور طاقتور شخص کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

''تم کیا چاہتے ہو؟'' ٹم گڑگڑایا۔ ''میرا قصور کیا ہے؟''

ریلنگ پر جھکتے ہوئے جیک نے ایک اور گھونٹ لینے

کے لیے مشروب کی بوتل نکالی پھر گلا صاف کیا اور اپنے قیدی کو سرخ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''بزدل مت بنو۔ تم جانتے ہو کہ تمہارا قصور کیا ہے۔ تم نے میری خوبصورت بیوی کے ساتھ تعلق قائم کیا ہے۔ یاد ہے؟''

یہ سن کر ٹم اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور زار و قطار رونے لگا۔

☆☆☆

تقریباً دوپہر کے کھانے کے وقت فادر گریگوری واپس آیا۔ اس نے صبح کا وقت کاؤنٹی اسپتال میں مریضوں کی عیادت کرنے میں گزارا، ان کی صحت یابی کے لیے دعا کی اور ان کے علاج معالجے کی سہولتوں کا جائزہ لیا۔ کبھی کبھی وہ ان کے اعترافات بھی سنتا اور بیماروں کے لیے دعائے خیر کرتا۔ گرجا کی طرف واپس آتے ہوئے اس کا دماغ صبح کیفے میں ہونے والے واقعے کی طرف چلا گیا۔ اسے اپنی حماقت کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کی تلافی کی ایک ہی صورت تھی کہ وہ جیک پلور سے معافی مانگ لے۔

اس خیال کے آتے ہی اس نے گاڑی جنوب کی جانب ڈیون ڈرائیو پر موڑ لی جہاں پلور کا دفتر تھا۔ اس نے گاڑی پارکنگ لاٹ میں کھڑی کی اور سڑک کی جانب کھڑکی پر نظر ڈالتا ہوا آگے بڑھ گیا جس میں مکانات، شاپس اور اپارٹمنٹ کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔

وہ اندر داخل ہوا تو لابی کے عقب میں کئی میزیں رکھی ہوئی تھیں جن پر لوگ بیٹھے کمپیوٹر پر کام کر رہے تھے۔ کئی نظریں اس کی جانب اٹھیں لیکن اس کا سیاہ سوٹ اور رومن کالر دیکھ کر وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

''صبح بخیر!'' فادر گریگوری نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں فادر گریگوری ہوں اور میرا تعلق سینٹ برینڈن سے ہے۔''

''ہیلو فادر۔'' ایک درمیانی عمر کی عورت نے جواب دیا۔ ''میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں؟''

''میں مسٹر جیک سے ملنا چاہتا ہوں۔'' پادری نے کہا۔

''مسٹر جیک؟'' وہ عورت منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''اوہ فادر! وہ اس وقت موجود نہیں ہیں۔ اگر کوئی کام ہے تو بتاؤ۔ شاید میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔''

''صبح بخیر فادر۔'' ایک دوسری آواز آئی۔ ''میں اتنی جلدی تمہیں دوبارہ دیکھ کر حیران ہو رہی ہوں۔ پلیز اندر آ جاؤ۔''

فادر گریگوری نے پلٹ کر دیکھا۔ ڈورا ایک اندرونی دفتر کے دروازے میں کھڑی ہوئی تھی۔

''شکریہ۔ میں تمہارے شوہر کو نہیں پہچان سکا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ وہ کون ہے۔'' وہ کھسیانا ہوتے ہوئے بولا۔ جب اس نے دیکھا کہ کمرے میں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں کی نظریں اس کی جانب ہیں تو وہ جلدی سے ڈورا کے پیچھے اندر چلا گیا۔

''مجھے افسوس ہے کہ صبح جب ہماری ملاقات ہوئی تو مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔ ''جس کی وجہ سے شاید تمہیں کچھ تکلیف ہوئی ہو۔ یہ بہت بڑی حماقت تھی.....''

''پلیز، بیٹھ جاؤ۔'' ڈورا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور خود بھی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

''یہ میری بے وقوفی تھی کہ میں نے ایسا فرض کرلیا.....''

ڈورا نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹی اور اپنے ہاتھ رانوں پر مسلتے ہوئے بولی۔ ''کاش یہ سچ ہوتا۔''

حیرت زدہ پادری نے دیکھا کہ ڈورا کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ''میں سمجھ گیا۔'' وہ بڑبڑایا۔

''میرا خیال ہے کہ مجھے اعتراف کرنے کی ضرورت ہے۔''

''تم کیتھولک ہو؟'' اس نے پوچھا۔

جیسے ہی اس نے اثبات میں سر ہلایا، بہت سے آنسو اس کی قیمتی پوشاک پر گر پڑے۔ ''میں ٹموتھی مورس سے محبت کرتی ہوں فادر۔ میں ایسا نہیں چاہتی لیکن دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔''

''کیا تمہارے شوہر کو یہ بات معلوم ہے؟'' پادری نے پوچھا۔

''اسے کچھ عرصے سے شک تھا لیکن جب تم نے مجھے مسز مورس کہہ کر مخاطب کیا تو مجھے اور ٹموتھی کو محسوس ہوا کہ ہم بے لباس ہوگئے ہیں اور جیک نے یہ بھی دیکھا۔ اگر اسے پہلے معلوم نہیں تھا تو اب جان گیا۔''

''اب میں سمجھا۔'' اب فادر گریگوری نے جواب دیا۔ وہ اپنے آپ کو قصوروار نہیں سمجھ رہا تھا۔ اس نے بند دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے شوہر کی واپسی کب تک ہوگی؟''

''میں نہیں جانتی فادر۔ وہ مجھے بہت کم کوئی بات بتاتا ہے۔''

''اور ٹموتھی.....؟''

''وہ ٹیلوں کی طرف کوئی مکان دیکھنے گیا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''جیک نے ناشتا... آنے کے تھوڑی دیر بعد ہی اسے وہاں بھیج دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس انتہائی قیمتی جائداد کے لیے کمی پر بھروسا کر رہا ہے۔ ان حالات میں یہ ایک عجیب بات معلوم ہوئی ہے۔ کیا تم ایسا نہیں سمجھتے فادر؟ وہ اس پر بہت مہربان نظر آرہا تھا جبکہ حقیقت میں وہ بہت ظالم ہے۔''

''میں نے اکثر لوگوں کو عجیب حرکتیں کرتے دیکھا ہے جب وہ ناخوش ہوتے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے کسی خطرے کا احساس ہونے لگا۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''شاید ہم اس گفتگو کو اعتراف کے دوران مکمل کرسکیں جب ہمیں کسی قسم کی مداخلت کا ڈر نہیں ہوگا۔ پلیز! تم مجھے آج سہ پہر چار بجے گرجا میں ملو۔ تمہیں اپنی توبہ کرنے کے لیے ابھی وہاں جانا ہوگا۔''

''لیکن فادر۔'' ڈورا نے احتجاج کیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ ''ابھی صرف گیارہ بجے ہیں اور تم نے میرا اعتراف بھی نہیں سنا۔ پھر تم توبہ کے لیے کیسے کہہ سکتے ہو؟''

پادری نے اسے خاموش کرنے کے لیے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور بولا۔ ''اس مرحلے پر میں کوئی مزید بات نہیں سننا چاہتا۔ براہِ کرم وہی کرو جو میں نے کہا ہے۔''

جب ڈورا نے رضامندی میں سر ہلایا تو وہ بولا۔ ''اب مجھے اس مکان کا پتا دو، جہاں ٹم گیا ہے۔ مجھے اس سے بھی بات کرنی ہوگی۔''

ڈورا نے آفس کمپیوٹر میں دیکھنے کے بعد اسے ایک کاغذ پر پتا لکھ کر دے دیا۔ ''اس میں ٹموتھی کی کوئی غلطی نہیں۔'' وہ التجا آمیز لہجے میں بولی۔ ''میں نے ہی پہل کی تھی۔''

''نان سینس.....'' فادر گریگوری نے جواب دیا۔ ''اس نے وہی کیا جو وہ چاہتا تھا۔ تم دونوں اس غلطی میں برابر کے شریک ہو۔'' پھر وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''تم گھر واپس مت آنا جب تک سہ پہر میں مجھ سے مل نہ لو۔''

☆☆☆

''جیک! تم ڈورا کو کوئی تکلیف نہیں پہنچاؤ گے۔'' ٹم نے التجا کی۔ ''تم جانتے ہو کہ اس نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔''

''نہیں؟'' جیک نے پوچھا۔ ''تم کہہ رہے ہو کہ اس نے کوئی غلط کام نہیں کیا؟'' اس نے مشروب کا ایک اور گھونٹ لیا۔ ''ممکن ہے کہ اس نے اس انداز میں نہ کیا ہو جس طرح تم دیکھ رہے ہو لیکن جہاں میں کھڑا ہوں، وہاں سے یہ مجھے

کچھ مختلف لگ رہا ہے۔ اس بلندی سے مجھے ہر چیز صاف نظر آ رہی ہے۔''

ٹم نے ریلنگ کے ذریعے نیچے فرش کی جانب دیکھا۔ اس کے ماتھے سے ٹھنڈا پسینا بہنے لگا اور اس نے محسوس کیا کہ اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے ہیں۔

''درحقیقت جب وہ پادری صبح ناشتے پر ملا تو یوں لگا جیسے میری آنکھوں پر سے پردہ ہٹ گیا ہے۔''

''میں جانتا ہوں کہ تم نے محسوس کیا ہوگا۔'' ٹم نے اپنے ماتھے پر سے پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ہم نے کچھ نہیں کیا۔ وہ صرف چھیڑ چھاڑ تھی۔''

''صرف..... اس ایک لفظ میں بہت کچھ پوشیدہ ہے۔ تم میری بیوی سے محبت کرتے ہو اور میں اسے یہ سمجھ کر نظر انداز کر دوں کہ یہ صرف چھیڑ چھاڑ ہے۔''

''اب.....'' جیک نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ ''میں تمہیں مار ڈالوں گا۔''

''ہمارے درمیان کوئی ایشو نہیں تھا۔'' ٹم چلایا۔ ''البتہ ایک دوسرے کے لیے جذبات تھے لیکن ڈورا نے کہا کہ اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔''

''میرے بھی کچھ جذبات ہیں۔'' جیک نے آہستہ سے کہا۔ ''اور وہ تمہارے لیے کچھ اچھے نہیں ہیں۔''

اس نے ٹم کی گردن میں لپٹی ہوئی ڈوری پکڑی اور اسے ایک جھٹکے سے کھینچ کر کھڑا کر دیا۔ ''ہر ایک کو معلوم ہو جائے گا کہ تم نے مجھے قتل کیا ہے۔'' ٹم نے اسے وارننگ دی۔

''کیا واقعی؟'' جیک نے اسے جنگلے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔ ''تم نے یہ اندازہ کیسے لگایا؟''

''تم نے میرے گرد پیکنگ ٹیپ لپیٹ دیا ہے۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی نہیں سوچے گا کہ میں نے خودکشی کی ہے۔''

''اوہ .....اتنی سی بات۔'' جیک نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''جب تم لاتیں چلانا بند کر دو گے تو میں یہ ٹیپ اتار لوں گا۔ میں تمہارا باس ہوں اور تم مجھ سے زیادہ عقل مند نہیں ہو۔''

ڈھلوان چڑھنے کے بعد فادر گریگوری بری طرح ہانپنے لگا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ڈرائیو وے کو ایک زنجیر کے ذریعے بند کر دیا گیا ہے چنانچہ اس نے کار باہر کھڑی کی اور زنجیر پھلانگ کر اندر آ گیا۔ وہاں ایک کار دیکھ کر اسے توقع ہو چلی کہ اندر صرف ٹم ہی ہوگا۔ شاید وہ ضرورت سے زیادہ ردِعمل ظاہر کر رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ چیف جولین نے اسے برسوں پرانی دوستی میں پہلی دفعہ موردِ الزام ٹھہرایا تھا۔

اس نے اپنی گردن اٹھا کر اس عالی شان عمارت کو دیکھا۔ اس کے فینسی برج، نکونی چھتیں اور وسیع رقبہ دیکھ کر اسے ہندوستانی ریاستوں کے راجوں مہاراجوں کا خیال آ گیا۔ اس نے سوچا کہ اگر اس مکان کے سابق مالکان سینٹ برینڈن کے عبادت گزار ہوئے تو ان سے چندہ لینا کتنا آسان ہوگا۔

پادری نے سیڑھیاں چڑھنے کے بعد رومال سے اپنا پسینا صاف کیا اور دروازے پر لگی گھنٹی تلاش کرنے لگا تب اس نے دیکھا کہ ایک دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔

''ہیلو۔'' اس نے کھلی جگہ میں منہ ڈال کر کہا اور اس کے ساتھ ہی دروازے پر دستک دی لیکن دونوں آوازیں فضا میں تحلیل ہو گئیں۔ اس نے دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا اور اندر سر ڈال کر سننے کی کوشش کرنے لگا۔

دور کہیں سے ایسی آواز سنائی دی جیسے دو آدمی باتیں کر رہے ہیں۔ مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح یہ آوازیں کبھی تیز اور کبھی ہلکی ہو جاتیں۔ فادر گریگوری نے سوچا کہ شاید جیک بھی ٹم کے ساتھ آیا ہے کیونکہ اس نے باہر ایک ہی کار دیکھی تھی۔

اس نے دروازہ ۔۔ تھوڑا سا اور کھولا اور اندر داخل ہو کر اس جانب چل دیا جہاں سے یہ آوازیں آ رہی تھیں۔ بڑے کمروں کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ بیش قیمت چیزوں سے آراستہ ہیں۔ نمائشی کمرے میں پہنچ کر وہ داخلی دروازے پر رک گیا اور اس عالی شان کھڑکی کو دیکھنے لگا۔

''اوہ ڈیئر گاڈ۔'' اس نے ٹمی کو دعا مانگتے ہوئے دیکھا۔ ''پلیز میری مدد کرو..... مقدس ماں میری مدد کرو..... خدا کے نیک بندو میری مدد کرو۔ سینٹ مائیکل میری مدد کرو۔''

پادری سمجھ گیا کہ ٹم بہت بڑی مشکل میں ہے لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی ردِعمل ظاہر کرتا، اسے جواب میں جیک کی آواز سنائی دی۔ ''چند لمحوں بعد تم ان سب سے مل سکو گے۔ ٹمی بوائے! مجھے اپنا ہاتھ پکڑاؤ۔''

''رک جاؤ۔'' فادر گریگوری چلایا اور کمرے میں داخل ہو کر ٹمی کو دیکھنے لگا جو اپنی جان بچانے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر دونوں آدمی اپنی جگہ پر منجمد ہو گئے۔

''فادر!'' ٹمی چلایا۔ باوجود اس کے کہ اس کے گلے میں رسی کا پھندا پڑا ہوا تھا۔

''پلے جاؤ۔'' جیک چلایا اور ٹمی پر اپنی گرفت سخت

کرلی۔

''تم ایسا نہیں کرسکتے مسٹر جیک.....'' پادری نے کہا۔ ''اگر تمہیں ٹمی کی پروا نہیں تو اپنا ہی خیال کرلو۔''

''اس ملک میں موت کی کوئی سزا نہیں ہے فادر اور میں جیل جانے سے نہیں ڈرتا۔'' جیک نے جواب دیا۔ اس کی آواز جذبات اور نشے کی وجہ سے بھاری ہو رہی تھی۔ ''اس نے میری عزت پر ڈاکا ڈالا ہے اور مجھ سے وہ چیز چھین لی جو میرے لیے سب سے اہم ہے اور یہ کسی طرح بھی اس کی تلافی نہیں کرسکتا۔ اس سے قطع نظر کہ لوگ کیا سمجھتے ہیں۔ میں ڈورا سے محبت کرتا ہوں۔ ہمارا رشتہ مصنوعی نہیں ہے۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں فادر۔'' یہ کہہ کر اس نے دوبارہ ٹمی کو بالکونی کی ریلنگ کی جانب دھکا دیا۔ ''اس نے اسے مجھ سے چھین لیا۔''

''لیکن اگر تم ایسا کرتے ہو۔'' فادر گریگوری نے کہا۔ ''تو تم اپنی روح سے بھی محروم ہو جاؤ گے اور تمہارے پاس کچھ نہیں رہے گا۔''

''میں تمہارے لوگوں میں سے نہیں ہوں۔'' جیک چلایا۔ ''مجھے اپنی روح کی پروا نہیں۔ مجھے صرف ڈورا کی پروا ہے اور مجھے انصاف چاہیے۔''

''پھر تمہیں فوری طور پر یہ جلد بازی کا رویہ ترک کرنا ہوگا مسٹر جیک..... کیونکہ یہ کوئی انصاف نہیں ہے اور اس سے صرف تمہاری محبت کو نقصان پہنچے گا جو میں سمجھتا ہوں کہ اب بھی تمہاری بیوی کے دل میں تمہارے لیے ہے۔''

''محبت..... میرے لیے؟'' وہ ہلکی آواز میں رونے لگا اور اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ ''اس کے دل میں میرے لیے کیسی محبت ہے؟ تم جانتے ہو کہ کیا کہہ رہے ہو؟''

''جتنا تم سمجھ رہے ہو، میں اس سے زیادہ جانتا ہوں ورنہ میں یہاں نہ آتا۔ کیا تم اس سے انصاف نہیں کرو گے؟''

''تمہارا کیا مطلب ہے؟ تم تو اسے جانتے بھی نہیں۔''

فادر گریگوری نے چند قدم آگے بڑھ کر کہا۔ ''میں ابھی اس سے مل کر آرہا ہوں۔''

''وہ نہیں جانتی کہ میں یہاں ہوں پھر وہ تمہیں کیسے بتا سکتی ہے کہ مجھے کہاں تلاش کرنا ہے؟''

''اس نے نہیں بتایا۔'' فادر گریگوری نے کہا۔ ''وہ سمجھتی ہے کہ تمہیں ٹمی پر شک ہے اور تم شاید اسے نقصان پہنچا سکتے ہو۔ بہرحال اس کے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہیے۔''

''فادر.....؟'' ٹمی گڑگڑایا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

''تم چپ رہو۔'' جیک نے اسے گڑیا کی طرح ہلایا۔

''میں انسانی فطرت کی کمزوریوں سے بخوبی واقف ہوں۔'' فادر گریگوری نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''لہٰذا جب اس نے مجھے اس پراپرٹی کے حوالے سے ٹمی پر تمہاری غیر متوقع مہربانی کے بارے میں بتایا تو میں نے فوراً ہی اس سے نتیجہ اخذ کرلیا، لیکن یہ اتنا اہم نہیں ہے۔ اس نے جو مجھے بتایا، وہ زیادہ اہم ہے۔''

''اس نے تم سے کیا کہا؟''

''یہی کہ وہ اعتراف کرنا چاہتی ہے۔''

''اعتراف.....؟ اس نے کیا کہا؟''

''وہ میں ابھی نہیں جانتا۔ ہماری ملاقات چند گھنٹوں بعد ہوگی۔''

''پھر تم واقعی کچھ نہیں جانتے۔'' جیک غرایا۔ ''اور اگر تم نے اس جانب ایک قدم اور بڑھایا تو میں اس کتے کے بچے کو ریلنگ سے نیچے پھینک دوں گا۔''

فادر گریگوری نے کہا۔ ''میں یہ جانتا ہوں کہ جب کوئی اعتراف کرنے کے لیے کہتا ہے تو وہ خدا کے سامنے ندامت اور شرمندگی کا اظہار کر رہا ہوتا ہے۔ اس کا کوئی محرک نہیں ہوتا۔ ہم پادریوں کے پاس اتنی طاقت نہیں کہ کسی کو اس عمل کے لیے مجبور کرسکیں۔ بہرحال ہماری یہ خواہش ہوتی ہے۔''

''نہیں مسٹر جیک! اس عمل کا تعلق انسان کی مرضی سے ہے اور جب تمہاری بیوی نے اس کی درخواست کی تو ہم دونوں سمجھ گئے کہ یہ ندامت اور معافی کی خواہش اس عمل کا پہلا حصہ ہے۔ اس کا دوسرا حصہ اس عمل کو چھوڑ دینے کا وعدہ ہے جس سے خود انہیں اور دوسروں کو نقصان پہنچا۔'' یہ کہہ کر اس نے گہرا سانس لیا اور بولا۔ ''اب تم سمجھ گئے کہ اس کی درخواست کیوں اہم ہے؟''

''وہ اسے چھوڑ رہی ہے؟'' جیک نے ٹمی کو کسی خرگوش کی طرح ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کیا وہ مجھ سے محبت کرتی ہے؟ کیا تم یہی بات کہہ رہے ہو؟''

''یقیناً میری بڑی خواہش ہے کہ ہاں کہوں لیکن نہیں کہہ سکتا۔ سچ کی بڑی اہمیت ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ آسان نہ ہو لیکن اس کے بغیر ہم صحیح اور غلط کا انتخاب نہیں کرسکتے۔ لہٰذا میں نہیں بتاؤں گا کہ تم کیا سننا چاہتے ہو۔ تمہیں صرف سچ کی بنیاد پر صحیح انتخاب کرنا ہے۔''

اس نے مسکراتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ''بہرحال میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ڈورا وہ کرنا چاہتی ہے جو صحیح ہے اور اس کے لیے یقیناً اسے ٹمی سے پیٹھ موڑنا

پڑے گی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کے نتیجے میں تم دونوں کے درمیان زیادہ مخلصانہ تعلق قائم ہو جائے گا۔ بہر حال میں اس کے لیے دعا کروں گا لیکن اسے ممکن بنانے کے لیے تمہیں ٹم کے خون سے اپنے ہاتھ نہیں رنگنے چاہئیں۔''

جیک نے کپکپاتے ہوئے ٹم کی طرف دیکھا۔

''تمہارے اندر ایک روح ہے۔'' فادر گریگوری نے کہا۔ ''ڈورا سے تمہاری محبت اس کا واضح ثبوت ہے۔ اس لیے میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ اس شخص کو آزاد کر دو اور اپنے آپ کو بچا لو۔''

جیک کی آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہو گئے پھر کئی لمحوں بعد ..... اس نے اپنا سر جھکایا اور ٹم کی گردن سے پھندا نکال لیا۔ ٹموتھی نے ایک چیخ ماری اور اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر لڑکھڑاتا ہوا فادر گریگوری کی طرف بڑھا۔

''شکریہ فادر..... شکریہ! تم نے میری جان بچالی۔''

فادر گریگوری نے اس کے کندھے پکڑ کر کہا۔ ''نہیں۔ تم نے اپنی زندگی خدا کے حوالے کر دی اور تمہیں اس کے بدلے میں رحم ملے گا۔ مجھے امید ہے کہ تم اپنے ذہن میں یہ بات رکھو گے اور پولیس کو بھی یہی بتاؤ گے۔ اب میرے ساتھ آؤ۔'' یہ کہہ کر وہ اسے اپنے ساتھ سیڑھیوں سے نیچے لے گیا۔

نیچے پہنچ کر پادری مڑا، اور یہ آواز بلند بولا۔ ''تم بھی میرے ساتھ چلو مسٹر جیک۔ میں تمہیں اتنے بڑے خالی مکان میں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ ہم چیف جولین کے پاس جائیں گے۔ اسے یہ سب بتانا ہوگا۔ وہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کیا کرنا چاہیے۔''

☆☆☆

''یعنی ان دونوں کی ملاقات ڈیون ہاؤس میں ہوئی۔'' انہوں نے جیک کی بوتل سے شراب کے کچھ گھونٹ لیے اور ڈورا کے بارے میں بحث کرنے لگے پھر جیک نے ٹم کی گردن میں پھندا ڈال کر اسے خوفزدہ کیا۔'' چیف جولین نے کہا۔ ''پھر تم وہاں پہنچ گئے اور اس کے بعد ان دونوں نے اچھے شہریوں کی طرح زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا..... کیا میں صحیح سمجھا ہوں؟''

''تم ان دونوں کا بیان لے لو چیف اور جیسا کہ تم نے کہا کہ میں ان کا تنازعہ ختم ہونے پر پہنچا تھا۔''

''کیا تم بیان دینے کو ترجیح نہیں دو گے؟''

''میں بیان نہیں دوں گا۔''

''تمہیں معلوم ہے کہ جیک پلور پر اقدام قتل کا الزام لگنا چاہیے یا نہیں؟''

''میں نے ان دونوں سے یہی کہا تھا کہ چیف جانتا ہے، کیا کرنا بہتر ہے۔''

''میں اس پر شدید حملے کا الزام لگا رہا ہوں۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟''

''اس میں اعتراض والی کوئی بات نہیں۔''

''لیکن تمہیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ اگر ٹم مورس اپنے بیان پر قائم رہا تو پراسیکیوٹر آفس اسے عام حملے میں تبدیل کر دے گا۔''

''سسٹم کو اپنا کام کرنے دو۔''

''کیا واقعی تم یہ چاہتے ہو؟''

دونوں دوست خاموش ہو گئے۔ فادر گریگوری مسلسل دیوار کی طرف دیکھتا رہا جبکہ چیف جولین نے اس کے چہرے پر نظریں جمائی ہوئی تھیں۔

''میں نہیں جانتا کہ تمہارے لیے سٹیزن ایوارڈ کی سفارش کی جائے۔'' چیف نے بالآخر کہا۔ ''یا تم پر انصاف میں رکاوٹ ڈالنے کا الزام عائد کیا جائے۔''

پادری نے اپنے دوست کی طرف دیکھا پھر دوبارہ دیوار پر نظریں جما دیں۔

''لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ اگلے جمعے جب ہم ناشتے پر ملیں گے تو تم کفارے کے طور پر بل ادا کرو گے اور میرا پیٹ بھر کر کھانے کا ارادہ ہے۔''

گریگوری نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''لیکن پیارے دوست! اس سے تو یہ ظاہر ہوگا کہ ایک پولیس آفیسر تحفے وصول کر رہا ہے۔ میں تمہیں کبھی اس پوزیشن میں نہیں دیکھنا چاہوں گا۔''

''اب تم چلے جاؤ پلیز۔''

فادر گریگوری نے دروازے پر پہنچ کر کہا۔ ''ٹھیک ہے پھر اگلے جمعے کی صبح ملاقات ہوگی لیکن تمہیں اپنا بل خود ادا کرنا ہوگا۔ میں اصولوں پر سمجھوتا نہیں کرتا۔''

چیف نے ایک سرد آہ بھری اور بولا۔ ''جیسے تمہاری مرضی۔'' لیکن وہ دل میں یہ اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکا کہ پادری کی کوششوں سے دو زندگیاں تباہ ہونے سے بچ گئیں ورنہ جیک اپنے رقیب کو موت کے گھاٹ اتار دیتا اور خود عمر بھر کے لیے جیل چلا جاتا۔ واقعی پادری نے ایک زبردست کارنامہ انجام دیا تھا جس پر وہ یقیناً سٹیزن ایوارڈ کا مستحق تھا۔

⌘⌘⌘

شہ زور

اسما قادری

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنونِ حرب وضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابلِ شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے والے اس پُرعزم نوجوان کو حرفِ غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جارہے تھے... اس کی زندگ جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تارِ عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چُور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہوسکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان

دھائیں، دھائیں، دھائیں..... ایک تسلسل سے ہونے والی فائرنگ کی کان پھاڑ آوازوں کے درمیان فائر کرنے والا کامل سکون کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کا پورا جسم ساکت تھا اور گن کی لبلبی پر موجود انگلی اس کے جسم کا وہ واحد عضو تھا جسے اس وقت متحرک دیکھا جا سکتا تھا۔ اس انگلی کی ہر حرکت کے ساتھ نکلنے والی کسی گولی نے اپنا نشانہ خطا نہیں کیا تھا اور مشین کا دھکیل کر سامنے لایا جانے والا ہر تازہ پتلا نشانہ بنتا جا رہا تھا۔ پورے آٹھ پتلوں کو نشانہ بنانے کے بعد اس کی انگلی غیر متحرک ہوئی اور باقی جسم میں تحرک پیدا ہوا۔ ہاتھ میں موجود آٹھ گولیوں والی گن کو ایک اسٹینڈ پر رکھ کر وہ کانوں پر موجود ہیڈ فون نما ایئر پروٹیکشن اتارنے لگا۔

''ویری ویل ڈن معاذ!'' ایئر پروٹیکشن اتار کر وہ دو قدم ہی چلا تھا کہ سر صفات اس کے سامنے آن کھڑے ہوئے اور اسے ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کے لیے تعریفی کلمات ادا کیے۔

''تھینک یو سو مچ سر! سارا آپ کی تربیت کا کمال ہے۔'' اس نے سر کو ہلکا سا خم دیتے ہوئے انکساری سے جواب دیا۔

''تربیت اپنی جگہ لیکن جب تک شاگرد ہونہار نہ ہو' استاد کے لیے اپنے ہنر کی منتقلی آسان نہیں ہوتی۔ تم نے جتنے کم وقت میں عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے' ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔'' سر صفات نے کھل کر اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا۔

''شاگرد کے اندر پورے خلوص اور دیانت داری سے اپنا ہنر منتقل کرنے والے اساتذہ بھی شاذ شاذ ہی ہوتے ہیں سر اور میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے ایک مخلص شخص کی سرپرستی میسر آئی ہے۔'' معاذ نے اس بار بھی انکساری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ تعریف وہ شے تھی جس سے اس کا قدم قدم پر واسطہ پڑتا تھا اور اب وہ اس کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ کسی نئی تعریف کو سن کر پھول کر کپا بننے کی نوبت نہیں آتی تھی۔

''باصلاحیت ہو اور باظرف بھی اس لیے امید رکھی جا سکتی ہے کہ زندگی میں بہت ترقی کرو گے۔ وش یو بیسٹ آف لک معاذ!'' سر صفات جو اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہے تھے، برآمدے کے آخری سرے پر پہنچ کر رک گئے۔ معاذ نے بھی احتراماً اپنے قدم روک لیے اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ان کی بات سنتا رہا۔ بات کے اختتام پر سر صفات نے اس کا شانہ دھیرے سے تھپکا اور ایڈمنسٹریشن سائڈ پر جانے والے راستے کی طرف بڑھ گئے۔ ان کے جانے کے بعد معاذ بھی حرکت میں آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنی بائیک پر سوار سڑک پر اڑا جا رہا تھا۔ اس کا موڈ خاصا خوشگوار تھا اس لیے ہونٹ ایک شوخ سی دھن پر وسلنگ کر رہے تھے۔ آگے ٹریفک جام دیکھ کر مزاج کی شوخی اور خوشگواری ماند پڑ گئی۔ اسے ایک جگہ پہنچنے کی جلدی تھی اور آگے راستہ ہی بند پڑا ہوا تھا۔

''کیا مسئلہ ہے؟'' اس نے کسی نہ کسی طرح پلٹ کر واپس آتے ایک موٹر سائیکل سوار سے پوچھا۔

''بجلی کی مسلسل بندش پر احتجاج کے لیے لوگوں نے سڑک بلاک کی ہوئی ہے اور ٹائر وغیرہ جلا کر حکومت اور بجلی کے محکمے کے خلاف نعرے بازی کر رہے ہیں۔'' اس شخص نے جواب دیا اور اپنی موٹر سائیکل نکال کر لے گیا۔ معاذ نے بھی واپس پلٹ جانے میں ہی عافیت جانی۔ کچھ پیچھے جانے کے بعد اس نے موٹر سائیکل ایک ذیلی سڑک پر موڑ لی۔ یہ ایک رہائشی علاقے سے گزرنے والی سڑک تھی جس پر سفر کر کے اپنی منزل پر پہنچنے میں اس کا زیادہ وقت خرچ ہوتا لیکن موجودہ صورتِ حال میں اس کے پاس کوئی دوسرا آپشن موجود نہیں تھا۔ اس سڑک پر سفر کرنے میں ایک مثبت پہلو یہ تھا کہ ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا اس لیے بہت تیزی سے سفر کر سکتا تھا اور وہ یہی کر رہا تھا کہ راستے میں اچانک ہی ایک رکاوٹ حائل ہو گئی۔ وہ دو موٹر سائیکل سوار تھے جو پہلے اسے اوورٹیک کرتے ہوئے آگے نکلے اور پھر اس کی راہ میں حائل ہو گئے۔ معاذ کی نظروں نے فوراً ہی پچھلے سوار کے ہاتھ میں موجود قاتل نائن ایم ایم کی جھلک دیکھ لی۔ یہ اسٹریٹ کرمنلز اور ٹارگٹ کلرز کا من پسند ہتھیار تھا جسے وہ کسی کھلونے کی طرح استعمال کرتے تھے اور انسانی زندگیوں کو کیڑے مکوڑوں سے بھی زیادہ حقیر گردانتے تھے۔

معاذ کو طوعاً و کرہاً اپنی بائیک کو بریک لگانے پڑے۔ اس کے رکتے ہی راستہ روکنے والی بائیک کا پچھلا سوار اپنا پسٹل لہراتا ہوا نیچے اترا اور بھاگ کر اس کے سر پر آ سوار ہوا۔

''بائیک کھڑی کر کے نیچے اتر جا۔'' وہ لڑکا جس کی عمر بمشکل اٹھارہ انیس سال تھی، نہایت بدتمیزی سے دہاڑا لیکن اس کی حرکات و سکنات میں موجود اضطراب اس امر کا غماز تھا کہ اسے اس ''فیلڈ'' میں آئے زیادہ وقت نہیں گزرا اور ابھی وہ تجربے کے اعتبار سے ''کچا'' ہے۔ ایسے ''کچے بندے'' زیادہ پینک ہوتے ہیں اور ان کے ہاتھ میں ہتھیار زیادہ خطرناک ثابت ہوتا ہے اس لیے معاذ نے کسی بحث مباحثے میں پڑنے کی کوشش نہیں کی اور خاموشی سے بائیک

چھوڑ کر اتر گیا۔

''اپنا موبائل اور والٹ بھی نکال..... جلدی کر۔''

لڑکے نے ایک اور حکم صادر کیا۔ معاذ نے فرمانبرداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے پینٹ کی بائیں جیب میں ہاتھ ڈال کر پہلے والٹ برآمد کیا اور پھر دائیں جیب سے موبائل باہر نکالا۔ دونوں چیزیں نکال کر اس نے یوں بیک وقت دونوں ہاتھ آگے بڑھائے جیسے لڑکے کو موبائل اور والٹ تھمانا چاہ رہا ہو۔ ثانیے بھر کے لیے لڑکے کی توجہ اس کے ہاتھوں کی طرف مبذول ہوگئی اور یہی وہ وقت تھا جب معاذ کی ٹانگ حرکت میں آئی۔ لڑکے کا پسٹل والا ہاتھ اس کی ٹانگ کا نشانہ تھا۔ ایک بھرپور ضرب نے اس کے ہاتھ سے پسٹل نکال دیا اور وہ ذرا سا لڑکھڑایا۔ پسٹل زور میں پتا نہیں کہاں جا گرا تھا۔ معاذ نے فوراً ہی موبائل اور والٹ ہاتھ سے چھوڑ دیے اور لڑکے کے سنبھلنے سے پہلے اس کے منہ پر ایک عدد گھونسا رسید کر دیا۔ اپنے ساتھی کی درگت بنتے دیکھ کر ابھی تک موٹر سائیکل پر براجمان ہیلمٹ پوش کے لیے اپنی جگہ ٹھہرا رہنا ممکن نہ رہا اور وہ پشت پر سے تیزی سے معاذ کی طرف جھپٹا۔ معاذ اس کے ردِعمل کی طرف سے غافل نہیں تھا اس لیے پھرتی سے ایڑی کے بل گھوما اور ایک عدد گھونسا ہیلمٹ پوش کے پیٹ میں رسید کیا۔ اس اثناء میں پہلے والے کو سنبھلنے کا موقع مل چکا تھا۔ وہ حرکت میں آیا اور کسی چونک کی طرح پیچھے سے معاذ کے ساتھ چمٹ گیا۔ اس کے تربوز جیسے سر کی ضرب گردن پر کھا کر لمحے بھر کے لیے معاذ کی آنکھوں کے آگے تارے سے ناچ گئے لیکن پھر اس نے بڑی تیزی سے خود کو سنبھال لیا اور یہ سنبھلنا بڑا بروقت تھا۔ پیٹ میں گھونسا کھا کر دہرا ہو جانے والا ہیلمٹ پوش موقع کا فائدہ اٹھا کر اپنی ٹانگ کے ساتھ بندھا خنجر نکال چکا تھا اور ایک وحشیانہ دہاڑ کے ساتھ اس پر حملہ آور ہو رہا تھا۔

درمیانی فاصلہ مختصر تھا اور معاذ کے پاس بہت کم مہلت تھی۔ اس نے فوری اور تیز رفتار ردِعمل ظاہر کیا اور پوری قوت صرف کر کے خود سے چمٹی جونک سمیت گھوم گیا۔ گھومنے کے ساتھ ہی اس نے دونوں کہنیوں کی ضرب اس کی پسلیوں میں رسید کی۔ ردِعمل اس کی توقع سے زیادہ شدید تھا۔ اس نے اپنی پشت سے چمٹے لڑکے کی ایسی دلدوز چیخ سنی جیسے اسے ذبح کیا جا رہا ہو۔ چیخ کے ساتھ ہی اس کی معاذ پر سے گرفت بھی ڈھیلی پڑ گئی۔ معاذ تیزی سے اچھل کر اس سے دور ہٹا۔ اس وقت اس نے دیکھا کہ لڑکا سڑک پر گرا ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہا ہے اور اس کی پشت سے خون نکل کر سڑک پر بہہ رہا ہے۔ معاذ کے گھوم جانے کی وجہ سے وہ اپنے ہی ساتھی کے چلائے گئے خنجر کے نشانے پر آ گیا تھا۔ اس کی اس حالت پر پہلے تو ہیلمٹ پوش ششدر سا کھڑا رہ گیا پھر اسے احساس ہوا کہ بازی مکمل طور پر پلٹ چکی ہے اور کھڑا رہنے کے مقابلے میں فرار ہو جانا زیادہ بہتر حکمتِ عملی ہے۔ اس نے اپنی موٹر سائیکل کی طرف دوڑ لگائی۔ معاذ نے بھی اپنی جگہ سے جست بھری اور اس کی ٹانگ میں ٹانگ اڑانے میں کامیاب رہا۔ ہیلمٹ پوش خود کو سنبھال نہیں سکا اور منہ کے بل سڑک پر گر پڑا۔ ہیلمٹ کی موجودگی نے اس کا منہ تو محفوظ رکھا لیکن فوراً ہی دوسری مشکل میں گرفتار ہو گیا۔ سڑک پر سے گزرنے والے اِکا دُکا راہ گیروں اور سواروں نے صورتِ حال کو قابو میں دیکھ کر اس معاملے میں مداخلت کی جرأت کر ڈالی تھی اور وہ ہیلمٹ پوش کو گھیر چکے تھے۔ اس منظر کو دیکھ کر معاذ پیچھے ہٹ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ ''چندے کی مار'' ہیلمٹ پوش کا نصیب بن چکی ہے اور اس مار کے بعد اس کا وہ حشر ہونے والا ہے کہ اس کی ماں بھی مشکل ہی سے اسے شناخت کر سکے گی۔

عوام کو اس ''کارِ خیر'' میں مصروف چھوڑ کر اس نے سڑک پر گرا اپنا والٹ اور موبائل اٹھایا۔ موبائل کی چٹخی ہوئی اسکرین دیکھ کر اسے تھوڑا سا تاسف ہوا لیکن یہ نقصان اس نقصان کے مقابلے میں بہت کم تھا جو ان اسٹریٹ کرمنلو کے ہاتھوں خاموشی سے لٹ جانے کی صورت میں اس کے حصے میں آتا۔ اس نے دل ہی دل میں شکر کا کلمہ ادا کرتے ہوئے دونوں چیزیں دوبارہ جیبوں میں منتقل کیں اور بائیک پر جا بیٹھا۔ وہاں اب تک ہنگامہ جاری تھا۔ ہیلمٹ پوش کی جوش و خروش سے تواضع کرتے لوگوں کی آوازوں کے ساتھ زخمی لڑکے کی چیخوں کے شامل ہو جانے سے منظر خاصا دہشت ناک ہو گیا تھا۔ معاذ نے بائیں جانب موجود کار سوار کو موبائل فون پر کسی سے بات کرتے دیکھا اور موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے جس جگہ پہنچنے کی جلدی تھی، اب وہاں پہنچنے کے بجائے پولیس کی کارروائی کا سامنا کرنا ہے۔ اس کارروائی میں اسے کوئی نقصان پہنچنے کا تو اندیشہ نہیں تھا لیکن اس کا طے شدہ شیڈول بہرحال برباد ہو چکا تھا۔

توقع کے مطابق تھوڑی دیر میں پولیس وہاں پہنچ گئی۔ اتنی دیر میں وہاں ہجوم میں کافی اضافہ ہو چکا تھا۔ دو چار بزرگ حضرات کی مداخلت پر ہیلمٹ پوش کے ساتھ مار پیٹ کا سلسلہ بھی روکا جا چکا تھا اور اب وہ بندھے ہوئے

ہاتھ پیروں کے ساتھ ابتر حالت میں اپنے زخمی ساتھی سے کچھ فاصلے پر پڑا ہوا تھا۔ پولیس اور ایمبولینس کی آمد بیک وقت ہوئی۔ زخمی نوجوان کو تھوڑی احتیاط سے ایمبولینس میں منتقل کر کے اسپتال روانہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد پولیس والے ہجوم سے واقعے کی تفصیل معلوم کرنے لگے۔ ایک تیس پینتیس سالہ شخص جس کے کپڑوں پر کتھے چونے کے دھبے لگے ہوئے تھے، پُرجوش انداز میں واقعے کی تفصیلات بیان کرنے لگا۔ تفصیل سنتے ہوئے پولیس والے مسلسل معاذ کو گھورتے رہے۔

''خبیث ایسے گھور رہے ہیں جیسے خود کو لٹنے سے بچا کر میں نے کوئی جرم کر ڈالا ہے۔'' ان کے انداز کو محسوس کر کے معاذ دل ہی دل میں بڑبڑایا۔

''تو تم نے اس لڑکے کو خنجر سے اتنا مہلک زخم لگایا ہے۔ کچھ اندازہ ہے تمہیں کہ اگر لڑکا زیادہ خون بہنے کی وجہ سے مر مرا گیا تو تم پر قتل کا کیس بن سکتا ہے۔'' اس پولیس پارٹی کو لیڈ کرنے والے اے ایس آئی نے یہ جملہ بول کر معاذ کا فیوز ہی اڑا دیا۔ وہ وکٹم تھا اور یہاں اسے ہی ڈرایا دھمکایا جا رہا تھا۔

''میں نے اس لڑکے کو زخمی نہیں کیا۔ وہ اپنے ساتھی کے خنجر سے زخمی ہوا ہے۔'' غصہ آنے کے باوجود اس نے ضبط سے کام لیا اور صورتِ حال کی وضاحت کی۔

''ابھی اس آدمی نے بتایا کہ لڑکے کو تم سے مقابلے کے دوران زخم لگا ہے۔ تم اتنی آسانی سے گواہ کو کیسے جھٹلا سکتے ہو؟'' پولیس والا اس کی وضاحت کو کسی خاطر میں نہیں لایا۔

''ان بھائی صاحب نے یہ بتایا ہے کہ لڑکا مجھ سے لڑنے کے دوران زخمی ہوا ہے، یہ نہیں کہا کہ اس پر خنجر سے وار کرنے والا میں تھا۔'' پولیس والوں کو خوامخواہ اپنے گلے پڑتے دیکھ کر اس کے غصے میں اضافہ ہو گیا جس کے باعث آواز بھی معمول سے کافی بلند ہو گئی۔

''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے سر! خنجر اس کے پاس نہیں بلکہ.....'' اس موقع پر پولیس کو بیان دینے والے شخص نے بھی مداخلت کر کے صورتِ حال کو واضح کرنے کی کوشش کی لیکن اسے ڈپٹ دیا گیا۔

''چپ کراوئے! جب تجھ سے بولنے کو کہا جائے تب بولنا۔''

''اگر آپ کو میری بات پر یقین نہیں تو خنجر پر سے فنگر پرنٹس اٹھوا کر تصدیق کر لیجیے گا۔ فنگر پرنٹس کی رپورٹ سے ثابت ہو جائے گا کہ اس لڑکے پر خنجر چلانے والا میں نہیں بلکہ یہ شخص تھا۔'' معاذ نے ایک بار پھر اپنے غصے کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک عقلی دلیل پیش کی اور ہیلمٹ پوش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ لوگوں نے مار پیٹ کے دوران اس کا ہیلمٹ اتار کر پھینک دیا تھا اور اس بیس بائیس سالہ لڑکے کے چہرے پر بھی عوام کی ''شفقت'' کی نشانیاں چند نیل کے نشانات اور پھٹے ہوئے ہونٹ کی صورت میں دکھائی دے رہی تھیں لیکن اب وہ زیادہ سراسیمہ محسوس نہیں ہو رہا تھا اور یوں لگتا تھا کہ پولیس کی موجودگی اسے تقویت پہنچا رہی ہو۔ معاذ کا ماتھا ٹھنکا۔ پولیس اور جرائم پیشہ افراد کے گٹھ جوڑ کی داستانوں سے تو وہ بھی خوب واقف تھا۔

''اب تیرے جیسا کل کا لونڈا ہمیں بتائے گا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔ ہم تو وہ ہیں بچو کہ بغیر کسی ماہر کے رپورٹ پیش کیے صرف ہاتھ دیکھ کر بتا سکتے ہیں کہ کس کے فنگر پرنٹس کہاں موجود ہو سکتے ہیں۔'' نہایت استہزائیہ لہجے میں یہ جملے کہتے ہوئے ایک پولیس والے نے جھپٹ کر معاذ کا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے چہرے کے نزدیک لے گیا۔ یکدم ہی اس کے نتھنے پھڑکنے لگے۔

''اوئے..... تیرے ہاتھ سے تو بارود کی بو آ رہی ہے۔ کہاں واردات کر کے آ رہا ہے؟'' وہ یوں چیخا جیسے ارشمیدس پہلی بار ''اچھال'' کی قوت دریافت کرنے پر چیخا ہوگا۔

''میں ایک شوٹنگ کلب کا ممبر ہوں اور سیدھا وہیں سے آ رہا ہوں، اسی لیے آپ کو میرے ہاتھ سے بارود کی بو آ رہی ہے۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی معاذ کو ان پولیس والوں کے سامنے صفائی دینی پڑی جن کے رویے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس سے زیادہ مجرموں کے حمایتی ہیں۔

''یہ ساری کہانیاں تھانے چل کر سنانا بچو! وہاں ہمارے پاس کہانیوں کی حقیقت تک پہنچنے کا پورا پورا انتظام ہے۔'' اے ایس آئی کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی تھی اور وہ معاذ کو ان نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے قصائی بکرے کو دیکھتا ہے۔

''میں نہیں جاؤں گا تھانے۔ میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں کہ تم ان لٹیروں کے سرپرست ہو اور اپنے شاگردوں کی ناکامی کا بدلہ لینے کے لیے مجھے تھانے لے جانا چاہتے ہو۔'' معاذ ہر طرح کی مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر حلق کے بل دہاڑا تو پولیس والوں کے چہروں کے زاویے پہلے سے بھی زیادہ بگڑ گئے۔

''سرِعام پولیس پر جھوٹے الزامات لگاتا ہے۔ تلاشی

لواس کی اور ہتھکڑی لگا کر موبائل میں ڈالو۔ تھانے جا کر اس پھنے خان کو خود پتا چل جائے گا کہ یہ کتنے پانی میں ہے۔'' معاذ کے حساب سے جس کارروائی میں اسے نقصان کا کوئی اندیشہ نہیں تھا، وہ کارروائی اس کے گلے پڑ گئی تھی۔

''تمہیں اس پولیس گردی کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔ تم پبلک کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اس طرح مجھے ایک غلط الزام میں اٹھا کر نہیں لے جا سکتے۔'' معاذ نے شور مچانا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی ہاتھ پیر بھی چلانا شروع کر دیے۔ اس کا پہلا مکا اس پولیس والے کی ناک پر پڑا جو ہتھکڑی اس کے ہاتھ میں ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوسرے مکے نے اپنے ساتھی کی معاونت کے لیے آگے بڑھ کر آنے والے کے جبڑے کا مزاج پوچھا لیکن اس سے آگے اس کی کوئی پیش نہ چلی کہ یکدم ہی دو رائفلوں کی نالیں اس کے جسم سے آ لگی تھیں اور وہ کتنا ہی جوشیلا سہی، اس بات کو اچھی طرح سمجھتا تھا کہ چند چھٹانک کا بارود جسم میں داخل ہو گیا تو اس کے پاس کسی جدوجہد کی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ پولیس گردی کے متعدد واقعات اس کے بھی علم میں تھے اور وہ جانتا تھا کہ یہ پولیس والے چاہیں تو ابھی اسے چھلنی کر کے واقعے کو پولیس مقابلے کا رنگ دے دیں گے۔ اس نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ''بٹھاؤ اس رستم کو گاڑی میں۔ ابھی تھانے جا کر اس کی طرم خانی..... کے راستے باہر نکالتے ہیں۔'' وہ لوگ اسے رائفلوں کے بٹ مارتے ہوئے موبائل کی طرف لے جانے لگے۔ ازراہ تکلف ہیلمٹ والے لڑکے کو بھی ساتھ بٹھا لیا گیا اور سیکنڈوں میں پولیس موبائل دھول اڑاتی چہ میگوئیاں کرتی عوام کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔

''یہ صاف غنڈا گردی ہے۔'' سڑک کنارے موجود پان کے کھوکھے کا مالک جو ابتدا سے پورے واقعے کا چشم دید گواہ تھا، بلند آواز میں بولا اور اپنے موبائل پر بنائی جانے والی ویڈیو وہاں موجود افراد کو دکھانے لگا۔ ذرا دیر میں وہ ویڈیو بہت سے افراد کے ساتھ شیئر کی جا چکی تھی۔

☆☆☆

''چل کاکے اندر جا اور فائیو اسٹار ہوٹل کے مزے اڑا۔'' لاک اپ کا دروازہ کھول کر اس سے طنزیہ لہجے میں کہنے کے ساتھ ہی اس کی پشت پر اتنی زوردار لات رسید کی گئی کہ وہ اپنے قدموں کو حرکت کی زحمت دیے بغیر ہی کھلے دروازے سے لاک اپ کے اندر جا گرا۔ وہاں پہلے ہی چار پانچ افراد موجود تھے۔ ان افراد نے اس کے اس طرح اندر آ گرنے پر ایک استہزائیہ قہقہہ لگایا۔

''ابھی فائیو اسٹار رہائش کے مزے لوٹ پھر تیری فائیو اسٹار خاطر تواضع بھی کریں گے۔'' لاک اپ بند کرتے ہوئے گہری سانولی رنگت والے پولیس والے نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے اطلاع دینی ضروری سمجھی۔ معاذ جو اتنی دیر میں اٹھ کر بیٹھ چکا تھا، خاموش رہا۔ جائے وقوعہ سے تھانے تک کے مختصر فاصلے میں اس کی اچھی خاصی گت بنائی جا چکی تھی۔ اس کی شرٹ کا کالر پھٹ چکا تھا اور ٹھوڑی پر نیل کا ایک نشان نظر آ رہا تھا۔

''اس چڑے کو کہاں سے اٹھا لائے ہو بادشاہو! کہیں کسی لڑکی کو آنکھ مار رہا تھا یا غلطی سے تمہاری موبیل (موبائل) کے آگے سے گزر گیا تھا؟'' لاک اپ میں بند افراد میں سے بڑی بڑی مونچھوں والے ایک شخص نے معاذ پر تمسخرانہ نگاہ ڈالی اور اسے بند کرنے والے سپاہی سے بے تکلفی سے پوچھنے لگا۔

''اسے معمولی نہ جانو استاد۔ یہ بڑا پھنے خان ہے۔ تمہارے دو بندوں کو اکیلے لمبا لٹایا ہے اس نے اور پولیس والوں پر ہاتھ اٹھانے کا کارنامہ بھی انجام دیا ہے۔ اسے تو اس کی جرأتوں پر بھی تمغوں سے نوازا جائے گا۔'' سپاہی نے جواباً جس بے تکلفی کا مظاہرہ کیا، اس سے اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ سرراہ معاذ کو لوٹنے کی کوشش کرنے والوں اور پولیس میں گہرا گٹھ جوڑ موجود ہے۔

''بلے بھئی بلے۔ پھر تو یہ سچ مچ بڑی اونچی چیز ہے۔'' اس بار بڑی مونچھوں والے استاد نے معاذ کو جانچنے والی نظروں سے دیکھا۔ معاذ نے ناپسندیدگی کے اظہار کے لیے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

''ذرا ادھر تو دیکھ کاکا! اتنی بھی بری شکل نہیں ہماری کہ تو نظر بھر کر دیکھنا بھی گوارا نہ کرے۔'' استاد کو اس کا منہ موڑنا گراں گزرا اور اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ جما کر زبردستی اس کا رخ اپنی طرف موڑا۔ اس کی گرفت میں اتنی سختی تھی کہ معاذ کو اس کی انگلیاں گڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

''دور ہٹ کر بیٹھو۔'' اسے استاد کی حرکت پر طیش آ گیا اور ایک جھٹکا دے کر اس کا ہاتھ اپنے چہرے سے دور ہٹا دیا۔ استاد کو شاید اس جھٹکے کی توقع نہیں تھی، سو اس کا توازن بگڑ گیا۔

''تیری تو ماں .....'' استاد کی یہ بے عزتی اس کے چیلوں سے برداشت نہیں ہوئی اور وہ مغلظات بکتے ہوئے اس پر جھپٹے۔ معاذ کے لیے اس صورت حال میں اپنی جگہ بیٹھے رہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ کسی اسپرنگ کی طرح اچھل کر اپنی

جگہ سے کھڑا ہوا اور خود کو مکا رسید کرنے کی کوشش کرنے والے کی کلائی پر ہاتھ ڈال کر اسے ناکامی سے ہمکنار کرنے کے ساتھ ساتھ دوسری جانب سے حملہ آور ہونے والے کو ایک لات بھی رسید کی تاہم اس دوران تیسرے کو موقع مل گیا اور اس نے معاذ کی کمر پر ایک لات دے ماری۔ اس کے بعد تو جیسے لاک اپ میں بھونچال ہی آ گیا۔ ایک طرف معاذ تھا اور دوسری طرف استاد کے تینوں گرگے۔ وہ بڑھ بڑھ کر اس پر حملے کر رہے تھے اور وہ اپنا دفاع کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں ٹھیک ٹھاک ضربیں بھی لگا رہا تھا لیکن بہرحال وہ تین تھے اور اسے بھی ان کے ہاتھوں چوٹیں کھانی پڑ رہی تھیں۔ بڑی بڑی مونچھوں والے استاد نے اس ہنگامے میں حصہ نہیں لیا تھا اور دیوار سے ٹیک لگائے دلچسپی سے اپنے ساتھیوں اور اسے لڑتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

''او بھین..... ماں کے..... یہ تھانہ ہے کوئی اکھاڑا نہیں جو تم حرام کے جنے سانڈوں کی طرح ایک دوسرے کو ٹکریں مار رہے ہو۔'' لاک اپ کے باہر کھڑا سپاہی چند ثانیوں کے لیے تو دم بخود کھڑا یہ منظر دیکھتا رہا پھر مغلظات بکتے ہوئے سلاخوں پر ڈنڈا مار کر چلانے لگا۔ شور شرابا سن کر دو تین مزید پولیس والے وہاں دوڑے چلے آئے۔

''اوئے استاد! بند کرواؤ یہ نوٹنکی۔ ایک آدھ کھسک گیا تو خوامخواہ پولیس کے گلے میں مصیبت آ جائے گی کہ ہم نے تشدد سے حوالاتی کو مار ڈالا۔'' بھاگ کر آنے والوں میں وہ اے ایس آئی بھی شامل تھا جس نے معاذ کو تھانے لانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اسی نے برہم لہجے میں استاد کو مخاطب کر کے یہ حکم صادر کیا تھا۔

''بس کرو اوئے۔ ختم کرو تماشا۔'' استاد نے اے ایس آئی کی فرمائش پر اپنے گرگوں کو ڈپٹ کر حکم دیا تو وہ پیچھے ہٹ گئے۔ معاذ بھی ایک بانچھ سے نکلنے والا خون آستین سے صاف کرتا ہوا ایک دیوار سے جا لگا۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے لیے صورتِ حال گمبھیر سے گمبھیر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ذرا سی دیر میں اس نے پولیس والوں کے ساتھ ساتھ ان غنڈوں سے بھی دشمنی مول لے لی تھی اور اب اسے اپنا مستقبل خاصا مخدوش نظر آ رہا تھا۔

''ذرا باہر تو نکالو اس طرم خان کو۔ ذرا ہم بھی تو آزمائیں کہ اس کے اندر کتنا زور ہے۔ ڈرائنگ روم میں الٹا لٹکا کر ایسی چھترول کریں گے سالے کی کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔'' صورتِ حال معمول پر آتی دیکھ کر اے ایس آئی نے غضب ناک لہجے میں سپاہی کو حکم دیا۔ سپاہی اس حکم پر عملدرآمد کرتا اس سے قبل ہی ''صاحب'' کی آمد کا غلغلہ مچ گیا۔

''پہلے ایس ایچ او صاحب سے ملاقات کرلوں پھر تیرے کس بل نکالتا ہوں۔'' اے ایس آئی نے دانت کچکچاتے ہوئے معاذ کو دھمکی دی اور وہاں سے ہٹ گیا۔ مضطرب سا معاذ بھی جس جگہ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا، وہیں بیٹھ گیا۔ وہ اپنے آپ کو ایک جھمیلے میں پھنسا چکا تھا اور کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ لاک اپ میں استاد اور اس کے گرگے اس کے مقابل بیٹھے ہوئے تھے گرگے مسلسل اسے کینہ توز نظروں سے دیکھ رہے تھے البتہ استاد کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ اچانک ہی لاک اپ کھولے جانے کی آواز سن کر دونوں فریقین اس طرف متوجہ ہوئے۔ وہی ہیلمٹ والا لڑکا جس نے اپنے ساتھی کے ساتھ مل کر معاذ کو لوٹنے کی کوشش کی تھی، اندر داخل کیا جا رہا تھا۔ لڑکے کی مرہم پٹی کی جا چکی تھی اور وہ خاصی بہتر حالت میں نظر آ رہا تھا۔ لاک اپ میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر معاذ پر پڑی تو وہ طیش سے چیختا ہوا اس کی طرف لپکا۔

''اوئے بس رہنے دے۔ تیری مردانگی کی مزید نشانیاں نہیں دیکھنی ہیں میں نے۔'' استاد کی دہاڑ نے اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک لیا اور وہ استاد کی طرف رخ کر کے ایسے تاثرات سے اسے دیکھنے لگا جیسے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتا ہو لیکن پھر شاید استاد کے رعب کے آگے اسے زبان کھولنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ استاد نے اسے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا اور واقعے کی تفصیلات پوچھنے لگا۔

''راجو ابھی کچا ہے۔ اسے ساتھ نہیں لینا چاہیے تھا تجھے۔ ہے بھی سالا چھ بہنوں کا اکلوتا بھائی۔ کچھ ہو گیا تو قیامت ٹوٹ پڑے گی اس کے گھر والوں پر۔'' پہلی نظر میں سخت گیر نظر آنے والے استاد کی نظروں میں اپنے ساتھی کے لیے تفکر تھا۔ اسی عالمِ تفکر میں اس نے معاذ پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور لاک اپ سے کچھ فاصلے پر بیٹھے سپاہی کو آواز دینے لگا۔

''کیا بات ہے استاد۔'' سپاہی گویا کچے دھاگے سے بندھا چلا آیا۔

''فون کرنا ہے۔'' استاد نے اپنی فرمائش بیان کی۔ سپاہی نے بلاتردد اپنی جیب سے موبائل نکال کر اس کے حوالے کر دیا۔ استاد کوئی نمبر ڈائل کر کے بات کرنے لگا۔

''ہاں شوکے! یہ میں ہوں گلو استاد۔ پتا تو تجھے لگ گیا

ہوگا کہ راجو اور انو کے ساتھ کیا لفڑا ہوا ہے۔ وہ سالا راجو اب اسپتال میں پڑا ہے۔ اس کے علاج ولاج کا خیال رکھنا اور اس کے گھر والوں کو بھی خرچے کے لیے تھوڑے پیسے بھجوا دینا۔'' شوکا شاید اس کا نائب تھا جسے ہدایات دینے کے بعد اب وہ دوسری طرف کی بات سن رہا تھا۔

''اور ہاں دیکھ تھانے والوں کے خرچے پانی میں کمی نہیں کرنا۔ ادھر اپنی بڑی اچھی خاطر تواضع ہو رہی ہے، تو بھی ان کو خوش رکھنا۔'' گلو استاد کی دی گئی اس دوسری ہدایت نے سلاخوں کے قریب ہی کھڑے کن سوئیاں لیتے سپاہی کے چہرے کو روشن کر دیا۔ ظاہر ہے تھانے میں پہنچنے والے خرچے پانی میں اس کا بھی حصہ تھا۔

''یہ لو جی سنتری بادشاہ تمہارا فون۔ تم ہمیں خوش رکھتے ہو تو یقین رکھو تمہیں بھی ہم سے خوشی ہی ملے گی۔'' کال نمٹا کر استاد نے موبائل سپاہی کو واپس کر دیا اور چپ چاپ بیٹھے یہ تماشا دیکھتے معاذ کی طرف متوجہ ہوا۔

''تجھے کسی کو مدد کے لیے کال کرنی ہے تو بتا..... ابھی تیری بات کروا دیتا ہوں۔'' چند ثانیے یونہی اسے گھورتے رہنے کے بعد اس نے جو پیشکش کی وہ معاذ کو چونکا گئی۔

''ایسے کیا دیکھ رہا ہے؟ مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ کسی کو بلانا چاہے تو بلا لے ابھی۔ وقت گزر گیا تو تیرا حشر نشر کر دیں گے یہ بھین کے.....'' اس نے بلا خوف و خطر پولیس والوں کے لیے گالی کا استعمال کیا۔ معاذ اس کی پیشکش سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ وہ دوستانہ مزاج رکھنے والا ایک وسیع حلقۂ احباب کا مالک تھا لیکن اس کے یہ دوست اسی کی طرح طالب علم اور عام سے لوگ تھے۔ ان میں سے کوئی بھی پولیس سے نمٹنے کا تجربہ نہیں رکھتا تھا۔ لے دے کر وہ اس موقع پر ابو کو ہی اپنی مدد کے لیے بلا سکتا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے اس وقت ابو کو زحمت دینی چاہیے یا نہیں۔ اپنے تینوں بچوں میں انہیں اسی سے سب سے زیادہ شکایات رہتی تھیں اور اس وقت وہ جس صورتِ حال میں پھنسا ہوا تھا وہ تو خاصی سنگین تھی۔

''آگے پیچھے کوئی سپورٹ کرنے والا نہیں ہے تو خون کو اتنا ابال کیوں آنے دیتا ہے۔ ٹھیک ہے جوانی دیوانی ہوتی ہے پر ایسا بھی کیا دیوانہ پن کہ بندہ اپنا آپ داؤ پر لگا دے۔ پہلے تو نے لٹیروں سے پھڈا ڈالا پھر پولیس سے بھی پنگا لے لیا۔ ایک طرف سے بچ گیا تھا تو شکر کا کلمہ پڑھتا اور سیدھا گھر کی راہ لیتا۔'' استاد نے اس کے تاثرات سے سب بھانپ لیا اور ایسے اسے لتاڑنے لگا جیسے کوئی خیر خواہ بزرگ کسی بچے کو اس کی غلطی پر سرزنش کر رہا ہو۔

''میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔ تمہارے آدمی میری حق حلال کی کمائی لوٹ کر لے جانا چاہتے تھے اور میں اتنا کمزور نہیں ہوں کہ انہیں ایسا کرنے دیتا۔ پولیس والوں کو بھی میں نے صرف آئینہ دکھایا تھا۔ وہ قانون کی وردی پہن کر حق کا ساتھ دینے کے بجائے لٹیروں سے ہمدردی جتا رہے تھے۔'' معاذ نے تنک کر جواب دیتے ہوئے استاد کے قریب بیٹھے زخمی انو کو گھورا۔

''حق وق کچھ نہیں ہوتا میرے للو..... یہاں بس اس کی سنی جاتی ہے جس کے پاس حق اور سچ کو خریدنے کی طاقت ہو۔''

''میں نہیں مانتا۔ میرا ماننا ہے کہ معاشرہ کتنا ہی کرپٹ ہو جائے لیکن حق اور سچ کی اپنی ایک طاقت ہوتی ہے اور بندہ اگر ثابت قدمی سے حق پر ڈٹا رہے تو بالآخر فتح حق کی ہی ہوتی ہے۔'' اس نے جذباتی لہجے میں استاد کی بات کا جواب دیا۔

''چچ چچ..... آئیڈیلسٹ ہو۔ پھر تو یقین کر لو کہ بڑی ٹھوکریں کھاؤ گے اس معاشرے میں۔'' استاد نے اس پر افسوس کا اظہار کیا۔

''معاشرے کے بگاڑ میں حصے دار بننے سے بہتر ہے کہ بندہ سدھار کی کوشش کرتے ہوئے تھوڑی ٹھوکریں کھا لے۔''

''ابھی تلخ تجربوں کی بھٹی سے نہیں گزرے اس لیے اتنے جذباتی اور جوشیلے ہو۔'' استاد نے اس کا جواب سن کر ایک قہقہہ لگایا پھر دوستانہ لہجے میں پوچھنے لگا۔

''کیا کرتے ہو؟''

''یونیورسٹی اسٹوڈنٹ ہوں۔'' معاذ اپنے دل میں استاد کے لیے پہلے لمحے جیسی ناگواری محسوس نہیں کر رہا تھا اس لیے آرام سے اس کے سوال کا جواب دیا۔

''باپ کیا کرتا ہے؟''

''ایک سرکاری محکمے میں چیف انجینئر ہیں۔''

''پھر تو خاصے تعلقات والا بندہ ہوگا۔ اسے اپنی مدد کے لیے کیوں نہیں بلاتے؟'' استاد حیران ہوا۔

''ایک تو وہ زیادہ سوشل نہیں ہیں، دوسرے میری حوالات میں موجودگی ان کے لیے تکلیف دہ ثابت ہوگی اس لیے انہیں فون کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی۔'' اس نے سچائی سے کام لیا۔

''تو رات گھر نہیں پہنچے گا تو بھی تو تیرا باپ پریشان ہوگا اور شہر بھر میں تجھے ڈھونڈتا پھرے گا..... تو اس سے

بہتر یہ نہیں ہے کہ تُو خود اسے اطلاع دے دے۔'' استاد کی بات میں وزن تھا پھر بھی معاذ ابو کو اطلاع دینے کے معاملے میں تذبذب کا شکار رہا۔ وہ اپنے والدین کی بڑی اولاد تھا اور یقینی طور پر وہ اس سے بہت محبت کرتے تھے لیکن ابو کو اس کے طرزِ زندگی سے سخت اختلاف تھا اور وہ ہمیشہ اس سے شاکی رہتے تھے کہ وہ اپنی ذہانت کا درست استعمال کرتے ہوئے اپنی تعلیم کو بھرپور توجہ دینے کے بجائے ادھر اُدھر کے مشاغل میں کیوں ٹانگ اڑائے رکھتا ہے۔ وہ اس کے مشاغل سے نالاں رہتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ان ''مشاغل'' کے بل پر ہی اس میں اتنی جرأت پیدا ہوگئی تھی کہ وہ کسی بھی خطرناک معاملے میں اپنی ٹانگ اڑانے میں جھجک محسوس نہیں کرتا تھا۔

''تُو بول تو اپن تیری سفارش کردیتے ہیں بڑے تھانیدار سے.....؟'' اسے تذبذب میں ڈوبا دیکھ کر استاد نے اسے ایک نئی پیشکش کی۔

''آپ..... آپ میری سفارش کیوں کریں گے؟'' معاذ اس پیشکش پر بھونچکا رہ گیا۔

''بس تیری جوانی پر رحم آگیا ہے اور جی چاہتا ہے کہ تجھے اپنے خوش نما نظریات کے ساتھ جینے کا کچھ موقع اور مل جائے۔'' استاد کی آنکھوں میں کچھ کھویا کھویا سا تاثر تھا۔ اس کے گرگے بھی خاموش لیکن حیرت زدہ چہروں کے ساتھ یہ گفتگو سن رہے تھے۔

''تمہاری سفارش پر میرا یہاں سے نکلنا اتنا آسان ہے تو تم خود کیوں یہاں بیٹھے ہوئے ہو؟'' معاذ کو لگا کہ وہ اس سے مذاق کررہا ہے اس لیے اپنی دانست میں ایک چبھتا ہوا سوال کیا۔

''یہ اور معاملات ہیں کاکا! تو ہمارے رہنے نکلنے کی فکر چھوڑ۔ تھانہ اپنا دوسرا گھر ہے۔ جب جی چاہتا ہے یہاں آجاتے ہیں جب جی چاہتا ہے نکل جاتے ہیں۔ ہمارے سر پر لالہ عیسیٰ کا ہاتھ ہے اور لالہ کی سرپرستی میں رہنے والا جہاں رہے عیش میں رہتا ہے۔'' استاد نے بڑی بے نیازی سے اس کی بات کا جواب دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر سلگانے کے بعد بے فکری سے اس کے کش لینے لگا۔ معاذ کو تسلیم کرنا پڑا کہ وہ اپنی بات میں سچا ہے۔ ذرا سی دیر میں وہ خود دیکھ چکا تھا کہ تھانے میں استاد اور اس کے ساتھی کتنے آرام سے رہ رہے ہیں۔

''چل ابھی اچھی طرح سوچ لے۔ لگتا ہے اے ایس آئی کسی دوسرے لفڑے میں پھنس گیا ہے اور اب فرصت سے رات کو ہی تیری خبر لے گا۔'' استاد کے تھانے میں اختیار کو تو معاذ نے تسلیم کرلیا تھا لیکن ایک غنڈے سے فون لینا دل کو گوارا نہیں ہورہا تھا اس لیے چپ سادھ لی تھی۔ استاد نے اس کے اس گریز کو محسوس کیا اور فراخ دلی سے سوچ کر فیصلہ کرنے کی پیشکش کردی۔ معاذ اس کی پیشکش پر غور کرنے سے زیادہ گھر والوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسے سب سے زیادہ فکر اپنی والدہ سعیدہ بیگم کی تھی۔ وہ خواتین کی اس قسم میں سے تھیں جن کی ذات کا محور و مرکز بس اپنا گھر اور بچے ہوتے ہیں۔ گھر اور اولاد کے معمولات میں سے کسی بھی شے میں بے ترتیبی ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی تھی اور معاذ سمیت وہ تینوں بہن بھائی اس بات کے پابند تھے کہ طے شدہ وقت پر گھر واپس پہنچ جائیں۔ کسی غیر متوقع صورت حال میں انہیں گھر فون کرکے لازماً امی کو مطلع کرنا ہوتا تھا لیکن آج معاذ ایسا کرنے سے قاصر تھا کہ وہ تمام اشیاء بشمول موبائل کے جنہیں لٹیروں سے بچانے کے لیے وہ اپنی جان کی بازی لگا گیا تھا، اب پولیس والوں کے قبضے میں تھیں۔

وہ بہت دیر تک حوالات کے ٹھنڈے فرش پر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا رہا اور ان امکانات کے بارے میں غور کرتا رہا جو اسے یہاں سے نکالنے میں معاون ثابت ہوسکتے تھے۔ گلو استاد کی پیشکش قبول کرنے میں عار محسوس کرنے کے باوجود اس کی پیشکش بھی بار بار ذہن میں آرہی تھی۔ ابھی پولیس والوں نے باقاعدہ اس پر اپنا ہنر نہیں آزمایا تھا پھر بھی وہ اپنے جسم کے کئی حصوں سے درد کی ٹیسیں اٹھتی ہوئی محسوس کررہا تھا۔ خصوصاً جن مقامات پر رائفلوں کے بٹ مارے گئے تھے، وہاں خاصا درد ہورہا تھا اور وہ سوچنے پر مجبور تھا کہ جب اسے ''ڈرائنگ روم'' میں الٹا لٹکایا جائے گا تو اس کا کیا حشر ہوگا۔ اس کے لیے تو ان مچھروں کو برداشت کرنا بھی مشکل ہورہا تھا جو دن کی روشنی ختم ہوتے ہی اچانک حملہ آور ہوگئے تھے اور جسم کے کھلے حصوں کے علاوہ لباس کے اوپر سے بھی کاٹنے کا فریضہ بخوبی انجام دے رہے تھے۔ اس کے مقابلے میں استاد اور اس کے ساتھی ان مچھروں کو ذرا بھی خاطر میں نہیں لارہے تھے اور مزے سے آپس میں گپ شپ لگانے میں مصروف تھے۔

آٹھ بجے کے قریب ایک آدمی دو بڑے بڑے ناشتا دانوں میں کھانا بھر کر استاد اور اس کے ساتھیوں کے لیے لے آیا۔

''آجا کاکے! کھانا کھالے۔'' حوالات کے گندے

فرش پر پلاسٹک کا دسترخوان بچھا کر کھانا چن دیا گیا تو استاد نے اسے آواز لگائی۔

'کیا امی تصور بھی کر سکتی ہیں کہ میں اتنے گندے ماحول میں ایسے میلے کچیلے لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاؤں جو اسے فوراً گھر والوں کی صحت کے لیے ہر دم متفکر رہنے والی اپنی ماں کا خیال آ گیا۔ امی تو اس معاملے میں اتنی حساس تھیں کہ ان لوگوں کو ہوٹلنگ کی بھی اجازت نہیں دیتی تھیں اور خود کو اس حد تک کاموں میں کھپائے رکھتی تھیں کہ ان کے گھر اچار، مربّے اور چٹنیاں تک شاذ و نادر ہی بازار سے آتی تھیں۔

''کیا سوچتا ہے ہیرو..... آجا کھانا کھالے۔'' استاد نے اسے خاموش خیالوں میں گم بیٹھا دیکھا تو دوبارہ آواز دی۔

''مجھے نہیں کھانا۔'' اس نے انکار میں گردن ہلائی۔

''کھالے یار! یہاں کوئی اور تجھے کھانے کا نہیں پوچھے گا۔'' استاد نے اصرار کیا تو وہ پہلے سنجیدگی سے اس کی شکل دیکھتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔

''تمہیں ایک بات بتاؤں استاد!''

استاد نے زبان سے کچھ نہیں کہا اور منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''میرے والد ایک اچھی پوسٹ پر ہیں اور اختیار رکھتے ہیں کہ اپنی اصل کمائی سے بہت زیادہ ''اوپر'' کی کمائی کر سکیں لیکن میری امی نے انہیں پابند کیا ہوا ہے کہ چاہے وہ ہمیں سہولیات و تعیشات کی فراہمی میں کمی کر دیں لیکن گھر میں حرام کا ایک دھیلا نہ لے کر آئیں۔ میرے والد بڑی مشکل سے کیچڑ میں دامن بچا بچا کر چلتے ہیں اور الحمدللہ ہمارے گھر کے تمام اخراجات بخوبی پورے ہو رہے ہیں۔ میں اپنے بھائی اور بہن کے مقابلے میں ذرا ایسے شوق رکھنے والا بندہ ہوں جن کی تکمیل کے لیے ابو کی چادر تنگ پڑتی ہے تو میں ان پر بوجھ نہیں ڈالتا اور اپنی ٹف روٹین میں سے وقت نکال کر ایک اچھے گھرانے کے بچوں کو ٹیوشن دیتا ہوں۔'' معاذ اتنا کہہ کر ذرا دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔

''میں کچھ کچھ تیری بات کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔ خاموش مت ہو، پوری بات بول۔'' استاد نے گمبھیر لہجے میں اس سے کہا۔

''زیادہ کیا بولوں۔ تم خود سوچو کہ جس بائیک، موبائل اور والٹ کو بچانے کے لیے میں اپنی جان کی بازی لگا کر مسلح افراد سے بھڑ گیا تھا، وہ میں نے کتنی مشقت سے خریدے ہوں گے اور وہ سارے لوگ جو ہر روز اس شہر کی سڑکوں پر لٹتے ہیں، وہ بھی میری طرح اپنے خون پسینے کی کمائی سے ہی یہ چیزیں خریدتے ہوں گے تو پھر میں کیسے یہ کھانا کھالوں جس میں.....'' اس نے اس بار بھی اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ بات ادھوری تھی لیکن اس کا مفہوم مکمل ہو چکا تھا۔ استاد اور اس کے ساتھیوں کے چہروں کی رنگت متغیر ہو گئی لیکن پھر استاد نے فوراً خود پر قابو پا لیا اور ہنس کر بولا۔

''تو مانے گا نہیں لیکن ہم بھی خون پسینا بہا کر ہی اپنا رزق حاصل کرتے ہیں۔''

''لیکن عام طور پر خون دوسروں کا ہوتا ہے۔'' اس نے ترنت کہا۔

''موڈ خراب نہ کر یار۔ نہیں کھاتا تو نہ کھا، ہمیں کھانے دے۔'' اس بار استاد کا لہجہ بگڑ گیا۔ معاذ نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ کھانے کے بعد استاد اور اس کے ساتھی بہت دیر تک سگریٹ سے شغل کرتے رہے۔ لاک اپ میں پھیل جانے والی ناگوار بو نے یہ حقیقت بھی عیاں کر دی کہ یہ عام سادہ سگریٹ نہیں ہیں لیکن کوئی اندھیر سا اندھیر تھا کہ استاد اور اس کے گرگے تھانے میں بیٹھ کر یہ بھرے ہوئے سگریٹ پی رہے تھے۔ سگریٹ پینے کے کچھ دیر بعد استاد اور اس کے گرگے ننگے فرش پر لیٹ کر خراٹے لینے لگے۔ معاذ کا تو مچھروں نے ہی جینا دوبھر کیا ہوا تھا۔ خالی پیٹ بھی دہائیاں دینے لگا پھر یہ خوف الگ تھا کہ جانے کب ''ڈرائنگ روم'' کی سیر کا سندیس آ جائے۔ ہر آہٹ پر اس کا دل سینے میں بری طرح دھڑکنے لگتا تھا۔ نیند کی دیوی مہربان ہوتی بھی تو کیسے۔ اس جہنم میں کتنے گھنٹے اور کتنے منٹ گزرے اس کے پاس انہیں گننے کا کوئی پیمانہ نہیں تھا۔ وہ بس گھٹنوں میں سر دیے کسی مجسمے کی طرح ساکت بیٹھا ہوا تھا۔ ایک سپاہی نے ڈنڈے سے سنا خیں بجا کر اس کا نام پکارا تو اس نے ہڑبڑا کر سر اوپر اٹھایا۔

''اٹھ اوئے نکل باہر۔ تیرے والی وارث آئے ہیں تجھے لینے۔'' سپاہی نے گویا اسے زندگی کا پیغام دیا۔ ناقابلِ یقین خوشی کی خبر سن کر اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''آجا لاٹ صاحب! تیرے چاہنے والوں نے سوشل میڈیا پر طوفان تو برپا کیا ہوا ہے، اب تو کیا چاہتا ہے کہ تجھے ڈھول تاشوں کے ساتھ باہر نکالا جائے۔'' اس کی بے یقینی نے سپاہی کو چراغ پا کیا تو اس نے اپنی جذباتی کیفیت پر قابو پا کر قدم آگے بڑھائے۔

''باپ سے پوچھ لینا کہ تجھے یہاں سے نکالنے کے لیے اپنی حق حلال کی کمائی میں سے کتنے لاکھ وردی والوں کو

رشوت میں نذر کیے ہیں۔'' وہ لاک اپ کے کھلے دروازے سے قدم باہر رکھ رہا تھا کہ اپنے عقب سے استاد کی طنزیہ آواز سن کر ٹھٹکا۔

''چل جیسے بھی سہی، پر مجھے خوشی ہے کہ تجھے تھانے میں وہ روایتی رات نہیں گزارنی پڑی جسے گزارنے کے بعد حق حلال کی کمائی کو بھول کر بندہ گلو استاد بننے کی راہ پر قدم رکھ دیتا ہے۔'' اب استاد کے لہجے میں خلوص تھا۔ معاذ نے پلٹ کر ملگجی روشنی میں عجیب وغریب شخصیت کے حامل گلو استاد کا چہرہ دیکھا اور بے ساختہ ہی ہاتھ کو الوداعی انداز میں حرکت دے کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

ایس ایچ او کے کمرے میں ابو کے ساتھ سر صفات کو دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا۔ سر صفات خوش اخلاقی سے ایس ایچ او کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھے جبکہ ابو کے سنجیدہ چہرے پر بے تحاشا پریشانی درج تھی۔ اسے دیکھ کر پل بھر کے لیے ان کی آنکھوں سے جذباتی کیفیت چھلکی پھر فوراً ہی انہوں نے چہرے پر بے رخی اور ناراضی کے تاثرات سجا لیے۔

''یہ لیں جناب! آ گیا آپ کا بندہ۔ آپ ایس پی صاحب کی سفارش ساتھ لائے تھے اس لیے آپ کا کام بن گیا ورنہ اس تیس مار خان کا رُواں رُواں دہائی دیتا کہ آئندہ پولیس والوں سے متھا نہیں لگائے گا۔'' اس کی شکل دیکھتے ہی ایس ایچ او نے بڑک ماری۔

''بچہ ہے جناب! گرم خون ہے۔ جذبات میں حماقت کر گیا۔ آئندہ کے لیے ہم اسے سمجھا دیں گے۔'' سر صفات نے ایس ایچ او کی تلخ بات کا بھی خوش خلقی سے مسکرا کر جواب دیا پھر ان کے درمیان اسی قسم کے مزید دو تین جملوں کا تبادلہ ہوا اور اللہ اللہ کر کے تھانے سے روانگی عمل میں آئی۔

''اگر آپ کی اجازت ہو خاور صاحب تو میں چند منٹ معاذ سے بات کر لوں۔'' باہر نکل کر سر صفات نے اس کے ابو سے درخواست کی تو وہ سر کو اثبات میں جنبش دیتے ہوئے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔

''اس وقت تم صرف اور صرف اپنی خوش قسمتی کے باعث تھانے سے باہر ہو۔ یہ اتفاق ہے کہ اس تھانے کے ایس ایچ او کے خلاف پہلے سے ہی ایک کیس میں خفیہ انکوائری چل رہی تھی اور انکوائری کروانے والا ایس پی میرا اچھا دوست تھا۔ سوشل میڈیا پر تمہاری ویڈیو وائرل ہونے سے لے کر اپنے ایس پی دوست سے رابطے اور ایس ایچ او سے معاملات طے پانے تک کتنے مراحل طے کیے گئے، ان کی تفصیل میں جانا بیکار ہے۔ اصل میں، میں تم سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ان چند گھنٹوں میں تمہارے والد بے پناہ پریشانی سے گزرے ہیں اور ردعمل میں تم سے سخت رویہ اپنا سکتے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ تم ان کی ہر تلخ وترش بات کو خاموشی سے سہہ لینا۔'' اس کے والد کے دور چلے جانے کے بعد سر صفات نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرم لہجے میں اسے نصیحت کی۔

''میں خیال رکھوں گا سر! تھینک یو سو مچ کہ آپ نے میرے لیے اتنا کچھ کیا۔'' معاذ نے ممنونیت کا اظہار کیا۔ تھانے میں گزرے پچھلے چند گھنٹے کسی بھیانک خواب کی طرح تھے اور وہ واقعی دلی طور پر ان کا شکر گزار تھا۔

''تم میرے اچھے شاگرد ہو اور میں جانتا ہوں کہ تم ایک اچھے کردار کے لڑکے ہو اس لیے مجھے لگا کہ تمہیں کسی ظلم کا شکار ہو کر ضائع نہیں ہونے دینا چاہیے۔ اس لیے میں نے وہ کیا جو میں کر سکتا تھا لیکن تمہارے والد نے بھی کچھ کم نہیں کیا ہے۔ حق حلال کی کمائی سے رشوت خوروں کی جیبیں بھرنے میں کتنی تکلیف ہوتی ہے، یہ میں جانتا ہوں لیکن اولاد کے لیے انسان بہت کچھ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔''

''میں سب سمجھتا ہوں سر اور یہ بھی جانتا ہوں کہ مجھ سے لاکھ اختلافات کے باوجود میرے ابو مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔'' معاذ دھیرے سے مسکرایا۔

''اچھا تو اب ایک بات اور جان لو۔ میں اگلے ہفتے بیرون ملک منتقل ہو رہا ہوں اس لیے آئندہ اس قسم کی حماقت کرتے ہوئے یاد رکھنا کہ کم از کم میں تو تمہاری۔۔۔ مدد کے لیے کچھ نہیں کر سکوں گا۔'' انہوں نے ہلکے پھلکے انداز میں اسے تنبیہ کی۔

''اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے سر۔ وہ کوئی اور انتظام کر دے گا۔'' اس کی مسکراہٹ میں شرارت تھی۔

''سنبھل کر لڑکے ورنہ مجھے یقین ہے کہ تمہارے والد صاحب تمہیں نہیں بخشیں گے۔'' انہوں نے مزید کوئی نصیحت کرنے کے بجائے خود بھی ہلکا پھلکا انداز اپنایا اور اس کا شانہ تھپکتے ہوئے اشارہ کیا کہ اب وہ وہاں سے روانہ ہو جائے۔ ذرا دیر میں وہ ابو کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھا گھر کی طرف جا رہا تھا۔ راستے بھر ابو نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ جوان کی طرف سے سخت غصے کے اظہار کا منتظر تھا، ان کی خاموشی کو غنیمت جان کر چپکا بیٹھا رہا۔ گھر پہنچتے ہی سعیدہ بیگم اور علینہ نے اسے گھیر لیا۔

''معاذ..... میری جان! تم ٹھیک تو ہو نا؟ تمہارے ساتھ کچھ ہوا تو نہیں؟'' سعیدہ بیگم اسے ٹٹول ٹٹول کر دیکھنے کے ساتھ ساتھ آنسو بھی بہاتی رہیں۔ پولیس والوں کی تھوڑی بہت مار کے جو آثار اس کے وجود پر موجود تھے، وہی ان کو دکھ دینے کے لیے کافی تھے اس لیے معاذ نے ان کے سامنے کسی تکلیف کا اظہار نہیں کیا۔ ان کی اور علینہ کی آنکھوں سے ظاہر تھا کہ وہ دونوں مسلسل روتی رہی ہیں۔ سعد کا چہرہ بھی ستا ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر ان لوگوں کی تسلی و تشفی کرواتا رہا۔ امی کے حکم پر سعد جو میڈیکل کا اسٹوڈنٹ تھا، اس سے مرہم پٹی بھی کروالی اور پین کلرز بھی حلق سے نیچے اتار لیں لیکن ابو کے رویے پر جو دل میں کھد بد تھی، وہ اپنی جگہ تھی۔ وہ کسی بھی ردِعمل کا اظہار کیے بغیر بالکل خاموشی سے ایک کرسی پر آنکھیں موندے بیٹھے ہوئے تھے۔

''ابو.....'' بالآخر اس سے برداشت نہیں ہوا اور ان کے قریب جا کر انہیں پکارا۔ اس کی پکار پر انہوں نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے چاہا کہ ان سے کچھ کہے لیکن الفاظ نے ساتھ نہیں دیا۔

''اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔ میں اور تم دونوں جانتے ہیں کہ کچھ کہنا سننا بیکار ہے۔ نہ میں تمہیں سمجھ سکتا ہوں نہ تم اپنی روش چھوڑ کر میری بتائی راہ پر چل سکتے ہو تو پھر گفتگو کا فائدہ ہی کیا۔ ہاں جو باپ ہونے کے فرائض ہیں، وہ میں ادا کرتا رہوں گا۔'' ابو نے اس کی مشکل آسان کر دی اور وہ کچھ کہتے چلے گئے جو مبنی بر حقیقت تھا۔ اس پل معاذ کا دل چاہا کہ ان سے وعدہ کر لے کہ جو کچھ وہ اس سے چاہتے ہیں، وہ کرنے کو تیار ہے لیکن پھر رک گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی افتادِ طبع ایسے کسی وعدے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

☆☆☆

وہ تقریباً اڑتا ہوا اس کی طرف آیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے دیکھنے والوں کو لگا کہ معاذ اس کو خود پر چھانے سے نہیں روک سکے گا لیکن معاذ کی پھرتی بے مثال تھی۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر اپنی جگہ سے ہٹا اور برق کی سی رفتار سے اپنے بائیں پیر کو گھما کر اس کے پہلو میں ضرب لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ ضرب کھا کر اس کا مقابل ہلکا سا ڈگمگایا لیکن اس نے بھی بہت خوبصورتی سے خود کو سنبھالا اور پوری قوت کے ساتھ معاذ کے شانے پر اپنی کہنی کی ضرب لگانے میں کامیاب رہا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ معاذ کا شانہ جھنجھنا اٹھا اور لمحہ بھر کے لیے اس کا دھیان اپنے مقابل کی طرف سے ہٹ گیا۔ مقابل نے اس موقع کا پورا فائدہ اٹھایا اور کھڑی ہتھیلی کا وار کر کے معاذ کے مضروب شانے کا مزید بھرکس نکالنے کی کوشش کی۔ وہ خاصی حد تک کامیاب بھی رہا اور اس کی ہتھیلی نے معاذ کے شانے کو چھو لیا لیکن اس بار معاذ نے بھی پھرتی کا مظاہرہ کیا اور اس کی کلائی پر ہاتھ ڈال دیا۔ مقابل کی کلائی پر اس کی گرفت آہنی تھی اور اسی آہنی گرفت کا کمال تھا کہ اس کے وار کی شدت اور زور درمیان میں ہی ٹوٹ گیا اور ہتھیلی کے شانے کو چھو لینے کے باوجود وہ معاذ کو خاص زک پہنچانے میں کامیاب نہیں رہا اور معاذ نے اس کی بٹی ہوئی توجہ کا فائدہ اٹھا کر دائیں پاؤں سے اس کے ٹخنے پر زوردار ضرب لگائی۔ اس ضرب نے اس کے مقابل کو تڑپا کر رکھ دیا اور اس نے جھنجلا کر اپنے سر سے معاذ کے چہرے پر زوردار ضرب لگانے کی کوشش کی۔ اگر معاذ نے بروقت اپنا بچاؤ نہ کر لیا ہوتا تو اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ جاتی۔ اب بھی اس کو سر پر بائیں جانب چوٹ لگی جو تکلیف دہ ہونے کے باوجود قابلِ برداشت تھی۔

اس نے اپنے مقابل کی کلائی ابھی تک نہیں چھوڑی تھی۔ چوٹ کھا کر اس نے مقابل کی کلائی کو زوردار جھٹکا دینے کے ساتھ ہی اس کے پیٹ میں اپنے گھٹنے کی ضرب لگائی۔ مقابل کے منہ سے اوغ کی آواز نکلی۔ بیک وقت جسم کے دو مختلف حصوں کو پہنچنے والی تکلیف نے اس کی مہارت کو ساتھ چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا تھا پھر بھی اس نے کوشش کی کہ اپنا آزاد ہاتھ استعمال کر کے معاذ کو نشانہ بنا سکے۔ اس بار اس نے معاذ کے اس ہاتھ پر کھڑی ہتھیلی کا وار کرنے کی کوشش کی تھی جس سے معاذ نے اس کی کلائی اپنی گرفت میں لے رکھی تھی۔ وہ اتنے غصے میں تھا کہ اگر اس کا بھرپور وار معاذ کے بازو پر لگ جاتا تو بازو کی ہڈی میں فریکچر ہو سکتا تھا۔ معاذ نے مقابل کی آنکھوں کی وحشت سے اس کے ارادے کو بھانپ لیا تھا چنانچہ بالکل اچانک اس کی کلائی پر اپنی گرفت ختم کر دی اور اس کے سینے پر ایک گھونسا رسید کر دیا۔ اچانک کلائی چھوڑ دیے جانے کی وجہ سے اس کا توازن پہلے ہی بگڑ چکا تھا۔ گھونسا کھا کر تو وہ خود کو سنبھال ہی نہیں سکا اور لڑکھڑا کر زمین پر جا گرا۔ معاذ اپنی جگہ سے اسپرنگ کی طرح اچھلا اور اس طرح اپنے مقابل کے نزدیک پہنچا کہ اس کا ایک پیر زمین پر اور دوسرا زمین پر پڑے اپنے مقابل کے سینے پر تھا۔ یکدم ہی وہ جگہ بے تحاشا تالیوں کی آواز سے گونج اٹھی۔ اس نے جوش و خروش سے داد دینے والوں پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور اپنے مقابل کے سینے پر سے پیر ہٹا کر دوستانہ انداز میں اسے سہارا دینے

شعاع ڈائجسٹ

جنوری 2020

Download

www.pklibrary.com

کے لیے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ زمین پر پڑا اس کا مقابل جو شکست کی شرمندگی کی وجہ سے نظریں چرا رہا تھا، اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھامنے سے ہچکچایا تو اس نے خود ہی مزید جھک کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور ہلکا سا زور لگا کر اسے اٹھاتے ہوئے بولا۔

''کم آن یار! اٹس جسٹ آ گیم اور گیم میں ہار جیت تو چلتی رہتی ہے۔ تم نیکسٹ ٹائم مجھے ہرا دینا، حساب برابر ہو جائے گا۔'' اس بار اس شخص کو بھی اخلاقیات کا مظاہرہ کرنا پڑا اور وہ اپنے ہونٹوں پر ایک جھینپی ہوئی سی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔

''نیکسٹ ٹائم کی نیکسٹ ٹائم دیکھی جائے گی۔ ابھی تو تم ونر ہو اور میں دل سے تمہیں کانگریچولیشن کہتا ہوں۔'' اب وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو چکا تھا اور معاذ کے مقابل کھڑا ہوا تھا۔ قد کاٹھ میں وہ معاذ کے مقابلے میں زیادہ اچھا تھا۔ اس کا قد معاذ سے ایک انچ کے قریب زیادہ تھا اور جسم بھی زیادہ بھاری اور مضبوط محسوس ہو رہا تھا۔ شاید اپنی اس شاندار جسامت کی بنیاد پر ہی اس نے معاذ کو مقابلے کے لیے چیلنج کیا تھا اور اب اس کے سامنے شکست خوردہ کھڑا ہوا تھا۔

''میں نے تم سے کہا تھا نا عالم کہ معاذ بہت شاندار فائٹر ہے۔ تمہارے لیے اس سے جیتنا مشکل ہوگا لیکن تم مقابلے پر بضد تھے۔'' اردگرد کھڑے ہوئے افراد میں سے حنین آگے بڑھ کر آیا اور معاذ سے مقابلہ کرنے والے سے مخاطب ہو کر بولا۔ دوست کی فتح کی خوشی میں اس کا اپنا چہرہ جوش سے سرخ ہو رہا تھا اور صاف نظر آ رہا تھا کہ معاذ کی جیت نے اسے بے حد خوشی دی ہے۔

''جیتنا تو عالم سے بھی آسان نہیں تھا حنین۔ اسے شکست دینے میں مجھے دانتوں پسینا آ گیا۔ یہ سچ مچ ایک زبردست فائٹر ہے اور اس طرح کے فائٹر سے جیتنے میں مہارت کے علاوہ لک بھی کام کرتی ہے۔ آج میری لک اچھی تھی جو عالم آخری لمحات میں مجھ سے مار کھا گیا ورنہ اس کی جگہ میں بھی تمہیں زمین پر لیٹا دکھائی دے سکتا تھا۔'' معاذ نے کھل کر عالم نامی اس لڑکے کی تعریف کی جس کو اس نے ابھی ابھی شکست سے دوچار کیا تھا۔ اس کے ان جملوں سے عالم کے چہرے کے جھینپے ہوئے تاثرات میں قدرے بہتری آئی لیکن حنین زبان سے کچھ کہے بغیر زیر لب اس طرح مسکرایا جیسے کہہ رہا ہو کہ دوست..... ہمیں سب حقیقت معلوم ہے، تم چاہے جتنی کسرِ نفسی سے کام لو لیکن تمہارے جوہر ہم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ معاذ نے اس کی مسکراہٹ میں چھپے اس مفہوم کو اچھی طرح سمجھا لیکن نظر انداز کر کے عالم شاہ کی طرف متوجہ ہو گیا اور دوستانہ لہجے میں بولا۔

''ایسا کرتے ہیں چل کر فریش ہو جاتے ہیں پھر لنچ کریں گے۔ تم نے میری اچھی خاصی ورزش کروا دی ہے اور مجھے بہت زوردار بھوک لگ رہی ہے۔ کیوں حنین! کھانا تو ریڈی ہے نا؟'' آخر میں وہ اپنے دوست سے مخاطب ہوا تھا۔

''کھانا تو کب سے آیا رکھا ہے معاذ بھائی! بس مقابلہ ختم ہونے کا انتظار تھا۔ آپ لوگ فریش ہو کر آ جائیں، اس دوران ہم کھانا لگواتے ہیں۔'' وہاں موجود افراد میں سے چار چھ لڑکے ان کے قریب آ کھڑے ہوئے تھے اور ان میں ہی سے ایک نے معاذ کے سوال کا جواب دیا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ ہمیں بس دس منٹ لگیں گے، تم لوگوں کو جوائن کرتے ہیں۔'' اس نے مطمئن ہو کر سر ہلایا اور عالم شاہ کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

''آ جاؤ یار! ہم دونوں بھی ذرا انسانوں والے حلیے میں آ جائیں۔'' عالم شاہ فوراً اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ دونوں اس وقت سیاہ ٹراؤزر اور سیاہ ہی چست بنیانیں ملبوس کیے ہوئے تھے اور اس لباس میں ان کے مضبوط ورزشی جسم نمایاں ہو رہے تھے۔ وہاں موجود لڑکوں میں سے بیشتر فٹنس کلب وغیرہ کے ممبر تھے اور اچھی شخصیت کے مالک تھے پھر بھی انہوں نے ان دونوں افراد کو رشک بھری نظروں سے دیکھا۔ وہ دونوں وہاں موجود افراد میں سے سب سے زیادہ خوبصورت اور مضبوط جسامت کے مالک تھے اور انہیں رشک بھری نظروں سے دیکھے جانے کا حق حاصل تھا۔ وہ دونوں نظروں سے اوجھل ہو گئے تو لڑکے بھی اپنے کام میں مصروف ہو گئے اور اسی کھلی جگہ پر جہاں معاذ اور عالم کے درمیان مقابلہ منعقد ہوا تھا، دریاں اور چاندنیاں بچھا کر دسترخوان لگانے کا انتظام کرنے لگے۔ یہ جگہ ماضی کے ایک اچھے پہلوان بدرو کا قائم کردہ اکھاڑا تھا لیکن ایسا اکھاڑا جہاں اب کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ پہلوان بدرو ایک زمانے سے اپنی شیفی اور بیماری کی وجہ سے اکھاڑا چلانے کے لائق نہیں رہا تھا لیکن اپنے بیٹے سے بے پناہ محبت کی وجہ سے اس نے اکھاڑے سے مکمل دستبرداری بھی قبول نہیں کی تھی۔ یہاں اب بھی چند بھولے بھٹکے نوجوان آتے تھے اور پہلوان سے کچھ نہ کچھ سیکھ کر جاتے تھے لیکن ان نوجوانوں میں سے بھی بہت کم ہی ایسے تھے جو باقاعدہ پہلوان بننے کی خواہش رکھتے تھے۔ ان میں سے اکثریت ایسی تھی جو اپنی شخصیت کو ذرا زوردار اور قابلِ دید دیکھنا

چاہتی تھی اور ساتھ ہی یہ شوق بھی تھا کہ دو چار ایسے گُر اور داؤ سیکھ لیے جائیں کہ کسی سے مقابلے کی نوبت آنے پر اسے شکست دینے میں آسانی رہے۔ بدرو ان باتوں کو سمجھتا تھا لیکن پھر بھی اپنے پاس آنے والے کسی شخص کو مایوس نہیں کرتا تھا کہ شاید ان میں سے ہی فن کا کوئی سچا قدردان نکل آئے۔ اسے اپنے فن سے بے پناہ محبت تھی اور وہ اسے نوجوان نسل میں منتقل کرنے کا شدید خواہش مند تھا۔ اللہ نے اسے نرینہ اولاد سے محروم رکھا تھا ورنہ یقیناً وہ اپنے بیٹے کو اپنے سے بھی اونچا پہلوان بنانے کی کوشش کرتا، فی الحال اس نے ان شوقین لڑکوں پر ہی قناعت کی ہوئی تھی۔ کراچی جیسے شہر میں یہ آدھے ادھورے سے شاگرد بھی غنیمت تھے۔

بنیادی طور پر بدرو گوجرانوالہ کا رہنے والا تھا اور اس نے ساری زندگی وہیں گزاری تھی۔ زندگی کے باقی سال بھی اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ وہیں گزارتا لیکن حالات کے آگے مجبور ہوگیا۔ بیٹیاں اس نے کم عمری میں بیاہ دی تھیں۔ کچھ سال قبل اس کی بیوی کا بھی انتقال ہوگیا اور تنہائی کا عذاب اکیلے سہتے سہتے اسے مختلف بیماریوں نے گھیرنا شروع کردیا۔ روزگار کے لیے اس کی دودھ دہی کی دکان تھی وہ دکان چلانا بھی اس کے لیے مشکل ہونے لگا تھا۔ ایسے میں اس کے چھوٹے بھائی قمرو کی محبت نے جوش مارا اور وہ بڑے بھائی کو زبردستی اپنے ساتھ کراچی لے آیا۔ نوجوانی میں قمرو کو بھی پہلوانی کا شوق تھا لیکن وہ ذرا ہوشیار نکلا۔ اس نے دیکھا کہ اس کام میں جان بہت کھپانی پڑتی ہے اور پیسا وغیرہ کچھ خاص نہیں ہے تو اس نے ہاتھ اٹھالیا اور ایک دوست کے پاس کراچی جا پہنچا۔ وہ دوست پیشے کے اعتبار سے باورچی تھا۔ اس کے ساتھ رہ کر قمرو نے کام سیکھا اور اپنی ہوشیاری کے باعث بہت جلد الگ سے کام شروع کردیا۔ آج اس کا اپنا بڑا پکوان ہاؤس تھا جہاں روزانہ آرڈر پر درجنوں کے حساب سے بریانی قورمے اور نہ جانے کن کن کھانوں کی دیگیں تیار ہوتی تھیں۔ پکوان ہاؤس کے پیچھے ہی اس نے خالی پلاٹ کا ایک حصہ بڑے بھائی کے شوق کی تکمیل کے لیے مختص کردیا تھا۔ یہ اور بات کہ اس حصے میں بھی اکثر خالی دیگیں، برتن دھونے کے ٹب اور کھانا پکانے سے متعلق دیگر سامان رکھا ہوا نظر آتا رہتا تھا لیکن بدرو نے کبھی اس سلسلے میں چھوٹے بھائی سے شکایت نہیں کی تھی۔ اس کے برے حالات میں چھوٹے بھائی نے اس کا جتنا خیال رکھا تھا اور کر رہا تھا زمانہ یہ بھی بہت تھا۔

معاذ کو اپنے کسی جاننے والے کے توسط سے پہلوان بدرو کے بارے میں علم ہوا تھا اور اس کی افتادِ طبع اسے یہاں کھینچ لائی تھی۔ جوڈو کراٹے وغیرہ اپنی جگہ تھے اور یہ روایتی فن اپنی جگہ جسے سیکھنے کے لیے اس کے پاس باقاعدہ وقت تو نہیں تھا لیکن وہ وقتاً فوقتاً بدرو کے اکھاڑے کا چکر لگاتا رہتا تھا۔ عالم شاہ بھی تقریباً اسی جیسا بندہ تھا جو شوقیہ وہاں آتا رہتا تھا۔ معاذ تو پھر بھی اپنے نت نئے شوق پورے کرنے کے چکر میں اس طرف متوجہ ہوا تھا لیکن عالم شاہ کو تو لڑائی بھڑائی سے خصوصی دلچسپی تھی اور اس کا خیال تھا کہ وہ اس کام میں بے حد ماہر ہے۔ اس کا خیال ایسا کچھ غلط بھی نہیں تھا اور واقعی وہ بہت اچھا فائٹر تھا۔ معاذ اور اس کی آپس میں بہت زیادہ شناسائی نہیں تھی، بس کبھی کبھار ایک دوسرے سے سامنا ہوجاتا تھا اور دونوں کو ہی دوسرے لڑکوں کی زبانی ایک دوسرے کی تعریفیں سننے کو ملتی رہتی تھیں۔ معاذ تو اپنی بے نیاز طبیعت کی وجہ سے زیادہ توجہ نہیں دیتا تھا لیکن عالم کے لیے اس کی تعریفیں گویا چیلنج کی حیثیت اختیار کرتی جارہی تھیں۔ اس نے دو ایک بار بدرو کی زبان سے بھی معاذ کی تعریف سنی تھی اور وہ جو خود کو بدرو کا سب سے اچھا شاگرد سمجھتا تھا، اندر ہی اندر جز بز ہوکر رہ جاتا تھا۔ اپنے اندر کی اس کیفیت کی وجہ سے ہی ایک دن وہ معاذ کو چیلنج دینے پر مجبور ہوگیا تھا۔ معاذ کو مقابلے وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن ساتھی لڑکے جوش میں آگئے۔ ان لڑکوں میں معاذ کا ایک یونیورسٹی فیلو حسنین بھی شامل تھا جس نے نہایت ہوشیاری سے اس مقابلے کے لیے ایک ایسا دن مقرر کیا جب پہلوان بدرو کسی شادی میں شرکت کی غرض سے تین چار دنوں کے لیے گوجرانوالہ گیا ہوا تھا اور اپنے بھائی کو ہدایت کرکے گیا تھا کہ لڑکوں کو اس کی غیر موجودگی میں بھی وہاں آنے دیا جائے۔ معاذ اور عالم کے درمیان ہونے والے مقابلے میں طریقہ کار کی کوئی شرائط نہیں تھی اور انہیں اجازت دی گئی تھی کہ وہ لڑتے ہوئے کوئی بھی تکنیک استعمال کرسکتے ہیں۔ بس انہیں ایک دوسرے کو زیر کرنا تھا اور معاذ عالم شاہ کو زیر کرکے یہ مقابلہ جیت چکا تھا۔ لڑکوں نے آپس میں چندہ کرکے مقابلے کے بعد پُرتکلف کھانے کا انتظام کر رکھا تھا اور اب وہی کھانا دسترخوان پر لگایا جارہا تھا۔ گرم گرم کھانا دسترخوان پر آنا شروع ہوا تو معاذ اور عالم شاہ بھی تازہ دم ہوکر واپس آگئے۔

''واہ بھئی واہ! کیا زبردست خوشبو ہے۔ خوشبو سے بھوک اور بھی کھل گئی ہے۔'' عالم شاہ نے دسترخوان پر بیٹھتے ہوئے تبصرہ کیا۔

''خوشبو ہی نہیں، ذائقہ بھی زبردست ہے عالم بھائی! آپ کھا کر تو دیکھیں۔'' کھانے کا انتظام کرنے والے لڑکوں میں سے ایک نے قدرے جوش سے گویا اطلاع دی۔

''اپنے قمرو پہلوان کے پکوان ہاؤس سے ہی تیار کروایا ہوگا کھانا؟'' قمرو نے پہلوانی ابتدا ہی میں چھوڑ دی تھی لیکن اپنے جثے سے وہ اب بھی پہلوان ہی لگتا تھا اس لیے بدرو کے ساتھ ساتھ اسے بھی پہلوان ہی کہہ کر پکارا جاتا تھا۔

''کہیں اور سے کھانا پکوا کر اپنی شامت بلوانی تھی کیا۔ کھانا بھی دروازے پر ہی ضبط ہو جاتا اور ہم سب کے یہاں داخلے پر بھی پابندی لگ جاتی۔'' ایک لڑکے کے بے ساختگی سے کیے گئے اس تبصرے پر زوردار قہقہہ لگا۔ آج وہاں لڑکوں کی تعداد معمول سے زیادہ تھی۔ اکھاڑے میں آنے والے لڑکوں کی زبانی ان کے یار دوستوں کو بھی آج کے مقابلے کے بارے میں اطلاع مل گئی تھی اس لیے وہ بھی شوق شوق میں مقابلہ دیکھنے وہاں چلے آئے تھے۔ مقابلہ واقعی بہت زبردست اور خوبصورت ثابت ہوا تھا۔ تقریباً بیس منٹ تک جاری رہنے والے اس مقابلے میں دونوں فریقین نے جوڈو کے علاوہ پہلوانی کی بھی کئی تکنیکس کا مظاہرہ کیا تھا اور کافی مشکل سے مقابلہ اپنے انجام کو پہنچا تھا۔ مقابلے سے پہلے طے ہو چکا تھا کہ دونوں فریقین ایک دوسرے کو کوئی جان لیوا ضرب نہیں لگائیں گے اور نہ ہی چہرے کو نشانہ بنایا جائے گا۔ دونوں نے حتی الامکان ان باتوں کا خیال رکھا تھا، صرف آخری لمحات میں جھنجلاہٹ کی کیفیت میں عالم شاہ نے معاذ کے چہرے پر اپنے سر سے ٹکر مارنے کی کوشش کی تھی لیکن معاذ خود کو بچانے میں کامیاب رہا تھا اور بعد میں بھی اس نے عالم شاہ کو اس کا یہ فاؤل جتانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ خوشگوار انداز میں یوں ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے جیسے بہت گہرے دوست ہوں۔ اصل میں اس سے قبل ان کی ایک دوسرے سے کبھی سرسری سلام دعا سے زیادہ بات چیت نہیں ہوئی تھی اور آج جب وہ ایک دوسرے کے ساتھ تھے تو دونوں ہی کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے لیے اچھے دوست ثابت ہو سکتے تھے۔

''تم کیا کرتے ہو عالم! تمہاری عمر تو زیادہ معلوم نہیں ہوتی۔ میرے خیال میں ابھی تمہاری اسٹڈیز ہی چل رہی ہوگی۔'' کھانے کے دوران سب لوگ بہت مصروف ہو گئے تھے تو معاذ نے عالم شاہ سے دریافت کیا۔

''نہیں یار! پڑھنا پڑھانا جتنا اپنے بس میں تھا پڑھ لیا۔ اب تو بس باپ کے مال پر عیش کرتے پھرتے ہیں اور ایسے ہی کوئی نیا شغل پال لیتے ہیں۔'' اس نے ہاتھ سے اکھاڑے کے در و دیوار کی طرف اشارہ کیا۔

''باپ کے پاس تمہیں عیش کروانے کے لیے مال ہے، اس کا مطلب ہے کہ وہ کوئی ٹھیک ٹھاک قسم کی چیز ہوں گے۔'' معاذ نے فوراً ہی اندازہ لگایا۔

''زمیندار ہیں اور اتنی زمینوں کے مالک ہیں کہ میں نے بھی آج تک ڈھنگ سے ان زمینوں کو نہیں دیکھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ میرا زمینداری کی طرف زیادہ رجحان نہیں ہے اور یہ واحد چیز ہے جس کی وجہ سے ابا جی مجھ سے ناراض رہتے ہیں لیکن ناراضی میں بھی ان کی عنایت و کرم میں کوئی کمی نہیں آتی۔ اب بھی میری فرمائش پر انہوں نے سال بھر سے مجھے کراچی بھیجا ہوا ہے۔ یہاں میرا ایک ٹیکسٹائل مل لگانے کا ارادہ ہے بلکہ سمجھو مل لگ چکی ہے اور بس افتتاح باقی ہے۔ میں نے ابا جی کو بڑی مشکل سے قائل کیا ہے کہ اب ہمیں زمینداری کے ساتھ ساتھ صنعت کاری میں بھی قسمت آزمانی چاہیے۔ وہ اپنی زمینوں کی آمدنی اور صوبائی سیٹ پر ہر بار کامیابی سے ہی کافی خوش رہتے ہیں لیکن میں نے انہیں سمجھایا کہ اتنی قناعت پسندی اچھی نہیں، ذرا آمدنی کے دوسرے ذرائع پر بھی توجہ دینی چاہیے۔ انہیں شاید اپنا سرمایہ ڈوبنے کا ڈر ہو لیکن اکلوتے بیٹے کی فرمائش بھی رد نہیں کر سکتے تھے اس لیے راضی ہو گئے۔ انہوں نے میرے لیے ایک تجربہ کار ٹیم کا بھی انتظام کر دیا ہے جس نے مل لگانے کا سارا بوجھ خود سنبھال رکھا ہے، میں بس کبھی کبھی اپنے مالکانہ حقوق جتانے کے لیے چکر لگا لیتا ہوں۔ اتنا تو مجھے بھی معلوم ہے کہ ملازمین پر تھوڑی نظر بھی رکھنی پڑتی ہے ورنہ جو سب سے زیادہ بھروسے کا بندہ ہو، وہی سب سے بڑا دھوکا بھی دیتا ہے۔'' عالم شاہ نے اس کے سوال کا بڑا تفصیلی جواب دیا۔

''مطلب تم خاصی اونچی شے ہو۔ اس صورت میں تو تمہاری اس معمولی اکھاڑے پر موجودگی پر مجھے حیرت کا اظہار کرنا چاہیے۔'' معاذ نے مرغی کی ٹانگ کو اس کے انجام تک پہنچانے کے بعد پلیٹ میں رکھتے ہوئے تبصرہ کیا۔

''میں موڈی بندہ ہوں یار! فائیو اسٹار ہوٹل میں لنچ اور ڈنر کرنے کی حیثیت رکھنے کے باوجود میرے جی میں آئے تو کسی تھرڈ کلاس ہوٹل یا ریڑھی والے سے بھی کھانا لے کر کھا سکتا ہوں۔'' عالم شاہ نے بے نیازی سے اسے اپنے بارے میں بتایا۔

''تم تو کافی حد تک اپنی کیٹیگری کے بندے ہی لگتے ہو۔ یہ میں صرف مزاج کے اعتبار سے کہہ رہا ہوں ورنہ حیثیت میں تو خیر ہمارے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے۔'' معاذ نے نہایت صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

''دوستی میں ان باتوں کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ فائدے کے لیے بنائے گئے تعلقات اور دوستی میں یہی فرق ہوتا ہے کہ دوستوں میں ایک دوسرے کی حیثیت وغیرہ نہیں بلکہ خلوص دیکھا جاتا ہے اور مجھے تم مخلص آدمی دکھائی دیتے ہو اسی لیے میں تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا ہوں۔'' عالم شاہ نے نہایت سادگی سے اسے دوستی کی پیشکش کر دی۔

''دوستی تو سمجھو اپنی ہو ہی چکی۔ میں تو ویسے بھی ذرا جلدی دوست بنا لینے والا بندہ ہوں۔'' معاذ نے مسکراتے ہوئے اسے جواب دیا۔

''کمال ہے، اس دور میں بھی تم ایسا مزاج رکھتے ہو۔ یہ اتنی جلدی کسی پر اعتبار کر لینے کا دور تو نہیں ہے۔'' عالم نے حیرت کا اظہار کیا۔

''اعتبار میں دوسروں پر نہیں، خود پر کرتا ہوں۔ میں اپنی جانب سے بالکل مخلص ہوتا ہوں اس لیے مجھے یقین ہوتا ہے کہ جواب میں دوسرا بھی مجھ سے خلوص کا ہی مظاہرہ کرے گا۔ وہ نیوٹن کا تھرڈ لا ہے نا کہ ہر عمل کا ردِ عمل سمتوں میں مخالف لیکن شدت میں برابر ہوتا ہے تو سمجھو میرے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ میں جتنے خلوص سے کسی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں، دوسری طرف سے بھی مجھے اتنا ہی خلوص ملتا ہے۔ کم از کم ابھی تک تو میں دوستی کے معاملے میں خوش قسمت ہی ثابت ہوا ہوں۔'' وہ دونوں باتوں کے دوران کھانے سے فارغ ہو چکے تھے اور اب ہاتھ دھونے کے لیے اس جانب جا رہے تھے جہاں واش بیسن لگے ہوئے تھے۔ کھانا عمدہ ہونے کے باوجود دونوں ہی نے ذرا ہاتھ روک کر کھایا تھا۔

''سچ پوچھو تو یار میری تربیت مجھے تمہاری طرح کے نظریات رکھنے کی اجازت نہیں دیتی۔ میں جس بیک گراؤنڈ سے تعلق رکھتا ہوں وہاں آدمی کو سجن کے روپ میں بھی دشمن کا سامنا ہو جاتا ہے۔ دولت اور جاگیر کے لیے سگے بھائیوں تک کا ایک دوسرے کی جان لے لینا معمول کی بات ہے، اس لیے مجھے سکھایا گیا ہے کہ کسی پر آسانی سے اعتبار نہ کرو لیکن تم میں کوئی ایسی بات ضرور ہے کہ دل خود بخود ہی تمہاری طرف کھنچ رہا ہے اور میرے اپنے اندر سے آواز آ رہی ہے کہ تم بہت اچھے دوست ثابت ہو گے۔'' ہاتھ دھونے کے بعد اسٹینڈ سے لٹکے ہوئے تولیے سے خشک کرتے ہوئے عالم شاہ نے بالکل سچائی سے اسے اپنے جذبات سے آگاہ کیا۔

''بس تو تم یقین رکھو کہ تمہارا دل تمہیں دھوکا نہیں دے رہا۔ دنیا میں دل کی گواہی سب سے معتبر ہوتی ہے۔'' معاذ نے اس سے کہا اور اپنا دایاں ہاتھ مصافحے کے لیے اس کی طرف بڑھا دیا۔ عالم شاہ نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ سرعت سے تھام لیا اور پھر اس سے بھی زیادہ تیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ معاذ نے بھی جواباً گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ ان دونوں ہی کو نہیں معلوم تھا کہ آگے اس دوستی کو کہاں تک جانا ہے لیکن اس بات کو دونوں ہی نے محسوس کر لیا تھا کہ یہ دوستی بہت مضبوط بنیادوں پر قائم ہوئی ہے اور اس کے سچا ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔

☆☆☆

شوخ سی دھن پر سیٹی بجاتا ہوا وہ بہت مگن انداز میں اپنی بائیک دوڑا رہا تھا۔ آج چھٹی کا دن تھا اور حنین نے اس سمیت کچھ دوستوں کو اپنے گھر کھانے پر بلا رکھا تھا۔ حنین کا گھر شہر سے کچھ ہٹ کر آباد کی جانے والی ایک اچھی سوسائٹی میں تھا۔ یہ گھر ان لوگوں نے کچھ عرصہ قبل ہی خریدا تھا اور اصل میں آج کی دعوت اس گھر کی خوشی میں ہی تھی۔ شہر کے ہنگاموں سے ہٹ کر قائم کی گئی صاف ستھری اور پُرسکون جگہ پر بنایا گیا گھر سب ہی کو بہت پسند آیا تھا۔ ساتھ ہی سب، پُرتکلف دعوت اور بے تکلف دوستوں کی کمپنی سے بھی خوب لطف اندوز ہوئے تھے لہٰذا کھانے کے بعد بھی کافی دیر تک محفل جمی رہی تھی۔ گھر کی دور دراز لوکیشن کی وجہ سے حنین نے جان کر انہیں دوپہر کے کھانے پر بلایا تھا تاکہ سب اطمینان سے انجوائے کر سکیں۔ وہ سب ہی اپنی اپنی سواریوں پر وہاں آئے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر کے پاس بائیکس تھیں اور صرف سرمد نامی ایک لڑکا اپنی سوزوکی الیف ایکس میں آیا تھا۔ وہی اپنے ساتھ دو ایسے دوستوں کو بھی لے کر آ گیا تھا جن کے پاس اپنی کوئی ذاتی سواری موجود نہیں تھی۔ جگہ اچھی اور پُرسکون ہونے کے باوجود بہرحال اس علاقے میں کنوینس کا مسئلہ تھا اور بہت کم پبلک ٹرانسپورٹ مل پاتی تھی۔ وہ سب شام کی چائے پینے کے بعد ایک ایک کر کے وہاں سے رخصت ہوئے تھے۔ معاذ سب سے آخر میں روانہ ہوا تھا۔ حنین نے بہت مشکل سے اسے اجازت دی تھی اور وہ اس تاخیر کی تلافی کے لیے شارٹ کٹ کا استعمال کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت وہ جس زیرِ تعمیر ہاؤسنگ سوسائٹی کے قریب سے گزر رہا تھا، وہ بھی

عام راستوں سے ذرا ہٹ کر قائم کی جارہی تھی اور اس کا اندازہ تھا کہ اس راستے سے اس کا سفر جلدی طے ہوجائے گا۔ وہ ویسے ہی خوش باش رہنے والا لڑکا تھا اور دوستوں کی محفل میں شرکت نے مزاج پر مزید اچھا اثر ڈالا تھا اس لیے اس وقت بہت خوشگوار موڈ میں بائیک دوڑا رہا تھا۔ اس کے سامنے پھیلی قدرے ناہموار سڑک دور تک خالی پڑی ہوئی تھی اس لیے اس کی بائیک کی رفتار بہت تیز تھی۔ اس رفتار پر بائیک چلاتے ہوئے اس نے سڑک کے کنارے لگے درختوں کے جھنڈ سے برآمد ہونے والے اس گلابی بگولے کو بالکل اچانک سڑک پر وارد ہوتے دیکھا تو ایک ثانیے کے لیے ذرا سا گڑبڑا گیا لیکن پھر بہت مہارت و مستعدی سے بائیک کو بریک لگانے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ رکتے ہوئے اس نے اپنے بہت قریب سے دہشت زدہ سی چیخ سنی۔ چیخ یقینی طور پر نسوانی تھی اور اب وہ خود بھی دیکھ سکتا تھا کہ گلابی رنگ کا وہ بگولا درحقیقت گلابی کپڑوں میں ملبوس ایک لڑکی تھی۔ لڑکی کے چہرے پر خوف زدہ سے تاثرات تھے جنہیں اول تو اس نے حادثے کے اندیشے کا ردِعمل محسوس کیا اور خاصے خراب موڈ میں بولا۔

''محترمہ آپ کیا یہاں سومیٹر کی ریس کی مشق کرنے نکلی تھیں۔ آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ آپ کتنے معجزانہ طور پر حادثے سے بچی ہیں۔ حادثہ ہوجاتا تو آپ کا تو جو ہوتا سو ہوتا، میں غریب بھی بیکار میں مارا جاتا اور تھانے کچہری کے چکر میں میری زندگی برباد.....'' وہ اپنی اس تقریر کو شاید مزید جاری رکھتا لیکن واحد سامع نے ہی میدان چھوڑ دیا۔ وہ لڑکی جو گھبراہٹ کے عالم میں سڑک پر گر چکی تھی، تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھی اور سڑک کی دوسری طرف درختوں کے جھنڈ کی طرف بھاگنے لگی۔ معاذ کی تیز حسیات نے اسے غیر معمولی پن کا احساس دلایا اور اس نے رخ موڑ کر اس طرف دیکھا جہاں سے لڑکی نمودار ہوئی تھی۔ وہاں درختوں کے جھنڈ سے اب دو لڑکے نمودار ہو رہے تھے۔ ان کے چہروں پر وحشت تھی اور سانس پھولا ہوا تھا۔ معاذ نے ان لڑکوں کو شناخت کرلیا۔ وہ یونیورسٹی میں ہی پڑھتے تھے اور ان کا شمار ان لڑکوں میں ہوتا تھا جو پڑھتے کم اور تفریح و غنڈا گردی زیادہ کرتے تھے۔ ان کا تعلق تو پتا نہیں کس ڈیپارٹمنٹ سے تھا لیکن وقتاً فوقتاً ہر ڈیپارٹمنٹ کے چکر لگانا ان کے پسندیدہ مشاغل میں شامل تھا۔ اصل میں وہ دولت مند باپوں کی اولاد تھے اور سمجھتے تھے کہ باپ کی دولت کی صورت میں ان کا مستقبل محفوظ ہے اس لیے پڑھنے پڑھانے میں جان کھپانے کے بجائے موج میلے میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ دولت سے متاثر ہونے والی اور ان ہی جیسا مزاج رکھنے والی لڑکیوں کی ایک بڑی تعداد ان کے دوستوں کے حلقے میں شامل تھی البتہ شریف اور سنجیدہ مزاج لڑکیاں ان سے پہلو بچا کر نکلتی تھیں۔ اپنی ان صفات کی وجہ سے وہ لڑکے پوری یونیورسٹی میں مشہور اور جانے پہچانے تھے اس لیے معاذ نے بھی انہیں فوراً ہی پہچان لیا اور یہ بھی سمجھ گیا کہ ابھی جو لڑکی بگولے کی طرح سڑک پر نمودار ہوئی تھی اور اس کی بائیک سے ٹکرانے سے بال بال بچی تھی، اس کے پیچھے یہی دونوں بلائیں لگی ہوئی تھیں۔ اسے حیرت اور تشویش دونوں نے بیک وقت گھیر لیا۔ اس ویرانے میں وہ لڑکی نہ جانے کیوں نکل آئی تھی اور اس کی خیریت سخت مشکوک نظر آرہی تھی۔ وہ دونوں جھنڈ سے نکلنے کے بعد اب سڑک پر پہنچ گئے تھے اور یقیناً انہیں بھی اندازہ تھا کہ لڑکی سڑک پار درختوں کے دوسرے جھنڈ میں گھس چکی ہے۔ معاذ کو بائیک سمیت سڑک پر رکے دیکھ کر وہ بھی ذرا سا ٹھٹکے تھے لیکن پھر گویا انہوں نے اسے نظرانداز کردینے کا فیصلہ کرلیا اور بھاگتے ہوئے اس کے سامنے سے گزرنے لگے۔ معاذ نے بے اختیار ہی بائیک کا ہارن بجا کر انہیں اپنی طرف متوجہ کیا اور بہ آوازِ بلند بولا۔

''ایک بات سنیں بھائی جان! مجھے آپ لوگوں سے کچھ کہنا ہے۔''

''لیکن ہمیں کچھ نہیں سننا۔ خیریت چاہتے ہو تو یہاں سے دفعان ہوجاؤ۔'' بھاگتے ہوئے ان میں سے ایک نے پلٹ کر اسے جواب دینے کی مہلت نکالی اور اسی وجہ سے وہ اپنے ساتھی سے کچھ پیچھے رہ گیا۔

''بات تو آپ کو میری سننی پڑے گی کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ آپ کے ہاتھوں کسی معصوم لڑکی کی زندگی خراب ہو۔'' وہ بہت اطمینان سے اپنی بائیک اسٹینڈ پر کھڑی کرچکا تھا اور اب خود بھی اسی سمت بڑھ رہا تھا جہاں اس کا مخاطب موجود تھا۔

''تم ہوش میں تو ہو۔ میں نے تم سے کہا نا کہ یہاں سے دفع ہوجاؤ ورنہ بعد میں تمہارے گھر والوں کو تمہاری لاش بھی مشکل سے ملے گی۔'' وہ بری طرح غرایا۔

''میں ایسی دھمکیوں کے رعب میں نہیں آتا لیکن تمہیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر تم لوگ باز نہیں آئے تو تمہارے ہاتھ پیروں کی ہڈیاں کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہوسکتی ہیں۔'' معاذ نے خوف زدہ ہوئے بغیر اسے جواب دیا اور

چند فٹ کے فاصلے سے اس کے عین سامنے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ بے خوفی اور بے جگری اس کی فطرت کا حصہ تھی۔

''ابے او مچھر کی اولاد! تو مجھے یعنی سلطان کو دھمکی دیتا ہے۔'' اس کے الفاظ نے مقابل کا دماغ گھما دیا اور وہ غصے سے کف اڑانے لگا۔ شدید غصے ہی کی کیفیت میں اس نے اپنا ہاتھ پیچھے کی طرف لے جا کر پینٹ میں اڑسا ہوا پسٹل باہر نکالنے کی کوشش کی، معاذ بھاگتے ہوئے اس کے پاس پسٹل کی موجودگی سے پہلے ہی واقف ہو چکا تھا اور جانتا تھا کہ کسی بھی مرحلے پر وہ پسٹل نکال سکتا ہے اس لیے اس طرف سے پوری طرح ہوشیار تھا۔ جیسے ہی سلطان ہاتھ پیچھے کی طرف لے گیا، معاذ نے اپنی ٹانگ کو حرکت دی اور نیم دائرے میں گھومتی ہوئی اس کی ٹانگ اتنی زور سے سلطان کے پہلو میں لگی کہ وہ اپنے قدموں پر کھڑا نہیں رہ سکا اور اچھل کر کچھ دور جا گرا۔ اس کی انگلیوں کی گرفت میں صحیح طور پر نہ آنے والا پسٹل بھی اچھل کر دوسری طرف جا گرا۔

''تو تو حرام..... تیری یہ ہمت کہ تو نے سلطان پر ہاتھ اٹھایا۔ تیری تو میں تکا بوٹی کر دوں گا سالے۔'' وہ گرنے کے بعد پھرتی سے اٹھا اور کسی فلمی ولن کی طرح بڑکیں مارنے لگا اور مغلظات کا ایک طوفان اس کے منہ سے ابل پڑا۔ ہر وقت غنڈا گردی کے بل پر اپنی برتری قائم رکھنے والے کو یہ کیسے برداشت ہو سکتا تھا کہ کوئی اس کے کام میں دخل دے۔ وہ اور اس کے ساتھی تو خود کو کوئی بہت اونچی شے سمجھتے تھے جن کا خیال تھا کہ کسی میں ان کے مقابلے پر آنے کی ہمت ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ معاذ کو یاد آ گیا تھا کہ اس کے دوسرے ساتھی کا نام کامران تھا اور وہ کامی کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ تو وہ جو کامی تھا وہ بھی یقیناً معاذ کی دخل اندازی سے واقف تھا لیکن وہ اپنے دوست کی مدد کے لیے رکا نہیں تھا۔ یقیناً اسے اعتماد تھا کہ اس کا دوست اس صورتِ حال سے بخوبی نمٹ لے گا اس لیے اس نے لڑکی کے پیچھے جانا ہی مناسب سمجھا تھا۔ غیظ و غضب سے بھرا سلطان مغلظات بکتا ہوا کسی سانڈ کی طرح معاذ پر چڑھا آ رہا تھا۔ اس کی اتنی بکواس پر بھی معاذ کے چہرے پر اشتعال کی کوئی علامت نہیں ابھری تھی اور وہ بہت سکون سے سلطان پر نظریں مرکوز کیے کھڑا تھا۔

سانڈ کی طرح ڈکراتا سلطان شاید پوری قوت سے اسے اپنے تربوز جیسے سر کی ٹکر مارنا چاہتا تھا۔ معاذ آخری لمحے تک اپنی جگہ جما رہا اور جب اس کے..... اور سلطان کے درمیان صرف چند انچ کا فاصلہ رہ گیا تو وہ نہایت تیزی اور خوبصورتی سے اس کے سامنے سے ہٹ کر ایک سائڈ میں ہو گیا۔ سلطان اپنے ہی زور میں آگے نکلتا چلا گیا۔ اس موقع پر معاذ نے محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً اپنی ٹانگ اڑا دی، نتیجتاً سلطان کے متحرک جسم کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور وہ توازن کھو کر اس طرح چاروں شانے چت ہوا کہ اس کا منہ زمین سے جا لگا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے حلق سے ایک زوردار چیخ بلند ہوئی۔ معاذ نے اس چیخ کو خاطر میں لائے بغیر اسے ٹھوکروں میں رکھ لیا۔ جتنی بکواس سلطان نے کی تھی، ایسا نہیں تھا کہ وہ اس پر اثر انداز نہیں ہوئی تھی۔ اسے سلطان کی گندی زبان پر اندر سے بہت تپ چڑھی تھی لیکن بظاہر اس نے خود کو پُرسکون رکھا تھا۔ وہ اس نکتے کو سمجھتا تھا کہ جذبات اور اشتعال میں آ کر فوری ردِعمل کا اظہار کرنا اکثر نقصان کا سبب بنتا ہے اور صورتِ حال انسان کے قابو سے باہر ہو جاتی ہے۔ اب جبکہ صورتِ حال کافی حد تک اس کے قابو میں آ چکی تھی۔ وہ اچھی طرح اپنی بھڑاس نکالنے کی کوشش کر رہا تھا اور سلطان کو اپنی ٹھوکروں پر رکھ لیا تھا۔

ہر ٹھوکر پر بلبلاتے سلطان نے جب خود کو اس کے مقابلے میں کھڑے ہونے کے لائق نہ پایا تو بچوں کی طرح زور زور سے ''کامی، کامی'' پکارنے لگا۔ شاید اسے امید تھی کہ کامی آ کر اسے اس عذاب سے نجات دلا دے گا۔ معاذ پہلے ہی کامی کی آمد کی طرف سے بالکل بے فکر نہیں تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ اپنی ''مہم'' میں کامیاب یا ناکام ہو کر کامی بہرصورت اس طرف واپس آئے گا۔ اس لیے سلطان کی ''تواضع'' کرتے ہوئے اپنے گردوپیش پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا۔ سلطان نے بہ آوازِ بلند کامی کو پکارنا شروع کیا تو وہ مزید چوکنا ہو گیا اور سب سے پہلے اس شور مچانے والے ڈبے کو خاموش کرنے کے لیے اس کی کیپٹی پر پیر سے ایک نپی تلی ٹھوکر لگائی۔ ٹھوکر کھاتے ہی سلطان کی آوازیوں بند ہوئی جیسے کسی سی ڈی پلیئر کا بٹن آف کر دیا گیا ہو۔ وہ اپنی ساری جدوجہد اور مزاحمت سے نجات پا کر ایک لمحے میں ہی انتہا غفیل ہو گیا۔ بے ہوشی کی حالت میں زمین پر پڑا وہ خاصا بھیانک لگ رہا تھا۔ اس کے لمبے بال اور چوڑا چکلا چہرہ مٹی سے اٹ گئے تھے اور منہ سے خون نکل کر دونوں طرف کی باچھوں سے بہہ رہا تھا۔ اس حلیے میں وہ کوئی آدم خور لگ رہا تھا لیکن ایسا آدم خور جس کے باہر کو نکلے ہوئے نکیلے اور لمبے دانت تو کجا عام اصلی دانت بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ زمین سے منہ ٹکرانے کے باعث اس کے آگے کے دو دانت ٹوٹ

چکے تھے اور ان ٹوٹے ہوئے دانتوں کی وجہ سے ہی اس کے منہ سے خون بہتا نظر آ رہا تھا۔

سلطان کی بے ہوشی کے بعد معاذ نے تیزی سے اپنے اردگرد نظریں دوڑانا شروع کر دیں۔ سڑک اب بھی دور تک خالی پڑی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی پوری توجہ درختوں کے اس جھنڈ کی طرف مبذول کر لی جس میں پہلے وہ لڑکی اور پھر کامران جا کر غائب ہو گئے تھے۔ سلطان کی پکار پر اگر کامران واپس پلٹ کر آتا تو یقیناً اسے اسی طرف سے آنا پڑتا لیکن کامران اس کی توقع کے برخلاف کچھ ہوشیار ثابت ہوا اور اندھا دھند بھاگتے ہوئے آنے کے بجائے درختوں کے جھنڈ میں ہی کہیں رک گیا۔ اس جگہ کے سناٹے اور اپنی حسیات کی تیزی کی وجہ سے ہی معاذ اس کے بھاگتے قدموں کی چاپ سننے میں کامیاب ہو سکا تھا اور اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ کامران کسی درخت کی آڑ میں رک چکا ہے۔ آخر ایک معمولی سے تحرک کے باعث اس نے کامران کو پالیا۔ خوفناک بات یہ تھی کہ اس کے ہاتھ میں لمبی نال والا ایک خاصا مہلک پستول موجود تھا اور وہ خود کو آڑ میں رکھتے ہوئے معاذ کو نشانہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ معاذ جس جگہ کھڑا تھا، وہاں اسے کوئی آڑ میسر نہیں تھی۔ نہ ہی اس کے پاس کوئی ہتھیار تھا۔ سلطان کا گر جانے والا پسٹل بھی خاصے فاصلے پر پڑا ہوا تھا اور وہ اتنی دور سے خالی ہاتھ کامران کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ بس اس نے کچھ نہ کرنے کے مقابلے میں کچھ کرنا بہتر سمجھتے ہوئے اس جانب چھلانگ لگائی جہاں سلطان کا پسٹل گرا ہوا تھا۔ اس کی یہ حرکت اس کے لیے بابرکت ثابت ہوئی۔ وہ جس لمحے قلابازی کھا کر پسٹل تک رسائی کی کوشش کر رہا تھا، فضا میں یکے بعد دیگرے دو دھماکے گونجے اور گولیاں شائیں شائیں کرتی ہوئی عین اس جگہ سے گزریں جہاں کچھ دیر قبل وہ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے سلطان کا پسٹل اپنے قبضے میں لے کر خود بھی اس طرف ایک فائر جھونک دیا جس جگہ اس نے کامران کو چھپا ہوا دیکھا تھا لیکن اس کا فائر بھی بے سود ثابت ہوا۔ کامران کو موٹے تنے کے درخت کی آڑ میسر تھی اس لیے کوئی اس تک رسائی حاصل نہیں کر سکی۔ معاذ کھلی جگہ پر مستقل ایک جگہ ٹکے رہنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا چنانچہ ایک بار پھر اس نے تیزی سے اپنی جگہ بدلنے کے لیے خود کو حرکت دی۔ اسی وقت اس کے کانوں نے ایک اور دھماکے کی آواز سنی لیکن یہ دھماکا پہلے دھماکوں کی بہ نسبت کچھ ہلکا تھا۔ لگتا تھا چھوٹے کیلیبر کا ہتھیار استعمال ہوا ہے۔ اس دھماکے کے ساتھ ہی فضا میں ایک دردناک مردانہ آواز گونجی۔ معاذ نے آواز کی سمت دیکھا تو اسے کامران اپنی ٹانگ پکڑ کر زمین پر بیٹھتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اتنا گھبرا گیا تھا کہ اس کے ہاتھ سے اس کا پسٹل بھی گر گیا تھا۔ فائر کس نے کیا وہ ابھی سوچ بھی نہیں پایا تھا کہ وہی گلابی بگولا ایک بار پھر درختوں کے جھنڈ سے برآمد ہوا۔

''وقت ضائع مت کرو اور جلدی یہاں سے نکلو۔''

معاذ کے قریب پہنچ کر اس نے ہیجانی لہجے میں اس سے کہا تو وہ بھی تیزی سے حرکت میں آ گیا اور سڑک پر کھڑی اپنی بائیک تک پہنچ کر پھرتی سے اسے کک لگائی۔ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ بائیک اسٹارٹ ہوتے ہی اچک کر اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ وہ نازک سی، نرم و گداز جسامت رکھنے والی خوش شکل لڑکی تھی جس کے بھورے بال چھوٹی سی پونی ٹیل کی شکل میں بندھے ہوئے تھے لیکن اس وقت معاذ کو وہ کچھ خطرناک لڑکی لگ رہی تھی کیونکہ اس کے نرم، گلابی ہاتھوں میں ایک چھوٹا سا چپٹی نال والا پسٹل دبا ہوا تھا اور معاذ سمجھ سکتا تھا کہ کامران کی ٹانگ میں لگنے والی گولی اسی پسٹل سے چلائی گئی ہوگی۔ بہرحال وہ جس صورتِ حال میں پھنس گیا تھا، اس کا اب یہاں سے نکل جانا ہی مناسب تھا۔ لڑکی سے وہ آگے جا کر اپنی جان چھڑا سکتا تھا۔ لڑکی کے بیٹھتے ہی اس نے ایک جھٹکے سے بائیک آگے بڑھائی۔ اسی وقت اس نے اپنے بہت قریب سے فائر کی آواز سنی اور سمجھ گیا کہ یہ گولی بھی اس کے پیچھے بیٹھی ہوئی لڑکی نے چلائی ہے۔ تیز رفتاری سے بائیک چلانے کے باوجود اس نے پیچھے مڑ کر لڑکی کی طرف دیکھا۔

''کچھ نہیں، بس ایسے ہی ڈرانے کے لیے ہوائی فائر کیا تھا۔ اس خبیث کامی کو اپنا پسٹل مل گیا تھا اور زخمی ہونے کے باوجود وہ ہم پر فائر کرنے کی فکر میں تھا۔ میرے گولی چلانے پر ڈر کر ایک بار پھر کسی درخت کے تنے کے پیچھے دبک گیا ہے۔'' وہ جو پہلے اسے خاصی خوف زدہ محسوس ہوئی تھی، اب کافی پرسکون محسوس ہو رہی تھی البتہ اس کے لہجے کا ہلکا سا ارتعاش بتا رہا تھا کہ ابھی وہ مکمل طور پر خوف کے حصار سے باہر نہیں آئی ہے۔ اس کا پسٹل بھی ہنوز اس کے ہاتھ میں تھا حالانکہ اب وہ لوگ جائے حادثہ سے کافی آگے نکل آئے تھے اور کوئی امکان نہیں تھا کہ اگر کامی اور سلطان کے پاس گاڑی بھی ہوئی تو وہ ان کے تعاقب میں آ جائیں گے۔ سلطان بے ہوش پڑا تھا اور کامی کی ٹانگ میں گولی لگی تھی، ایسے میں تو انہیں اپنی مدد کے لیے بھی کسی کو بلانا پڑتا۔ وہ بھلا تعاقب کے چکر میں کیسے پڑ سکتے تھے۔

''محترمہ! بہتر ہوگا کہ آپ اپنے اس پسٹل کی نمائش بند کر کے اسے کہیں چھپالیں ورنہ اگر کسی پولیس موبائل سے ٹاکرا ہوگیا تو سرعام اسلحے کی نمائش پر ہم دھر لیے جائیں گے۔''

''وہ جو بڑی بڑی خطرناک گنیں لے کر سرعام شہر میں دندناتے پھرتے ہیں، انہیں تو پولیس کچھ نہیں کہتی اور میرے اس چھوٹے سے معصوم پسٹل پر جس کا میرے پاس لائسنس بھی موجود ہے، اس کے لیے پولیس ہمیں دھر لے گی؟ یہ تو کوئی بات نہیں ہے۔'' معاذ کی ہدایت پر اس نے گویا برا مانتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا لیکن پسٹل بہرحال اس نے اپنی گلابی قمیص کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر کہیں ''چھپر'' کر دیا تھا۔

''ان بڑی بڑی گنوں والوں کو پولیس اس لیے کچھ نہیں کہتی کہ جن کے ہاتھ میں وہ گنیں ہوتی ہیں، انہیں بڑے بڑے لوگوں کی آشیر باد حاصل ہوتی ہے اور ان بڑے لوگوں کے خلاف منہ سے بھاپ نکالنے میں بھی پولیس والوں کے پر جلتے ہیں لیکن آپ اپنے چھوٹے سے پسٹل کو اتنا معصوم اور بے ضرر بھی قرار نہ دیں۔ اس پسٹل سے نکلنے والی چندانچ کی گولی نے اچھے بھلے چھ فٹ کے آدمی کو ناکارہ بنایا ہے اور وہ بے چارہ اب بھی اس ویرانے میں پڑا ہائے وائے کر رہا ہوگا۔'' وہ کافی آگے آگئے تھے اس لیے معاذ نے بائیک کی رفتار کم کر دی تھی اور بہت سادہ سے انداز میں اس کے اعتراض کا جواب دے رہا تھا۔ خود وہ سلطان کا پسٹل ایک گڑھے میں اچھال چکا تھا۔

''گولی تو مجھے آپ کی وجہ سے چلانی پڑی تھی۔ اگر میں اس کی ٹانگ میں گولی نہیں مارتی تو وہ آپ کو گولی مار چکا ہوتا اور ظاہر ہے میں آپ کو خاموشی سے گولی کا نشانہ بنتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ میرے خیال میں آج کے دور میں بھی دل میں جذبۂ ہمدردی رکھنے اور مشکل وقت میں کسی کے کام آنے والے شخص کے ساتھ اتنا برا نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ آج کل ایسے لوگ کمیاب ہوگئے ہیں اور جتنے بچے ہیں، انہیں اتنی آسانی سے ضائع نہیں ہونے دینا چاہیے۔'' وہ اب مکمل طور پر خوف کے حصار سے نکل آئی تھی اور بڑی شگفتگی سے معاذ کو اپنے گولی چلانے کی وجہ سے آگاہ کر رہی تھی۔

''آپ جس انداز میں میرے بارے میں بات کر رہی ہیں، اس سے مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ میں کوئی کالا غزال یا سرخ زریں وغیرہ کے قبیلے کا فرد ہوں جس کی نسل معدومی کے خطرے سے دوچار ہے اور جس کے تحفظ کے لیے محکمۂ جنگلی حیات کو خصوصی اقدامات کرنے پڑ رہے ہیں۔'' لڑکی کے شگفتہ انداز پر معاذ کی حسِ ظرافت بھی پھڑک اٹھی اور اس نے شوخ سے لہجے میں تبصرہ کیا۔ اس تبصرے کو سن کر لڑکی ہنس پڑی پھر یکدم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔

''بات کچھ ایسی ہی ہے معاذ صاحب! ہمارے معاشرے سے بہادر، جرأت مند اور اعلیٰ اخلاقی اقدار رکھنے والے لوگ معدوم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اب کوئی کسی کو مصیبت میں دیکھتا ہے تو اس کی مدد کے لیے نہیں رکتا مگر آپ رکے تھے تو میرے حساب سے آپ واقعی ایک قابلِ قدر ہستی ہیں۔''

''میں کیا ہوں اور کیا نہیں اس بات کو چھوڑیے لیکن میں اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ لوگوں کا عمومی رویہ ایک المیہ ہی سہی، بہرحال غیر فطری نہیں ہے۔ دن بدن بگڑتے حالات نے لوگوں کو دہشت زدہ کر دیا ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ کسی کے معاملے میں دخل دینے سے ان کی اپنی جان کے لالے پڑ سکتے ہیں اس لیے ہر شریف آدمی کی کوشش ہوتی ہے کہ آنکھ کان لپیٹ کر رکھے اور خود کو محدود کر کے بیوی بچوں کے ساتھ باعزت اور پُرسکون زندگی گزار سکے۔''

''شاید آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔'' اس نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے معاذ کے ساتھ اتفاق کیا۔

''آپ میرا نام کیسے جانتی ہیں؟'' معاذ کو یاد تھا کہ اس نے ابھی اسے اس کے نام سے مخاطب کیا تھا، اس لیے موقع ملتے ہی اس سے دریافت کیا۔

''آپ یونیورسٹی کے ان نمایاں اسٹوڈنٹس میں سے ہیں جنہیں مجھ سمیت بہت سے لوگ ویسے ہی اچھی طرح جانتے ہیں۔ جو نہیں بھی جانتے ہوں گے، وہ پولیس سے ہونے والے آپ کے ٹاکرے کی ویڈیو وائرل ہونے کے بعد اچھی طرح آپ کو جان چکے ہوں گے، اس لیے میرے خیال میں آپ کا یہ سوال بالکل بے مقصد ہے۔'' اس نے ایسے انداز میں جواب دیا کہ معاذ جھینپ سا گیا۔ اس کی وہ ویڈیو تو واقعی بہت مقبول ہوئی تھی اور لوگ اسے اکثر اس کا حوالہ دیتے رہتے تھے حالانکہ وہ خود اس واقعے کو بھول جانا چاہتا تھا۔ تھانے میں گزری اس تکلیف دہ رات میں لالہ عیسیٰ کے خاص آدمی گلو استاد اور اس کے چیلوں سے ہونے والی ملاقات، ابو کی دی ہوئی رشوت اور سرصفات کی سفارش کے نتیجے میں ملنے والی رہائی میں سے کچھ بھی ایسا خوشگوار نہیں تھا جسے وہ یاد رکھنا چاہتا ہو۔

''ویسے میرا تعلق آپ ہی کے ڈیپارٹمنٹ سے ہے بس میں آپ سے جونیئر اور کچھ غیر نمایاں سی لڑکی ہوں اس لیے

آپ مجھے نہیں جانتے ہوں گے۔'' معاذ کے احساسات سے بے خبر وہ برجستہ لہجے میں اپنی گفتگو جاری رکھے ہوئے تھی۔

''اوہ تو آپ یونیورسٹی میں پڑھتی ہیں یعنی ان دونوں کو بھی جانتی ہوں گی۔'' معاذ کا اشارہ کامی اور سلطان کی طرف تھا۔

''جانتی تو ہوں لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ ان دونوں سے اس جگہ مڈبھیڑ ہوجائے گی۔'' اس نے ماتھے پر آجانے والی ایک لٹ کو چٹکی میں پکڑ کر کان کے پیچھے اڑستے ہوئے جواب دیا۔ اب وہ شہر کی بارونق سڑکوں پر آچکے تھے اس لیے خوف کا معمولی سا بھی اثر باقی نہیں رہا تھا اور وہ بہت اطمینان سے گفتگو کررہے تھے۔

''بائی داوے۔ آپ وہاں اس ویران سی جگہ پر کیا کررہی تھیں؟'' اس بار معاذ نے بیک ویو مرر میں اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی لیکن اسے کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ لڑکی اس کی اپنی پشت کے پیچھے تقریباً چھپی ہوئی تھی۔

''ذرا یہاں تھانے کے سامنے روک لیں۔ میں ایف آئی آر کٹوا کر ابھی آتی ہوں۔ اگر آپ اتنی دیر میرا انتظار کرسکیں تو میں آپ کے تمام سوالوں کے اطمینان بخش جواب دے دوں گی۔'' پولیس اسٹیشن کی عمارت سامنے ہی نظر آرہی تھی جسے دیکھ کر اس نے معاذ سے فرمائش کی تھی۔

''آپ اس واقعے کی پولیس میں رپورٹ بھی کریں گی؟'' معاذ نے بائیک روک دی لیکن حیرت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ وہ ایک بندے کی ٹانگ میں گولی مار کر آرہی تھی اور ایف آئی آر کٹوانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ یہ کوئی کم حیرت کی بات نہیں تھی۔

''میں صرف اپنا پرس اور موبائل چھیننے جانے کی ایف آئی آر کٹوانا چاہتی ہوں تاکہ بعد میں میرے لیے کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہوسکے۔'' اس نے سنجیدگی سے معاذ کو جواب دیا اور خود اعتمادی سے قدم اٹھاتی ہوئی پولیس اسٹیشن کے گیٹ کی طرف بڑھنے لگی۔ معاذ کو اعتراف کرنا پڑا کہ وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے۔ وہ جانتا تھا کہ ہمارے ہاں کی عام خواتین تو اشد مجبوری کی حالت میں ہی تھانوں وغیرہ کی چار دیواری میں قدم رکھتی ہیں اور وہ بھی اکیلی بہت ہی کم اس طرف کا رخ کرتی ہیں۔ عموماً ان کے ساتھ کوئی مرد ضرور موجود ہوتا ہے لیکن وہ نہایت بے خوفی سے تن تنہا ایف آئی آر کٹوانے چلی گئی تھی۔ وہ اس کے قریب سے ہی گزر کر گئی تھی اس لیے اس نے اس کا چہرہ اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ اس چہرے کے لیے اسے ہلکی سی شناسائی محسوس ہوئی تھی اور اسے خیال آیا تھا کہ شاید اس نے یہ چہرہ یونیورسٹی میں ہی دیکھا تھا لیکن بہرحال وہ ان شناسا چہروں میں سے نہیں تھی جنہیں وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ وہیں رک کر اس کا انتظار کرے گا۔ اس لڑکی کے لیے اس کے دل میں تجسس پیدا ہوگیا تھا۔ کمال کی بات یہ تھی کہ وہ اسے اتنی خطرناک صورتِ حال سے نکال کر لایا تھا اور وہ اتنی دیر تک اس کے پیچھے بائیک پر بیٹھ کر اس سے اچھی خاصی گفتگو کرتی رہی تھی اور ابھی تک اسے اس لڑکی کا نام بھی معلوم نہیں تھا۔ تجسس نے اسے لڑکی کے انتظار میں وہاں رکے رہنے پر مجبور کردیا۔ انتظار کے اس عرصے میں اس نے گھر فون کرکے اطلاع دے دی کہ وہ حنین کے گھر سے واپس آچکا ہے اور ایک دوست کے ساتھ ہے، اس لیے ممکن ہے کہ اسے گھر پہنچنے میں کچھ تاخیر ہوجائے۔ روایتی ماؤں کی طرح سعیدہ بیگم بھی اپنی اولاد کی طرف سے ازحد فکرمند رہا کرتی تھیں اور ان کی خواہش ہوتی تھی کہ ان کے تینوں بچے وقتِ مقررہ پر گھر واپس آجائیں اور یہ ممکن نہ ہوسکے تو کم از کم انہیں اطلاع ضرور دے دیں کہ وہ کہاں مصروف ہیں اور کتنی دیر سے واپس آئیں گے۔

اسے پولیس اسٹیشن کے باہر اپنے اندازے سے کچھ کم وقت انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی اور وہ لڑکی باہر آتی دکھائی دی۔ پولیس اسٹیشن کے گیٹ سے خود تک کا درمیانی فاصلہ طے کرنے کے دوران اسے لڑکی کا بھرپور جائزہ لینے کا موقع مل گیا۔ اس نے ہلکی اور گہری گلابی لائنوں والی گھٹنوں سے ذرا اونچی اوپن شرٹ اسٹائل کی قمیص پہنی ہوئی تھی جس کے ساتھ قدرے چست ہلکے گلابی رنگ کا ٹراؤزر تھا۔ باقاعدہ دوپٹے کی جگہ اس نے گلے میں گلابی مفلر سا پہن رکھا تھا جس کو گرہ لگی ہوئی تھی اور شاید اسی وجہ سے وہ بھاگ دوڑ کے دوران کہیں گرا نہیں تھا۔ پیروں میں اس نے کینوس شوز پہن رکھے تھے جن کی وجہ سے یقیناً اسے تیز رفتاری سے بھاگنے میں آسانی رہی ہوگی، اس وقت بہرحال وہ بہت اطمینان سے نپے تلے قدم اٹھاتی ہوئی اس کی طرف آرہی تھی۔ چلنے کے دوران اس کے بھورے بالوں کی پونی ٹیل ایک ردھم سے دائیں بائیں جھول رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی بھوری تھیں اور بہت گوری رنگت کے ساتھ تیکھے نقوش اسے خاصی خوبصورت لڑکیوں میں شمار کروانے کے لیے کافی تھے لیکن معاذ کو ایسا محسوس ہورہا تھا کہ اس کے حسن میں مشرقیت سے زیادہ مغربیت ہے۔ وہ مکمل طور پر بھی مغربی حسن کی مالک نہیں تھی۔ خصوصاً اس کی رنگت میں جو

کشش تھی، وہ مغربی عورتوں میں بہت کم پائی جاتی ہے۔ گویا وہ جیسے مغرب اور مشرق کا ملاپ تھی۔

''میرے خیال میں ہم کچھ دیر کسی پارک وغیرہ میں بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں۔ بائیک پر بیٹھ کر چیخ چیخ کر باتیں کرنا مجھے زیادہ اچھا نہیں لگتا۔ ویسے بھی اب ہم بارونق شہر میں موجود ہیں اور مجھے آپ کو زیادہ زحمت نہیں دینا چاہیے۔ یہاں سے اپنے گھر جانے کے لیے مجھے کوئی رکشا ٹیکسی وغیرہ آرام سے مل جائے گی لیکن میں نہیں چاہتی کہ آپ کے ذہن میں کوئی الجھن رہ جائے اس لیے آپ کو یہ پیشکش کر رہی ہوں۔ یہاں قریب ہی ایک پارک ہے، آیئے وہاں چلتے ہیں۔'' اس نے کہا تو معاذ نے انکار نہیں کیا اور خاموشی سے بائیک اسٹارٹ کر دی۔ وہ ایک بار پھر اچک کر اس کے پیچھے سوار ہو گئی۔ دو تین منٹ میں وہ لڑکی ہی کی راہنمائی میں اس قریبی پارک تک پہنچ چکے تھے۔ ابھی شام ڈھلی نہیں تھی لیکن پارک کی روشنیاں جل چکی تھیں۔ وہاں کافی رونق تھی اور بڑی تعداد میں بینچ پر بیٹھے ہوئے جوڑوں کے علاوہ بچے بھی نظر آ رہے تھے۔ انہیں ایک دور افتادہ گوشے میں خالی بینچ میسر آ سکی۔ وہ اسی پر ٹک گئے۔

''میرے خیال میں سب سے پہلے آپ مجھے اپنے نام سے آگاہ کر دیں۔ بڑا عجیب سا لگ رہا ہے کہ ہم اتنی دیر سے ایک دوسرے کے ساتھ ہیں لیکن مجھے ابھی تک آپ کا نام ہی معلوم نہیں ہے۔'' بینچ پر بیٹھتے ہی معاذ نے اس سے فرمائش کی تو وہ ہنس دی۔ پھر بولی۔

''جس سچویشن میں ہماری ملاقات ہوئی اس میں تعارف کی گنجائش ہی کہاں تھی، بہرحال اب میں آپ کو بتا دیتی ہوں کہ میرا نام بشریٰ گلزار ہے اور میرے والد گلزار عاصم ایک ممتاز صحافی ہیں۔''

''اوہ! انہیں تو میں نے کئی ٹاک شوز میں تبصرے اور تجزیے کرتے ہوئے دیکھا ہے۔''

''ضرور دیکھا ہوگا۔ وہ ایسے آدمی ہیں جو گھر پر کم اور چینلز پر زیادہ نظر آتے ہیں۔ ان کے تجزیوں کو بہت مستند تصور کیا جاتا ہے اس لیے ہر اینکر کی خواہش ہوتی ہے کہ انہیں اپنے پروگرام میں ضرور شامل کرے۔ اب آپ کو معلوم ہی ہے کہ ہمارے ملک میں کتنے تھوک کے بھاؤ ٹی وی چینلز کھل گئے ہیں اور ہر چینل سے ہفتے میں دسیوں ٹاک شوز پیش کیے جاتے ہیں۔ میرے والد صاحب ذرا بامروت قسم کے انسان ہیں اس لیے چھوٹے سے چھوٹے چینل کے عام سے اینکر تک کو انکار نہیں کر پاتے اور براہ راست پروگرام میں شرکت کے لیے نہ بھی جا سکیں تو ٹیلی فون لائن پر ضرور ایسے لوگوں کو دستیاب ہو جاتے ہیں حالانکہ اس طرح خود ان کا بہت وقت ضائع ہوتا ہے اور انہیں اپنے کام انجام دینے کے لیے اکثر اپنی راتوں کی نیند بھی قربان کرنی پڑتی ہے لیکن ستم یہ ہے کہ لوگ اس پر بھی انہیں نہیں بخشتے اور نجی محفلوں میں ان پر یہ تبصرہ کیا جاتا ہے کہ گلزار عاصم صاحب کو شہرت کی چاٹ لگ گئی ہے اس لیے وہ ہر وقت ٹی وی کی اسکرین پر موجود رہتے ہیں۔'' اپنی بات کے اختتام پر اس نے ایک استہزائیہ قہقہہ لگایا لیکن اس قہقہے میں بھی بڑا ترنم اور دلکشی تھی۔ فوراً ہی قریب سے گزرتے لڑکوں میں سے ایک کی حسِ ظرافت پھڑکی اور وہ اپنی بھونڈی آواز میں گنگنانے لگا۔

کوئی لڑکی ہے جب وہ ہنستی ہے
بارش ہوتی ہے چھم چھما چھم چھم

لڑکے کی اس حرکت پر معاذ نے غصے سے اس کی طرف گھور کر دیکھا۔

''رہنے دیجیے، اس پارک میں ذرا اس طرح کے جوڑوں کی آمد و رفت زیادہ ہے جو لوگوں سے چھپ چھپا کر گوشۂ تنہائی میں ایک دوسرے سے ملنے آتے ہیں اور اس طرح کے منچلے ایسے جوڑوں کے ساتھ ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ کر کے اپنی تفریح کا بندوبست کر لیتے ہیں۔ یہ ایک بے ضرر سی ایکٹویٹی ہے جس پر کوئی ردِعمل دینا فضول ہے۔ ہمیں اس الگ تھلگ بینچ پر بیٹھے دیکھ کر ان لڑکوں کو ہم پر ایسے ہی کسی جوڑے کا گمان ہوا ہوگا۔ بہرحال جانے دیں۔ میرے پاس میرا پرس نہیں تھا اس لیے میں نے مجبوراً کسی ریسٹورنٹ کے بجائے آپ سے اس پارک میں چلنے کو کہا تھا ورنہ میں آپ کو ہرگز یہاں نہ لاتی۔'' معاذ کے ردِعمل پر بشریٰ نے اسے نرمی سے سمجھایا اور یہاں آنے کی وجہ بیان کی۔ اس دوران وہ لڑکے قہقہے لگاتے ہوئے آگے چلے گئے تھے۔

''مجھے اندازہ نہیں تھا ورنہ میں خود آپ کو ریسٹورنٹ چلنے کی پیشکش کرتا۔ اپنے پرس کی غیر موجودگی پر آپ نے ایک غلط فیصلہ کر لیا۔ ہمارے معاشرے میں مرد کی موجودگی میں خواتین کے بل پے کرنے کو کچھ بدتہذیبی شمار کیا جاتا ہے اور میں اتنا بدتہذیب نہیں ہوں۔ خیر، اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ ہم یہاں سے اٹھ کر کسی ڈھنگ کی جگہ پر جا سکتے ہیں بلکہ چلتے ہی ہیں۔'' وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

''پلیز بیٹھیے معاذ! میں اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کی زیادہ پروا نہیں کرتی۔ وہ لڑکے کم عمر اور ناسمجھ تھے جو ایسی

چھیڑ چھاڑ کر گئے۔ دو میچور لوگوں کو ایسی باتوں پر ردعمل ظاہر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔'' اس کے سنجیدگی سے کہنے پر معاذ کو ہنسی آ گئی اور وہ بغور اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''باتیں تو تم ایسے کر رہی ہو جیسے خود نانی اماں ہو حالانکہ میرے اندازے کے مطابق تمہاری اپنی عمر بھی بائیس سال کے آس پاس بلکہ شاید کچھ کم ہی ہوگی۔'' اس نے بالکل اچانک ہی آپ جناب کا تکلف چھوڑ دیا تھا۔

''میں طبعی نہیں، ذہنی عمر کی بات کر رہی تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ ہم دونوں ہی ابھی نوجوانوں میں شمار ہوتے ہیں لیکن ہماری ذہنی پختگی اپنی عمر کے نوجوانوں سے کہیں زیادہ ہے اس لیے ہم ان کے مقابلے میں اپنے آپ کو بجا طور پر زیادہ میچور تصور کر سکتے ہیں۔'' اس کی سنجیدگی میں ذرا فرق نہیں آیا اور معاذ کو تسلیم کرنا پڑا کہ واقعی وہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔

''اوکے۔ جو تم مناسب سمجھو۔ ہم یہیں بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں۔'' وہ دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

''ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ میرے والد گلزار عاصم صاحب ایک صحافی ہیں اور مجھ میں بھی اپنے والد کے صحافیانہ جراثیم پائے جاتے ہیں اس لیے ابھی اسٹوڈنٹ ہونے کے باوجود میں نے اس پُرخار میدان میں قدم رکھ دیے ہیں۔ میں عام صحافی خواتین کی طرح اخبارات و رسائل کے خوبصورت بنیے، آج کے فیشن، دسترخوان یا سچی آپ بیتیوں جیسے صفحات کے لیے تو لکھ نہیں سکتی تھی چنانچہ میں نے ان گنی چنی صحافی خواتین کے نقش قدم پر چلنے کا فیصلہ کیا جو اہم مسائل پر لکھتی ہیں اور یہ لکھنا محض ٹیبل پر بیٹھ کر لکھنا نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے باقاعدہ فیلڈ ورک کیا جاتا ہے۔ جس ہاؤسنگ سوسائٹی کے قریب میرا آپ سے ٹکراؤ ہوا، اس کے بارے میں کچھ مشکوک سی افواہیں سننے میں آ رہی تھیں۔ دو نمبر کام تو اس فیلڈ میں ویسے ہی ہوتا ہے لیکن اس زیر تعمیر ہاؤسنگ سوسائٹی کے بارے میں دس نمبری کی خبریں مل رہی تھیں۔ میں نے کچھ معلومات اِدھر اُدھر سے جمع کیں اور باقی کی تلاش میں خود اس جگہ جانے کا فیصلہ کیا۔ مجھے معلوم ہے کہ اس طرف ذرا کنوینس کا مسئلہ ہوتا ہے اس لیے میں نے اپنی ایک دوست کو اپنے پروگرام میں شامل کر لیا۔ میری اس دوست کو صحافت اور اس سے متعلق کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور اس کی شمولیت بس اس حد تک تھی کہ وہ مجھے سوسائٹی کے سائٹ آفس کے قریب ڈراپ کر کے کچھ دور واقع ایک دوسری ہاؤسنگ سوسائٹی میں موجود اپنی خالہ کے گھر چلی جائے گی اور جب میں اپنے کام سے فارغ ہو جاؤں گی تو وہ میرے کال کرنے پر مجھے پک کرنے آ جائے گی۔ ہاؤسنگ سوسائٹی کے سائٹ آفس کے قریب میں اپنی دوست کی تسلی کے لیے اتری تھی ورنہ میرا فوری طور پر وہاں جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں اپنا کام نمٹا کر آخر میں کسی سے ملاقات کرنا چاہتی تھی اس لیے سائٹ آفس سے کنی کترا کر آگے نکل گئی۔ میرے علم میں یہ بات تھی کہ اگرچہ تعمیر کا کام بہت تیزی سے ہو رہا ہے لیکن چھٹی کے دن وہاں کام نہیں ہوتا اس لیے مزدوروں وغیرہ سے سامنے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ وہاں صرف چوکیدار کی موجودگی کی اطلاع تھی اور چوکیدار کے بارے میں بھی یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ زیادہ تر گیٹ کے سامنے ہی کرسی ڈالے بیٹھا رہتا ہے۔ شاید باؤنڈری وال کی وجہ سے اطمینان ہوگا کہ کوئی اندر نہیں آئے گا لیکن میرے لیے دیواریں وغیرہ پھلانگ لینا کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ بچپن سے درختوں، چھتوں اور دیواروں پر چڑھنے کی بہت زیادہ پریکٹس ہے اس لیے وہاں بھی میں آرام سے دیوار پر چڑھ کر اندر کود گئی۔ پہلے میں نے لوگوں کے معائنے کے لیے تیار کردہ ماڈل بنگلوز کا جائزہ لیا۔ وہ واقعی بہت شاندار تھا اور اس پر پینٹ وغیرہ بھی بہت عمدہ کوالٹی کا کیا گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے دوسرے زیر تعمیر بنگلوز کا رخ کیا اور کافی دیر وہاں مٹرگشت کرنے کے بعد یہ جاننے میں کامیاب رہی کہ واقعی وہاں گڑبڑ ہے۔ عام سی نظر ڈالنے والے شخص کو اگرچہ زیر تعمیر بنگلوز کو دیکھ کر کبھی یہ گمان نہیں ہو سکتا کہ وہاں کیسا گھٹیا میٹریل استعمال کیا جا رہا ہے لیکن بہرحال میں کھوج لگانے میں کامیاب رہی کہ وہاں تعمیر میں استعمال ہونے والا سریہ، سیمنٹ، لکڑی کچھ بھی اس اعلیٰ کوالٹی کا تو کیا جس کا اشتہارات میں شور کیا جا رہا ہے، درمیانے درجے کی کوالٹی کا بھی نہیں ہے اور بس یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ جن حصوں میں ماربل وغیرہ کا استعمال کیا جانا ہے، ان حصوں کو ماربل کے ذریعے اور باقی حصوں کو عمدہ پینٹ کی مدد سے چھپانے کا انتظام کر لیا جائے گا۔

''میں نے اپنے موبائل کی مدد سے ان سارے نقائص کی ویڈیو اور تصویریں وغیرہ تیار کر لی تھیں۔ میں اس کام میں اتنی مصروف تھی کہ مجھے وہاں کسی کی آمد کی خبر نہیں ہو سکی اور میں نے اتنی دیر میں آنے والوں کی آوازیں سنیں کہ میرے لیے ان کی نظروں میں آئے بغیر راہِ فرار اختیار کرنا ممکن نہیں رہا۔ مجھے بس اتنی ہی مہلت ملی کہ میں نے اپنا موبائل سیمنٹ کی بوریوں کے پیچھے احتیاط سے چھپا دیا۔

میں نے اسے اپنے پرس میں جان کر نہیں رکھا تھا۔ میری احتیاط میرے کام آئی۔ میں نے جن لوگوں کی آوازیں سنی تھیں، وہ کامی اور سلطان تھے۔ وہ مجھے وہاں دیکھ کر حیران رہ گئے اور سختی سے مجھ سے پوچھنے لگے کہ میں وہاں کیا کر رہی ہوں۔ میں نے انہیں یہی بتایا کہ میں کہیں اور جانے کے لیے اپنی ایک سہیلی کے ساتھ اس علاقے سے گزر رہی تھی۔ اس ہاؤسنگ سوسائٹی کا بورڈ نظر آیا تو اسے دیکھنے کے لیے بے قرار ہوگئی کیونکہ ٹی وی کمرشلز میں اسے دیکھ دیکھ کر مجھے ویسے ہی اسے دیکھنے کا بہت شوق ہو چکا تھا۔ میں نے اپنی سہیلی سے کہا کہ وہ مجھے یہیں اتار کر اپنی خالہ کے گھر چلی جائے اور مجھے بعد میں یہاں سے پک کر لے۔ میرے شوق کو دیکھتے ہوئے اسے مجبوراً مجھے یہاں اتارنا پڑا۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ میری سہیلی کی خالہ بیمار ہیں اس لیے اس کا ان کے گھر جانا بہت ضروری تھا ورنہ وہ بھی میرے ساتھ ہی یہاں رک جاتی۔ میری اس کہانی پر شاید وہ بہت زیادہ مطمئن نہیں ہوئے اور سلطان نے میرے ہاتھ سے میرا پرس لے کر اس کی اچھی طرح تلاشی لی۔ پرس میں عام استعمال کی کچھ چیزوں اور پیسوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ موبائل میں چھپا چکی تھی اور پسٹل ہمیشہ اپنے گریبان کے اندر چھپا کر رکھتی ہوں تاکہ میری رسائی میں رہے۔ بابا کو معلوم ہے کہ میں کس انداز میں کام کرتی ہوں اس لیے انہوں نے خود حفاظتی کے لیے مجھے یہ پسٹل دے رکھا ہے۔ میرا نشانہ بھی کافی اچھا ہے لیکن پہلی بار یہ نوبت آئی ہے کہ میں نے اس پسٹل سے گولی چلائی ہو۔ بہرحال میں آپ کو بتا رہی تھی کہ سلطان نے میرے پرس کی تلاشی لی اور مجھ سے موبائل کے بارے میں پوچھنے لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ میرے والدین بہت کنجوس ہیں اس لیے میں اس دور میں بھی ایک عدد موبائل سے محروم ہوں۔ میں نے ان کے سامنے دو چار مزید ایسی باتیں کیں کہ انہیں یقین ہوگیا کہ میں انتہائی کنجوس والدین کی ایسی بیٹی ہوں جو معمولی معمولی خواہشات کے لیے بھی ترستی رہتی ہے۔ وہ مجھ سے یہ بھی پوچھنا بھول گئے کہ گیٹ پر چوکیدار موجود ہونے کے باوجود میں اندر کیسے داخل ہوئی۔ انہوں نے نہایت خوش خلقی سے مجھے اپنے ساتھ آفس میں چل کر بیٹھنے کی پیشکش کی۔ میرے پاس ان کی بات ماننے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ اس لیے ان کے ساتھ چل پڑی۔ راستے میں کامی نے مجھے بتایا کہ یہ اس کے والد کا پروجیکٹ ہے اور وہ کبھی کبھار وہاں کا چکر لگا لیتا ہے۔

"سلطان کا اس نے اپنے دوست کی حیثیت سے تعارف کروایا۔ میں ان کے ساتھ سائٹ آفس تک پہنچی تو میں نے دیکھا کہ اسے تالا لگا ہوا تھا۔ چھٹی کی وجہ سے وہاں بیٹھنے والا اسٹاف بھی نہیں آیا ہوگا۔ میں، کامی اور سلطان کو یونیورسٹی کے حوالے سے بھی جانتی تھی اور ایک لڑکی کی حیثیت سے بھی ان کی آنکھوں میں موجود شیطانی ارادوں کو پہچان سکتی تھی اس لیے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ ان کے ساتھ سائٹ آفس میں جا کر بیکار کی مشکل میں نہ پڑوں۔ میں نے ان سے کہا کہ فی الحال میں ان کی میزبانی کا لطف نہیں اٹھا سکتی کیونکہ میری دوست آنے والی ہوگی اور اس نے مجھ سے سڑک کے کنارے ہی کھڑے ہو کر انتظار کرنے کو کہا تھا۔ میں اگر وہاں نہیں پہنچی تو مجھے اور میری سہیلی دونوں کو پریشانی ہو جائے گی۔ میرے پاس موبائل بھی نہیں ہے کہ ہم ایک دوسرے سے رابطہ کر سکیں۔ میرا یہ بہانہ سن کر سلطان عجیب سے انداز میں بولا کہ یہ تو اور بھی اچھی بات ہے کہ میرا میری سہیلی سے رابطہ نہیں ہوگا۔ کامی جو آفس کا لاک کھول رہا تھا، وہ بھی ہنسنے لگا لیکن پھر اس نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے مجھے بہلانے کی کوشش کی اور بولا کہ اگر میں اپنی سہیلی کے ساتھ نہ بھی جا سکی تو وہ خود اپنی گاڑی میں مجھے میرے گھر چھوڑ دے گا۔ میں جانتی تھی کہ یہ سب مجھے دھوکا دینے والی باتیں ہیں اس لیے میں نے ایک بار پھر انکار کر دیا۔ میرے اس بار کے انکار پر سلطان فوراً اپنی اصلیت پر اتر آیا اور کامی سے بولا کہ فضول میں اس لڑکی سے مغز ماری کر کے وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ہے جو کرنا ہے کر گزرتے ہیں۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی لیکن میں ہوشیار تھی اس لیے اسے غچا دے کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ اسکول کے زمانے میں، میں گیمز میں پابندی سے حصہ لیتی تھی اس لیے بہت تیز رفتاری سے دوڑ سکتی ہوں۔ میری والدہ کو اپنے سخت مذہبی رجحان کی وجہ سے میرے اس طرح کے گیمز میں حصہ لینے پر شدید اعتراض نہ ہوتا تو شاید میں کھیلوں کی دنیا میں خاصا نام کما لیتی۔ بہرحال عرصہ پہلے کی وہ ٹریننگ کام آئی اور میں بہت تیزی سے وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔

"پہلے ان دونوں نے مجھے آواز دے کر دھمکی دینے کی کوشش کی کہ اگر میں نہ رکی تو وہ مجھے گولی مار دیں گے۔ مجھے ان جیسے لڑکوں کے پاس ہتھیار کی موجودگی پر تو شک نہیں تھا لیکن یہ اندازہ تھا کہ جس مقصد کے لیے وہ مجھے روکنا چاہتے ہیں، گولی مارنے کی صورت میں وہ پورا نہیں ہو سکتا اس لیے

وہ حتیٰ لامکان مجھے گولی مارنے سے گریز کریں گے۔ میرا یہ اندازہ ٹھیک نکلا۔ انہوں نے مجھ پر فائر نہیں کیا اور مجھے پکڑنے کے لیے میرے پیچھے بھاگ کھڑے ہوئے۔ آپ کو شاید معلوم ہو کہ وہ ہاؤسنگ سوسائٹی سڑک سے بھی کچھ اندر کی طرف موجود ہے اور سڑک پر بس اس کے بینرز اور بورڈ وغیرہ ہی لگے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ میں بس اس امید پر بھاگی تھی کہ شاید کبھی کبھی وہاں سے گزرنے والی گاڑیوں میں سے کسی میں لفٹ لینے میں کامیاب ہو جاؤں دوسری صورت میں، میں اپنے لیے کوئی پناہ گاہ یا مورچا تلاش کرتی اور انہیں اپنے پاس پسٹل کی موجودگی سے آگاہ کرتے ہوئے انہیں خود سے دور رہنے پر مجبور کر دیتی۔ ایک موہوم سی امید تھی کہ اگر میں اپنی سہیلی کو فون نہیں کروں گی تو وہ خود آخر کار پریشان ہو کر مجھے ڈھونڈتی ہوئی وہاں آ جائے گی۔ اس طرح کی صورتِ حال میں کچھ بھی یقینی تو ہوتا نہیں ہے، بس آدمی کو قسمت پر ہی انحصار کرنا پڑتا ہے۔ میں نے بس ایک بات طے کر لی تھی کہ مجھے ان کے گھناؤنے ارادوں کی تکمیل کے لیے ان کے ہاتھ کسی صورت نہیں لگنا ہے اور اپنے اس ارادے میں، میں اتنی پختہ تھی کہ مرنے اور مار دینے کے لیے بھی بالکل تیار تھی۔ وہ تو صورتِ حال ہی بالکل اچانک بدل گئی اور آپ وہاں آ گئے اس لیے کامی کے گولی کھا لینے کے باوجود ان دونوں کی جان پھر بھی بچ گئی۔''

اس نے اتنی روانی سے ساری تفصیل سنائی کہ معاذ کو درمیان میں کہیں دخل تک دینے کا موقع نہیں مل سکا۔ جب وہ چپ ہو گئی تب پوچھا۔

''تم نے اپنا مورچا کہاں بنایا تھا؟ میرے خیال میں تو کامی درختوں کے جھنڈ میں کافی آگے تک جا کر تمہیں تلاش کرتا رہا تھا اور تم نے اسے اس وقت گولی ماری تھی جب وہ سلطان کی پکار پر واپس لوٹ کر آیا تھا۔''

''آپ کو یاد ہوگا کہ وہ مجھ سے خاصے پیچھے تھے۔ پھر آپ آ گئے تو ذرا دیر وہ آپ سے الجھ گئے۔ میرے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ میں درختوں کے جھنڈ میں گھستے ہی پھرتی سے ایک گھنے درخت پر چڑھ گئی اور خود کو درخت کی گھنی شاخوں میں چھپا لیا۔ کامی سلطان سے زیادہ چالاک ہے اس لیے وہ زیادہ دیر آپ کے چکر میں نہیں پڑا تھا اور سلطان کو آپ کے ساتھ الجھا چھوڑ کر میرے پیچھے آنے کی کوشش کی تھی لیکن میں اس سے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرنے میں کامیاب رہی تھی۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ اس کا اس طرف دھیان ہی نہیں گیا کہ میں درخت کے اوپر بھی ہو سکتی ہوں اس لیے وہ مجھے نیچے ہی ڈھونڈتا رہا۔ میں اوپر بیٹھ کر سب دیکھ رہی تھی۔ آپ نے جس طرح سلطان کی درگت بنائی، یہ دیکھ کر مجھے بڑا مزہ آیا لیکن جب اس گدھے نے ننھے بچوں کی طرح کامی کو پکارنا شروع کیا تو میں الرٹ ہو گئی۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ آپ نہتے تھے جبکہ ان دونوں کے ہی پاس ہتھیار موجود تھے۔ سلطان کو تو آپ نے اس کا پسٹل استعمال کرنے کا موقع نہیں دیا تھا لیکن مجھے خدشہ تھا کہ آپ کی رینج میں نہ ہونے کی وجہ سے کامی آپ کو نشانہ بنا سکتا ہے۔ میں چپکے سے درخت سے نیچے اتر کر اس کے تنے کے پیچھے چھپ گئی۔ اس وقت کامی کا میری طرف بالکل بھی دھیان نہیں تھا اور وہ جوش میں سلطان کی پکار پر دوڑا جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اس کا پسٹل تھا اور میرے اندیشوں کے مطابق اس نے آپ کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ آپ کے بچاؤ کے لیے مجبوراً مجھے اس کی ٹانگ پر گولی چلانی پڑی۔'' اس نے جیسے گولی چلانے کے سلسلے میں اپنی صفائی پیش کی۔

''اب تم اپنے موبائل فون کا کیا کرو گی، تمہاری اس مہم کا ''حاصل'' تو اسی موبائل میں موجود ہے۔ ہو سکتا ہے وہاں وہ مزدوروں یا پھر کسی دوسرے شخص کے ہاتھ لگ جائے۔ اس طرح تو تمہاری ساری محنت ضائع ہو جائے گی۔'' معاذ نے اس سے دریافت کیا۔

''موبائل میں نے سائیلنٹ پر رکھا ہوا تھا اور سیمنٹ کی بوریوں کے پیچھے بہت احتیاط سے چھپایا تھا اس لیے کسی کو اس کی وہاں موجودگی کا صرف اسی صورت میں علم ہو سکتا ہے کہ بوریوں کو وہاں سے ہٹایا جائے۔ موبائل جیسے بھی ملے وہ اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکے گا کیونکہ اس کا سیکیورٹی لاک صرف میرے فنگر پرنٹ پر ہی کھل سکتا ہے۔ ویسے میں جلد از جلد اسے خود حاصل کرنے کی کوشش کروں گی۔ اس پروجیکٹ کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں میں نے کافی محنت کی ہے۔ موبائل میں موجود تصاویر اور ویڈیوز میری سابقہ معلومات کے ساتھ مل کر تہلکہ مچانے میں خاصا کردار ادا کر سکتی ہیں اس لیے میری اپنے موبائل تک رسائی ضروری ہے۔'' اس کے سوال کا جواب دینے کے ساتھ وہ اطمینان سے اپنے ارادے کا اظہار کر رہی تھی۔ معاذ کو اس پر رشک آیا لیکن چھیڑنے والے انداز میں بولا۔

''تم لڑکی ہو یا کوئی بلا؟ وہاں تم نے اتنی مصیبت اٹھائی اور باقاعدہ ایک بندے کو گولی مار کر وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو سکی ہو پھر بھی دوبارہ وہاں جانے کا ارادہ۔

رکھتی ہو۔''

''ایک اچھے صحافی کو کسی بلا کی طرح ہی ہونا چاہیے جو اپنے اسائنمنٹ کے ساتھ بلا کی طرح چمٹ جائے اور اسے مکمل کر کے ہی چھوڑے۔ صرف اسی صورت میں سچی اور بے باک صحافت کا حق ادا ہوسکتا ہے۔'' وہ حد درجے سنجیدہ تھی۔ معاذ کو ہنسی آنے لگی لیکن اس نے ہنسی کو ظاہر نہیں ہونے دیا اور سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے ایک اور نکتہ اٹھایا۔

''اگر کامی اور سلطان نے تمہارے خلاف ایف آئی آر کٹوا دی کہ تم مجرمانہ عزائم کے تحت ان کے زیر تعمیر پروجیکٹ پر پائی گئی تھیں اور پکڑے جانے پر کامی کو گولی مار کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگئیں تو تم کیا کرو گی؟''

''اسی لیے میں نے پہلے ہی اپنے پرس اور موبائل کے چھینے جانے کی ایف آر کٹوا دی ہے۔ میری سہیلی راحیلہ گواہی دے دے گی کہ آج سارا دن میں اسی کے ساتھ تھی اس لیے میرے لیے زیادہ مسئلہ نہیں بنے گا۔'' اس نے مزے سے بتایا اور پھر بری طرح چونکی۔

''اوہ..... میں راحیلہ کو تو بھول ہی گئی۔ پتا نہیں وہ اپنی خالہ کے گھر بیٹھی ابھی تک میری کال کا انتظار کر رہی ہے یا میری تلاش میں نکل پڑی ہے۔ کہیں وہ کسی مصیبت میں نہ پھنس جائے۔ مجھے اسے فوری طور پر فون کر کے اطلاع دینی ہوگی۔ آپ نے یہاں کہیں کوئی پی سی او دیکھا تھا کیا؟'' اتنی دیر میں معاذ کو وہ پہلی بار پریشان اور بے چین دکھائی دی۔

''نمبر یاد ہے تو تم میرے سیل سے اپنی سہیلی کو فون کر سکتی ہو۔'' معاذ نے اسے پیشکش کی۔

''تھینک یو۔ نمبر مجھے یاد ہے۔ راحیلہ میری سب سے بیسٹ فرینڈ ہے، اس کا نمبر مجھے کیسے یاد نہیں ہوگا۔'' اس کے چہرے پر اطمینان کے رنگ آگئے اور اس نے بڑی بے تکلفی سے معاذ کا موبائل لینے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ معاذ نے اسے موبائل دے دیا اور وہ فوراً ہی نمبر ملا کر اپنی سہیلی سے باتوں میں مصروف ہوگئی۔ معاذ کو اتنی دیر میں اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ اچھی خاصی باتونی ہے اور مشکل سے ہی کوئی بات اختصار کے ساتھ کرتی ہے اس لیے اس کی یکطرفہ گفتگو سنتے ہوئے بہت صبر سے اپنا موبائل واپس ملنے کا انتظار کرنے لگا۔ اللہ اللہ کر کے اس کی گفتگو ختم ہوئی اور اس نے معاذ کو اس کا موبائل واپس کر کے رسمی سا شکریہ کہنے کے بعد از خود اسے سہیلی سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کرنا شروع کر دیا۔

''راحیلہ میرے لیے بہت پریشان تھی۔ اس نے اپنی خالہ کے گھر سے کئی بار میرے موبائل پر کال کی لیکن بیل جانے کے باوجود جب میں نے کال ریسیو نہیں کی تو وہ تھوڑی سی پریشان ہوگئی۔ اسے معلوم ہے کہ میرا موبائل اکثر سائیلنٹ پر رہتا ہے لیکن میں اس کی طرف سے اتنی غافل نہیں رہتی کہ کئی کالز آنے کے باوجود مجھے علم نہ ہو سکے۔ پھر بھی اس نے کچھ دیر انتظار کیا اور اس فکر میں رہی کہ یا تو میں اس کی کال ریسیو کر لوں یا از خود اس سے رابطہ کر لوں۔ جب دونوں ہی باتیں نہیں ہوئیں تو وہ اپنی خالہ کے گھر سے روانہ ہوگئی۔ وہ خود سیدھی سادی لڑکی ہے لیکن میرے بارے میں جانتی ہے کہ میں خاصی گڑبڑ گھٹالا ہوں اس لیے میری تلاش میں نکلنے کے باوجود وہ خاصی محتاط تھی۔ ہاؤسنگ سوسائٹی والی سڑک پر اس نے ایمبولینس اور پولیس کی ایک موبائل دیکھی تو ٹھٹک گئی اور گاڑی روک کر وہاں موجود ایک بندے سے پوچھا کہ کیا کوئی حادثہ ہوگیا ہے۔ اس بندے کو خود صحیح سے کچھ معلوم نہیں تھا، اس نے راحیلہ کو بتایا کہ شاید راہزنی کی کوئی واردات ہوئی ہے اور لٹیرے ایک لڑکے کو مار پیٹ کر اور ایک کو گولی مار کر بھاگ گئے ہیں۔ راحیلہ نے وہاں مزید رکنے میں خطرہ محسوس کیا اور گاڑی آگے نکال کر لے گئی۔ ایسے حالات میں وہ کچھ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی اس لیے خوامخواہ خود کو مشکل میں نہیں ڈالا اور میرے والد صاحب کو فون کر کے انہیں حالات سے آگاہ کر دیا۔ اس وقت وہ حسب معمول ایک ٹاک شو میں حصہ لینے کے لیے ایک چینل کے اسٹوڈیو میں موجود تھے۔ راحیلہ کی کال ملنے کے بعد یقیناً پریشان ہوں گے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں ایک کال انہیں بھی کر لوں!'' ساری تفصیل سنانے کے بعد اس نے معاذ سے درخواست کی تو وہ انکار نہیں کر سکا اور اپنے بیلنس پر فاتحہ پڑھتے ہوئے موبائل اسے تھما دیا۔ اس کے خدشات کے برخلاف اس بار اس نے بہت مختصر گفتگو کی اور صرف اپنے والد کو اپنی خیریت کی اطلاع دینے پر ہی اکتفا کیا۔

''بابا بہت بال کی کھال نکالتے ہیں اس لیے میں نے خود ہی لائن کاٹ دی۔ ورنہ راحیلہ کی طرح ان کی بھی تفصیلی باتیں سننے میں آپ کا سارا بیلنس ہی ختم ہو جاتا۔'' اس نے موبائل واپس کرتے ہوئے بڑی سادگی سے کال کے اختصار کی وجہ بتائی تو اس بار معاذ اپنی ہنسی کو نہیں روک پایا۔ محترمہ کو اپنے باتونی پن کا کوئی احساس نہیں تھا اور ان کے خیال میں دوسرے لوگ ان سے طویل گفتگو کیا کرتے تھے۔

''آپ کیا میرے بابا پر ہنس رہے ہیں؟'' اس نے

مشکوک سے انداز میں معاذ کو گھورا۔

''میری ایسی مجال کہاں؟ میں تو بس یہ سوچ رہا تھا کہ میری وجہ سے تمہارا خاصا قیمتی وقت ضائع ہو گیا ہے۔'' معاذ نے خود پر مصنوعی سنجیدگی طاری کی۔

''آپ نے میری اتنی مدد کی اور مشکل وقت میں میرے کام آئے، ایسے میں اگر مجھے آپ کے سوالات کے جوابات دینے کے لیے آپ کو وقت دینا پڑا تو یہ میرا فرض بنتا تھا ورنہ آپ الجھن ہی میں رہتے کہ کس ڈرامے میں حادثاتی طور پر انٹری دے بیٹھے تھے۔'' وہ اب بھی پوری طرح سنجیدہ تھی اور معاذ کو بڑی بردباری سے جواب دے رہی تھی۔ اس وقت معاذ کو وہ خاصی دلچسپ لڑکی لگی۔ ایک طرف تو وہ اتنی بہادر، جرأت مند اور پھرتیلی تھی کہ اتنی کم عمری میں سچائیاں ڈھونڈنے اور انہیں بے نقاب کرنے کے مشن میں جت گئی تھی اور دوسری طرف سادگی کا یہ عالم تھا کہ اسے معاذ کے اپنی گفتگو سے لطف لینے کا بھی اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا اور اس کی مذاق میں کہی گئی باتوں کا بھی نہایت سنجیدگی سے جواب دے رہی تھی۔

''کامی اور سلطان بڑی کمینی فطرت کے لوگ ہیں۔ وہ اتنی آسانی سے تمہارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ کہیں تم کسی مشکل میں نہ پڑ جاؤ۔'' اس بار معاذ پوری طرح سنجیدہ تھا۔

''میں مشکلات سے گھبرانے والی لڑکی نہیں ہوں۔ ان دونوں کو جو کرنا ہے کرنے دیں، میں انہیں ہینڈل کر لوں گی لیکن ایک بات ذہن میں رکھیں کہ مشکل میں صرف میں ہی نہیں، آپ بھی پڑ سکتے ہیں۔ ان کے خیال میں تو آپ کی دخل اندازی سے ہی معاملہ بگڑا اور شکار ان کے ہاتھوں سے نکل گیا اس لیے وہ آپ سے بدلہ لینے کی پوری پوری کوشش کریں گے۔'' اس نے اپنی بات کہتے ہوئے معاذ کا چہرہ غور سے دیکھا جیسے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی ہو کہ وہ خوف زدہ ہے یا نہیں۔

''میرے خیال میں تمہاری طرح میں بھی انہیں ہینڈل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ ویسے جہاں تک میرا اندازہ ہے کامی کو دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں کم از کم مہینا تو لگ جائے گا اور ظاہر ہے سلطان بھی یہ عرصہ اپنے دوست کی تیمارداری میں گزارے گا اسے اپنے ٹوٹ جانے والے دانتوں کا بھی کچھ نہ کچھ بندوبست کرنا ہوگا۔ اس لیے فوری طور پر کوئی ردعمل آنا مشکل ہے۔ ویسے بھی اب ڈرنے سے کیا ہوگا۔ اوکھلی میں سر دے کر موصلوں سے ڈرنا تو نری حماقت ہے۔'' معاذ نے بے پروائی سے شانے اچکائے تو وہ مسکرا دی۔ معاذ نے نوٹ کیا اس کی مسکراہٹ بہت جاندار اور چمکیلی تھی اور ذرا سا مسکرانے پر اس کا چہرہ جگمگا اٹھتا تھا۔

''تو پھر اجازت..... اب میں چلتی ہوں۔'' وہ یکدم ہی کھڑی ہو گئی۔

''میں تمہیں گھر تک چھوڑ دیتا ہوں۔'' معاذ بھی اس کے ساتھ ہی کھڑا ہوا۔

''ویسے تو یہاں سے میں رکشا یا ٹیکسی کر کے گھر جا سکتی ہوں۔ گھر پہنچ کر سواری کا کرایہ دینا کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن جب آپ نے مجھے اتنی لفٹ دی ہے تو گھر تک بھی آپ سے لفٹ لینے میں حرج نہیں ہے۔ چلیں چلتے ہیں۔'' اس نے بہت آسانی سے معاذ کی پیشکش قبول کر لی۔ پارک سے اس کے گھر تک کا راستہ بیس بائیس منٹ سے زیادہ کا نہیں تھا۔ متوسط طبقے کی آبادی میں تعمیر دو سو گز کے اس مکان کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ گلزار عاصم صاحب واقعی ایک ایمان دار صحافی ہیں جو میڈیا کی چمک دمک میں تو ضرور گھرے ہوئے ہیں لیکن صحافت سے نوٹ کمانے کا دھندا انہوں نے اختیار نہیں کیا ہے۔

''ایک کپ چائے یا کافی کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' اپنے گھر کے دروازے کے سامنے اترتے ہوئے بشریٰ نے اسے دعوت دینے کے انداز میں کہا۔

''نہیں، بس اب میں گھر جاؤں گا۔ میری امی میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔'' اس نے انکار کر دیا۔

''اوکے ایز یو وش لیکن میری یہ پیشکش محدود مدت کے لیے نہیں ہے۔ آپ جب چاہیں تشریف لا سکتے ہیں۔ بابا یقیناً آپ سے مل کر خوشی محسوس کریں گے۔'' اس نے معاذ کو اندر بلانے پر اصرار نہیں کیا لیکن یہ اشارہ بھی دے دیا کہ اس کی یہاں آمد کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔

''تمہارے بابا جیسی شخصیت سے ملنے کا تو مجھے خود بھی بہت شوق ہے اور اپنے اس شوق کی تکمیل کے لیے میں جلد یہاں کا رخ کروں گا۔ فی الحال مجھے اجازت دو۔'' معاذ نے بائیک کو کک لگائی۔ دوسری طرف اس کے لیے بھی گھر کا بند دروازہ کھل چکا تھا اور وہ ایک پیر اندر اور دوسرا باہر رکھے گویا صرف معاذ کے رخصت ہونے کی منتظر تھی۔ معاذ خود بھی روانہ ہونا چاہتا تھا لیکن پھر یکدم ہی اس کی طرف رخ کر کے اس سے بولا۔

''تم وہاں مت جانا بشریٰ! یہ تمہارے لیے ٹھیک نہیں ہوگا۔ اگر تم مجھ پر بھروسا کرو تو میں تمہارے موبائل کی

واپسی کے لیے کوشش کرسکتا ہوں۔ بس تم مجھے اچھی طرح اس جگہ کے بارے میں سمجھا دو جہاں تم نے اپنا موبائل چھپایا تھا۔''

''ٹھیک ہے۔ بابا کے موبائل پر آپ کا موبائل نمبر آ گیا ہوگا۔ میں خود آپ کو کال کر کے تفصیل سے سمجھا دوں گی۔'' معاذ کی توقع کے برخلاف اس نے ایک بار بھی انکار نہیں کیا اور بہت آسانی سے اس کی مدد لینے پر تیار ہوگئی۔ اس کے اس ردعمل پر معاذ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اسے کوئی اپنی طرح ہی کی چیز ٹکرا گئی ہے اور یہ ٹکراؤ اسے اچھا لگا تھا چنانچہ اپنی مسکراہٹ کو چھپانے کے بجائے کچھ اور کشادہ کرتے ہوئے پہلے ہی سے اسٹارٹ بائیک کو ریس دی اور وہاں سے ہوا ہوگیا۔ اگر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا ہوتا تو اسے معلوم ہوتا کہ خود بشریٰ کے ہونٹوں پر بھی بڑی جاندار سی مسکراہٹ تھی اور وہ اس وقت تک گیٹ پر ہی کھڑی رہی تھی جب تک وہ اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوگیا تھا۔

☆☆☆

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تمہیں کسی ہاؤسنگ سوسائٹی سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔ میرے خیال میں تو تمہیں فی الحال کسی گھر وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد جاب کی تلاش پھر شادی اور آخر میں ساس بہو کے پھڈوں کے بعد الگ گھر کی تلاش کا مرحلہ آنے میں تو میرے حساب سے ابھی خاصا وقت لگتا ہے تو پھر تم ابھی سے کیوں اس طرح کی چیزوں میں دلچسپی لے رہے ہو؟'' اپنی شاندار سی لینڈ کروزر کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے عالم شاہ نے چھیڑنے والے انداز میں معاذ سے دریافت کیا۔ معاذ سے اس کی دوستی کو بہت کم عرصہ گزرا تھا لیکن ان کی دوستی بہت مضبوط ہوچکی تھی چنانچہ جب معاذ نے اسے فون کیا کہ وہ اس کے ساتھ کہیں جانا چاہتا ہے تو اس نے مصروفیت کے باوجود انکار نہیں کیا اور اب وہ دونوں یزدانی ہاؤسنگ سوسائٹی کی طرف گامزن تھے۔ عالم شاہ کو اس نے صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ وہاں متوقع گاہک کی حیثیت سے جائیں گے اور پروجیکٹ کے مختلف حصوں کا جائزہ لے کر وہاں بنگلوز کی بکنگ کے حوالے سے بات چیت کریں گے۔ اس مبہم صورتِ حال پر عالم شاہ کے دماغ میں کھد بد ہونے لگی تھی اس لیے وہ اس سے وہاں جانے کی اصل وجہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

''میں بہت دور اندیش آدمی ہوں یار اور اندازہ لگا چکا ہوں کہ تمہارے بیان کردہ مراحل سے گزر کر آخرکار تجھے ایک گھر کی تلاش میں روانہ ہونا ہی پڑے گا اس لیے ابھی سے ایک گھر بک کروالینا چاہتا ہوں تاکہ میری ہونے والی بیوی کو ساس سے لڑنے جھگڑنے میں کوئی پریشانی پیش نہ آئے اور وہ اس اطمینان کے ساتھ طبل جنگ بجائے کہ ساس صاحبہ اس جنگ کے نتیجے میں اسے اپنی سلطنت سے دربدر کریں گی تو وہ سچ مچ دربدر نہیں ہوگی اور ایک پیارا سا گھر اس کا منتظر ہوگا۔ تمہارا کیا خیال ہے وہ وقت آنے تک یزدانی بلڈرز والے اس پروجیکٹ کو مکمل تو کرلیں گے نا؟'' اس نے اس سنجیدگی سے جواب دیا جیسے واقعی وہ اسی مقصد کے تحت یزدانی ہاؤسنگ سوسائٹی کے دورے پر جا رہا ہو۔

''ٹھیک ہے بھائی جیسی تیری مرضی پر اب میں تجھ سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔'' عالم شاہ نے سمجھ لیا کہ وہ اسے اصل وجہ نہیں بتانا چاہتا۔

''یہ بہت اچھا فیصلہ ہے۔ فضول کی پوچھ گچھ کرنا صرف بیوی اور تھانیدار کا کام ہوتا ہے اور تم ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں ہو۔'' معاذ نے اس کے فیصلے کو سراہا۔ عالم شاہ جواب میں کچھ نہیں بولا اور خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ یزدانی ہاؤسنگ سوسائٹی کے سائٹ آفس تک پہنچ گئے۔

''بیوی اور تھانیدار بننے سے تو تم بچ گئے یار لیکن یہ روٹھی محبوبہ کیوں بنے ہوئے ہو؟'' گاڑی سے اترنے سے پہلے معاذ نے آہستہ سے کہا تو عالم شاہ بے ساختہ ہنس دیا اور بولا۔

''بہت خبیث آدمی ہو تم۔ چلو اب نیچے اترو۔ میں خود ہی دیکھ لوں گا کہ تم یہاں کیوں آئے ہو۔'' اس بار معاذ نے خاموشی اختیار کرلی۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ اسٹاف کے ایک آدمی کے ساتھ پروجیکٹ کے مختلف حصوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ وہ شخص انہیں محض ماڈل بنگلوز دیکھنے تک ہی محدود رکھنا چاہتا تھا لیکن معاذ نے اسے بتایا کہ اس کے باس زیرتعمیر حصوں کا بھی جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ اس نے عالم شاہ کو باس اور خود کو اس کے سیکریٹری کی حیثیت سے ہی متعارف کروایا تھا۔ وہ اپنے ساتھ عالم کو لایا ہی اس لیے تھا کہ اس کی شاندار شخصیت اور گاڑی سے سامنے والوں کو مرعوب کر کے اپنا مقصد حاصل کرسکے۔ اسے اندازہ تھا کہ وہاں ہر ایرے غیرے کو اس کی فرمائش پر پورے پروجیکٹ کی سیر نہیں کروائی جاتی ہوگی۔ یوں بھی اس ہاؤسنگ سوسائٹی کے زیادہ تر بنگلوز کی ایڈوانس... بکنگ کی

جا چکی تھی اور اب صرف چند گنے چنے بنگلوز کی بکنگ کے لیے ہی اشتہار دیا جا رہا تھا۔ اشتہار دینے والوں کا کم از کم یہی دعویٰ تھا۔

وہ اور عالم شاہ پوری سنجیدگی سے مکمل اور نامکمل بنگلوز کا معائنہ کرتے ہوئے اس شخص کی باتوں کو بھی دلچسپی اور توجہ سے سننے کا تاثر دے رہے تھے جو ان کے ساتھ وہاں آیا تھا اور مسلسل پروجیکٹ کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔ اپنے مطلوبہ حصے تک پہنچنے میں معاذ نے کوئی جلدی نہیں دکھائی اور بڑی مہارت سے ایک سمجھدار و فرمانبردار سیکریٹری کا کردار ادا کرتا رہا۔ عالم شاہ بھی اس کا بھرپور ساتھ دے رہا تھا۔ بشریٰ کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں جب وہ لوگ مطلوبہ حصے میں پہنچے تو معاذ نے نہایت مہارت سے عالم شاہ اور ساتھ آئے آدمی کی توجہ بھٹکا دی اور بتانے لگا کہ اس بنگلوز کے ٹیرس سے اردگرد کے مناظر کا بہت زبردست نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کا کہا ہوا ایک جملہ ہی کافی ثابت ہوا اور ساتھ آیا ہوا شخص اس کی تائید میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگا۔ اتنی تعریفوں پر عالم شاہ نے خصوصی دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور چند منٹ خاص طور پر ٹیرس پر رک کر اردگرد کے نظارے کو دیکھنے لگا۔ اس موقع پر معاذ غیر محسوس انداز میں پیچھے ہی رک گیا اور پھر نہایت مشاقی سے بشریٰ کا سیمنٹ کی بوریوں کے پیچھے چھپایا ہوا موبائل نکال کر اپنی جیب میں منتقل کر لیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر انہوں نے مزید چند منٹ وہاں گزارے اور اس کے اشارے پر عالم شاہ نے عندیہ دیا کہ کل کسی وقت اس کا سیکریٹری یعنی معاذ وہاں آ کر بکنگ کی کارروائی نمٹا لے گا۔ اس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ وہ دیگر افراد کی طرح قسطوں میں ادائیگی کے بجائے یکمشت ادائیگی کو ترجیح دے گا۔ اس کی گاڑی اور شخصیت نے پہلے ہی اچھا تاثر ڈالا تھا اس فیصلے پر وہ لوگ مزید مرعوب ہو گئے اور سائٹ آفس میں کولڈ ڈرنکس سے ان کی تواضع کرتے ہوئے منیجر نے افسوس کا اظہار کیا کہ وہ خواہش کے باوجود ان کے اپنے باس یزدانی سے ملاقات نہیں کروا سکے گا۔ اس نے بتایا کہ باس اس وقت اکثر یہاں کا چکر لگا لیتے ہیں لیکن آج اپنے بیٹے کے آپریشن کی وجہ سے نہیں آ سکے۔

''خیریت! کس چیز کا آپریشن ہونا ہے یزدانی صاحب کے بیٹے کا؟'' عالم شاہ نے بہت اخلاق سے دریافت کیا۔

''بس وہی اسٹریٹ کرائم کا چکر ہے۔ کل کسی نے کامران صاحب کی گاڑی چھیننے کی کوشش کی۔ وہ نوجوان اور جذباتی آدمی ہیں۔ گاڑی دینے پر راضی نہیں ہوئے اور وہ لوگ غصے میں انہیں ٹانگ میں گولی مار کر بھاگ گئے۔'' منیجر نے اداس شکل بنا کر وجہ بتائی۔

''اوہو! کہاں پیش آیا یہ واقعہ..... کیا یہیں اسی علاقے میں؟'' معاذ نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اسے بڑی ہوشیاری سے پن چبھوئی۔

''ارے نہیں جناب! یہ جگہ تو بہت پُرسکون ہے اور یہاں اس طرح کی وارداتیں نہیں ہوتیں۔ کامران صاحب کو تو شہر ہی میں کہیں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔'' منیجر نے جلدی سے تردید کی۔ ظاہر ہے وہ نہیں چاہتا تھا کہ سیکیورٹی رسک کی بنیاد پر ایک اچھا کسٹمر اس کے ہاتھ سے نکل جائے۔ اس کے بعد کولڈ ڈرنکس ختم ہونے تک ان کے درمیان روز بروز بگڑتے حالات کے متعلق ہی گفتگو ہوتی رہی اور آخر کار وہ دونوں آنے والے کل کے وعدے پر وہاں سے روانہ ہو گئے۔

''تو تم وہاں سے وہ موبائل لینے گئے تھے۔'' واپسی کے سفر میں عالم شاہ نے آہستہ سے کہا تو معاذ ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ عالم شاہ جیسے ہوشیار آدمی سے اس کی کارروائی چھپی نہیں رہ سکی تھی۔

''میرے خیال میں تو وہ موبائل تمہارا نہیں ہے۔'' اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر عالم شاہ نے دوسرا سوال داغا۔

''نہیں۔ وہ موبائل میرا نہیں ہے۔ فی الحال میں تمہیں موبائل کے مالک کا نام نہیں بتا سکتا لیکن اتنا بتا سکتا ہوں کہ کامران یزدانی کو گولی اسی موبائل کے مالک نے ماری تھی اور آج وہ اپنا موبائل لینے یہاں آنے کا رسک لینا چاہتا تھا لیکن میں نے مناسب سمجھا کہ میں خود یہ کام کر دوں۔ تم نے اس سلسلے میں جو تعاون کیا اس کا شکریہ۔ میرے خیال میں یزدانی بلڈرز والوں کی طرف سے کوئی کال آئی تو تم آسانی سے نمٹ لو گے۔''

''وہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں کوئی بھی بہانہ بنا کر انہیں انکار کر سکتا ہوں لیکن اگر تم مجھے سچویشن بتا کر بھی تعاون کے لیے کہتے تو بھی میں انکار نہیں کرتا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم کسی غلط کام کے لیے مجھے استعمال نہیں کر سکتے۔'' عالم شاہ کے لہجے میں بے حد سنجیدگی تھی۔

''سوری یار! بس میں نے ایسے ہی تمہیں نہیں بتایا۔ مجھے تم پر پورا اعتماد ہے اور اگر یہ میرا کوئی ذاتی

معاملہ ہوتا تو میں کھل کر تمہیں سب بتا دیتا لیکن جس شخص کا یہ معاملہ ہے، وہ شاید اسے پوشیدہ رکھنا چاہے اس لیے میں تمہیں تفصیلات بتانے سے قاصر ہوں۔'' معاذ کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

''اب اتنے بھی شرمندہ نہ ہو۔ عالم شاہ یاروں کا یار ہے۔ آئندہ بھی تمہیں میری مدد کی ضرورت پڑے تو بلاتکلف میرے پاس آسکتے ہو۔'' عالم شاہ نے بات ختم کردی۔ اس کی رہائش گاہ پر پہنچ کر معاذ اس کے اصرار کے باوجود وہاں رکا نہیں اور اپنی بائیک لے کر سیدھا بشریٰ کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ کل فون پر گفتگو کے دوران ان کے درمیان طے ہوگیا تھا کہ معاذ آج ہی اس کے موبائل کے حصول کے لیے جائے گا اور موبائل گھر پر ہی اس کے حوالے کردے گا چنانچہ وہ سارا دن گھر پر رہ کر اس کا انتظار کرے گی۔

وہ بشریٰ کے گھر پہنچا تو خود بشریٰ ہی نے دروازہ کھولا۔ معاذ نے دروازے ہی سے اسے موبائل پکڑایا اور اندر آنے کی پیشکش کو ایک بار پھر رد کردیا کہ اسے اپنے کرائے کلب جانا تھا۔ اس دن کے بعد اس کی بشریٰ سے یونیورسٹی میں سرسری سلام دعا کے علاوہ بات نہیں ہوسکی البتہ اتوار کے اخبار میں اس کا انکشافات سے بھرپور کالم چھپ گیا جو خاصا تہلکہ خیز ثابت ہوا۔ اس کالم میں یہ انکشاف بھی کیا گیا کہ جس زمین پر یہ ہاؤسنگ سوسائٹی قائم کی گئی ہے، وہ ایک ایسے شخص کی ملکیت ہے جو بیرونِ ملک مقیم ہے اور یزدانی بلڈرز والوں نے جعل سازی کے ذریعے اس زمین پر قبضہ کررکھا ہے۔ کالم کی اشاعت کے بعد ٹی وی شوز وغیرہ میں بھی اس موضوع پر بات ہوتی رہی۔ یزدانی بلڈرز والوں نے جواب میں یہی کہا کہ یہ ان کے مخالفین کی طرف سے پروپیگنڈا ہے۔ بشریٰ نے تمام اہم چینلز پر ثبوت کی نقول بھجوا دی تھیں جنہیں لہرا لہرا کر اینکرز یزدانی بلڈرز والوں سے سوالات کرتے رہے اور وہ ہر ثبوت کو جعلی قرار دیتے رہے۔ سب کو معلوم تھا کہ کچھ دنوں بعد یہ ایشو دب جائے گا لیکن یزدانی بلڈرز والوں کی ساکھ کو بہرحال نقصان پہنچا تھا اور خیال کیا جاسکتا تھا کہ وہ غصے میں ذمے دار کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرسکتے ہیں۔ معاذ کی بشریٰ سے ملاقات ہوئی تو اس نے بشریٰ کے سامنے اس اندیشے کا اظہار کردیا۔

''وہ جتنے گھٹیا لوگ ہیں ان سے کوئی نیک امید رکھی بھی نہیں جاسکتی۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میرے پاس ان ڈائریکٹلی دھمکی آمیز پیغامات پہنچنے شروع ہوگئے ہیں لیکن میں ان سب باتوں سے نہیں ڈرتی۔'' اس چھوٹی سی لڑکی کی جرأت مندی بڑے کمال کی تھی۔ معاذ اسے دیکھتا رہ گیا۔

''اتنے حیران مت ہوں۔ مجھے ڈرنا ہی ہوتا تو اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ کامی اور سلطان میرے دشمن بن چکے ہیں اور کامی کی صحت یابی کے بعد وہ دونوں جلد یونیورسٹی آنے والے ہوں گے۔ میری فکر چھوڑ کر آپ اپنے بارے میں سوچیے۔ ہوسکتا ہے ان لوگوں نے آپ کو پہچان لیا ہو اور کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کریں۔'' بشریٰ نے جیسے اسے ہوشیار کیا۔

''میرے خیال میں ایسا نہیں ہے ورنہ ان کی طرف سے اب تک کوئی نہ کوئی کارروائی ہوچکی ہوتی۔'' معاذ نے جواب دیا۔

''آپ کا خیال ٹھیک بھی ہوسکتا ہے لیکن میرا مشورہ یہی ہے کہ آپ بالکل بےفکر نہ رہیں، خطرہ ہوبھی سکتا ہے۔'' اس نے اپنی بات پر اصرار کیا۔

''اور تم..... تم تو مجھ سے زیادہ خطرے میں ہوگی؟ پھر تمہیں کوئی فکر کیوں نہیں ہے؟'' معاذ نے اسے گھورا۔

''میں اپنے پاس وہ رکھتی ہوں نا جس نے کامران کی ایک ٹانگ کو ناکارہ کردیا ہے۔ آئندہ بھی مجھ سے پنگا لے گا تو نقصان اٹھائے گا۔'' بشریٰ کا اشارہ اپنے پسٹل کی طرف تھا۔

''اتنی بھی جرأت مندی ٹھیک نہیں لڑکی! تم اپنی عمر سے بہت تیز دوڑ رہی ہو۔'' معاذ نے اسے سمجھایا۔

''میں اس دنیا میں بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں اس لیے تیز دوڑتی ہوں۔ مجھ پر آپ کی نصیحتیں بےکار جائیں گی۔'' اس نے مسکرا کر معاذ کو جواب دیا تو وہ اس کی شکل دیکھتا رہ گیا اور وہ اسے خدا حافظ کہتی ہوئی ایک دوست کے پکارنے پر اس کی طرف بڑھ گئی۔ اس روز معاذ کلاسز کے بعد یونیورسٹی سے روانگی کے لیے پارکنگ میں کھڑی اپنی بائیک تک پہنچا تو سن رہ گیا۔ وہاں بیک ویو مرر پر سیاہ مارکر سے ایک تحریر درج تھی اور وہ اس تحریر کو پڑھ کر ہی سن ہوا تھا۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان کی داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب ناک تھا، باقی واقعات آیندہ ماہ پڑھیے

خدا جانے کس نے کیا سوچ کر لاڈلی بوا کا نام لاڈلی رکھا تھا کہ پچاس کے پیٹے میں آ گئی تھیں مگر انہیں کبھی کوئی لاڈ نہ ملا۔ جو ملا تو بس کبھی کوسنے، کبھی دھتکار اور کبھی منحوس کا لقب۔

اماں کہتی تھیں کہ جس دن لاڈلی بوا کی شکل دیکھ لو اس دن کوئی نقصان تو پکا ہے۔ ان کا راستے میں نظر آنا کالی بلی کے راستہ کاٹنے جیسا ہی تھا۔ کالے توے سا رنگ، موٹے نقوش اور بڑے بڑے دانت۔ لاڈلی بوا کوئی حبشن چڑیل سی لگتی تھیں۔ ہم لڑکے بالے اکثر ان کو لاڈلی چڑیل کہہ کر چڑاتے اور وہ ہمارے سر پر ہاتھ رکھ کر گزر جاتیں۔ ان کے ہاتھ رکھنے سے بھی سارے بدکتے تھے سوائے میرے اور وہ بھی میرا مطلب تھا کیونکہ لاڈلی بوا سر پر ہاتھ پھیرنے کے ساتھ ساتھ کبھی روپے، دو روپے بھی ہاتھ میں پکڑا کر جاتی تھیں۔

ان دنوں ایک روپیہ بھی کافی بڑی عیاشی تھی۔ گھر میں تو جیب خرچ ملنے کا کوئی رواج نہ تھا۔ ابا کبھی کبھار کوئی پھل گھر لے آتے یا اماں گڑ والے چاول بنا لیتیں تو ہم اسی میں خوش ہو لیتے کہ عید ہو گئی۔

ایسے حالات میں لاڈلی بوا کا دیا ہوا روپیہ مال غنیمت جیسا تھا اور میں کمال مہارت سے کسی کو ہوا تک نہ لگنے دیتا کہ مجھے کیا خزانہ ملا ہے۔

اچھو اور منور کو نہ دیتا تو وہ دوستی کے طعنے مارتے اور بعد میں بدلہ لینے کے لیے گھر سے چرائے کسی بھی مال میں مجھے شریک نہ کرتے۔

ایسی کسی بھی خطرناک صورت حال سے بچنے کے لیے میں لاڈلی بوا کا دیا روپیہ چپکے سے چھپا لیتا اور دوپہر میں سب کی نظر بچا کر پپو کی ہٹی سے کبھی مرونڈا لے کر کھاتا اور کبھی کریم والے بسکٹ۔

یہی وجہ تھی کہ مجھے لاڈلی بوا کبھی اتنی بری نہ لگیں باوجود اپنی حبشن سی شکل اور منحوسیت کے۔

لاڈلی بوا کے ان التفات کا ہی نتیجہ تھا کہ میں نے ان کے گھر تک جانا شروع کر دیا۔ ان کے گھر تک جانے کی ہمت

اللہ کی رضا میں راضی رہنے والی ایک عورت کی شکر گزاری

لاچار

غزالہ یاسمین

دنیا خوبصورتی اور بدصورتی کا مجموعہ ہے... اگرچہ ان دونوں عناصر کا اپنا کوئی کردار نہیں مگر خوبصورتی سراہے جانے کی وجہ سے خود پر گھمنڈ کرتی ہے اور بدصورتی ناپسندیدگی کی بدولت ایک شرمندگی کے حصار میں قید ہو جاتی ہے... یہی حال اس لاچار کا بھی تھا جسے قدم قدم پر رد کیے جانے کا غم ملتا رہا۔

میں کبھی نہ کرتا اگر مجھے پکڑے جانے کا کوئی خوف ہوتا۔

اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ کوئی لاڈلی بوا کے گھر کبھی نہیں جاتا تھا کہ مجھے وہاں پکڑ پاتا۔ دوسرا لاڈلی بوا کا گھر بستی کے بالکل آخری حصے میں تھا اس لیے اتفاقاً بھی پکڑے جانے کا امکان نہیں تھا اور اسی سہولت کا فائدہ اٹھا کر میں ہر دوسرے دن ان کے گھر پہنچ جاتا۔

لاڈلی بوا بھی میری خاطر مدارت کسی مہمان کی طرح کرتیں۔ بلکہ ان کے اس چھوٹے سے گھر میں آنے والا میں واحد مہمان ہی تھا۔ ورنہ پوری بستی میں سے کوئی بھی ان کے گھر نہیں جاتا تھا۔

لاڈلی بوا کی پیدائش پر ان کی ماں چل بسیں۔ ان کی دو بہنیں اور تین بھائی ان کے بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ وہ تیرھویں سال میں تھیں جب ان کے ابا کو کھیتوں میں پانی لگاتے ہوئے سانپ نے ڈس لیا۔ چودھویں سال ان کی رشتے کی چاچی نے ان کی شادی کروادی مگر ان کا میاں بھی شادی کے دوسرے ہفتے ہی ایک ایکسیڈنٹ کا شکار ہو کر فوت ہو گیا۔ ان سب اموات نے لاڈلی بوا پر منحوس کا ٹھپا پکی سیاہی سے لگا دیا جو کبھی نہ مٹا۔

سب کے ذہنوں میں یہ بات جڑ پکڑ گئی کہ لاڈلی بوا کا ساتھ منحوس ہے۔ سگا رشتہ تو کوئی رہا نہ تھا اور جو دوسرے قریبی رشتے دار تھے وہ بھی دور ہونے لگے۔ رفتہ رفتہ لاڈلی بوا سے پوری بستی نے کنارہ کر لیا۔ لاڈلی بوا نے کسی سے کوئی گلہ کیا نہ شکوہ۔ آبائی زمین ٹھیکے پر اٹھا دی اور اپنے چھوٹے سے گھر تک محدود ہو کر جینے لگیں۔ بستی سے گزرتے ہوئے ہم بچوں کو کھیلتے دیکھتیں تو پیار ضرور کرتیں۔ ہم سب کے گھروں سے خاص ہدایت تھی کہ لاڈلی بوا کے سائے سے بھی بچیں۔

ایک دن ان کے گھر بیٹھا میں گڑ والے چاول کھا رہا تھا کہ اچانک مجھے ان کے منحوس ہونے کا خیال آیا اور بے دھیانی میں ان سے بھی پوچھ بیٹھا۔

''لاڈلی بوا! تم منحوس ہو نا؟''

''نہ پتر! میں کیوں منحوس ہونے لگی۔ سب کو اللہ سوہنے نے بنایا اور اس کی بنائی کوئی چیز منحوس کیسے ہو سکتی ہے۔''

لاڈلی بوا پلے کی ٹکڑی دیوار سے چپکاتے ہوئے بولیں۔

''اماں تو کہتی ہے کہ تو منحوس ہے۔ تو کیا اماں جھوٹ بولتی ہے؟'' میں نے چاولوں میں سے کھوپرے کا ٹکڑا الگ کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہ پتر! ماں کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔''

لاڈلی بوا کی بات مجھے سمجھ نہیں آئی کہ نہ تو وہ منحوس ہیں نہ اماں جھوٹ بولتی ہیں۔ میرا کشمش چنتا ہاتھ رکا اور میں ان کا جھریوں بھرا کالا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہ اپلے دیوار سے چپکا کر اب سوکھے اُپلوں کا ڈھیر بنانے لگی تھیں۔ میری شکل پر درج ناسمجھی کے تاثرات شاید انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر ہی پڑھ لیے تھے اس لیے چلتے ہاتھ روک کر میری طرف پلٹ کر دیکھنے لگیں اور بولیں۔

''دیکھ پتر! سکھ اور دکھ دینا سب رب سوہنے کے ہاتھ میں ہے۔ بندہ بس شکر کرے یا صبر۔ پر کبھی کبھی بندے کو لگتا ہے کہ تکلیف رب کی طرف سے نہیں آئی، یہ کسی بندے کی وجہ سے آئی ہے۔ اسی لیے بندہ بندے سے کٹ جاتا ہے۔ دل میں بیر پال بیٹھتا ہے۔ قصور بندے کا نہیں اس کی سمجھ کا ہے۔ تیری اماں جھوٹ نہیں بولتی۔ بس اس کی سمجھ کا پھیر الٹا ہے۔''

لاڈلی بوا کی بات تو مجھے سمجھ نہیں آئی لیکن اتنی تسلی ضرور ہوئی کہ لاڈلی بوا اول تو منحوس نہیں ہیں اور اگر ہیں بھی تو مجھے کچھ نہیں ہوگا۔

اس دن کے بعد لاڈلی بوا کی منحوسیت کا رہا سہا ڈر بھی دل سے نکل گیا اور میں بلا جھجک ان کے گھر جانے لگا۔

☆☆☆

ایک دن میں لاڈلی بوا کے گھر گیا تو وہ کسی کتے کی ٹانگ پر ہلدی کا لیپ لگا رہی تھیں۔

بستی میں چند آوارہ کتے ضرور گھومتے تھے مگر میں نے کبھی کسی کو کسی کتے کی مرہم پٹی کرتے نہیں دیکھا تھا۔ اماں کہتی تھیں۔ یہ ناپاک جانور ہے۔ گھر میں آ جائے تو فرشتے چلے جاتے ہیں۔ اگر کاٹ لے تو چودہ ٹیکے لگتے ہیں۔

ایسے میں لاڈلی بوا کو گھر میں کسی کتے کو لیپ لگاتے دیکھنا مجھے تجسس میں مبتلا کر گیا اور میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

''لاڈلی بوا! اس کو کیا کر رہی ہو؟''

''اس کی ٹانگ پر چوٹ لگی ہے۔ کسی شرارتی بچے نے پتھر مارا ہوگا۔ اس پر ہلدی تیل کا لیپ لگا رہی ہوں۔''

لاڈلی بوا نے دو انگلیوں کی پوروں پر پیالے میں پڑا ملغوبا نکال کر کتے کی ٹانگ پر جماتے ہوئے کہا۔

''پر یہ تو ناپاک ہے، آپ بھی ناپاک ہو جاؤ گی۔''

''نہ پتر! اس دھرتی پر رب کی جتنی مخلوق ہے نا، سب کی سیوا، سب کا خیال رکھنا انسان کی ذمے داری ہے۔ تو میں بس وہی کام کر رہی ہوں۔''

مجھے لاڈلی بوا کی کوئی بات پلے نہیں پڑ رہی تھی لہٰذا منہ پھاڑے کبھی ان کو دیکھ رہا تھا، کبھی کتے کو جو نہ تو بھونک رہا تھا نہ کاٹنے کو دوڑ رہا تھا۔

حالانکہ ہم لڑکوں کو یہ آوارہ کتے کتنا تنگ کرتے تھے۔ گلی سے گزرنے نہیں دیتے تھے۔

''ابھی تجھے یہ گلاں سمجھ نہیں آئیں گی۔ ابھی تو چھوٹا ہے۔ بڑا ہوگا تو خود سمجھ جائے گا۔'' لاڈلی بوا نے یقیناً میرے چہرے پر پھیلی ناسمجھی کو سمجھ لیا تھا۔ ''بس اتنا جان لے کہ اللہ کی بنائی ہر شے چنگی ہے..... سب کا خیال رکھا کر، وہ بھی تیرا خیال رکھیں گی۔''

میں چپ بیٹھا بلاوجہ سر ہلاتا رہا۔ نہ سمجھ آنے کے باوجود ان کی باتوں میں مجھے ایک کشش محسوس ہوتی تھی۔

☆☆☆

اس کتے پر لاڈلی بوا کا ایسا جادو چلا کہ وہ سارا سارا دن ان کے گھر کے باہر بیٹھا رہتا۔ بستی کے لوگ تو پہلے ہی ان کے گھر نہیں جاتے تھے، اب کتے کی موجودگی نے اس راستے سے سب کا گزرنا بھی بند کر دیا تھا۔ شروع شروع میں تو میں بھی کئی دن ان کے گھر نہ گیا۔ ایک دن گلی میں مجھے کھیلتا دیکھ کر لاڈلی بوا نے پاس بلایا اور پوچھا۔

''پتر! گھر کیوں نہیں آتا۔ کتنے دن ہو گئے تجھے آئے ہوئے۔''

''بوا! تیرے دروازے پر بیٹھے کتے سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ میں نے نہیں آنا۔''

لاڈلی بوا ہلکا سا مسکرائیں اور میرا ہاتھ پکڑ کر بولیں۔

''چل میرے ساتھ۔ دیکھنا وہ تجھے کچھ نہیں کہے گا۔''

دل میں تمام تر ڈر چھپائے میں لاڈلی بوا کے ساتھ چل پڑا۔ کتے نے پہلے تو مجھے دیکھ کر سر اٹھایا اور پھر بھونکتا ہوا میری طرف لپکا مگر پھر بوا کو میرے ساتھ دیکھ کر واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ بوا میرا ہاتھ پکڑے مجھے اندر لے گئیں۔

''اب یہ تجھ پر کبھی نہیں بھونکے گا اور نہ کاٹے گا۔ اب جب دل کرے آجایا کر۔'' میں حیران سا بوا کو دیکھ رہا تھا۔

بوا کو تو سچ میں جادو آتا ہے۔ پہلا خیال یہی ذہن میں آیا۔ یقیناً ایسا ہی تھا ورنہ کاٹنے والا کتا اتنا فرماں بردار کیسے بن سکتا تھا۔

بہرحال لاڈلی بوا کے جادو کا مجھے بہت فائدہ ہوا۔ اب وہ کتا میرے سامنے بھی سر جھکا کر بیٹھا رہتا۔

☆☆☆

ابھی تک تو کتے نے ہی لاڈلی بوا کے گھر ڈیرے ڈالے تھے مگر کچھ دنوں بعد ایک کالی بلی بھی لاڈلی بوا کے خاندان میں شامل ہو گئی۔ پتا نہیں وہ کہاں سے آئی تھی مگر ہر وقت لاڈلی بوا سے چپکی رہتی۔

شیشے سی چمکتی آنکھوں والی کالی سیاہ بلی سے جانے کیوں مجھے بہت خوف آتا تھا۔ میرا اس سے ڈر ایک طرف لیکن لاڈلی بوا کی تو وہ لاڈلی بن گئی تھی۔

بوا جو مجھے کھانے کو دیتیں اس میں سے ایک حصہ پہلے ہی نکال کر بلی کو بھی ڈال دیتیں۔ ایک طرح سے وہ میرے حصے کو بھی جھپٹ رہی تھی۔ کچھ اس کی چمکتی آنکھوں کا خوف اور کچھ اپنے حصے میں کمی کا دکھ کہ مجھے اس بلی سے چڑ ہونے لگی۔

☆☆☆

''اے زلیخا کچھ سنا۔ لاڈلی بوا نے جادو ٹونا بھی شروع کر دیا ہے۔''

روٹی کھاتے ہوئے چاچی کلثوم کی آواز میرے کان میں پڑی اور میرا دھیان ان کی گفتگو پر مرکوز ہو گیا۔

چاچی، اماں کو لاڈلی بوا کا نیا کارنامہ بتا رہی تھی۔ لاڈلی بوا کے اکثر کارناموں کا انکشاف چاچی کلثوم ہی کرتی تھیں۔

''ہائے توبہ توبہ..... کافرنی ہو گئی لاڈلی بوا تو۔'' اماں نے گال پیٹے۔

''میں نے کل خود دیکھا تھا وہ ایک کالی بلی کو لے کر راشدہ کے گھر کا چکر کاٹ رہی تھی۔'' چاچی نے مزید انکشاف کیا۔

چاچی کلثوم سمیت اماں کا بھی ماننا تھا کہ جادو ٹونے کے کام بلیوں کے ذریعے ہی ہوتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ یقین مجھے بھی تھا کیونکہ اب تک سنی گئی کئی کہانیوں میں جادوگرنی بلی بن کر ہی گھومتی تھی یا اس کے پاس کوئی بلی ہوتی تھی۔

''ہائے ہائے، اللہ رحم کرے بیچاری راشدہ پر۔ اس کے تو بچہ بھی ہونے والا ہے۔'' اماں کو خالہ راشدہ پر ترس آنے لگا۔

''ہاں تو اسی لیے تو جادو ٹونا کر رہی تھی تاکہ بچہ مر جائے۔'' چاچی نے ایک اور انکشاف کیا۔ ''اور تجھے پتا ہے یہ سب کروا کون رہا ہے لاڈلی بوا کے ذریعے؟''

چاچی نے اپنی آواز میں خوب سنسنی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''کون؟'' اماں کا اشتیاق بھی دیدنی تھا۔

''اس کی نند خالدہ..... اور کون؟'' چاچی نے بلند آواز میں سرگوشی کی۔

''ہاں تو اور کون کروائے گا۔ اپنی تو اولاد ہوئی نہیں۔ اب بھائی کا بسا گھر کیسے دیکھے۔'' اماں نے فوراً ان کے موقف کی تائید کی۔

ان کی باتوں سے میرے شک کو بھی یقین مل گیا تھا کہ لاڈلی بوا سچ میں جادو جانتی ہیں۔ اماں اور چاچی کی باتیں ابھی جاری تھیں مگر میں روٹی کھا چکا تھا۔

اماں کو باتوں میں لگا دیکھ کر میں چپکے سے باہر کھسک آیا۔ اچھو اور منور مجھے جوہڑ کے پاس ہی مل گئے۔ وہ سائیکل کے ٹائر کی ریس لگا رہے تھے۔

''تم لوگ ریس چھوڑو۔ اور میری بات سنو۔ میرے

پاس ایک بہت بڑی خبر ہے۔"

"کیسی خبر۔" وہ دونوں میرا منہ دیکھنے لگے۔

"تمہیں پتا ہے لاڈلی بوا جادو کرتی ہیں۔" میں نے اتنی بڑی خبر ان دونوں کو بلا تمہید فوراً سنا دی۔

"سچی.....؟" دونوں منہ پھاڑے مجھے دیکھنے لگے۔

"ہاں میں نے خود سنا اماں اور چاچی کلثوم کو بات کرتے۔" میں نے مزید یقین دلانے کے لیے ثبوت دیا۔

"چل ہم بھی لاڈلی بوا سے کہتے ہیں ہمیں بھی جادو سکھا دے یا پھر جادو سے چیزیں بنا کر دے دے۔" میرے اندر کا لالچ بولنے لگا۔

"نہ بھائی مجھے تو بہت ڈر لگتا ہے لاڈلی بوا سے۔ تو خود ہی جا تجھے تو کچھ کہتی بھی نہیں۔ مجھے تو جس دن دیکھ لے اسی دن رات کو خواب میں آ کر بھی اتنا ڈراتی ہے۔" اچھو نے صاف انکار کر دیا۔

"منور تو چلے گا۔" میں نے اچھو کے صاف جواب پر منور کو لے جانا چاہا۔

"میں بھی گھر کے اندر نہیں جاؤں گا۔"

"اس کے گھر کے باہر کتا بیٹھا ہوتا ہے۔ اس سے بڑا ڈر لگتا ہے مجھے۔"

☆☆☆

لاڈلی بوا کی کالی بلی اس دن دیوار پر چڑھی نیم کے پیڑ پر بیٹھی چڑیوں کو گھور رہی تھی۔ اور میں صحن میں بان کی چارپائی پر بیٹھا بلی کو دیکھ رہا تھا۔ آج اس کی نظریں چڑیا پر تھیں اور یقیناً وہ شکار کے موڈ میں تھی۔

لاڈلی بوا نے پیڑ تلے چاول کے دانے بکھیرے ہوئے تھے۔ چڑیاں ارد گرد دیکھ کر دانوں پر لپکتیں اور منہ میں دبا کر دوڑ جاتیں۔ بلی کب سے چڑیا کی تاک میں تھی۔

"پتر کھانا کیوں نہیں کھا رہا۔ سواد نہیں لگ رہا کیا۔"

لاڈلی بوا کی آواز نے میرے انہماک کو توڑا اور میں نے سامنے پڑی پلیٹ کو دیکھا۔

میں بلی اور چڑیا کو دیکھنے میں اتنا مگن تھا کہ یہ بھی نہ دیکھ سکا کہ میرے سامنے رکھے چاول ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔

"نہیں بوا! چاول میں تو سواد ہے۔"

اچانک مجھے وہ کام یاد آیا جس کے لیے میں آیا تھا۔

"بوا تجھے جادو آتا ہے نا؟ مجھے بھی سکھا دے۔" میں نے لجاجت بھرے لہجے میں کہا۔

"تجھ سے کس نے کہا کہ مجھے جادو آتا ہے۔" بوا نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ "مجھے کوئی جادو نہیں آتا اور جادو سیکھنا برا کام ہے پتر۔ دوبارہ ایسی گل نہ کرنا۔" بوا نے صاف جواب دے دیا۔

"پر بوا چاچی کلثوم کہہ رہی تھی کہ تجھے جادو آتا ہے۔ تو نے خالہ راشدہ پر جادو کیا ہے اس کالی بلی کے ساتھ۔" میں نے اپنے تئیں ان کا جھوٹ پکڑا۔

"نہ پتر! میں نے کسی پر جادو نہیں کیا۔" بوا اب بھی ماننے کو تیار نہ تھیں۔ "اور اب خبردار جو بھی جادو ٹونے کی باتیں کیں۔" بوا نے مجھے ڈانٹتے ہوئے بات ختم کر دی۔

اس دن مجھے لاڈلی بوا پر بہت غصہ آیا۔ کیا تھا جو مجھے جادو سکھا دیتی یا جادو سے چیزیں بنا کے دے دیتی۔ کیا چلا جاتا ان کا جو میرا بھی تھوڑا سا فائدہ ہو جاتا۔

لاڈلی بوا کی خود غرضی پر رہ رہ کر دل جل رہا تھا۔ میں نے کتنا کچھ کیا ان کے لیے۔ چھپ کر ان کے گھر جاتا تھا۔ ان سے بات کرتا تھا۔ ان سے سر پر ہاتھ رکھواتا تھا اور کوئی تو پاس پھٹکتا بھی نہیں تھا اور لاڈلی بوا نے ایسا سلوک کیا میرے ساتھ۔

کچھ جادو نہ سیکھ پانے کا غم تھا اور کچھ ڈانٹ کا دکھ کہ میں نے پکا عہد کیا کہ اب کبھی لاڈلی بوا سے بات نہیں کروں گا، نہ ان کے گھر جاؤں گا۔

مگر یہ وعدہ میں بس چند دن ہی نبھا سکا۔ تیسرے دن پھر میں ان کے گھر میں بیٹھا آم کھا رہا تھا۔

آم مجھے بہت پسند تھے اور یہ بات لاڈلی بوا بھی جانتی تھیں اس لیے وہ موسم آتے ہی میرے لیے آم ضرور منگوا کر رکھتیں۔

اس دن بھی میں نے آم کھا کر گٹھلی ہوا میں اچھال کر دور کونے میں پھینکی۔

"نہ پتر! ایسے نہیں پھینکتے۔ اس کو دباتے ہیں۔" بوا نے میری حرکت دیکھ کر فوراً ٹوکا۔

"کیا مطلب؟" میں نے بوا کی طرف دیکھا۔

بوا نے کونے میں پھینکی گٹھلی کو اٹھایا اور میرے پاس لے آئیں۔

"چل اٹھ اس کو زمین میں دبا کر آ۔" بوا نے گٹھلی واپس مجھے پکڑائی۔

میں گٹھلی ہاتھ میں پکڑے بوا کو دیکھ رہا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ مجھے گٹھلی دبانی نہیں آتی تھی مگر آج تک کبھی کسی نے آم کھانے کے بعد مجھے اس کام کا نہیں کہا تھا۔

بوا میرا ہاتھ پکڑ کر کچے صحن کے ایک کونے میں لے آئیں۔ دیوار کے ساتھ رکھی کھرپی کو اٹھا کر انہوں نے ایک جگہ سے زمین کھودنی شروع کر دی۔

"جب بھی کوئی پھل کھاؤ تو اس کی گٹھلی یا بیج زمین میں دبا دیا کرو تاکہ اور پھل کھانے کو ملیں۔" بوا نے زمین کھودتے ہوئے مجھے سمجھایا۔

"پر بوا یہ پیڑ تو اتنے سالوں میں پھل دے گا۔ تب مجھے کیا فائدہ اس کو لگانے کا؟" میں نے دو جمع چار کرتے

ہوئے دماغ لڑایا۔

''ہاں سال تو بہت لگیں گے۔ پر ایک بات بتا۔ ابھی جو تُو نے پھل کھایا اس کا پیڑ کیا تو نے لگایا تھا؟''

بوا نے گٹھلی دباتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔

''نہیں۔'' میں نے نفی میں گردن ہلائی۔

''تو پتر تُو کسی اور کا لگایا کھا رہا ہے تو تیرا لگایا کوئی اور کھالے گا۔'' انہوں نے زمین برابر کرتے ہوئے مجھے سمجھایا۔

یہ حساب تو مجھے سمجھ نہیں آیا مگر میں نے بوا کی تسلی کی خاطر گردن ہلا دی۔ ورنہ وہ اور سمجھاتی رہتیں۔

اس دن کے بعد میں نے بوا کے ساتھ کئی پیڑ لگائے۔ کچھ گھر کے صحن میں اور کچھ گھر سے باہر راستے کے کنارے اور کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر۔

بوا نے نہ صرف مجھ سے پیڑ لگوائے بلکہ اکثر مجھے ان کو پانی دینے بھی بھیجا کرتیں۔

اگرچہ یہ کام مجھے اتنا پسند نہیں آیا مگر میں پھر بھی کر دیتا تھا۔ اب بوا مجھے اتنا کچھ دیتی تھیں تو بدلے میں اتنا کرنا تو بنتا ہی تھا۔

☆☆☆

اس دن سویرے سویرے گلی میں شور مچا ہوا تھا۔ اسی شور سے میری نیند ٹوٹی تھی۔ اسکول کی چھٹیاں تھیں اس لیے دیر تک سونے کی آزادی ملی ہوئی تھی مگر اس شور نے ساری نیند خراب کر دی۔

کچھ دیر میں نے دوبارہ سونے کی کوشش کی مگر ناکام ہونے کی صورت میں اٹھ بیٹھا۔ اب نیند تو اڑ چکی تھی، سوچا باہر جا کر دیکھوں کہ اتنا شور کیوں ہے۔

شور کا محور خالہ راشدہ کا گھر تھا۔ ان کے دروازے کے سامنے لوگوں کا ہجوم تھا۔

خالہ راشدہ کا میاں ذوالفقار اونچی آواز میں بول رہا تھا۔ کچھ دیر تو کچھ سمجھ نہ آیا کہ ہوا کیا ہے پھر مجھے ایک طرف کھڑا اچھو نظر آیا تو میں اسی سے پوچھنے چلا گیا۔

''اچھو کیا ہوا ہے؟ اتنا شور کیوں ہو رہا ہے؟''

''یار غضب ہو گیا ہے۔ تو بڑا لیٹ آیا اتنے مزے کی لڑائی ہوئی۔'' اچھو نے میرے دیر سے آنے پر افسوس کیا۔

''لڑائی..... کس کی لڑائی ہوئی ہے؟''

''خالہ راشدہ اور اس کی نند خالدہ کی۔ دونوں کے میاں بھی خوب لڑے۔''

''مگر کیوں..... ہوا کیا؟ تو شروع سے بتا۔''

اچھو کا اتنا سسپنس پھیلانا مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا اس لیے اس سے پوری بات بتانے کا کہا۔

پھر جو کچھ اچھو نے گھما پھرا کر بتایا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ خالہ راشدہ کا دو دن پہلے مردہ بیٹا پیدا ہوا۔ بستی میں تو پہلے ہی افواہیں گردش کر رہی تھیں کہ لاڈلی بوا نے ان پر جادو ٹونا کیا ہے اور اس سب کو کروانے والی ان کی نند خالدہ ہے۔ تو اسی وجہ سے دونوں گھروں کے بیچ زوردار لڑائی ہوئی جس کے عینی شاہدین اب خالدہ کو برا بھلا کہہ رہے تھے اور لاڈلی بوا کو بددعائیں دے رہے تھے جنہوں نے خالہ راشدہ کے گھر کی خوشیاں چھین لی تھیں۔

لاڈلی بوا کے خلاف اب ایک دو نہیں، کئی شہادتیں اکٹھی ہو گئی تھیں۔ ان کا منحوس ہونا، کالی زبان کا ہونا ہی بستی کے لیے کافی اذیت ناک تھا کہ اب ان کا جادو ٹونا بھی سامنے آ گیا۔

خالہ راشدہ اب بھی وقفے وقفے سے بین کرتیں..... کبھی خالدہ کو کوسنے دیتیں، کبھی لاڈلی بوا کو اور میں چپ چاپ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ لاڈلی بوا کونسی تھی؟

شفیق، مہربان اور پیار کرنے والی جو میرے سامنے ہوتی تھیں یا کسی کی کوکھ کا بچہ مارنے والی ظالم چڑیل؟

☆☆☆

مجھے اچھے سے یاد ہے، یہ اس لڑائی کے ٹھیک آٹھ دن بعد کا واقعہ تھا۔ اس دن میں نے لاڈلی بوا کے گھر کے دو چکر کاٹے تھے۔

اس دن لاڈلی بوا نے مجھے کھیر کھلائی تھی اور تل والے لڈو بھی دیے تھے۔

ان کی کالی بلی اس دن ایک کونے میں ست پڑی اونگھتی رہی تھی اور اس نے مجھے گھورا بھی نہیں تھا۔

اس دن کا آغاز بھی عام دنوں کی طرح ہی تھا۔ شاید مجھے کبھی یاد بھی نہ رہتا مگر اس دن کی رات بہت بھیانک تھی۔ میرے لیے وہ رات عام رات نہیں تھی۔

اس دن میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کچھ ایسا ہو گا اور شاید لاڈلی بوا نے بھی نہ سوچا ہو گا کہ آنے والی رات کیا لے کر آئے گی۔

اس دن کے بعد میں نے آنے والے بے شمار دنوں تک بس یہی سوچا کہ لاڈلی بوا تو جادو جانتی تھیں نا..... تو ان کو پہلے سے پتا کیوں نہیں چلا۔ کاش ان کو پتا چل جاتا۔

اس رات نے جہاں بستی والوں کی زندگی بدل دی تھی، وہیں میری زیست کو بھی اتھل پتھل کر رکھ دیا تھا۔

وہ رات کا دوسرا پہر تھا جب بستی کے کونے سے دھواں اٹھا۔ پھر روشنی دکھائی دینے لگی جو پھیلتی چلی گئی۔ روشنی کے ساتھ ساتھ کسی کتے کے بھونکنے کی تیز آواز بھی سنائی دی جو بتدریج بڑھتی رہی۔ جب تک دھوئیں اور روشنی

نے بستی کے لوگوں کو جگایا تب تک بہت دیر ہوگئی تھی۔
لاڈلی بوا کا پورا گھر جل گیا تھا اور لاڈلی بوا خود بھی اس میں جل کر ختم ہوگئی تھیں۔
ان کا کتا گھر کے باہر تیز آواز میں بین کر رہا تھا۔ کالی بلی اپنی جلی دم اور جلے بالوں کے ساتھ کراہ رہی تھی۔
آج مجھے اس کالی بلی سے بالکل خوف نہیں آرہا تھا۔ بلکہ مجھے اس پر ترس آرہا تھا۔ آج اس کتے کا بھونکنا مجھے برا نہیں لگا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ وہ بھی میری طرح اکیلے رہ جانے پر رو رہا ہے۔
بستی کے لوگوں کا ہجوم ان کے گھر کے گرد جمع تھا۔ آج وہ سب لوگ آئے تھے جو کبھی ان کی گلی سے بھی نہیں گزرتے تھے۔ کوئی افسوس کر رہا تھا اور کوئی دبی آواز میں قدرت کا جواب بتا رہا تھا۔
''جادو ٹونا کر رہی تھی، عمل الٹا پڑ گیا اور خود ہی جل کر مر گئی منحوس۔'' کسی نے بہ آوازِ بلند تبصرہ کیا۔
''یہ سارا کام ذوالفقار کا ہے۔ اس نے اپنے بچے کی موت کا بدلہ لیا ہے۔'' کسی نے قاتل کا سراغ دیا۔
جتنی آوازیں تھیں، اتنی ہی رائے، اتنے ہی تبصرے۔
میں کچی نیند سے جاگا تھا اور میرا سویا ذہن جیسے کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔
بھڑکتے شعلے ماند پڑنے لگے۔ صبح کی سپیدی آسمان سے جھلکنے لگی۔ کچھ لوگوں نے لاڈلی بوا کی جلی ہوئی لاش کو باہر نکال کر رکھ دیا۔
مجھے یہ سمجھنے میں بہت دیر لگی کہ لاڈلی بوا مر گئی ہیں۔ ان کا کالا وجود جل کر اور بھی کالا ہو گیا تھا۔
یہ وہ لاڈلی بوا تو تھیں ہی نہیں جن سے میں روز ملتا تھا۔ جن کی نصیحتیں سنتا تھا جن کے ہاتھ کے بنے کھانے کھاتا تھا۔ یہ تو کوئی کوئلے کا ڈھیر تھیں۔
میرا دل چاہا میں دھاڑیں مار مار کر روؤں۔
وہاں بہت سے شکر کرنے والے لوگ تھے اور چند افسوس کرنے والے بھی مگر رونے والا شاید میں اکیلا ہی تھا۔
آنسو تواتر سے نکل رہے تھے..... اتنے کہ میری ہچکیاں بندھنے لگیں۔
''ارے..... تو کیوں رو رہا ہے؟'' چاچا مختار نے مجھے اچنبھے سے دیکھا۔
''ڈر گیا ہے بیچارہ۔ اس کو گھر لے جاؤ۔'' ایک اور آواز ابھری۔
ابا میرا ہاتھ پکڑ کر گھر لے آیا۔
لاڈلی بوا کی موت کا تذکرہ کئی دن رہا لیکن میرے غم کا ذکر کسی نے بھی نہیں کیا۔
لاڈلی بوا کے مرنے پر مجھے پتا چلا کہ وہ میرے لیے اس سے بہت بڑھ کر تھیں جو میں ان کو سمجھتا تھا۔
میں اگلے دن لیپ بنا کر بھی لے کر گیا تاکہ اس کالی بلی کے زخموں پر لگا سکوں۔ لاڈلی بوا کے جانے کے بعد مجھے لگا کہ اب اس کا خیال رکھنا میری ذمے داری ہے مگر وہ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ البتہ ان کا کتا ان کے جلے ہوئے مکان کے باہر ہی بیٹھا تھا۔
میں کئی دن تک اس کے لیے روٹی بھی لے جاتا رہا مگر اس نے منہ اٹھا کر بھی روٹی کی طرف نہ دیکھا۔
پھر وہ پتا نہیں کہاں چلا گیا۔
شاید لاڈلی بوا کے بعد اس کا بھی بستی سے دل بھر گیا تھا۔
بعد میں ثابت بھی ہو گیا کہ آگ ذوالفقار نے ہی لگائی تھی مگر لاڈلی بوا کی طرف سے کون تھا جو کوئی کارروائی کرتا۔ مگر میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ ان کا قاتل کون تھا۔
وہ ذوالفقار جسے بتایا گیا کہ ان کے بچے کو کوکھ میں مردہ لاڈلی بوا کے جادو نے بنایا؟ چاچی کلثوم جنہوں نے ان پر جادو ٹونے کا الزام لگایا؟ میری اماں سمیت وہ سب عورتیں جنہوں نے اس الزام کو پھیلایا؟ یا پھر پوری بستی جس نے انہیں منحوس سمجھ کر اچھوت بنا دیا تھا؟
قاتل جو بھی تھا مگر اب لاڈلی بوا نہیں رہی تھیں۔ لاڈلی بوا بستی والوں کی سوچ کی سولی چڑھ گئی تھیں۔
وہ اب منوں مٹی تلے چلی گئی تھیں جہاں ان کو کوئی منحوس کہنے والا نہیں تھا مگر مٹی کے اوپر سب ویسا ہی تھا۔
وہ منحوس نہیں تھیں مگر ان پر لگا ٹھپا کوئی ان کی موت کے بعد بھی نہ ہٹا سکا۔
دن مہینے اور مہینے سالوں میں ڈھلتے رہے۔ بستی کے لوگ بھول گئے کہ یہاں کوئی لاڈلی بوا بھی رہتی تھیں مگر میں ان کو کبھی نہیں بھول سکا۔
میٹرک کے بعد میں پڑھنے شہر چلا گیا اور پھر وہیں نوکری ملنے کے بعد رہائش پذیر ہو گیا۔ مگر اب بھی کبھی کبھی بستی میں جاتا ہوں۔
جب بھی وہاں جاتا ہوں تو لاڈلی بوا کے لگائے ان درختوں سے ضرور ملتا ہوں جن کی چھاؤں میں اب نئی نسل کھیلتی ہے۔
وہ درخت مجھے لاڈلی بوا کے ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ کبھی کبھی ان میں مجھے لاڈلی بوا کی سرگوشیاں بھی سنائی دیتی ہیں جو کہتی ہیں..... پتر اللہ کا بندہ کبھی منحوس نہیں ہوتا۔ بس سمجھ کا پھیر الٹا ہے۔

راز

شاکر لطیف

عشق کی کارفرمائیاں ہمیشہ دنیا میں بڑے بڑے تماشوں کا سبب بنتی رہی ہیں۔ وہ جو ایک مسیحا تھا زخموں پر مرہم رکھتا تھا مگر کسی کی محبت نے اسے اپنی ڈگر سے ہٹا دیا... اب وہ زخموں کا سوداگر تھا اور لاشوں کا بیوپاری... کیونکہ اسے اپنی محبت کی رسوائی کسی طور گوارہ نہ تھی۔

عشق کی فسوں گری اور رقیبوں کے انتقام کی دلچسپ روداد

اس وقت رات کے آٹھ بجے کا وقت ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر سائمن اپنے بنگلے کے خوبصورت اور سجے سجائے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ایک فائل کے مطالعے میں مصروف تھا۔ ڈاکٹر سائمن کا شمار اس شہر کے چند بڑے اور قابل ڈاکٹروں میں ہوتا تھا وہ ایک ماہر سرجن تھا۔ اس کا اپنا ذاتی کلینک تھا وہ صبح نو بجے سے کر شام چھ بجے تک اپنے کلینک پر موجود رہتا تھا تاہم اس کے بعد وہ مزید دس منٹ بھی وہاں نہیں رکتا تھا اس کی عمر ویسے تو چالیس سال سے زیادہ تھی اور اس کو ذیابیطس کا

مرض بھی لاحق تھا مگر اس کے باوجود اس نے خود کو اسمارٹ اور فٹ رکھا ہوا تھا۔ وہ اب بھی اپنی عمر سے خاصا کم دکھائی دیتا تھا چونکہ اس نے شادی نہیں کی تھی اس لیے وہ اپنے گھر میں ایک عدد ملازم کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ شادی نہ کرنے کے باوجود بھی وہ خوشگوار زندگی بسر کر رہا تھا۔ اسے کوئی پریشانی یا فکر لاحق نہیں تھی۔ اس کے پاس دولت کی فراوانی تھی اس لیے وہ بہت شاہانہ اور پُرآسائش زندگی بسر کر رہا تھا۔

ڈاکٹر سائمن فرانسیسی تھا اور اس کا شمار ان افراد میں ہوتا تھا جن کی زندگی کا مقصد بس دولت کمانا ہوتا ہے، چاہے وہ کسی بھی ذریعے سے حاصل ہو۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنے گھر کے اندر ایک چھوٹا سا آپریشن تھیٹر بنا رکھا تھا۔ اس آپریشن تھیٹر میں وہ کچھ ایسے زخمی مریضوں کا علاج کرتا تھا جن کا علاج عام اسپتال میں ممکن نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ مریض پولیس کو مطلوب ہوتے تھے ایسے جرائم پیشہ افراد جن کا کوئی ساتھی پولیس مقابلے میں یا کسی آپسی گینگ وار میں زخمی ہو جاتا، وہ اس کے علاج کے لیے ڈاکٹر سائمن کی ہی خدمات حاصل کرتے تھے۔

یہ علاج انتہائی خفیہ طور پر کیا جاتا اور ڈاکٹر سائمن اس کام کے منہ مانگے دام وصول کرتا تھا۔ ڈاکٹر سائمن کا خفیہ آپریشن تھیٹر بھی کوٹھی کے تہ خانے میں تھا اور اس بارے میں صرف اس کا اسسٹنٹ منموہن جانتا تھا۔ منموہن نامی یہ ملازم بھی ڈاکٹر سائمن کو بہت سستے میں پڑتا تھا۔ منموہن ہندوستانی تھا اور ترکی کے راستے غیر قانونی طور پر فرانس میں داخل ہوا تھا اس لیے ڈاکٹر سائمن نے اسے بہت کم تنخواہ پر ملازم رکھا ہوا تھا۔ وہ منموہن سے گھر کے سارے کام کرواتا تھا۔ صفائی سے لے کر کھانا بنانے تک ساری ذمے داری منموہن ہی کی ہوتی تھی۔

ساتھ ہی بنگلے کے لان میں لگے پودوں کو پانی دینا اور ان کی دیکھ بھال کرنا بھی اس کی ڈیوٹی میں شامل تھا۔ اس کے علاوہ وہ ڈاکٹر سائمن کے خفیہ آپریشن تھیٹر میں میل نرس کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔

اپنی نوکری کے سلسلے میں منموہن مجبور تھا اس کے لیے یہ نوکری بھی غنیمت تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ غیر قانونی طور پر فرانس میں رہائش پذیر ہونے پر پکڑا گیا تو اسے پہلے جیل اور پھر ہندوستان واپس بھیج دیا جائے گا۔ اس پر اپنے خاندان کی کفالت کی ذمے داری تھی اور وہ اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر ترکی کے راستے فرانس داخل ہوا تھا۔ وہ خوش قسمت تھا کہ پُرخطر سمندری راستے کو عبور کرنے میں کامیاب ہو گیا اپنے ناگفتہ بہ معاشی حالات کی وجہ سے ہی وہ ڈاکٹر سائمن کے پاس نوکری کرنے پر مجبور تھا۔ ڈاکٹر سائمن اس شہر کے جرائم پیشہ افراد کا خفیہ علاج کرتا۔ اگر کوئی زخمی مر جاتا تو اس کی لاش کو ٹھکانے لگانے کی ذمے داری بھی اسی کے ذمے ہوتی تھی۔ جرائم پیشہ افراد اپنے کسی زخمی ساتھی کی موت کے بعد اس کی لاش کو وہیں چھوڑ کر چلے جاتے۔ ڈاکٹر سائمن لاش کو ٹھکانے لگانے کا بھی منہ مانگا معاوضہ وصول کرتا۔ اس کے نزدیک ہاتھی زندہ ایک لاکھ کا اور مرا ہوا سوا لاکھ کا ہوتا تھا۔ کسی کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے لیے اسے کہیں باہر نہیں جانا پڑتا تھا۔ اس کے بنگلے کے تہ خانے میں ہی ایک برقی بھٹی موجود تھی جس میں لاش کو جلا کر آسانی سے راکھ میں تبدیل کر دیا جاتا پھر اس راکھ کو گٹر میں بہانے کی ذمے داری منموہن کی ہوتی تھی۔

اگرچہ ڈاکٹر سائمن اور اس کی حیثیت میں بہت واضح فرق تھا مگر دونوں کی سوچ میں بہت مماثلت پائی جاتی۔ منموہن انتہائی لالچی فطرت کا انسان تھا۔ اس کی بھی خواہش تھی کہ وہ ڈاکٹر سائمن کی طرح دولت مند بن جائے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس غیر قانونی کام میں ڈاکٹر کا ساتھ دے رہا تھا ورنہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ کسی لاش کو جلا کر گٹر میں بہا دینا ایک سنگین ترین جرم ہے اور کسی مجرم کا پولیس کو مطلع کیے بغیر علاج کرنا بھی مجرم کی معاونت کرنے کے زمرے میں آتا ہے۔ اگر پولیس کو اس بارے میں خبر ہو جاتی تو ڈاکٹر سائمن کے ساتھ ساتھ اسے بھی لمبی جیل یاترا کرنا پڑ سکتی تھی مگر وہ دلجمعی سے ڈاکٹر سائمن کے ہر حکم کی تعمیل کرتا تھا کیونکہ ایسے موقع پر اسے تنخواہ کے علاوہ بھی بونس کے طور پر کچھ رقم مل جاتی تھی۔ اسے ڈاکٹر سائمن کے پاس کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اب سوچنے لگا تھا کہ آخر وہ کب تک ایسی زندگی بسر کرے گا۔ پکڑے جانے کی صورت میں وہ انجام سے بخوبی آگاہ تھا وہ یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ ڈاکٹر سائمن جتنی تنخواہ اسے دے رہا تھا اس سے زیادہ دینے والا نہیں ہے۔ اسے معلوم تھا کہ منموہن غیر قانونی طور پر فرانس میں داخل ہوا ہے۔ وہ اس کی اسی مجبوری سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ منموہن اس صورتِ حال سے ناخوش تھا مگر فی الحال اس کے پاس دوسرا کوئی آپشن نہیں تھا۔ ڈاکٹر سائمن نے اس کے علاوہ کوئی دوسرا ملازم نہیں رکھا ہوا تھا۔ وہ اسی سے سارے کام کرواتا تھا۔ جب کسی جرائم پیشہ شخص کا علاج کیا جاتا یا آپریشن کیا جاتا تو اس وقت ڈاکٹر سائمن کی معاونت بطور میل نرس وہی کرتا تھا۔ اب اس سلسلے میں اسے کافی تجربہ ہو گیا تھا۔ کسی زخمی کا بلڈ گروپ چیک کرنا ہو یا اسے فوری ڈرپ وغیرہ لگانی ہو وہ یہ سارے کام کر لیتا تھا

تاہم پچھلے کافی دنوں سے اس طرح کا کوئی کیس نہیں آیا تھا اس لیے آج فی الحال وہ کچن کے کاموں میں مصروف تھا۔ ڈاکٹر سائمن ڈرائنگ روم میں بیٹھا کسی فائل کے مطالعے میں منہمک تھا اور وہ کچن میں برتن دھو رہا تھا۔ برتن دھونے کے بعد اسے ڈاکٹر سائمن کے لیے کافی بھی تیار کرنا تھی مگر اسی لمحے ڈور بیل بجی تو وہ چونک پڑا۔ اس وقت رات کے آٹھ بجے ڈاکٹر سائمن سے ملنے اس کا کوئی رشتے دار تو نہیں آسکتا تھا۔ ویسے بھی ڈاکٹر سائمن کے رشتے دار اس کے سخت اور درشت رویّے سے نالاں ہونے کے بعد اس سے میل جول ترک کر چکے تھے۔ اپنے عزیزوں کے ساتھ شاید اس طرح کا رویہ بھی ڈاکٹر سائمن نے دانستہ اختیار کر رکھا تھا تاکہ نہ کوئی یہاں آئے اور نہ انہیں معلوم ہو سکے کہ وہ اپنے گھر میں جرائم پیشہ افراد کا خفیہ علاج بھی کرتا ہے۔ منموہن نے برتن دھونا ترک کیا اور یہ دیکھنے کے لیے باہر کی جانب بڑھ گیا کہ کون آیا ہے۔ ڈرائنگ روم میں ڈاکٹر سائمن بدستور فائل کے مطالعے میں مصروف تھا۔

''کوئی ضروری ملاقاتی ہو، تبھی میری موجودگی کے بارے میں بتانا ورنہ کہہ دینا میں گھر پر نہیں ہوں۔'' ڈاکٹر سائمن نے لمحہ بھر کے لیے فائل سے نظریں اٹھا کر اسے مخاطب کیا اور پھر دوبارہ فائل پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔

منموہن اس کی بات سن کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ بنگلے کا انٹر کام کافی دنوں سے خراب تھا اور کنجوس فطرت ڈاکٹر سائمن نے ابھی تک اسے ٹھیک نہیں کروایا تھا۔ اس لیے باہر کون آیا تھا، یہ دیکھنے کے لیے منموہن کو بنگلے کے گیٹ تک جانا پڑا۔

تاہم اس نے گیٹ پر جا کر اسے کھولنے کے بجائے ایڑیوں کے بل گیٹ کے اوپر سے باہر جھانک کر اس گنجے شخص کو دیکھا جو گیٹ کے بالکل سامنے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے پینٹ کوٹ پہن رکھا تھا اور اس کی ظاہری وضع قطع یہ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ خاصا صاحب حیثیت آدمی ہے۔

''کون ہیں آپ اور آپ کو کس سے ملنا ہے؟'' منموہن نے اس کی ظاہری وضع قطع سے متاثر ہوتے ہوئے مؤدبانہ لہجے میں سوال کیا۔

''میرا نام کارلوس ہے اور مجھے ڈاکٹر سائمن سے ایک ضروری کام کے سلسلے میں فوری ملنا ہے۔'' اس شخص نے جواب دیا۔

''آپ کو کس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب سے ملنا ہے؟'' منموہن نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس وقت اس شخص کے چہرے پر بے چینی کے تاثرات نمایاں تھے اگرچہ رات کا وقت تھا مگر گیٹ کے اطراف موجود کنکریٹ کے ستونوں پر نصب لائٹس کی تیز روشنی میں منموہن نے اس کا چہرہ واضح طور پر دیکھ لیا تھا۔

''یہ میں ڈاکٹر سائمن کو ہی بتا سکتا ہوں۔ تم ان کو جا کر بتاؤ کہ کارلوس آیا ہے اور بتانے کے لیے رائل کلب کے مالک چارلس کا حوالہ دے دینا۔''

چارلس کا حوالہ سنتے ہی منموہن چونک پڑا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ چارلس ڈاکٹر سائمن کا بہت پرانا دوست ہے اس کا تعلق بھی جرائم کی دنیا سے تھا۔ چارلس ڈاکٹر سائمن کے پاس اکثر ایسے زخمی افراد بھیجتا تھا جو جرم کی دنیا سے تعلق رکھتے تھے اور پولیس سے یا کسی آپسی مسلح مڈبھیڑ میں زخمی ہو جاتے تھے۔ ڈاکٹر سائمن نے ایسے بہت سے مریضوں کا علاج کیا تھا۔ گولی سے زخمی ہونے والے افراد کو فوری طور پر خون کی ضرورت پڑتی تھی اس لیے ڈاکٹر سائمن نے یہ انتظام بھی کر رکھا تھا تاہم خون کی یہ بوتلیں بہت تھوڑے عرصے کے لیے ہی رکھی جاتی تھیں کیونکہ اس کے بعد یہ بلڈ ایکسپائر ہو جاتا تھا مگر ڈاکٹر سائمن زخمیوں کے علاج کے سلسلے میں خون کی ان بوتلوں کی اہمیت سے بخوبی آگاہ تھا وہ جانتا تھا کہ بہت سے زخمی زیادہ خون بہنے کی وجہ سے ہی ہلاک ہو جاتے ہیں اس لیے وہ فوری طور پر خون کی نئی بوتلوں کا انتظام کر لیتا تھا۔ منموہن جانتا تھا کہ اس وقت بھی آپریشن تھیٹر میں ہر بلڈ گروپ کی کم از کم ایک بوتل موجود ہے۔

''ٹھیک ہے، تھوڑا انتظار کریں، میں ڈاکٹر سائمن سے پوچھ کر آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر منموہن اندر چلا گیا۔

''ڈاکٹر سائمن! باہر ایک شخص آیا ہے۔ اس نے اپنا نام کارلوس بتایا ہے اور چارلس کا حوالہ دیا ہے۔'' منموہن نے ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر ڈاکٹر سائمن کو مخاطب کیا جو ابھی تک فائل کے مطالعے میں ہی منہمک تھا۔

''چارلس کا حوالہ دیا ہے تو پھر یقیناً کسی زخمی کا کیس ہی ہوگا۔'' ڈاکٹر سائمن نے منموہن کی بات سن کر چونکتے ہوئے کہا۔ ''کیا وہ اکیلا ہے یا اس کے ساتھ کوئی زخمی شخص بھی ہے؟''

''میں نے اس کو گیٹ کے اوپر سے دیکھا ہے، اس کے ساتھ ایسا کوئی شخص نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی گاڑی میں ہو۔'' منموہن نے پرخیال لہجے میں جواب دیا۔

''چارلس کا ریفرنس کافی ہے۔ تم اسے اندر آنے دو۔ اگر اس کے پاس گاڑی ہے تو اسے گاڑی کو بھی پورچ میں لانے کا کہو۔'' ڈاکٹر سائمن نے کہا تو منموہن اثبات میں سر

ہلاتے ہوئے واپس گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔

''آپ اندر جا سکتے ہیں۔'' اس نے گیٹ کھولتے ہوئے باہر کھڑے شخص سے کہا۔

اگر آپ کار میں آئے ہیں تو اسے بھی اندر لے آئیں۔''

''میرے پاس گاڑی ہے۔'' کارلوس نے جواب دیا۔ ''میں اسے لے آتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ایک جانب بڑھ گیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ اپنی کار اندر لے آیا جس کے بعد منموہن نے گیٹ بند کر دیا۔ اس دوران ڈاکٹر سائمن ڈرائنگ روم سے پورچ میں آ چکا تھا۔ کار کھڑی کر کے کارلوس جیسے ہی فرنٹ دروازہ کھولتے ہوئے باہر نکلا، ڈاکٹر سائمن بے اختیار بول اٹھا۔

''ارے مسٹر کارلوس! یہ آپ ہیں۔ میں آپ کو جانتا ہوں آپ تو اس شہر کے خاصے معروف بزنس مین ہیں۔ مجھے ڈاکٹر سائمن کہتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر سائمن نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

''یہ میرے لیے اچھی بات ہے کہ آپ مجھے جانتے ہیں۔'' کارلوس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور پھر آگے بڑھ کر ڈاکٹر سائمن سے باقاعدہ مصافحہ کیا۔ منموہن گیٹ بند کرنے کے بعد خاموشی سے ان کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''آپ کس سلسلے میں میرے پاس تشریف لائے ہیں؟ چارلس کا حوالہ تو یہ بتاتا ہے کہ کوئی غیر قانونی اور خفیہ کام ہے۔'' ڈاکٹر سائمن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جی آپ کی بات بالکل درست ہے۔ مجھے واقعی آپ سے غیر قانونی کام کروانا ہے۔'' کارلوس نے کہا۔ ''اور میرے پاس وقت بھی بہت کم ہے یوں سمجھ لیں کہ ایک ایک منٹ بہت قیمتی ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ میرے پاس وقت ہے بھی یا نہیں، مجھے ابھی اس کا بھی بخوبی ادراک نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟'' ڈاکٹر سائمن نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''مطلب یہ کہ میرے ساتھ ایک زخمی مریض ہے جسے میں بچانا چاہتا ہوں۔'' کارلوس نے جواب دیا۔

''کہاں ہے وہ زخمی مریض؟'' ڈاکٹر سائمن نے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔

''میری کار کی ڈکی میں۔'' کارلوس نے جواب دیا۔

''آپ اس مریض کو بچانا چاہتے ہیں یا مارنا چاہتے ہیں؟'' سائمن کی بات سن کر کارلوس کے چہرے پر حیرت کے تاثرات دوچند ہو گئے۔

''میں فی الحال اسے بچانا ہی چاہتا ہوں تاہم میں اسے کسی کی نگاہوں میں آئے بغیر یہاں لانا چاہتا تھا اس لیے کار کی ڈکی میں بند کیا اور اس وقت وہ شدید زخمی ہے اور اب تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کار کی ڈکی میں زندہ موجود ہے یا مر چکا ہے۔ اگر وہ میرے سوال کا جواب دیے بغیر مر گیا تو مجھے زندگی بھر اس بات کا افسوس رہے گا۔ اس کے پاس ایک ایسا راز ہے جس کا انکشاف میرے لیے بہت ضروری ہے۔ اس کے کندھے پر گولی لگی ہے اور کافی خون بہہ چکا ہے۔''

''منموہن! مسٹر کارلوس کی کار کی ڈکی میں سے اس زخمی مریض کو فوراً نکال کر آپریشن تھیٹر منتقل کرو..... ہری اپ!'' ڈاکٹر سائمن نے پاس کھڑے منموہن کو تیز لہجے میں حکم دیا۔

کارلوس نے ڈاکٹر سائمن کی بات سن کر اپنی کار کی چابی منموہن کی جانب بڑھا دی جس نے فوراً ہی کار کی ڈکی کھولی اور پھر اس میں موجود زخمی کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر باہر نکال لیا۔

''ڈاکٹر سائمن یہ ابھی زندہ ہے تاہم بے ہوش ہے۔'' منموہن نے اپنے بازوؤں میں موجود دنیا و مافیہا سے بے خبر اس شخص کا جائزہ لیتے ہوئے کہا اگرچہ وہ بے ہوش تھا مگر بے ہوشی کی حالت میں بھی ہلکے ہلکے کراہ رہا تھا۔

''پھر وقت ضائع نہ کرو اس کو فوراً آپریشن تھیٹر میں لے کر جاؤ۔ میں بھی آ رہا ہوں اور ہاں، اس کے چہرے پر لگا خون وغیرہ صاف کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا بلڈ گروپ بھی چیک کرو۔'' ڈاکٹر سائمن نے مضطرب لہجے میں کہا تو منموہن پھرتی سے اس زخمی نوجوان کو اٹھا کر اندر داخل ہو گیا۔ آپریشن تھیٹر تہ خانے میں تھا اور تہ خانے کا راستہ ڈرائنگ روم سے ہی جاتا تھا۔

''آپ بھی تشریف لے آئیں اور ڈرائنگ روم میں بیٹھ جائیں۔'' ڈاکٹر سائمن نے کہا تو کارلوس اثبات میں سر ہلاتا ہوا ان کے ساتھ ہو لیا۔

''ویسے یہ نوجوان کون ہے؟ اس کے چہرے پر خون لگا ہوا ہے اس لیے میں اس کی شکل واضح طور پر نہیں دیکھ پایا۔''

''اس کا نام مارکم ہے۔ ویسے آپ اسے نہیں جانتے آپ بس اس کی زندگی بچانے کے لیے کوشش کریں، اس کے پاس میرا ایک ایسا راز ہے جس کو میں ہر صورت جاننا چاہتا ہوں۔'' کارلوس نے بے چین لہجے میں جواب دیا۔

''تو پھر آپ یہاں بیٹھ کر میرا انتظار کریں۔ مجھے فوری طور پر زخمی کو چیک کرنا پڑے گا۔'' ڈرائنگ روم میں داخل ہو

کر ڈاکٹر سائمن نے صوفے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تو کارلوس اثبات میں سر ہلاتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا جبکہ ڈاکٹر سائمن تہ خانے کے راستے کی جانب بڑھ گیا۔ منموہن راستہ کھول چکا تھا اور اس زخمی کو لے کر نیچے جا چکا تھا۔ ڈاکٹر سائمن جب تہ خانے کی سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچا تو منموہن نے زخمی نوجوان کو آپریشن تھیٹر کے بیڈ پر لٹا دیا تھا اور اب اس کے چہرے کا خون صاف کر رہا تھا جبکہ ڈاکٹر سائمن حیرت سے اس نوجوان کو دیکھ رہا تھا۔

چہرے سے خون صاف ہونے کے بعد اب اس کی شکل واضح ہو گئی تھی۔

اس نے آگے بڑھ کر نوجوان کے کندھے کا زخم چیک کیا۔ ''گولی اندر ہی ہے، اسے نکالنا بہت ضروری ہے۔ ہمیں اس کا آپریشن کرنا پڑے گا۔ فوری اس کا بلڈ گروپ چیک کرو اور اسے خون کی بوتل لگاؤ ورنہ یہ زیادہ خون بہنے سے ہی ہلاک ہو جائے گا۔'' ڈاکٹر سائمن نے پُرتشویش لہجے میں کہا تو منموہن اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس جانب بڑھ گیا جہاں خون کی بوتلوں کے ساتھ ساتھ بلڈ گروپ چیک کرنے کے مخصوص آلات موجود تھے۔

ڈاکٹر سائمن منموہن کے ہمراہ تقریباً ایک گھنٹے تک آپریشن تھیٹر میں موجود رہا۔ اس دوران اس نے اس زخمی نوجوان کا باقاعدہ آپریشن کر کے اس کی گولی نکال دی اور زخموں پر بینڈیج کر دی۔ اس نے بے ہوش نوجوان کو طاقت کے کچھ انجکشن بھی لگائے۔ ایک گھنٹے بعد وہ اپنے کام سے فارغ ہو گیا۔

''ابھی اسے ہوش میں آنے میں دو گھنٹے تک کا وقت لگ سکتا ہے۔ اگر اس وقت تک یہ ہوش میں آ گیا تو اس کے زندہ بچنے کے امکانات ہیں ورنہ نہیں۔'' ڈاکٹر سائمن اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے پُرخیال لہجے میں بولا۔

وہ کچھ دیر تک پُرسوچ انداز میں اس نوجوان کا جائزہ لیتا رہا اور پھر منموہن کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

''تم اس کا خیال رکھو، میں ڈرائنگ روم میں جا رہا ہوں۔ اگر یہ ہوش میں آئے یا کوئی خطرے والی بات ہو تو مجھے اطلاع کر دینا۔ میں ذرا کارلوس سے بات چیت کر لوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔ منموہن نے ڈاکٹر سائمن کے جانے پر کسی قسم کے ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ڈاکٹر سائمن نے نوجوان کو فی الحال موت کے منہ میں جانے سے بچا لیا تھا اور وہ جانتا تھا کہ اب وہ کارلوس نامی اس بزنس مین سے رقم بٹورے گا جو اس کو لے کر یہاں آیا تھا۔

ڈاکٹر سائمن تہ خانے سے باہر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ کارلوس صوفے پر خاموش بیٹھا ہوا تھا۔

''کیا ہوا..... کیا مارکم بچ گیا ہے؟'' ڈاکٹر سائمن کو دیکھتے ہی کارلوس نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے سوال کیا۔ اس کے چہرے پر شدید بے چینی اور تجسس کے تاثرات ابھر آئے تھے۔

''مجھے امید ہے کہ وہ بچ جائے گا۔ میں نے اس کی گولی نکال دی ہے اور زخموں کی بینڈیج کے ساتھ ساتھ اسے خون بھی چڑھا دیا ہے، آپ اطمینان سے بیٹھیں۔'' ڈاکٹر سائمن نے کارلوس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''ویسے گولی لگنے کے علاوہ بھی اس کے چہرے پر چوٹوں کے نشانات موجود ہیں۔''

''وہ میرے کیے گئے تشدد کے نشانات ہیں۔ اسے گولی بھی میرے آدمیوں نے ماری ہے۔'' کارلوس نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ کی باتیں میرے لیے مبہم اور حیران کن ہیں۔'' ڈاکٹر سائمن نے کہا۔ ''اگر آپ نے اس پر تشدد کیا ہے اور اسے گولی ماری ہے تو اسے بچانے کے لیے یہاں پر کیوں لے آئے؟''

آپ اس بات کو چھوڑیں ڈاکٹر صاحب۔ آپ یہ بتائیں کہ وہ بچ تو جائے گا نا؟'' کارلوس نے کہا۔

''میں کسی بات کی گارنٹی تو نہیں دے سکتا مگر مجھے یقین ہے کہ وہ بچ جائے گا۔'' ڈاکٹر سائمن نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''اگلے ایک دو گھنٹے بہت اہم ہیں۔ اس کے ہوش میں آنے کے بعد ہی میں کچھ کہہ سکتا ہوں۔ گولی اس کے کاندھے پر لگی ہے اس لیے وہ یہاں آنے تک زندہ رہا ہے تاہم خون کچھ زیادہ بہہ گیا ہے۔''

''میرے لیے اس کی وقتی زندگی بہت ضروری ہے۔'' کارلوس نے باقاعدہ ڈرائنگ روم میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ ''جو راز میں اس سے جاننا چاہتا ہوں اگر وہ اسے بتائے بغیر مر گیا تو مجھے بہت تکلیف ہو گی۔''

''کون سا راز؟'' ڈاکٹر سائمن نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''آپ اس کی زندگی بچانے کے لیے پورا زور لگائیے۔ بدلے میں، میں آپ کو آپ کی سوچ سے بھی زیادہ رقم دوں گا۔'' کارلوس نے ڈاکٹر سائمن کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے کہا اور پھر اپنے کوٹ کی جیب سے نوٹوں کی ایک بڑی گڈی نکال لی۔

رقم دیکھ کر ڈاکٹر سائمن کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی۔ وہ لالچی فطرت کا آدمی تھا۔ دولت کا لالچ گویا اس کے رگ وپے میں سرایت کر چکا تھا۔

''یہ رقم رکھ لیں۔'' کارلوس نے نوٹوں کی گڈی اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''مارکم زندہ بچے یا نہ بچے یہ رقم آپ کی ہوئی تاہم یاد رکھیں اگر آپ اسے زندہ بچانے میں کامیاب ہوگئے تو میں اس جیسی تین گڈیاں آپ کو مزید دوں گا۔''

''آپ بے فکر ہو جایئے میں اسے بچانے کے لیے اپنا پورا زور لگا دوں گا اور اپنی پوری مہارت استعمال کروں گا۔'' ڈاکٹر سائمن نے آگے بڑھ کر نوٹوں کی گڈی تھامتے ہوئے کہا اور پھر گڈی کو فوری طور پر اپنی جیب میں منتقل کر لیا۔

''فی الحال میں جو کر سکتا تھا میں نے کر دیا ہے، میں نے اس کا آپریشن کر دیا ہے۔ اگر گولی کا زہر میرے لگائے گئے انجکشن وغیرہ سے اپنا اثر کھو دے تو مجھے امید ہے کہ وہ دو گھنٹے کے اندر اندر ہوش میں آجائے گا مگر ہوش میں آنے کے بعد اس سے فوری بات کرنا مناسب نہیں ہوگا، اس طرح اس کی طبیعت دوبارہ بگڑ سکتی ہے۔''

''مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔'' کارلوس نے مضطرب لہجے میں جواب دیا۔ ''مجھے بس اس سے چند باتیں معلوم کرنی ہیں اس کے بعد بھلے میری طرف سے اسی وقت مر جائے۔''

''مگر کیا آپ اس سے جو بات معلوم کرنا چاہتے ہیں وہ آسانی سے بتا دے گا؟'' ڈاکٹر سائمن نے استفسار کیا۔

''اس حالت میں آپ اس پر تشدد کر کے تو کچھ اگلوا نہیں سکتے۔ اگر وہ ہوش میں آبھی گیا تو ذرا سے تشدد سے ہی ہلاک ہو جائے گا۔ اس زخمی حالت اور جسمانی کنڈیشن میں وہ کسی ہلکے سے تشدد کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا۔''

''آپ اس بارے میں فکر نہ کریں۔'' کارلوس نے... پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ ''مجھے اندازہ ہو چکا ہے کہ یہ تشدد سے کچھ نہیں اگلے گا مگر میرے پاس ایک ایسا حربہ ہے کہ اس کے فرشتے بھی بولیں گے اس وقت اس کی بیوی اور بچوں کو میرے آدمیوں نے یرغمال بنا رکھا ہے۔ میں فون پر اس کی اپنی بیوی اور بچوں سے بات کروا دوں گا اور ساتھ ہی یہ دھمکی دوں گا۔ اس نے مجھے اس آدمی کا نام نہ بتایا تو میں اس کے بچوں کو گولی مار دوں گا۔ اپنے بچوں کی جان بچانے کے لیے وہ مجھے سب کچھ بتانے کے لیے مجبور ہو جائے گا۔''

''کون سے آدمی کا نام؟'' ڈاکٹر سائمن نے اشتیاق بھرے لہجے میں کہا۔ ''وہ کون ہے جو آپ جیسے بڑے بزنس مین کے لیے اتنی اہمیت کا حامل ہے؟ شاید وہ بھی آپ کی طرح کوئی بہت بڑا بزنس مین ہوگا۔ اب تو آپ کی باتوں سے مجھے بھی تجسس ہونے لگا ہے۔''

''میرے خیال میں آپ کو حقیقت بتا دینے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ آپ نے کون سی پولیس کو میری مخبری کر دینی ہے۔'' کارلوس نے جواب دیا۔

''میں خود آپ کے جرم میں شریک ہوں۔ آپ جس زخمی کو گولی مار کر میرے پاس لائے ہیں، میں پولیس کو مطلع کیے بغیر اس کا علاج کر رہا ہوں اور جہاں تک میرا خیال ہے مارکم نامی اس شخص کی زبان کھلوانے کے بعد شاید آپ بھی یہ بات پسند نہ کریں کہ وہ زندہ رہے۔'' ڈاکٹر سائمن نے کہا تو کارلوس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''آپ کو ساری کہانی بتا دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ویسے بھی مجھے چارلس نے آپ کے بارے میں گارنٹی دی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ اگر میں اپنے ساتھ لے کر جانے والے مغوی کو مارنا چاہوں تو ڈاکٹر سائمن اس سلسلے میں بھی میرا ساتھ دیں گے۔''

''جی بالکل..... اگر یہ نوجوان خود مر گیا یا آپ اسے مارنے کا فیصلہ کر لیں تو میں اس کی لاش ٹھکانے لگانے کی بھی ذمے داری لیتا ہوں۔ ابھی مارکم کو ہوش میں آنے میں کافی وقت لگے گا، اس وقت تک آپ مجھے اپنی کہانی سنائیں..... اس بہانے کچھ ٹائم پاس ہو جائے گا۔ مارکم کے پاس میرا ملازم ممو ہن موجود ہے۔'' ڈاکٹر سائمن نے کہا اور پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔

''ویسے آپ کا یہ ملازم تو قابلِ اعتماد ہے نا؟'' کارلوس نے بھی دوبارہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''آپ اس کی فکر مت کریں۔ وہ میرا بہت قابلِ اعتماد آدمی ہے۔ آپ مجھے بتائیں کہ یہ معاملہ کیا ہے؟ میں تھوڑا سا تجسس پسند فطرت کا مالک ہوں جب تک مجھے آپ کی پوری کہانی کا پتا نہیں چلے گا میں ذہنی طور پر الجھن کا شکار رہوں گا۔''

''چلیں میں آپ کی یہ الجھن دور کر دیتا ہوں۔ آپ نے میرے اندر داخل ہونے پر کہا تھا کہ آپ مجھے جانتے ہیں تو پھر آپ میری بیوی کے کیس والے سلسلے کو بھی جانتے ہی ہوں گے۔''

''جی بالکل.....'' ڈاکٹر سائمن نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اس سلسلے میں اخبارات میں پڑھا تھا۔ ویسے آپ خاصی مشہور شخصیت ہیں۔ میں نے یہ خبر اخبارات میں ہی پڑھی تھی کہ آپ کو اپنی بیوی فیری کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا ہے تاہم عدالت نے

عدم ثبوت کی بنا پر آپ کو بری کر دیا تھا۔ جس پولیس افسر نے آپ کو گرفتار کیا تھا، اسے بھی آپ کو بے گناہ گرفتار کرنے کے سلسلے میں اپنی نوکری سے ہاتھ دھونے پڑے تھے۔"

"نہیں ڈاکٹر! میں بے گناہ نہیں تھا۔ میں نے ہی اپنی بیوی فیری کو قتل کیا تھا۔ اگرچہ میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔" کارلوس نے افسردہ لہجے میں جواب دیا۔

"ویسے یہ راز کی بات ہے مگر اب آپ سے کیا پردہ..... آپ نے اخبارات میں یہ بھی پڑھا ہوگا کہ میرے جرائم پیشہ افراد سے بھی تعلقات ہیں اگرچہ میں نے ان الزامات سے ہمیشہ انکار کیا ہے اور ان اخبارات کے خلاف ہرجانے کے دعوے بھی دائر کر رکھے ہیں جنہوں نے ایسی خبریں شائع کی ہیں تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے الزامات سو فیصد حقیقت پر مبنی ہیں، مجھ جیسے بزنس مینوں کو ایسے لوگوں سے تعلقات رکھنے پڑتے ہیں۔ بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جو صرف ٹیڑھی انگلی سے ہی نکلتے ہیں۔"

"میں نے کہا نا کہ میں آپ کے بارے میں اخبارات میں کافی کچھ پڑھ چکا ہوں۔" ڈاکٹر سائمن نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "کاروبار کوئی بھی ہو، اس میں جذبات کا دخل نہیں ہوتا اور نہ ہی قانونی اور غیر قانونی کے چکر میں پڑنا چاہیے ورنہ انسان کامیاب نہیں ہوسکتا۔ دولت کمانے کے لیے شارٹ کٹ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ میں بھی دولت کمانے کے لیے یہ خفیہ آپریشن تھیٹر چلاتا ہوں۔ میں اپنے کلینک میں ایک مہینے میں جتنا کماتا ہوں یہاں میں دو دن میں کما لیتا ہوں۔ میرے نزدیک انسانیت، اصول اور ایمانداری جیسے جذبات چھوٹے لوگوں کی سوچ ہے۔ ہم اس دنیا میں ایک بار ہی آئے ہیں اور ہمیں اس زندگی کو بھرپور طریقے سے انجوائے کرنا چاہیے، دولت میں بڑی طاقت ہے۔"

"آپ کی بات بالکل درست ہے۔ دولت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ میں نے اپنی بیوی کو قتل کر ڈالا۔ پولیس کے ایک ایماندار افسر نے مجھے گرفتار بھی کر لیا مگر وہ مجھے قاتل ثابت نہ کر پایا، الٹا اسے اپنی نوکری سے ہاتھ دھونے پڑے۔ خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے میں نے پیسا پانی کی طرح بہایا تھا۔ عدالت میں ملک کے بہت مہنگے اور قابل وکیل نے میرا مقدمہ لڑا اور میں باعزت طور پر بری ہوگیا۔ فیری کا قتل ڈاکوؤں کے کھاتے میں ڈال دیا گیا۔ میں فیری کو مارنا نہیں چاہتا تھا، میں نے تو اس پر تھوڑا سا تشدد کیا تھا، وہ اتنی نازک اندام نکلے گی کہ تھوڑے سے تشدد سے ہی ہلاک ہوجائے گی، یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔"

"مگر آپ نے اپنی بیوی پر تشدد کیوں کیا تھا؟ آپ جس طرح اس کے بارے میں بات کر رہے ہیں جس طرح اس کے ذکر پر آپ کے لہجے میں افسردگی آجاتی ہے، اس سے تو ایسا لگتا ہے آپ کو اس سے بہت محبت تھی؟" ڈاکٹر سائمن نے سوالیہ نگاہوں سے کارلوس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" کارلوس نے ایک سرد آہ بھری۔ "مجھے واقعی اپنی بیوی سے بہت محبت تھی۔ میں اس کے ساتھ تمام عمر گزارنا چاہتا تھا مگر شاید یہ ہماری قسمت میں نہ تھا۔ جہاں تک اس پر تشدد کی بات ہے تو میں اس سے بھی اسی شخص کا نام جاننے کا خواہاں تھا جس کا نام اس نوجوان سے جاننا چاہتا ہوں۔ اسی وجہ سے میں نے بادل ناخواستہ اس پر تشدد کیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میرے تشدد کو برداشت نہیں کر پائے گی اور مجھے اس شخص کا نام بتا دے گی مگر وہ توقع کے برعکس میرے تشدد کی تاب نہ لاتے ہوئے اس دنیا سے ہی چل بسی۔"

"کون سا شخص؟" ڈاکٹر سائمن نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔ "آپ کی بیوی کی وفات تو ایک سال پہلے ہوئی تھی جبکہ مارکم نامی نوجوان کو آپ آج اغوا کرنے کے بعد یہاں لائے ہیں، وہ کون ہے جس کے بارے میں آپ کو پچھلے ایک سال سے معلوم نہیں ہوسکا؟"

"وہ جو کوئی بھی تھا میں ابھی تک اس سے لاعلم ہوں مگر میں اس کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔" کارلوس پُرسوچ انداز میں بولا۔ "اس کا میری بیوی فیری سے معاشقہ چل رہا تھا۔ میں ان دنوں اپنے بزنس کے سلسلے میں خاصا مصروف رہتا تھا۔ میں دنیا جہاں کی خبر رکھتا تھا مگر اپنے گھر کی خبر نہ رکھ سکا۔ نہ جانے اس کا اور فیری کا افیئر کب شروع ہوا؟ میں ہمیشہ اس خوش فہمی میں ہی رہا کہ میری بیوی مجھ سے بہت محبت کرتی ہے مگر یہ میری بہت بڑی غلط فہمی تھی۔ وہ تو کسی اور ہی کو اپنے دل میں بسائے بیٹھی تھی۔ میں جب کام سے فارغ ہوکر اس سے ملنے جاتا تو مجھ سے اس طرح ملتی تھی جیسے سارا دن میرا ہی انتظار کر رہی ہو۔ ڈاکٹر سائمن آپ یہ سوچ سکتے ہیں کہ ایک مرد جو دس سال تک اس خوش فہمی میں رہا ہو کہ اس کی بیوی اس سے بہت محبت کرتی ہے اور جب اس کا یہ بھرم اچانک ٹوٹ جائے تو اس پر کیا گزری ہوگی؟ مجھے جب اپنی بیوی کی بے وفائی کا علم ہوا تو میرا بھی ایسا ہی حال ہوا۔ وہ کون تھا جو مجھ سے بہتر تھا؟ کسی مرد کے لیے یہ احساس خاصی تکلیف کا باعث ہوتا ہے کہ اس کی عورت نے اس پر کسی دوسرے مرد کو ترجیح دے دی ہے، میرے لیے بھی یہ احساس

بڑا تکلیف دہ تھا کہ میری بیوی نے کوئی خفیہ عاشق پال رکھا ہے۔ مجھے اسی وقت اس ان دیکھے انسان سے شدید نفرت ہوگئی تھی اور میں نے فیصلہ کیا تھا کہ فیری سے تو میں بعد میں نمٹوں گا مگر اس شخص کو میں کسی صورت بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میرے جرائم پیشہ افراد سے بھی تعلقات ہیں اور مجھے اکثر اوقات ان کی خدمات درکار ہوتی ہیں۔ میں دوستوں کا دوست ہوں مگر دشمنوں کے معاملے میں مجھ سے بے رحم شاید ہی کوئی ہو۔

''بہرحال اگرچہ میری اور فیری کی کوئی اولاد نہیں تھی تاہم اس کے باوجود میرے دل میں اس کی محبت اور مقام میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ میں نے تو اس سے کبھی جھگڑا بھی نہیں کیا تھا وہ ہی کبھی کبھی خوامخواہ مجھ سے جھگڑ کر اپنے ایک علیحدہ فلیٹ میں چند دنوں کے لیے چلی جاتی تھی اور پھر میرے منانے پر واپس بھی آجاتی تھی۔ ویسے وہ لگژری فلیٹ بھی اسے میں نے ہی تحفے میں دیا تھا اور جب بھی وہ وہاں جاتی تھی، میں اپنے کچھ آدمیوں کو فلیٹ کی نگرانی پر مامور کر دیتا تھا۔ اس وقت مجھے اس کی بے وفائی کا بالکل علم نہیں تھا۔ میرے وہ آدمی اس کے فلیٹ کی نگرانی کیا کرتے تھے وہ اس لیے کہ کوئی اسے نقصان نہ پہنچا سکے۔ ہم جیسے لوگوں کے دوست ہوتے ہیں تو دشمن بھی ہوتے ہیں۔ اس وقت تک میرا یہ خیال تھا کہ فیری میرے آدمیوں کی اس نگرانی سے بے خبر ہے مگر بعد کے واقعات سے اندازہ ہوا کہ یہ میری خوش فہمی تھی۔

''ان دنوں فیری مجھ سے جھگڑ کر علیحدہ رہ رہی تھی اور میرا خیال تھا کہ میں چند دنوں تک اسے منا کر واپس لے آؤں گا مگر پھر اس کی نگرانی کرنے والے میرے آدمیوں نے مجھے ایسی خبر دی کہ میں چونکنے پر مجبور ہوگیا۔ میرے آدمیوں نے مجھے خبر دی کہ فیری اچانک ہی اپنے فلیٹ سے غائب ہوگئی ہے اور اس کے فلیٹ کو بھی تالا پڑا ہوا ہے۔ میرے آدمی فلیٹ والی عمارت کے خارجی و داخلی راستے پر ہمہ وقت موجود رہتے تھے مگر فیری انہیں چکما دے کر عقبی راستے سے فرار ہوچکی تھی۔ گویا وہ اپنی خفیہ نگرانی سے بخوبی آگاہ تھی۔ فیری کی اس ڈرامائی گمشدگی نے مجھے خاصا پریشان کر دیا۔ ہمارے درمیان جھگڑا ہوتا اور فیری کا روٹھ کر علیحدہ فلیٹ چلے جانا تو معمول کا واقعہ تھا مگر اس بار اس نے مجھے حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اس وقت تک مجھے اندازہ نہیں تھا کہ فیری مجھ سے بے وفائی کی مرتکب ہو رہی ہے۔ میں نے اپنے آدمیوں کو اس کی تلاش میں لگا دیا۔ اس کا سیل فون بھی آف جا رہا تھا جس کی وجہ سے میری تشویش میں اضافہ ہوگیا تھا۔ مجھے یہ گمان ہونے لگا کہ کہیں اسے میرے کسی دشمن نے اغوا تو نہیں کروالیا۔ دو دن گزرے تو مجھے یقین ہونے لگا کہ فیری کو کسی نے واقعی اغوا کرلیا ہے اور اب مجھے اس کی تلاش کے سلسلے میں اپنے آدمیوں پر انحصار کرنے کے بجائے پولیس کی مدد حاصل کر لینی چاہیے مگر اس کے اغوا کے بارے میں بھی میرا شک غلط نکلا کیونکہ دو دن بعد اس نے مجھے فون کیا اور پھر مجھ سے وہ باتیں کیں جن کو سن کر میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔

''اس نے مجھے بڑے دوٹوک انداز میں بتایا کہ اب وہ میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے اور اس شخص سے شادی کرنا چاہتی ہے اس لیے میں اسے طلاق دے دوں۔ اگر میں نے اسے طلاق نہ دی تو وہ عدالت کے ذریعے طلاق لے لے گی۔

''پہلے پہل تو مجھے لگا کہ شاید وہ مجھ سے مذاق کر رہی ہے یا پھر مجھے چڑانے کے لیے اس طرح کی باتیں کر رہی ہے مگر جیسے جیسے ہماری بات چیت طوالت پکڑتی گئی مجھے یقین ہوتا چلا گیا کہ وہ درست کہہ رہی ہے۔ گویا کوئی ایسا موجود تھا جو اسے مجھ سے زیادہ پیارا تھا۔ اس وقت مجھے زندگی میں پہلی بار احساسِ کمتری کا احساس ہوا۔ اپنی بے توقیری اور کم مائیگی کا ایسا احساس مجھے آج سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے مجھ پر گھڑوں پانی انڈیل دیا ہو۔'' اتنا کہہ کر کارلوس خاموش ہوگیا اس وقت اس کے چہرے پر گہرے رنج و غم اور حزن و ملال کے تاثرات نمایاں تھے۔

ڈاکٹر سائمن کو اس کی باتوں سے بخوبی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کس ذہنی کرب سے دوچار ہے۔ اس کی بیوی ایک سال پہلے اس کے ہاتھوں اپنی جان گنوا چکی تھی مگر کارلوس آج بھی حسد اور رقابت کی آگ میں جل رہا تھا۔ اسے یہ خیال چین نہیں لینے دیتا تھا کہ اس کی بیوی کا عاشق اب بھی اس دنیا میں موجود ہے۔

''فیری مجھے ایک بزنس مین کے طور پر جانتی تھی۔ اس نے ابھی تک صرف میرا پیار دیکھا تھا، وہ نہیں جانتی تھی کہ میں جب غصے میں آتا ہوں تو کس قدر بے رحم بن جاتا ہوں۔ اب اسے میرے دوسرے روپ کا سامنا کرنا تھا مگر پہلے اس تک پہنچنا ضروری تھا۔ فیری نے تو مجھے اپنے عشق کے بارے میں بتا کر فون منقطع کر دیا مگر میری راتوں کی نیند حرام ہوگئی۔ میں نے اپنے آدمیوں کو اس کی تلاش میں لگا دیا۔ فیری نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے اسے طلاق نہ دی تو وہ کورٹ چلی جائے گی۔ مجھے اب اس تک جلد از جلد پہنچنا تھا۔ مجھے

اندازہ تھا کہ اگر بات عدالت تک گئی تو یہ معاملہ اخبارات کی زینت بنے گا۔ مرچ مسالے دار خبروں کے ذریعے میری خوب بدنامی کی جائے گی لہٰذا میں نے فیری تک پہنچنے کے لیے ہر ممکن ذریعہ اختیار کیا حتیٰ کہ اس کی موبائل لوکیشن کے ذریعے بھی اسے تلاش کرنے کی کوشش کی مگر وہ بہت ذہین عورت تھی۔ اس نے جس دن مجھے آخری کال کی تھی اسی دن اپنے موبائل سے بھی چھٹکارا حاصل کرلیا تھا لہٰذا اگلے تین دن تک مجھے اس کا کچھ پتا نہ چلا۔ چوتھے دن میرے ایک دوست نے اسے دیکھا وہ کسی شخص کے ساتھ گاڑی میں تھی۔ اس وقت میرا وہ دوست پیدل تھا اور رات کا وقت تھا اس لیے وہ اپنے پاس سے گزرتی ہوئی کار میں صرف فیری کی جھلک ہی دیکھ پایا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے اس شخص کی شکل نہ دیکھ پایا جو آج تک میرے لیے صیغۂ راز بنا ہوا ہے۔

''جب مجھے اس دوست کے توسط سے اس واقعے کے بارے میں علم ہوا تو میں گویا پاگل سا ہوگیا۔ میں اس شخص کو ایک بار ضرور دیکھنا چاہتا تھا جسے میری بیوی نے مجھ پر ترجیح دی تھی آخر اس میں ایسی کون سی خصوصیت تھی جو مجھ میں نہیں تھی؟ میں نے فیری کو کبھی کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی تھی اس کی ہر ضد اور جائز و ناجائز خواہش پوری کرتا رہا تھا مگر اس کے باوجود اس نے مجھ سے بے وفائی کی۔ یہ میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ مجھے یہ اندیشہ بھی تھا کہ جلد یا بدیر فیری طلاق کے لیے عدالت کا رخ بھی کرلے گی اور اس کے بعد یہ قصہ میڈیا کی بھی زینت بنے گا مگر اس سے پہلے کہ وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہوتی، میرے آدمیوں نے اس کے ٹھکانے کا پتا چلا لیا۔ وہ شہر کے ایک پوش علاقے میں کرائے کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہ رہی تھی۔

''مجھے یقین تھا کہ اس کے ساتھ اس کا وہ عاشق بھی وہیں رہ رہا ہوگا لہٰذا میں نے اپنے آدمیوں کو کہا کہ وہ خاموشی سے فیری اور اس کے ساتھی کو اغوا کر کے میرے فارم ہاؤس پہنچا دیں۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ فیری کے بارے میں تو میں بعد میں فیصلہ کروں گا مگر اس کے سامنے اس کے عاشق کو عبرتناک موت ماروں گا تاکہ اسے اندازہ ہو کہ کارلوس کے حق پر شب خون مارنے والوں کا کیا انجام ہوتا ہے۔

''میرے حکم پر میرے آدمی فیری اور اس کے محبوب کو اغوا کرنے کے لیے اس کے فلیٹ میں رات گئے پہنچے اور دروازے کے لاک کو اپنی فنی مہارت کا استعمال کرتے ہوئے کھول کر اندر داخل ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ انہوں نے بیڈ پر لیٹی دنیا و مافیہا سے بے خبر فیری تک رسائی حاصل کرلی مگر اس وقت وہ بیڈروم میں اکیلی سو رہی تھی۔ کلوروفارم سے تر رومال نے اس کی نیند بے ہوشی میں بدل دی اور اس کے بعد اسے وہاں سے کسی کی نگاہوں میں آئے بغیر اغوا کرنا کوئی مشکل کام ثابت نہ ہوا۔ میرے آدمیوں نے اسے میرے فارم ہاؤس پہنچا دیا، جہاں میں نے اس پر تشدد کیا تاکہ اس شخص کے بارے میں جان سکوں جس نے میری جگہ لینے کی کوشش کی تھی مگر شاید میں غصے میں تھا اور میں نے اس کی نازک اندامی کا اندازہ لگائے بغیر اس پر تشدد کیا تھا۔ اس لیے وہ مجھے اس کا نام بتائے بغیر ہی مر گئی۔ افسوس صد افسوس.....'' کارلوس نے تاسف بھرے لہجے میں کہا اور پھر خاموش ہوگیا۔

ڈاکٹر سائمن اب بھی خاموش رہا اور اس کے دوبارہ بولنے کا منتظر رہا تاہم وہ پوری دلچسپی اور انہماک سے کارلوس کی کہانی سن رہا تھا۔

''فیری مر چکی تھی۔'' چند ثانیوں بعد کارلوس نے کہا۔ ''یہ حقیقت ہے کہ میں اس سے شدید محبت کرتا تھا اور کم از کم اس وقت اسے مارنا بھی نہیں چاہتا تھا تاہم اب جو ہونا تھا، ہو چکا تھا اس لیے میں نے اگلے لائحہ عمل کے بارے میں سوچنا شروع کردیا۔ اگر میں فیری کی لاش کو خاموشی سے ٹھکانے لگا بھی دیتا تو اس کی پراسرار گمشدگی کا راز جلد یا بہ دیر کھل ہی جاتا۔ فیری کے والدین پیرس میں مقیم ہیں اور ہر دو ماہ بعد اس سے ملنے میرے گھر بھی آتے تھے۔ جیسے ہی انہیں فیری کے لاپتا ہونے کا علم ہوتا، وہ پولیس کو اطلاع کردیتے۔ مجھے اب پولیس سے بھی بچنا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے فیری کی لاش کو اپنے آدمیوں کے ذریعے واپس اسی فلیٹ میں پہنچا دیا جہاں سے وہ اسے اٹھا کر لائے تھے۔ تین دن بعد فیری کی لاش کفن پھیلنے پر دریافت ہوگئی اور پھر چند دنوں بعد پولیس کے ایک افسر نے مجھے اس کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا۔ اسے فیری کے والدین سے یہ بات معلوم ہوگئی تھی کہ مرنے سے پہلے فیری اور میرے تعلقات کشیدہ تھے اور فیری مجھ سے طلاق کا مطالبہ بھی کر چکی تھی فیری نے اپنے والدین کو فون پر اتنا بتایا تھا کہ وہ مجھ سے طلاق لینے والی ہے تاہم اپنے نئے دوست کا نام اس نے ان کو بھی نہ بتایا تھا پولیس افسر نے اسی بنیاد پر مجھے گرفتار کیا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ میں نے ہی اپنی بیوی کو حسد یا انتقام جیسے جذبات کے ہاتھوں مغلوب ہو کر قتل کروایا ہے۔ بہرحال وہ عدالت میں مجھے قاتل ثابت کرنے میں ناکام رہا اور میرے پیسے اور اثر رسوخ کی وجہ سے اسے اپنی نوکری سے بھی ہاتھ دھونے

پڑے۔

''اب پچھلے ایک سال سے میں اس شخص کو تلاش کر رہا ہوں جو میری بربادی کا ذمے دار ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ بات میری بیوی کی کوئی سہیلی بھی نہیں جانتی۔ میں فیری کی تمام سہیلیوں سے پوچھ گچھ کر چکا ہوں۔ فیری نے اپنا یہ معاشقہ سب سے خفیہ رکھا ہوا تھا اور وہ اس خفیہ عشق کو اپنے سینے میں لیے قبر میں چلی گئی۔

''ایک سال گزر جانے کے بعد مجھے ایسا لگنے لگا تھا جیسے میں اس شخص کو کبھی تلاش نہیں کر پاؤں گا مگر پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ یہ زخمی نوجوان جسے میں آپ کے پاس لایا ہوں، یہ ایک ہوٹل کا مالک ہے اور اس کے ہوٹل میں شہر کے ان جوڑوں کو کمرے دیے جاتے ہیں جو اپنے تعلق کو انتہائی خفیہ رکھنا چاہتے ہوں۔ اس کے ہوٹل کی شہرت بھی اسی رازداری کی وجہ سے ہے مگر بسا اوقات انسان کی زبان پھسل جاتی ہے خاص کر جب وہ نشے کی حالت میں ہو۔ اس نے بھی ایک دن اپنے ایک دوست کو شراب کے نشے میں دھت ہو کر یہ بات بتائی کہ معروف بزنس مین کارلوس کی بیوی کا جس شخص کے ساتھ معاشقہ چل رہا تھا، وہ اسے جانتا ہے اور اس کی اور میری بیوی کی خلوت میں ملاقاتوں کے لیے خفیہ طور پر کمرا بھی وہی فراہم کیا کرتا تھا اور اس نے فیری کی موت کے بعد بھی اس راز کو افشا نہیں کیا۔ اسے یہ معلوم ہے کہ کارلوس آج بھی اس شخص کو تلاش کر رہا ہے اگر وہ چاہے تو کارلوس کو اس کے بارے میں بتا کر بدلے میں بہت بڑی رقم حاصل کر سکتا ہے مگر رازداری اس کے کاروبار کا پہلا اور آخری اصول ہے اور وہ مر تو سکتا ہے مگر اپنے اصولوں سے انحراف نہیں کر سکتا۔

''مارکم نے اپنے جس دوست کو شراب کے نشے میں دھت ہو کر یہ بات بتائی تھی، وہ میرا احسان مند تھا اور یہ بات بھی جانتا تھا کہ میں آج بھی اپنی بیوی فیری کے خفیہ عاشق کو تلاش کر رہا ہوں جس کی خاطر فیری نے جان دے دی مگر اس کا نام منہ پر نہ لائی اس لیے اس نے یہ بات مجھے بتا دی، یہ میرے لیے ایک چونکا دینے والی خبر تھی۔ جس شخص کو تلاش کرنے کے سلسلے میں مجھے مسلسل ایک سال تک ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا، اب مجھے اس تک پہنچنے کا راستہ مل گیا تھا۔

''اس وقت میرا خیال تھا کہ مارکم مجھے بڑی آسانی سے یہ بات بتا دے گا کہ فیری کس کے ساتھ اس کے ہوٹل میں آیا کرتی تھی۔ میں نے پہلے اسے فون کیا اور اسے بتایا کہ میں فیری کا شوہر بول رہا ہوں۔ اگر وہ مجھے اس شخص کے بارے میں بتا دے جسے وہ فیری کے ہمراہ اپنے ہوٹل میں خلوت کے لمحات بتانے کے لیے کمرا فراہم کیا کرتا تھا تو میں اسے منہ مانگی قیمت دوں گا۔

''مگر مارکم نامی یہ نوجوان عجیب و غریب فطرت کا مالک نکلا۔ پہلے تو اس نے اس بات کو تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا کہ وہ میری بیوی یا فیری نام کی کسی عورت کو جانتا ہے تاہم میں نے جب اسے اس کے اس دوست کا حوالہ دیا جس کے سامنے اس نے نشے میں دھت ہو کر یہ انکشاف کیا تھا تو اس نے اعتراف کر لیا کہ وہ مجھے بھی جانتا ہے اور میری مرحوم بیوی کو بھی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ فیری اپنے دوست کے ساتھ اس کے ہوٹل میں کمرے کے حصول کے لیے آتی رہتی تھی تاہم وہ مجھے فیری کے ساتھی کا نام نہیں بتائے گا۔

''اس نے کہا کہ یہ اس کا کام ہے۔۔ وہ ایسے جوڑوں کو مناسب دام پر آج بھی کمرے فراہم کرتا ہے اور رازداری اس کا پہلا اصول ہے اور چاہے کچھ بھی ہو جائے، وہ اپنے کسی کسٹمر کا راز فاش نہیں کرے گا۔

''میرے لیے مارکم کا یہ جواب بڑا حیرت انگیز اور ناقابلِ فہم تھا بظاہر مارکم ایک دلال ہے جو اس طرح کے جوڑوں کو خفیہ طور پر کمرے فراہم کرتا ہے مگر اس کے یہ اصول میرے لیے حیران کن تھے۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح وہ مان جائے اسے جان سے مارنے کی دھمکی بھی دی مگر مارکم اپنے اصولوں کا نام لے کر اپنی ضد پر اڑا رہا۔ اس نے دوٹوک انداز میں مجھ پر واضح کر دیا کہ اگر میں نے دوبارہ اسے فون کر کے دھمکانے کی کوشش کی تو وہ پولیس کو انفارم کر دے گا۔

''مارکم ایک ضدی انسان واقع ہوا تھا تاہم وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ میں اس سے زیادہ ضدی ہوں۔ میرے پاس اب آخری چارہ یہی بچا تھا کہ میں اسے اغوا کروا لوں اور میں نے یہی کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کیں۔ مارکم اپنے ہوٹل میں نہیں رہتا تھا بلکہ اس نے رہائش کے لیے علیحدہ گھر لے رکھا تھا۔ اور ان دنوں اس کے بیوی بچے بھی چند دنوں کے لیے اپنی نانی کے گھر گئے ہوئے تھے۔ گویا ان دنوں وہ اپنے گھر پر تنہا ہی رہ رہا تھا۔

''میرے لیے یہ بات خاصی حوصلہ افزا۔۔۔۔ تھی ورنہ ہوٹل سے اسے اغوا کرنا اتنا آسان ثابت نہ ہوتا۔ میں نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ مارکم کو اغوا کر کے اسی فارم ہاؤس پر پہنچا دیں جہاں فیری کو پہنچایا تھا۔

''میرے آدمیوں نے مسلح ہو کر اس کے گھر دھاوا بول

دیا اور گھر کے اندر داخل ہونے میں تو کامیاب ہو گئے مگر اس کے سر پر اچانک پہنچ کر اسے بروقت قابو کرنے میں ناکام رہے۔ مارکم نے ان کی آمد کے بارے میں معلوم ہوتے ہی اپنے ریوالور سے ان پر فائر کھول کر ان کی پیش قدمی روک دی۔ مجبوراً میرے آدمیوں کو بھی اس پر فائرنگ کرنا پڑی۔ ایک گولی مارکم کے کندھے پر لگی جس سے ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ زمین پر گر گیا۔

''اس کے بعد اسے قابو کرنا زیادہ مشکل ثابت نہ ہوا۔ فائرنگ کی آواز آس پاس سب نے سنی تھی، پولیس کسی بھی وقت وہاں پہنچ سکتی تھی۔ مزید وقت برباد نہیں کیا جا سکتا تھا لہٰذا میرے آدمیوں نے مارکم کو اپنی گاڑی میں ڈالا اور پھر اسے میرے فارم ہاؤس پر لے آئے جہاں میں ان کا منتظر تھا۔ مارکم اس وقت اگرچہ زخمی تھا تاہم بے ہوش نہیں تھا۔ میں نے اس سے اپنے سوال کا جواب مانگا اور پھر اس کے انکار پر اس پر زخمی حالت میں ہی تشدد کر ڈالا۔ میں بس اس سے فیری کے عاشق کا نام جاننا چاہتا تھا اس لیے مجھ پر جنون سا طاری تھا مجھے یقین تھا کہ مارکم تشدد کے آگے نہیں ٹھہر پائے گا مگر یہ آدمی تو پاگل پن کی حد تک اصول پسند تھا۔ ایسی حالت میں بھی کچھ بتانے سے انکاری تھا۔ کندھے پر لگنے والی گولی کی وجہ سے اس کا کافی خون بہہ چکا تھا۔ اس وجہ سے کچھ ہی دیر میں یہ بے ہوش ہو گیا۔

''وہ بے ہوش ہو گیا مگر مجھے ہوش دلا گیا۔ مجھے خیال آیا کہ اگر یہ اس حالت میں مر گیا تو میں اس آدمی کا نام جاننے سے اس بار بھی قاصر ہی رہوں گا جسے میں ایک سال سے تلاش نہیں کر پایا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے احساس ہو رہا تھا کہ اگر اسے فوری طبی امداد نہ دی گئی تو یہ مر جائے گا۔ آپ جانتے ہیں ڈاکٹر سائمن! پریشانی کے عالم میں بعض افراد کی عقل ماؤف ہو جاتی ہے لیکن کچھ افراد کا دماغ ایسی حالت میں زیادہ چلتا ہے۔'' کارلوس نے بات کرتے ہوئے ڈاکٹر سائمن سے سوال کر ڈالا۔

''جی آپ کی بات درست ہے۔'' ڈاکٹر سائمن نے کہا۔

''آپ کی کہانی بہت دلچسپ ہے آپ اسے جاری رکھیں میں ہمہ تن گوش ہوں۔''

ڈاکٹر سائمن کی بات سن کر کارلوس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تیرنے لگی اور پھر اس نے سلسلۂ کلام دوبارہ شروع کیا۔ ''ڈاکٹر سائمن! میرا شمار بھی ان افراد میں ہوتا ہے جن کا ایسی حالت میں دماغ ذرا زیادہ چلتا ہے۔ مارکم کو اس وقت فوری طبی امداد کی ضرورت تھی اور میں اسے اس حالت میں کسی اسپتال لے کر جاتا تو خود پر سیدھا سیدھا پولیس کیس بنوا لیتا۔ اسی وقت میرے ذہن میں اپنے دوست چارلس کا خیال آیا۔ ویسے تو چارلس ایک جرائم پیشہ شخص ہے مگر اس نے ہم جیسے بزنس مینوں سے بھی رابطے بنا رکھے ہیں۔''

''اور ہم جیسے ڈاکٹروں سے بھی۔'' ڈاکٹر سائمن نے لقمہ دیا تو کارلوس بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''جی آپ کی بات بالکل درست ہے۔'' کارلوس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''بہرحال میں نے اس معاملے میں چارلس سے مدد مانگنے کا فیصلہ کیا میں نے چارلس سے اپنے سیل فون پر فوری رابطہ کیا تو اس نے مجھے آپ کا پتا بتا دیا اور یہ بھی کہا کہ اگر میں اس زخمی کو آپ کے پاس لے جاؤں تو آپ اپنے گھر میں موجود خفیہ آپریشن تھیٹر میں اس کا علاج کر دیں گے اس کے بعد میں نے اپنی کار کی ڈکی میں مارکم کو ڈالا اور اسے آپ کے پاس لے آیا مگر ساتھ ہی ساتھ میں نے ایک اور کام بھی کیا۔ مارکم کے بارے میں جب میرے آدمیوں نے معلومات حاصل کی تھیں تو انہیں معلوم ہوا تھا کہ مارکم کے بیوی بچے اپنی نانی کے ہاں گئے ہوئے ہیں اور ان کی نانی کا گھر مارکم کے گھر سے پندرہ بیس منٹ کی ڈرائیو پر ہی ہے۔ مارکم کی ساس شاید بیمار تھی اس لیے مارکم کی بیوی چند دنوں سے اپنے بچوں سمیت اپنی ماں کی دیکھ بھال کے لیے وہیں رہ رہی تھی۔

''مارکم پر تشدد کرنے کے بعد مجھے اس کی نفسیات کا بخوبی ادراک ہو گیا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ شخص مرنا پسند کر لے گا مگر اپنی زبان نہیں کھولے گا۔ اس لیے میں خود تو اسے اپنی کار کی ڈکی میں لے کر یہاں آ گیا مگر میں نے اپنے آدمیوں کو گاڑی میں مارکم کی ساس کے گھر روانہ کر دیا۔ اور انہوں نے میرے یہاں پہنچنے کے دوران مارکم کی ساس کے گھر پہنچ کر اس کی بیوی اور بچوں کو یرغمال بنا لیا۔ میں جب آپ کے گھر کے سامنے پہنچا تھا تو میرے آدمیوں کی طرف سے میرے سیل فون پر یہ اطلاع دی گئی تھی جس کے بعد مجھے یہ اطمینان تو ہو گیا ہے کہ اب یہ مجھے اس شخص کا نام بتانے سے انکار نہیں کر پائے گا کیونکہ اب اس کی فیملی کی زندگی کا سوال ہے۔ اگر یہ ہوش میں آ گیا تو میں اس کی بات اس کی بیوی اور بچوں سے کراؤں گا اور اسے دھمکی دوں گا کہ اگر اس نے سچ نہ اگلا تو میں اس کے بچوں کو مار دوں گا۔ اور یہ سب کچھ بتانے پر مجبور ہو جائے گا۔ ایک دفعہ مجھے فیری کے عاشق کا نام پتا لگ جائے اس کے بعد میں اسے بھی انتہائی اذیت ناک اور عبرتناک موت دوں گا۔

''فیری اپنی بے وفائی کا انجام بھگت چکی ہے مگر وہ شخص ابھی تک زندہ ہے اور اب اسے اپنے کیے کا انجام عبرت ناک موت کی صورت میں بھگتنا ہے۔ بس ایک دفعہ آپ مارکم کو ہوش میں لے آئیں، میں آپ کو آپ کی سوچ سے بھی زیادہ پیسے دوں گا۔''

کارلوس نے اپنے آخری الفاظ ڈاکٹر سائمن کی جانب امید بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہے۔

''میں آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میں نے اس کا آپریشن کر دیا ہے۔'' ڈاکٹر سائمن نے کہا۔ ''یہ دو گھنٹے بہت اہم ہیں۔ اگر وہ ان دو گھنٹوں کے دوران ہوش میں آ گیا تو پھر اس کے زندہ بچنے کے امکانات بھی روشن ہیں، بصورتِ دیگر اس کی زندگی کے امکانات معدوم ہو جائیں گے۔''

''میں بس آخری چانس کے طور پر آپ کے پاس آیا ہوں، یوں سمجھ لیں کہ میں نے اس جوئے کا آخری داؤ کھیلا ہے۔'' کارلوس نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''مارکم مر گیا تو مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں ہوگا۔ میں یہ سمجھ لوں گا کہ فیری کا وہ خفیہ عاشق بہت خوش قسمت واقع ہوا ہے اسی لیے مجھ سے بچ گیا۔''

''آپ تسلی رکھیں، میں پوری کوشش کر رہا ہوں اسے بچانے کی۔ میرا خیال ہے اب مجھے تہ خانے میں جا کر اس کا دوبارہ جائزہ لینا چاہیے۔ میں منموہن کو اس کے پاس چھوڑ آیا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر سائمن اٹھ کھڑا ہوا۔ کارلوس نے اس بار کچھ کہنے کے بجائے بس اثبات میں سر ہلا دیا۔

ڈاکٹر سائمن بھی مزید کچھ بولنے کے بجائے نیچے تہ خانے میں آ گیا۔ منموہن بے ہوش مارکم کے بیڈ کے پاس ہی کھڑا ہوا تھا۔

''اس کے چہرے کی سرخی واپس لوٹ رہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ بچ جائے گا۔'' ڈاکٹر سائمن تہ خانے کی سیڑھیاں اتر کر جیسے ہی نیچے پہنچا، منموہن نے کہا۔

''ہاں، امید تو مجھے بھی ہے کہ یہ بچ جائے گا۔ میرے خیال میں اسے طاقت کا ایک اور انجکشن لگا دینا چاہیے۔'' ڈاکٹر سائمن نے پُرسوچ لہجے میں کہا اور پھر ایک جانب موجود الماری کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے الماری سے ایک انجکشن اور سرنج نکالی اور پھر دوبارہ بے ہوش نوجوان کے پاس آ گیا۔

اس نے انجکشن کا محلول سرنج میں آدھا بھر لیا اور باقی بچ جانے والے محلول کی چھوٹی سی شیشی کو اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ وہ کچھ دیر تک نوجوان کو دیکھتا رہا اور پھر اس نے انجکشن اس کے بازو میں انجیکٹ کر دیا۔

منموہن خاموشی سے پاس کھڑا ہوا تھا۔ اس نے ڈاکٹر سائمن کے کام میں مداخلت کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ انجکشن لگنے کے ایک دو منٹ تک تو مارکم کے جسم میں کسی ردعمل کے آثار نظر نہیں آئے مگر پھر اچانک اس کا جسم بری طرح پھڑکنے لگا۔

''ڈاکٹر سائمن! یہ کیا ہوا؟'' منموہن نے نوجوان کی حالت دیکھ کر تیز لہجے میں کہا۔

''مجھے لگتا ہے انجکشن کا ری ایکشن ہو گیا ہے، ویری بیڈ! یہ بہت بُرا ہوا، میرا خیال تھا کہ اس انجکشن سے اس کی جسمانی طاقت بحال ہو جائے گی۔'' ڈاکٹر سائمن نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

''اب کیا ہوگا؟'' منموہن نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اب دعا کرو کہ اس کا جسم اس انجکشن کو قبول کر لے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اس کی موت واقع ہو جائے گی۔ اس حالت میں اب اسے مزید کوئی انجکشن یا ڈرپ بھی نہیں لگائی جا سکتی۔'' ڈاکٹر سائمن نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

اسی لمحے پھڑکتے ہوئے نوجوان نے آخری ہچکی لی اور اس کا جسم ساکت ہو گیا۔

منموہن نے آگے بڑھ کر اس کی نبض چیک کی اور پھر مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ڈاکٹر سائمن! یہ مر گیا ہے۔''

''افسوس..... ہم اس کی جان نہ بچا سکے۔'' ڈاکٹر سائمن نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی تھی اب اس کی قسمت میں موت تھی تو میں کیا کر سکتا تھا۔''

''آؤ اب اوپر کارلوس کے پاس چلتے ہیں دیکھتے ہیں وہ کیا کہتا ہے، اس کے لیے اس کی موت کی خبر بہت تکلیف دہ ہوگی۔ میں نے اس سے ایڈوانس رقم تو حاصل کر لی ہے مگر اب اس کی موت کے بعد شاید مزید رقم نہ ملے۔'' یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر سائمن تہ خانے کی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔ اس بار منموہن نے بھی اس کی تقلید کی۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ ڈرائنگ روم میں آ گئے۔

کارلوس اس کے ساتھ منموہن کو آتے دیکھ کر چونک پڑا۔ اس کے چہرے پر فکر مندی کے تاثرات عود آئے۔ ''کیا ہوا؟'' اس نے بے چین سے لہجے میں پوچھا۔

''آئی ایم سوری میں مارکم کو نہیں بچا سکا۔ دراصل اس کا خون بہت زیادہ بہہ چکا تھا۔ اس کی قوتِ مدافعت بھی

بہت کم ہو چکی تھی اس لیے وہ زندہ نہیں بچ پایا۔"

ڈاکٹر سائمن کا جواب سن کر کارلوس کے چہرے پر بے پناہ مایوسی کے تاثرات... ابھر آئے۔ وہ کچھ دیر تک مایوسی بھرے انداز میں سر جھکائے کھڑا رہا اور پھر حلق سے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

"مارکم مجھے میری بربادی کے ذمے دار کا حدود اربعہ بتائے بغیر ہی مر گیا۔ فیری کا محبوب بہت خوش قسمت انسان واقع ہوا ہے۔ اگر مجھے اس کا نام معلوم ہو جاتا تو میں اسے اس کے پورے خاندان سمیت موت کے گھاٹ اتار دیتا۔ بہرحال اب کیا کیا جا سکتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا سیل فون نکال لیا اور پھر کوئی نمبر ملانے لگا۔ کچھ دیر میں ہی اس کا رابطہ ہو گیا۔

"کارلوس بول رہا ہوں۔ اس کے بیوی بچوں کو چھوڑ دو۔ مارکم مر گیا ہے اور چند دنوں کے لیے اپنے آدمیوں سمیت انڈر گراؤنڈ ہو جاؤ کیونکہ یہ معاملہ اب پولیس تک جائے گا لیکن میں سنبھال لوں گا۔ تم سب وہاں سے نکلو۔" یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

ڈاکٹر سائمن کو اس کی گفتگو سے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنے ان آدمیوں سے بات کر رہا ہے جن کو اس نے مارکم کے بیوی بچوں کو یرغمال بنانے کے لیے بھیجا تھا۔

"اب مارکم کی لاش کو ٹھکانے لگانا آپ کے ذمے ہے۔ میرے خیال میں جتنی رقم میں آپ کو دے چکا ہوں، وہ کافی ہے۔" کارلوس نے موبائل فون واپس جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"آپ لاش کے بارے میں بے فکر ہو جائیں۔" ڈاکٹر سائمن نے تفہیمی لہجے میں جواب دیا۔ "لاش ٹھکانے لگانے کی ذمے داری اب میری ہے۔ مارکم کا اب کوئی نشان بھی کبھی دریافت نہیں ہو پائے گا۔"

"ڈاکٹر سائمن! تو پھر مجھے بھی اجازت دیں۔" کارلوس نے کہا۔

"منموہن! مسٹر کارلوس کے لیے گیٹ کھولو۔" ڈاکٹر سائمن نے منموہن سے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے باہر کی جانب چلا گیا۔

"مجھے افسوس ہے مسٹر کارلوس... میں نے تو اس نوجوان کو بچانے کے لیے بہت کوشش کی مگر شاید... اس کی زندگی ہی باقی نہیں بچی تھی۔"

ڈاکٹر سائمن نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"میں جانتا ہوں ڈاکٹر سائمن! چارلس نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا تھا۔ آپ بہت قابل ڈاکٹر ہیں۔ میں نے اس سے پہلے بھی آپ کا نام سن رکھا ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ جس کی قسمت میں مزید زندگی ہی نہ ہو اسے دنیا کا کوئی ڈاکٹر زندہ نہیں بچا سکتا۔"

یہ کہتے ہوئے کارلوس ڈرائنگ روم کے خارجی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ ڈاکٹر سائمن بھی پورچ تک اس کے ساتھ آیا۔

منموہن گیٹ کھول چکا تھا۔ اپنی کار میں بیٹھنے سے پہلے اس نے ڈاکٹر سائمن سے مصافحہ کیا۔ گاڑی اسٹارٹ کرنے کے بعد اس نے آخری بار ڈاکٹر سائمن کی جانب دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور پھر کار کو ریورس گیئر میں چلاتا ہوا پورچ سے باہر لے گیا۔ منموہن نے بھی اس کی کار باہر نکلتے ہی گیٹ بند کر دیا۔

ڈاکٹر سائمن خاموشی سے واپس ڈرائنگ روم میں آ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس وقت اس کے چہرے پر شکنوں کا ایک جال سا پھیلا ہوا تھا۔ منموہن بھی اندر آ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"منموہن! مارکم کی لاش کو بھٹی میں ڈالنا ہے مگر اس سے پہلے میرے لیے کافی تیار کرو۔ میں اعصابی طور پر بہت تھکاوٹ محسوس کر رہا ہوں۔" ڈاکٹر سائمن نے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا کچن کی جانب بڑھ گیا۔

کچھ ہی دیر میں وہ کافی تیار کر کے واپس آ گیا۔ اس نے کافی کے دو مگ تیار کیے تھے۔ اس نے ایک مگ ڈاکٹر سائمن کے سامنے موجود ٹیبل پر رکھا اور پھر ٹیبل کے دوسری طرف موجود کرسی پر خود بھی بیٹھ گیا۔ عام طور پر وہ اس طرح ڈاکٹر سائمن کے سامنے بیٹھ کر چائے یا کافی نہیں پیتا تھا اس لیے اس کے اس طرز عمل پر ڈاکٹر سائمن کو حیرت ہوئی تاہم اس نے اس سے کچھ کہنے سے گریز ہی کیا اور خاموشی سے کافی کی چسکیاں لینے لگا۔

"ڈاکٹر سائمن! آپ نے اس نوجوان کو کیوں مارا؟" چند ثانیوں بعد منموہن نے کہا تو کافی کا مگ ڈاکٹر سائمن کے ہاتھوں سے گرتے گرتے بچا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس نے حیرت بھرے لہجے میں منموہن سے پوچھا۔ "میں بھلا مارکم کو کیوں ماروں گا؟"

"میں نے بڑا سیدھا سادہ سا سوال کیا ہے ڈاکٹر سائمن!" منموہن نے سخت لہجے میں کہا۔ آج تک وہ اس کے سامنے مؤدبانہ لہجے میں گفتگو کرتا تھا مگر آج اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔

"یہ تم کس لہجے میں مجھ سے بات کر رہے ہو؟" ڈاکٹر

سائمن نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''اسی لہجے میں جس لہجے میں تم جیسے آدمی سے بات کرنی چاہیے۔'' منموہن نے بھی جارحانہ لہجے میں جواب دیا۔ ''تم اس نوجوان کو بچا سکتے تھے مگر تم نے دانستہ اسے مار ڈالا۔ اگر میں یہ بات کارلوس تک پہنچا دوں تو تم جانتے ہو وہ تمہارا کیا حشر کرے گا؟ کارلوس اس شہر کا معروف بزنس مین ہے اس لیے اس تک پہنچنا میرے لیے کوئی زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوگا۔''

''تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔'' ڈاکٹر سائمن نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم جانتے ہو کہ تم غیر قانونی طور پر فرانس میں داخل ہوئے ہو اس کے باوجود میں نے تمہیں نوکری دے کر تم پر احسان کیا ہے۔ میں اب بھی ایک منٹ میں تمہیں اس نوکری سے نکال سکتا ہوں۔''

''تم نے مجھ پر یہ نوکری دے کر کوئی احسان نہیں کیا۔'' منموہن نے سخت لہجے میں کہا۔ ''تم نے اگرچہ مجھے ملازم رکھا ہوا ہے مگر تم ایک عرصے سے میری محنت کا پورا معاوضہ نہیں دے رہے۔ آدھی تنخواہ پر بھی تم مجھ سے گھر کے سارے کام کرواتے ہو۔ آج تک میں چپ تھا تمہارے سامنے بے بس تھا مگر آج مجھے موقع مل گیا ہے۔ اگر میں یہ خبر کارلوس تک پہنچا دوں کہ تم نے اس نوجوان کو دانستہ قتل کیا ہے تو تمہارا کیا انجام ہوگا؟ میں نیچے تہ خانے میں تھا اس لیے اس کی اور تمہاری تمام باتیں تو نہیں سن سکا مگر جو باتیں میرے سامنے ہوئیں ان سے مجھے اتنا تو معلوم ہو گیا ہے کہ کارلوس مارکم نامی نوجوان سے کسی راز کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔''

''اور اگر میں پولیس کو یہ بتا دوں کہ تم غیر قانونی طور پر یہاں رہ رہے ہو تو تمہارا کیا انجام ہوگا؟'' ڈاکٹر سائمن نے درشت لہجے میں کہا۔

''تم چاہ کر بھی ایسا نہیں کر سکتے۔'' منموہن نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ''کیونکہ تم نے ایک طویل عرصے سے مجھے پناہ دی ہوئی ہے۔ اس طرح تم خود بھی شریکِ جرم بن جاؤ گے اور پھر میں تمہارے بہت سے رازوں کا امین ہوں۔ برقی بھٹی میں لاشوں کو میں تمہارے حکم پر ہی جلا کر راکھ میں تبدیل کرتا ہوں۔ میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ تم نے اس نوجوان کو وہ انجکشن دانستہ لگایا تھا تاکہ وہ ہلاک ہو جائے۔ میں ایک طویل عرصے سے تمہارے ساتھ کام کر رہا ہوں اور اس انجکشن سے اچھی طرح واقف ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اس انجکشن کی انتہائی قلیل مقدار میں دوسری دوا کو مکس کیا جاتا ہے اور پھر کسی زخمی کو یہ لگایا جاتا ہے مگر تم نے تو آدھی مقدار میں وہ محلول براہِ راست اس نوجوان کی رگوں میں اتار دیا۔ ایسی صورت میں اس کی موت یقینی تھی۔''

''تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' ڈاکٹر سائمن اس بار نرم لہجے میں بولا۔ ''تم ڈاکٹر نہیں ہو اور ڈاکٹر بننے کی کوشش بھی نہ کرو۔ یہ حقیقت ہے کہ پہلے میں اس انجکشن کو دوسری دواؤں کے ساتھ انتہائی قلیل مقدار میں استعمال کرتا تھا مگر آج مارکم کی کنڈیشن دیکھ کر مجھے یہ زیادہ مقدار میں استعمال کرنا پڑا۔''

''مجھے چکر دینے کی کوشش نہ کرو۔'' منموہن نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تمہارے پاس کئی زخمی زیادہ .... تشویش ناک حالت میں آتے رہے ہیں مگر تم نے یہ انجکشن اتنی مقدار میں کبھی استعمال نہیں کیا۔ ویسے میں اس انجکشن کا نام کارلوس کو بتا دوں گا اور وہ کسی دوسرے ڈاکٹر سے اس بات کی تصدیق کر لے گا کہ اس کی آدھی مقدار کسی زخمی کے بازو میں انجیکٹ کرنے سے زخمی کا کیا حال ہوگا؟''

ڈاکٹر سائمن نے اس بار منموہن کی بات کا فوری جواب نہ دیا۔ وہ کچھ دیر تک پُرخیال نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا اور پھر بولا۔

''تم تو میری توقع سے بھی زیادہ سمجھدار ہو گئے ہو۔ چلو ایسا ہی سمجھ لو کہ میں نے مارکم کو دانستہ قتل کیا ہے کیونکہ رقم تو میں حاصل کر چکا تھا، اب تم بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو؟''

''مجھے ایک لاکھ یورو دے دو۔ میں ہندوستان واپس چلا جاؤں گا۔'' منموہن نے جواب دیا۔ ''بصورتِ دیگر میں کارلوس کو حقیقت بتا دوں گا۔''

''کیا تم مجھے بلیک میل کر رہے ہو؟'' ڈاکٹر سائمن نے پوچھا۔

''تم جو چاہے سمجھ سکتے ہو۔'' منموہن نے ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا۔ ''ویسے ایک بلیک میلر کو دوسرے بلیک میلر سے یہ سوال نہیں کرنا چاہیے۔ جرائم پیشہ افراد جب کوئی بھی زخمی شخص لے کر تمہارے پاس آتے ہیں تو وہ مجبور ہوتے ہیں اور تم ان کی اس مجبوری سے خوب فائدہ اٹھاتے ہو۔ بادی النظر میں تم بھی ایک بلیک میلر ہو اب سیدھی طرح سے ایک لاکھ یورو میرے حوالے کرو میں مزید تمہارے پاس کام نہیں کرنا چاہتا۔''

''ٹھیک ہے، میں تمہیں ایک لاکھ یورو دینے کے لیے تیار ہوں۔'' ڈاکٹر سائمن نے رضامند ہوتے ہوئے کہا تو منموہن کے چہرے پر حیرت کے تاثرات نمودار ہوئے۔ شاید اسے امید نہیں تھی کہ ڈاکٹر سائمن اتنی جلدی رضامند ہو جائے گا۔

''اس جگہ کو چھوڑ کر جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ، مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر جانے سے پہلے تمہیں اس نوجوان کی لاش ٹھکانے لگانی ہے۔''

''میں اس کی لاش ٹھکانے لگا دوں گا۔ تم اس بارے میں فکر مت کرو جب میں ہندوستان میں تھا تو اس وقت بھی میں لاشیں جلانے کا ہی کام کرتا تھا۔ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میں نے ایک شمشان گھاٹ پر کافی عرصے کام کیا ہے۔ اب صرف اتنا فرق ہے کہ لکڑی کے استعمال کی ضرورت نہیں اس کی جگہ برقی بھٹی نے لے لی ہے مگر میرا کام آج بھی وہی ہے، یعنی مُردے جلانا۔ تم ان باتوں کو چھوڑو، بس رقم دو۔'' منموہن نے بے چین سے لہجے میں کہا۔

''تمہیں رقم کے لیے صبح تک انتظار کرنا ہوگا۔ صبح بینک کھلتے ہی تمہیں رقم مل جائے گی۔ فی الحال یہ رکھ لو۔'' ڈاکٹر سائمن نے اپنے کوٹ کی جیب سے نوٹوں کی وہ گڈی نکال کر منموہن کی جانب بڑھا دی جو اس نے کارلوس سے حاصل کی تھی۔

منموہن نے پھرتی سے گڈی تھام لی۔ رقم دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی تھی۔

''ویسے میں پوچھنے کا حق تو نہیں رکھتا مگر پھر بھی پوچھنا چاہوں گا کیونکہ میرے دل میں تجسس ہے۔ آخر تم نے اس نوجوان کو کیوں مارا؟ تم نے آج سے پہلے ایسا کبھی نہیں کیا۔'' اس نے رقم کی گڈی اپنی جیب میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔

''آج سے پہلے تو تم نے ہمیشہ ہر شخص کی جان بچانے کی پوری کوشش کی ہے۔''

''تمہیں حقیقت بتانے میں کوئی حرج نہیں۔'' ڈاکٹر سائمن نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''مگر تم نے میری کافی میں چینی کیوں نہیں ڈالی؟''

''کیونکہ تم ذیابیطس کے مریض ہو اور بغیر چینی کافی پیتے ہو'' منموہن نے جواب دیا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر آج میں نے انسولین کی ضرورت سے زیادہ ڈوز لے لی ہے اور ابھی تک رات کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ مجھے اس وقت ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میرا شوگر لیول لو ہو رہا ہے۔'' ڈاکٹر سائمن نے نقاہت زدہ لہجے میں کہا۔

''میں چینی لے آتا ہوں۔'' منموہن نے اپنا کافی کا مگ ٹیبل پر رکھا اور پھر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا ''مگر اس سے پہلے تم اپنا سیل فون میرے حوالے کر دو۔ آج رات تمہارا سیل فون میرے قبضے میں رہے گا۔ صبح رقم ملتے ہی میں یہ تمہیں واپس کر دوں گا۔''

''تم تو مجھ پر بالکل اعتبار کرنے کو تیار نہیں ہو۔'' ڈاکٹر سائمن نے ناراض سے لہجے میں کہا ''تم جانتے ہو کہ میں پولیس کو نہیں بلا سکتا کیونکہ اس طرح میں خود بھی پکڑا جاؤں گا۔''

''میں جانتا ہوں تم ایسی بے وقوفی نہیں کرو گے مگر تم اپنے جرائم پیشہ دوست چارلس کی مدد حاصل کر سکتے ہو۔ تم اسے فون کر کے یہاں آدمی بلا سکتے ہو اور مجھے ان کے ہاتھوں مروانے کے بعد برقی بھٹی کی زینت بھی بنوا سکتے ہو میں تم جیسے شخص پر بھروسا بالکل نہیں کر سکتا۔ آج رات تمہیں تمہارے بیڈ روم میں جانے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ آج رات تم میری نگرانی میں سو سکتے ہو۔ مجھے تمہاری نگرانی کے لیے ساری رات بھی جاگنا پڑا تو میں جاگوں گا۔ صبح ہم دونوں بینک جائیں گے، وہاں تم مجھے رقم دو گے اور اس کے بعد ہماری راہیں جدا ہو جائیں گی، میں رات کو ہی اپنے کپڑے پیک کر لوں گا۔ اگر تم نے مجھے صبح پیسے نہ دیے تو پھر میں کارلوس والا آپشن اختیار کروں گا۔''

''میرا تمہیں دھوکا دینے کا کوئی ارادہ نہیں ہے..... یہ لو۔'' ڈاکٹر سائمن نے اپنی جیب سے موبائل فون نکال کر اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ منموہن نے سیل فون پکڑا اور اسے اپنی جیب میں ڈال لیا۔ ڈرائنگ روم میں رکھے... فون کا تار بھی کچن کی طرف جاتے وقت اس نے توڑ ڈالا تھا۔

ڈاکٹر سائمن خاموشی سے ہونٹ بھینچے اسے دیکھتا رہا۔ اس نے فون کا کنکشن تار توڑنے پر بھی کسی ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں منموہن چینی لے کر واپس آ گیا۔ ڈاکٹر سائمن نے ایک چمچ چینی کافی میں ملائی تو منموہن نے چینی کی بوتل ٹیبل پر رکھ دی۔

''شوگر زیادہ لو ہو جائے تو انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔'' منموہن نے اپنا کافی کا آدھا بھرا مگ اٹھاتے ہوئے کہا ''اس لیے چینی تمہارے لیے بہت ضروری تھی۔ تمہاری کم از کم آج کی زندگی میرے لیے بہت ضروری ہے۔ اب بتاؤ تم نے اس نوجوان کی جان کیوں لی اور کارلوس اس سے کس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا؟'' منموہن نے کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے سوال کیا۔

''تمہیں پوری بات کا علم نہیں۔'' ڈاکٹر سائمن نے مسکراتے ہوئے کہا ''تم تہ خانے میں تھے اس لیے کارلوس کی پوری کہانی نہیں سن سکے۔ تمہیں بس اتنا معلوم ہے کہ کارلوس نے کہا تھا کہ میں اس نوجوان سے کوئی راز جاننا چاہتا تھا۔ میں تمہیں پوری بات بتاتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر

سائمن نے منموہن کو پوری کہانی سنادی۔

''تو یہ کسی عورت کی بے وفائی کا قصہ ہے۔'' منموہن نے پورا قصہ سننے کے بعد کہا۔ ''مارکم نامی نوجوان اس شخص سے واقف تھا جس کا کارلوس کی بیوی سے معاشقہ چل رہا تھا اور کارلوس اسے اسی لیے زندہ رکھنا چاہتا تھا کہ وہ اس سے اس شخص کا نام جاننے کا خواہاں تھا مگر پھر بھی میری سمجھ میں یہ بات نہیں آسکی کہ تم نے اسے کیوں مار دیا؟''

''اس لیے کہ میں ہی وہ شخص ہوں جس کا کارلوس کی بیوی سے معاشقہ چل رہا تھا۔'' ڈاکٹر سائمن نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا.....؟'' منموہن اس کا جواب سن کر لمحہ بھر کے لیے ششدہ رہ گیا' وہ کچھ دیر تک متحیر نگاہوں سے ڈاکٹر سائمن کو دیکھتا رہا اور پھر اپنی کافی کا آخری گھونٹ لے کر مگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''اب مجھے سمجھ آئی کہ تم مجھے ایک لاکھ یورو دینے پر کیوں آمادہ ہوگئے تھے' مجھے تو تم سے زیادہ رقم کی ڈیمانڈ کرنی چاہیے..... کیونکہ اگر کارلوس کو معلوم ہوجائے کہ تم ہی اس کی بیوی کے وہ نامراد عاشق ہو جسے وہ تلاش کررہا ہے تو وہ تمہارا کیا حشر کرے گا اس کا اندازہ تم خود بھی لگا سکتے ہو۔''

''تبھی تو میں تمہارے ہاتھوں بلیک میل ہونے پر مجبور ہوا ہوں۔'' ڈاکٹر سائمن نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ ''یہ حقیقت ہے کہ میں اور کارلوس کی بیوی فیری آپس میں محبت کرتے تھے اور شادی بھی کرنا چاہتے تھے مگر وہ کارلوس کی بیوی تھی اور بہ قول اس کے کارلوس اسے اپنی جان سے بھی زیادہ چاہتا تھا۔ وہ اسے آسانی سے طلاق دینے والا نہیں تھا۔ ہم اس کی طاقت اور اثر رسوخ سے بھی بخوبی آگاہ تھے اور جانتے تھے کہ اگر کارلوس کو ہماری محبت کے بارے میں علم ہوجاتا تو وہ کم از کم مجھے تو فوری طور پر موت کے گھاٹ اتار دیتا اس لیے ہم نے اپنے عشق کو انتہائی خفیہ رکھا۔ فیری نے میرے بارے میں اپنی قریبی سہیلیوں کو بھی کچھ نہیں بتایا تاہم اپنے ماں باپ کو اتنا بتا دیا تھا کہ وہ کارلوس سے طلاق لے کر کسی اور شخص سے شادی کرنے والی ہے اور جلد ہی انہیں اس کے بارے میں سب کچھ بتا دے گی۔ فیری اور میں آپس میں ملتے وقت بڑی رازداری برتتے تھے اور اسی سلسلے میں ہم نے مارکم نامی اس شخص سے رابطہ کیا تھا جو اب تہ خانے میں مُردہ پڑا ہے۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ ہم جیسے جوڑوں کی پُرخلوت ملاقاتوں کا معقول معاوضے پر بڑی رازداری سے انتظام کرتا ہے۔ میں اور فیری کافی عرصے تک اسی کے ہوٹل میں خفیہ ملاقاتیں کرتے رہے تھے مگر فیری اب مستقل طور پر میرے ساتھ رہنے کی خواہش مند تھی۔

''وہ میری محبت میں پاگل ہو چکی تھی اس لیے جان بوجھ کر کارلوس سے جھگڑ کر علیحدہ ہوگئی اور کارلوس کے تحفے میں دیے گئے ایک فلیٹ میں رہنے لگی تاہم وہ جانتی تھی کہ کارلوس کے آدمی اس کی نگرانی کررہے ہیں اس لیے ایک دن انہیں چکما دے کر اس فلیٹ سے نکل بھاگی اور اس نے شہر کے ایک پوش علاقے میں نیا فلیٹ بھی خفیہ طور پر حاصل کرلیا۔ وہاں میں بھی اس سے ملنے جاتا تھا۔ فیری نے مجھے بتا دیا تھا کہ اس نے کارلوس کو بھی فون پر صاف صاف کہہ دیا ہے کہ وہ اس سے طلاق چاہتی ہے اور کسی اور سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ بات سن کر کارلوس کا پارہ ہائی ہو چکا ہوگا اور یہ سب معلوم ہونے پر اسے مروا دے گا مگر فیری میرے عشق میں اتنی پاگل ہوگئی تھی کہ اسے کسی چیز کی پروا ہی نہیں رہی تھی۔

''ان دنوں مجھے ایک ضروری کام کے سلسلے میں شہر سے باہر جانا پڑا۔ واپس آیا تو پتا چلا کہ صبح فیری کی لاش اس کے فلیٹ سے برآمد ہوئی ہے۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہ ہوئی کہ فیری کا قتل کارلوس نے ہی کروایا ہے اور اگر اسے میرے بارے میں معلوم ہے تو وہ مجھے بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس وقت مجھ پر کارلوس کا خوف طاری تھا تاہم چند دنوں بعد پولیس نے اسے فیری کے مرڈر کے الزام میں گرفتار کرلیا۔ اس پر کیس چلا مگر وہ عدالت سے بری ہوگیا۔

''وہ جب بری ہوا تو میں اس وقت بھی اس خوف میں مبتلا رہا کہ ممکن ہے اسے میرے بارے میں معلوم ہوگیا ہو اور اب وہ مجھ سے انتقام لے۔ جس آدمی نے اپنی بیوی کو بے وفائی پر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا، وہ اس کے عاشق کو کہاں چھوڑنے والا تھا مگر ایک مہینا مزید گزرا تو مجھے یہ اطمینان ہوگیا کہ میرے اور فیری کے عشق کا راز اس پر نہیں کھلا، ورنہ اب تک وہ مجھ تک پہنچ چکا ہوتا اس طرف سے اطمینان ہونے کے بعد میں اپنی زندگی میں مگن ہوگیا تاہم فیری کو نہ بھلا پایا۔ وہ ہمیشہ میری یادوں میں زندہ رہی اور رہے گی۔

''آج ایک سال بعد کارلوس کی میرے گھر ڈرامائی انداز میں آمد ہوئی تو میں نے اسے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تاہم میں مارکم کو فوری طور پر نہ پہچان پایا کیونکہ تشدد کی وجہ سے اس کا چہرہ بگڑا ہوا تھا مگر پھر کارلوس نے جب اس کا نام بتایا اور آپریشن تھیٹر میں جب تم نے اس کے چہرے سے خون صاف کیا تو مجھے اسے پہچاننے میں دیر نہ لگی۔ فیری کی

موت کو ایک برس گزر چکا ہے اس لیے فوری طور پر میرے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ کارلوس اسے اس مقصد کے لیے یہاں لایا ہے کہ اس سے فیری کے عاشق کے بارے میں معلوم کر سکے۔ میں نے اس کا آپریشن کیا اور پھر اوپر آ کر کارلوس کے پاس بیٹھ گیا۔ کارلوس نے باتوں باتوں میں مجھ پر انکشاف کیا کہ وہ مارکم کو کس مقصد کے لیے یہاں لایا ہے۔ اس کی بات سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کارلوس نے مارکم کی زبان کھلوانے کے لیے اس کے بیوی بچوں کو یرغمال بنا لیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اب مارکم زبان کھولنے پر مجبور ہو جائے گا لہٰذا میں نے اس کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دی۔ مجھے اس کی موت پر افسوس ہے مگر میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ مارکم کو بچانے کے لیے میں نے لمحہ بھر کے لیے تمہاری مدد سے کارلوس کو مارنے کا بھی سوچا مگر پھر اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ کارلوس کی اس جگہ آمد کے بارے میں اس کے آدمی جانتے تھے۔

''اور چارلس نے اسے اس جگہ کا پتا دیا تھا اس لیے اس کی گمشدگی مجھے بہت سے مسائل سے دوچار کر سکتی تھی۔ میرے خیال میں اب تمہیں ساری کہانی سمجھ آ گئی ہو گی۔ مارکم کو مارنا میری مجبوری تھی ورنہ میرا راز فاش ہو جاتا۔ نہ جانے فیری نے میرے نام کو راز میں رکھنے کے لیے کارلوس کا کتنا تشدد برداشت کیا تھا۔ اس کی موت تھوڑے بہت تشدد سے تو واقع نہیں ہو سکتی تھی' اس نے اپنی زندگی دے دی مگر کارلوس کے سامنے میرا نام نہیں لیا۔'' بات کرتے ہوئے ڈاکٹر سائمن کے چہرے پر گہرے رنج و غم کے تاثرات عود آئے۔

''ڈاکٹر سائمن! مجھے کل ایک لاکھ نہیں بلکہ دو لاکھ یورو چاہئیں۔'' منموہن نے پورا قصہ سننے کے بعد کہا۔ ''مجھے اب اندازہ ہوا ہے کہ تم ایک لاکھ یورو دینے پر بلا حیل و حجت کیسے آمادہ ہو گئے ہو۔''

''او کے کل دو لاکھ یورو لے لینا۔'' ڈاکٹر سائمن نے کہا تو منموہن کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھرے۔

''نہیں' مجھے دو نہیں تین لاکھ یورو چاہئیں۔'' اس نے تیز لہجے میں کہا۔

''او کے' تین لاکھ یورو لے لینا۔'' ڈاکٹر سائمن نے بے نیازی سے جواب دیا تو منموہن کے چہرے پر یک بہ یک غصے کے تاثرات ابھرائے۔

''تم میرا مذاق اڑا رہے ہو؟'' اس نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا مگر وہ اپنی کوشش میں دھڑام سے زمین پر جا گرا' اس کی ناک اور منہ سے خون بھی نکلنے لگا تھا۔ اس کے جسم نے اب زمین پر اس طرح تڑپنا شروع کر دیا تھا جیسے پانی سے نکلنے والی مچھلی تڑپتی ہے۔

''تم بہت سمجھدار ہو گئے تھے۔ وہ باتیں بھی جان گئے تھے جو تمہیں نہیں جاننا چاہیے تھیں اور پھر مجھے بلیک میل کرنے کی جرأت بھی کی اس لیے تمہاری موت بہت ضروری ہو گئی تھی۔ تم شاید بھول گئے کہ جب میں نے مارکم کو انجکشن لگایا تھا تو محلول والی شیشی اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال لی تھی۔ تم ڈاکٹر نہیں ہو اس لیے یہ بات نہیں جانتے کہ بظاہر یہ محلول خون میں انجیکٹ کرنے کے لیے ہے مگر اگر اسے کوئی براہِ راست پی لے تو معدے میں جا کر چند منٹ کے اندر یہ ایک خطرناک زہر میں تبدیل ہو جاتا ہے اس لیے میں نے تمہارے سامنے اپنی شوگر لو ہونے کا ڈراما کیا اور جیسے ہی تم چینی لینے کچن میں گئے، میں نے یہ محلول تمہاری کافی میں ملا دیا یہ بے رنگ اور بے بو ہے اس لیے تمہیں کافی پیتے وقت اس کا پتا نہ چلا' چند منٹ کی گفتگو بھی میں نے اسی لیے کی کہ ایک تو تمہیں مرنے سے پہلے حقیقت کا علم ہو جائے اور دوسرا اس وقت تک زہر کا اثر بھی شروع ہو جائے۔ تم نے بہت سے افراد کو برقی بھٹی میں جلایا ہے، آج تمہاری اپنی باری ہے۔ اب مجھے تمہیں اور مارکم کو برقی بھٹی کے حوالے خود ہی کرنا ہو گا۔ تم غیر قانونی طور پر فرانس میں داخل ہوئے تھے اس لیے نہ تمہاری آمد کا کوئی ریکارڈ ہے اور نہ تمہاری موت کا کوئی ریکارڈ ہو گا۔''

ڈاکٹر سائمن نے منموہن کا جائزہ لیتے ہوئے کہا جس کا جسم اب ساکت ہو چکا تھا اور ادھ کھلی بے نور آنکھیں اس کی موت کا اعلان کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر سائمن جانتا تھا کہ معدے کے اندر جانے کے بعد جیسے ہی اس محلول کی ماہیت تبدیل ہو کر زہر میں بدلتی ہے' انسان کی چند لمحے تڑپنے کے بعد موت واقع ہو جاتی ہے۔

''تم اس دنیا سے جانے والے وہ آخری آدمی ہو جو میرے اور فیری کے عشق کے راز سے واقف تھا۔'' ڈاکٹر سائمن، منموہن کے بے جان جسم کو تکتے ہوئے بڑبڑایا۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور منموہن کے مُردہ وجود کی جیب سے اپنا موبائل فون اور رقم کی گڈی نکال لی' اب بس ایک مشقت طلب کام رہ گیا تھا اور وہ تھا منموہن کے مُردہ اور بھاری جسم کو تہ خانے میں موجود برقی بھٹی تک لے جانا..... اور اسے یقین تھا کہ وہ یہ کام بھی سرانجام دے ہی لے گا۔

⌘⌘⌘

معما تہمت

مرزا امجد بیگ

نیک سیرت اور پُرخلوص شریکِ حیات ہر دور میں نصیب والوں کو ملا کرتے ہیں جو مشکل حالات اور دکھ درد میں بھی ایک دوسرے سے وفا نباہتے ہیں مگر... جنہیں قدرت کا یہ تحفہ نہیں ملتا وہ شریک زندگی کے بجائے ایک ایسے بھٹکے ہوئے مسافر بن جاتے ہیں جن کی کوئی منزل نہیں ہوتی... ان کی اذیت اور دکھوں کا کوئی حساب نہیں ہوتا۔ وہ بھی ایک ایسا ہی مسافر تھا جس کے ساتھ رسوائیوں نے قدم ملا لیا تھا اور اس بار بیگ صاحب نے جو معمّا حل کیا وہ تہمت کے حوالے سے شرمناک تھا۔

مقدس رشتوں کی دھجیاں اڑانے والے چند
مکروہ چہروں کا انجام

وکالت کے پیشے میں بعض اوقات ایسے کلائنٹس سے بھی واسطہ پڑ جاتا ہے جن کا کیس لینے سے پہلے سو بار سوچنا پڑتا ہے۔ اب یہ ''سو بار سوچنا'' ایک لمحے پر بھی محیط ہو سکتا ہے، ایک دن پر بھی اور ایک سال پر بھی۔ زیرِ نظر واقعہ بھی ایک ایسے ہی کلائنٹ کا ہے۔ اس کا مقدمہ لڑنے کا فیصلہ کرنے کے لیے مجھے چھتیس گھنٹے تک غور و فکر کرنا پڑا تھا۔

اس مختصر تمہید کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔

ماہِ اکتوبر اختتام پذیری کی جانب گامزن تھا۔ تاریخ مجھے یاد نہیں۔ میں حسبِ معمول اپنے آفس میں بیٹھا کلائنٹس کو ڈیل کر رہا تھا کہ میری سیکریٹری فرحانہ نے انٹرکام پر بتایا۔

''سر! ایک جوڑا حیدرآباد سے آیا ہے اور اپنے کسی کیس کے سلسلے میں وہ لوگ آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں مگر ان کے پاس اپائنٹمنٹ نہیں ہے.....''

''وزیٹنگ لابی کی کیا پوزیشن ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''سر! آج کے اپائنٹمنٹس مکمل ہیں۔'' سیکریٹری نے جواب دیا۔ ''اگر کوئی کلائنٹ گول ہو جائے تو ان کے لیے وقت نکل سکتا ہے۔''

''آپ انہیں صورتِ حال سے آگاہ کر دیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر وہ یہ چانس لینے کو تیار

ہیں تو انہیں انتظار کرنے کو کہیں ورنہ آگے کی کسی تاریخ کا اپائنٹ منٹ دے دیں۔"

"میں اس سلسلے میں ان سے بات کر چکی ہوں....." وہ جز بز ہوتے ہوئے بولی۔

"پھر کیا پرابلم ہے.....؟"

"انہیں انتظار کرنے میں کوئی دقت یا پریشانی نہیں ہے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "مگر وہ آج ہی لازماً آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ شاید یہ ان کے کیس کا کوئی قانونی تقاضا ہے کیونکہ آئندہ روز ان کے مقدمے کی عدالت میں پیشی ہے۔ وہ کہتے ہیں، آج وہ آپ سے ملاقات کر کے ہی جائیں گے چاہے اس کے لیے انہیں کتنا بھی انتظار کیوں نہ کرنا پڑے۔"

"تو ٹھیک ہے، آپ انہیں ویٹنگ پر ڈال دیں۔" میں نے حتمی انداز میں کہا۔ "آگے ان کا نصیب اور مالک کی مرضی!"

میرے پاس عموماً لوگ وقت لے کر ہی آتے ہیں اور اس حوالے سے میں نے اپائنٹ منٹس کا ایک مربوط نظام قائم کر رکھا ہے جو کہ میرے اور میرے کلائنٹس دونوں کے لیے آسانی اور سہولت فراہم کرنے کا باعث ہے لیکن جنہیں اس سسٹم سے آگاہی نہیں وہ اپائنٹ منٹ کے بغیر بھی ملاقات کے لیے چلے آتے ہیں۔ ایسے افراد میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہوتی ہے جنہیں کسی وکیل کی تلاش ہوتی ہے، بالآخر وہ میرے آفس کے دروازے تک پہنچ جاتے ہیں۔

میں نے اس حیدرآبادی جوڑے کا معاملہ مالک کی مرضی اور ان کے نصیب پر چھوڑ دیا تھا۔ مالک کی مرضی سے ان کے نصیب نے کام دکھایا اور صرف ایک گھنٹے کے اندر وہ لوگ ایک مسنگ اپائنٹ منٹ کے طفیل میرے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔

مرد کی عمر پینتیس کے اریب قریب تھی۔ وہ متناسب بدن کا مالک ایک خوش شکل دراز قامت شخص تھا۔ اس کی ساتھی عورت بھی دلکش اور جاذب نظر شخصیت کی مالک تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے پچیس اور تیس کے درمیان قائم کیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد مرد نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا۔

"وکیل صاحب! میرا نام عبیداللہ ہے اور یہ میری اہلیہ نازش ہے۔" اس نے ساتھی عورت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں آج ہی واپس حیدرآباد جانا ہے اس لیے بھی آپ سے ملاقات بہت ضروری تھی کیونکہ میں جو کیس آپ کے سپرد کرنا چاہتا ہوں، کل عدالت میں اس کی تاریخ ہے۔ میں چاہتا ہوں، کل آپ ملزم سے ایک ملاقات ضرور کر لیں....."

"عبید صاحب! آپ یہ بتائیں کہ ٹھنڈا چلے گا یا گرم؟" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "آپ دوسرے شہر سے آئے ہیں۔ آپ کی خاطر تواضع ضروری ہے۔"

"اس تکلف کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں وکیل صاحب۔" وہ شائستہ لہجے میں بولا۔ "آپ نے اپنی مصروفیت میں سے آؤٹ آف اسکیجوٹل وقت نکال کر ہم سے ملاقات کر لی، ہمارے لیے یہی بڑے اعزاز کی بات ہے۔ چائے پانی پھر کبھی سہی۔"

ابھی عبیداللہ نے اپنے مقدمے کے حوالے سے جو بات کی تھی، یہی سب کچھ تھوڑی دیر پہلے فرحانہ انٹرکام پر مجھے بتا چکی تھی مگر کسی بھی کیس کو لینے کے لیے یہ معلومات انتہائی ناکافی تھیں لہٰذا میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھال لیا پھر اپنے سامنے بیٹھے ہوئے عبیداللہ نامی اس خوش پوش شخص کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"عبید صاحب! آپ حیدرآباد میں کیا کرتے ہیں؟"

"میرا چوڑیوں کی میکنگ کا بزنس ہے۔" اس نے بتایا۔

حیدرآباد بلوری چوڑیوں کے حوالے سے ملک بھر میں مشہور ہے۔ میں نے پھر بھی اپنے اطمینان کی غرض سے پوچھ لیا۔

"کانچ کی چوڑیاں یا گولڈ کی؟"

"کانچ کی وکیل صاحب۔" اس نے رسانیت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ "والد صاحب مرحوم نے کسی زمانے میں بلوری چوڑیاں تیار کرنے کا کارخانہ قائم کیا تھا۔ اب ان کے کاروبار کو میں سنبھالتا ہوں۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے ہمارے پاس۔ میں نازش اور ہمارا اکلوتا بیٹا کاشان امن و سکون کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

پھر اس نے مزید بتایا کہ نازش سے اس کی شادی پانچ سال پہلے ہوئی تھی۔ ان کے بیٹے کاشان کی عمر اس وقت کم و بیش چار سال تھی۔ میں نے سوال کیا۔

"آپ جس کیس کے سلسلے میں مجھ سے مشورہ کرنے آئے ہیں، کیا اس کا تعلق حیدرآباد کی کسی عدالت سے ہے؟"

اس استفسار سے یہ جاننا مقصود تھا کہ کیس لینے سے پہلے اس کی لوکیشن کا پتا چلایا جا سکے کیونکہ میرے پاس کراچی کی سیشن کورٹ کے ہی اتنے زیادہ کیسز تھے کہ مجھے سر

کھجانے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ اس صورتِ حال میں حیدرآباد کی کسی عدالت میں زیرِ سماعت مقدمے کو پکڑنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔

''یہ کیس پچھلے سات ماہ سے کراچی کی سیشن کورٹ میں لگا ہوا ہے۔'' عبیداللہ نے بتایا۔ ''لیکن دلاور کا وکیل اتنا ڈھیلا اور نکما ہے کہ ابھی تک کیس نے جوں کی رفتار سے بھی چلنا شروع نہیں کیا اور اسی وجہ سے ہم دلاور کے لیے کسی تجربہ کار وکیل کا بندوبست کرنے کے خواہش مند ہیں اور.....'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''ہم آپ سے محض مشورہ کرنے نہیں آئے۔ ہم دلاور کا کیس آپ کے حوالے کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ آپ کل صبح عدالت میں دلاور سے ایک ملاقات کرلیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔''

''ہوں.....!'' میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ ''عبید صاحب! کیا میں یہ جان سکتا ہوں کہ دلاور سے آپ کا کیا تعلق ہے اور اس کے مقدمے کی نوعیت کیا ہے؟''

''آپ اسے تعلقِ انسانیت سمجھ لیں۔'' وہ میرے سوال کے پہلے حصے کا جواب دیتے ہوئے بولا۔ ''دراصل، سات سال پہلے تک دلاور اپنی فیملی کے ساتھ حیدرآباد ہی میں رہتا تھا اور وہ والد صاحب کے چوڑیوں کے کارخانے میں کام کیا کرتا تھا۔ والد صاحب کے ساتھ اس کی رفاقت کم وبیش بیس سال پر محیط رہی ہے لیکن والد صاحب کے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے ان کے بیچ کسی بات پر ایسا شدید اختلاف ہوگیا کہ دلاور نے والد صاحب اور ان کے کارخانے کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ اس سے قطع تعلقی کے بعد والد صاحب لگ بھگ ایک سال تک زندہ رہے اور اس دوران میں انہوں نے دلاور کو منانے اور پاس لانے کی بھی کئی بار کوشش کی لیکن ان کی یہ تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دلاور نے تجدید تعلقات اور مراجعت کے ذیل میں کوئی قسم کھالی تھی۔ والد صاحب کے انتقال کے موقع پر بھی وہ غیر حاضر رہا۔ بعدازاں جب میں نے کارخانے کا نظام سنبھالا تو ایک آدھ بار میں نے بھی دلاور کو واپس لانے کی کوشش کی لیکن کوئی نیا یا مختلف نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس کی ناراضی اپنی جگہ پر قائم ودائم رہی۔ پھر وہ اپنی فیملی کے ساتھ حیدرآباد سے کراچی شفٹ ہوگیا چنانچہ ہمارے بیچ کوئی تعلق رابطہ باقی نہ رہا۔ چند روز پہلے مجھے کہیں سے پتا چلا کہ دلاور کسی سنگین نوعیت کے مقدمے میں الجھ گیا ہے اور وہ کوئی قابل وکیل کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ جو وکیل اس کے کیس کو دیکھ رہا ہے اس میں وہ کرنٹ موجود ہی نہیں جو کسی کیس کو آگے بڑھانے اور جیتنے کے لیے انتہائی ضروری ہوتا ہے۔ ان حالات نے مجھے مجبور کیا کہ اس نازک موقع پر میں دلاور کی بھرپور مدد کروں۔ آپ کی فیس اور دیگر عدالتی معاملات پر جتنا پیسا بھی خرچ ہوگا، وہ میں دوں گا۔ میری دلی خواہش ہے کہ دلاور اس مصیبت سے نکل آئے۔ میں اسی مقصد سے کراچی آیا ہوں۔ مجھے کراچی کی چند پارٹیوں سے پیمنٹ بھی لینا تھی لیکن اصل کام یہی تھا جس کی میں نے آپ کو تفصیل سنادی ہے۔''

''آپ جس تفصیل کا ذکر کررہے ہیں وہ میرے نزدیک انتہائی ناکافی ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے ابھی تک مجھے یہ نہیں بتایا کہ دلاور کے مقدمے کی قانونی حیثیت کیا ہے۔ جب تک مجھے یہ معلوم نہیں ہوگا کہ دلاور کو کن جرائم کے الزام میں عدالت تک پہنچایا گیا ہے، میں کیس لینے یا نہ لینے کے حوالے سے کوئی حتمی فیصلہ نہیں کرسکوں گا اور اب تو ایک اور بھی پیچیدگی سامنے آگئی ہے.....''

''کون سی پیچیدگی وکیل صاحب؟'' اس نے تشویش بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''آپ کی بیان کردہ تفصیل سے یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ دلاور نہ صرف آپ کے مرحوم والد صاحب سے بلکہ... آپ سے بھی خفا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''اس پس منظر کی روشنی میں وہ آپ کی مدد لینے کو کیونکر راضی ہوگا..... کیا آپ نے کراچی میں اس سے کوئی ملاقات کی ہے؟''

''نہیں!'' عبیداللہ نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے کہ وہ مجھ سے کسی بھی نوعیت کی مدد لینے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔''

میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''پھر.....؟''

''اس مسئلے کو بھی آپ ہی نے مینیج کرنا ہے۔'' وہ بڑی سادگی سے بولا۔ ''میں سامنے نہیں آؤں گا، صرف پیسا خرچ کروں گا۔ باقی کی ساری تدبیریں آپ کو کرنا ہوں گی۔''

''آپ تو میرا کام بڑھا رہے ہیں عبید صاحب!'' میں نے قدرے بیزاری سے کہا۔ ''آپ مجھے ایک ایسے کیس کی پیروی کرنے کو کہہ رہے ہیں جس میں درپردہ جانی مدعی کا کردار بھی مجھے ہی ادا کرنا ہوگا اور وہ بھی ایسے

کیس میں کہ جس کے سر پیر سے بھی واقف نہیں ہوں.....!''

''آپ اطمینان رکھیں وکیل صاحب!'' وہ تسلی آمیز لہجے میں بولا۔ ''اس کیس میں روٹین سے ہٹ کر آپ کا جتنا بھی کام بڑھے گا، میں آپ کے اس وقت کا معاوضہ الگ سے ادا کروں گا اور جہاں تک دلاور کے کیس کی نوعیت ہے تو.....'' اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''دلاور پر عائد کردہ الزام کے دو حصے ہیں.....!''

اس دوران میں عبیداللہ کی بیوی نازش کسی خاموش تماشائی کا کردار ادا کر رہی تھی۔ ابتدائی رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے بڑی سنجیدہ چپ سادھ لی تھی اور مجھ سے تمام تر گفتگو اس کا شوہر عبیداللہ ہی کر رہا تھا۔ نازش کے اس انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک بردبار اور شوہر کی اطاعت گزار ہے ورنہ ایسے مواقع پر بیویاں عموماً خاموشی اختیار کرنے کو گناہ خیال کرتی ہیں اور شوہر کی گفتگو کے بیچم بیچ لقمے بازی کو حقِ نسوانیت سمجھتی ہیں۔

''آپ کن دو حصوں کی بات کر رہے ہیں؟'' میں نے عبیداللہ سے دریافت کیا۔

''نمبر ایک..... اقدامِ قتل!'' اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں بتایا۔

''اوہ.....'' میں نے رف پیڈ پر قلم کو چلاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اٹیمپٹ آف مرڈر..... دفعہ تین سو سات..... ناقابل ضمانت..... اور دوسرا حصہ؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

میرے آخری سوالیہ جملے کے جواب میں عبیداللہ نے بتایا۔ ''نمبر دو..... کامیاب مجرمانہ حملہ..... ریپ کا الزام.....!''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''یہ تو بہت ہی سنگین الزام ہے، اس ذیل میں پاکستان پینل کوڈ (PPC) کی دفعہ تین سو چھہتر کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ بھی ناقابلِ ضمانت دفعہ ہے اور اس کی کم از کم سزا دس سال قید بامشقت علاوہ جرمانہ ہے۔ زیادہ سے زیادہ سزا عمر قید ہو سکتی ہے۔''

''آپ نے تعزیرات پاکستان (پی پی سی) کی دفعات 307 اور 376 کی بالکل درست تشریح کی ہے وکیل صاحب!'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''لیکن مجھے یقین ہے کہ دلاور نے ان میں سے کسی بھی جرم کا ارتکاب نہیں کیا۔ میں بہت چھوٹا تھا جب سے اسے جانتا ہوں۔ وہ مجرمانہ ذہنیت رکھنے والا انسان نہیں ہے۔ میں بڑے دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ کسی گہری سازش کے تحت اسے اس سنگین مقدمے میں پھنسایا گیا ہے اور..... آپ نے دلاور کو ہر حال میں اس مصیبت سے نجات دلانا ہے۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا.....؟''

''بالکل سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں جاننا چاہوں گا کہ دلاور کے خلاف یہ گھناؤنی سازش کس نے کی ہے؟''

''اس کی بیوی سعیدہ نے.....!'' اس نے انکشاف انگیز لہجے میں جواب دیا۔ ''وہ اس کیس میں مدعی اول ہے اور آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ مجرمانہ حملے کا الزام دلاور کی سگی بیٹی فوزیہ نے لگایا ہے.....''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ''ایک باپ اپنی سگی بیٹی کو ہوس کا نشانہ کیسے بنا سکتا ہے.....!''

''واقعتاً نہیں بنا سکتا وکیل صاحب!'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''اس سلسلے میں آپ سے میں مکمل اتفاق کرتا ہوں اور آپ کو یہ بھی یقین دلاتا ہوں کہ دلاور نے ان میں سے کسی بھی جرم کا ارتکاب نہیں کیا۔ وہ ایک سوچی سمجھی سازش کا شکار ہو کر پچھلے چھ سات ماہ سے جے سی (جیوڈیشل کسٹڈی) میں ہے۔ دلاور کی بے گناہی کو ثابت کرنے کے لیے کسی تجربہ کار تگڑے وکیل کی ضرورت تھی۔ اسی لیے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔''

''اگرچہ دلاور کا کیس خاصا پیچیدہ اور خطرناک ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس مقدمے کے اندر وکیل صفائی کے لیے ایک کڑا چیلنج بھی چھپا ہوا ہے۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں کل دلاور سے ملاقات کرتا ہوں۔ اس کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔''

''ٹھیک ہو گیا۔'' وہ اطمینان بھرے انداز میں بولا۔ ''آپ کل عدالت میں دلاور کا انٹرویو کر لیں۔ پرسوں مجھے دوبارہ کراچی آنا ہے۔ میں ملاقات کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔ اگر آپ نے اس کیس کو لینے کا فیصلہ کر لیا تو میں آپ کی فیس وغیرہ اسی وقت ادا کر دوں گا..... اور مجھے یقین ہے کہ آپ اس کیس کو ضرور لیں گے کیونکہ میرے اندازے کے مطابق آپ ایک

مشکل پسند انسان ہیں۔"

"آپ کی تجویز معقول ہے عبید صاحب!" میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ "میں کل دلاور سے مل لیتا ہوں۔ آپ پرسوں میرے آفس آئیں گے تو ہم اس موضوع پر فائنل۔۔ بات کرلیں گے۔"

"اوکے!" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "سر، ایک بات آپ کو یاد رکھنا ہے.....!"

"یہی نا کہ....." میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ "ملزم دلاور کو کسی بھی صورت یہ پتا نہیں چلنا چاہیے کہ اس کیس میں آپ اس کی مدد کررہے ہیں۔"

"بالکل یہی!" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"آپ بے فکر ہوجائیں عبید صاحب!" میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ "اگر میں نے اس کیس کو لینے کی ہامی بھر لی تو پھر آپ کا ہر راز ایک امانت کے طور پر میرے سینے میں دفن رہے گا۔"

ان دونوں نے میرا شکریہ ادا کیا اور الوداعی کلمات کے تبادلے کے بعد وہ میرے دفتر سے رخصت ہوگئے۔

☆☆☆

دلاور کا کیس جس عدالت میں لگا ہوا تھا اس کے بارے میں عبیداللہ نے مجھے تفصیلاً آگاہ کردیا تھا لہٰذا آئندہ روز میں اپنی مصروفیات میں سے تھوڑا وقت نکال کر متعلقہ عدالت چلا گیا۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ میں جس وقت عدالت پہنچا، دلاور اپنے وکیل کے ہمراہ کمرائے عدالت سے باہر نکل رہا تھا۔ اس کے وکیل کا چہرہ مجھے شناسا سا لگا۔ ذہن پر تھوڑا سا زور ڈالا تو یاد آگیا کہ مذکورہ وکیل کا نام اشفاق علی تھا اور وہ ابھی وادی وکالت میں نووارد تھا۔ دلاور کو ہتھکڑی لگی ہوئی تھی جس کی آہنی زنجیر کا دوسرا سرا ایک باوردی پولیس والے کے ہاتھ میں تھا۔ عدالت کے احاطے میں جیل کی وین کھڑی تھی یقیناً وہ پولیس والا دلاور کو جیل وین کی طرف لے کر جانے والا تھا۔

اشفاق علی نے میرے اندازے کے مطابق دلاور کے کان میں دو چار خوش خبریاں پھونکیں اور ایک جانب بڑھ گیا۔ میں تیز قدموں سے چلتے ہوئے دلاور کے نزدیک پہنچ گیا۔ پولیس اہلکار نے میری موجودگی کو فوراً محسوس کرلیا اور چونک کر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ وہ میرے لبادے سے پہچان گیا کہ میں ایک وکیل ہوں لہٰذا وہ محتاط ہوگیا۔

میں نے کہا۔ "میں دلاور سے تنہائی میں چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

کانسٹیبل چلتے چلتے رک گیا پھر سرتاپا تنقیدی نگاہ سے میرا جائزہ لینے کے بعد خشک لہجے میں بولا۔ "یہ بندہ جیوڈیشل ریمانڈ پر ہے اور میں اسے واپس جیل لے جارہا ہوں۔"

"میں جانتا ہوں۔" میں نے جیل وین کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم اس وین میں واپس جاؤ گے۔" پھر میں نے اضافہ کرتے ہوئے ایک تکا لگایا۔ "لیکن اس وین کی روانگی میں ابھی دیر ہے۔ چند قیدی آنا ابھی باقی ہیں۔ میں زیادہ وقت نہیں لوں گا اور تمہارا بھلا بھی مجھے عزیز ہے.....!"

آخری جملہ میں نے بڑے معنی خیز انداز میں ادا کیا تھا۔ کانسٹیبل کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی اور اس نے مجھ سے پوچھا۔

"میرا بھلا کیسا؟"

میں نے اپنے بٹوے میں سے پچاس روپے والا ایک کرارہ سا نوٹ نکال کر اس کی مٹھی میں رکھتے ہوئے رازدارانہ انداز میں کہا۔

"آج جن قیدیوں کو پیشی کے لیے عدالت لایا گیا ہے جب تک وہ تمام اس وین میں آکر بیٹھ نہیں جاتے، وین عدالت کے احاطے سے روانہ نہیں ہوگی۔ میں نے تمہارا بھلا کردیا ہے۔ اب تم میرا بھلا کرو اور چند منٹ کے لیے ہمیں تنہا چھوڑ دو۔ ہمیں بات کرتے ہوئے جو بھی دیکھے گا، وہ یہی سمجھے گا کہ دلاور اپنے وکیل سے گفتگو کررہا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے۔ تم پر کسی طرح کا کوئی بار نہیں آئے گا۔"

کانسٹیبل نے چوکنا نظر سے دائیں بائیں دیکھا پھر مجھ سے مستفسر ہوا۔ "آپ اس قیدی کے وکیل کس طرح ہوسکتے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو اس کا وکیل یہاں سے گیا ہے؟"

"میں تم سے مکمل اتفاق کرتا ہوں کہ تھوڑی دیر پہلے تک دلاور کا وکیل اشفاق علی ہی تھا۔" میں نے کانسٹیبل کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پراسرار لہجے میں کہا۔ "لیکن اب دلاور کا وکیل میں ہوں۔ میں اسی سلسلے میں دلاور سے چند باتیں تنہائی میں کرنا چاہتا ہوں۔ سمجھ لو کہ اشفاق علی نے اس کیس سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔"

میں کانسٹیبل کی مٹھی پیشگی گرم کرچکا تھا اور اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے کی خاطر میں نے جھوٹ اور سچ کی کھچڑی بھی پکا ڈالی تھی تاہم اس کے پاس انکار کی گنجائش

نہیں تھی۔ اس نے ایک بار پھر اپنے گردوپیش پر ایک محتاط نگاہ ڈالی پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''میں آپ کو صرف دس منٹ دے سکتا ہوں۔ آپ نے اس قیدی سے جو بھی پوچھنا ہے، بس جلدی سے پوچھ لیں۔''

''میرے لیے دس منٹ کافی ہیں۔'' میں نے کہا۔

میں نے اس کانسٹیبل کی جو مٹھی گرم کی تھی اس کی گرمائش سے کانسٹیبل کا دل پگھل گیا تھا اور اس نے مجھے تنہائی میں دس منٹ تک دلاور سے بات کرنے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ میں پچاس روپے کے چٹکاری اثرات کو اتنی وضاحت کے ساتھ کس لیے بڑے فخر سے بیان کر رہا ہوں؟ یہ ٹھیک ہے کہ آج کل دو ہزار بیس عیسوی میں پچاس روپے کی بس اتنی ہی حیثیت ہے کہ آپ اس رقم سے پیٹ بھر کر ایک وقت کا کھانا بھی نہیں کھا سکتے لیکن آج سے چالیس سال پہلے پچاس روپے کے نوٹ کی اچھی خاصی ویلیو ہوا کرتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایک عام آدمی کی ماہانہ تنخواہ آٹھ سو روپے سے پندرہ سو روپے کے درمیان ہوتی تھی۔

دلاور کی عمر کا اندازہ میں نے پچپن اور ساٹھ کے درمیان قائم کیا۔ بعد ازاں پتا چلا کہ وہ اس وقت اپنی عمر کی ستاونویں سیڑھی پر کھڑا تھا۔ وہ درمیانے قد کا مالک ایک صحت مند انسان تھا۔ یہاں ''صحت مند'' ہونے سے میری مراد اس کا مائل بہ فربہی ہونا ہے۔ اس کے سر کے بال بے ترتیب اور شیو اچھا خاصا بڑھا ہوا تھا۔ دلاور کی آنکھوں میں مجھے کسی کھنڈر کی ویرانی دکھائی دی۔ اس کی آنکھیں اندر سے پوری طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ اغلب امکان یہی تھا کہ وہ کئی راتوں کا جاگا ہوا تھا۔ کانسٹیبل سے ہونے والی بات چیت کے دوران میں دلاور بالکل خاموش اور لاتعلق سا کھڑا رہا تھا اور تا حال وہ اسی کیفیت میں دکھائی دیتا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ اگر میں اس کے سامنے دس منٹ تک چپ چاپ کھڑا رہا تو وہ ایک بار بھی نگاہ اٹھا کر سوالیہ انداز میں میری طرف نہیں دیکھے گا لیکن میں چونکہ وہاں وقت برباد کرنے نہیں گیا تھا لہٰذا میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے دوستانہ لہجے میں کہا۔

''دلاور! تمہارا کیس میں نے آج سے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ تم اشفاق علی کی چھٹی سمجھو۔ اس وکیل نے ابھی تک تمہارے لیے کچھ نہیں کیا۔ اگر تم مجھے سچائی سے روشناس کرا دو تو میں تمہیں اس مصیبت سے چھٹکارا دلانے کی کوشش کروں گا۔''

یہ حقیقت ہے کہ مجھے دلاور کا کیس لینے یا نہ لینے کا فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کرنا تھا تاہم اس کا اعتماد جیتنے کے لیے میں نے سردست مصلحتاً دروغ گوئی سے کام لیا تھا۔

اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا اور عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''وکیل صاحب! میں آپ کو نہیں جانتا۔ سچ پوچھیں تو میں اشفاق علی کو بھی نہیں جانتا.....''

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''اشفاق علی پچھلے سات ماہ سے تمہارے کیس کی پیروی کر رہا ہے۔ تم اس سے اپنی ناواقفیت کا اظہار کس طرح کر سکتے ہو.....؟''

''میرے کیس کی پیروی کوئی بھی کرے یا سرے سے کوئی بھی نہ کرے، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' وہ خواب ناک لہجے میں بولا۔

میں نے اپنایت بھرے انداز میں پوچھا۔ ''اس کا بھلا کیا مطلب ہوا؟''

''آپ اور آپ جیسے دوسرے وکلا الغرض، ہر کوئی یہی سمجھ رہا ہے کہ میرا مقدمہ اس عدالت میں زیر سماعت ہے اور عنقریب مجھے بڑی عبرت ناک سزا سنائی جانے والی ہے۔''

''تو کیا ایسا نہیں ہے؟'' میں نے اس کی فلسفیانہ باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے سوال کیا۔

''ہرگز نہیں!'' وہ اپنی سرخ انگارہ آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''حقیقت یہ ہے کہ میں نے اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا ہے۔ اس کی عدالت سے جو بھی فیصلہ آئے گا، میں گردن جھکا کر اسے قبول کر لوں گا۔ اپنے معبود کے سامنے خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے مجھے وکیلوں کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ایسا تو صرف وہی شخص سوچ سکتا ہے جسے اپنی بے گناہی کا کامل یقین ہو.....؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اسے گھورا۔

''الحمدللہ!'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''میرا ضمیر ہر لحاظ سے مطمئن ہے۔''

''ویری گڈ!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا پھر بڑی نرمی سے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''دلاور! یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ تم نے اپنا کیس خالق کائنات کی عدالت میں دائر کر دیا ہے لیکن تمہیں اتنا تو معلوم ہوگا ہی کہ وہ ذات پاک اپنے بندوں کی مدد کے لیے آسمان سے فرشتوں کو نازل نہیں کرتا بلکہ بعض لوگوں کو وہ ایسے کاموں کے لیے مقرر کر دیتا ہے۔ سمجھ لو کہ میں بھی وکیل

کے روپ میں قدرت کا مقرر کردہ ایک ایسا ہی شخص ہوں جو تمہاری قانونی مدد کے لیے اچانک سامنے آ گیا ہے.....''

وہ چند لمحات تک شک زدہ انداز میں مجھے تکتا رہا پھر بغیر کسی لگی لپٹی کے بے دھڑک بولا۔ ''اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ میرا مقدمہ لڑنے کی آپ کو کوئی بھاری فیس دی جائے گی تو میں اسے آپ کی غلط فہمی کہوں گا کیونکہ میں مالی طور پر بہت زیادہ کمزور ہو چکا ہوں۔''

''جب قدرت کسی کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیتی ہے تو وہ اس کے بدلے میں کوئی فیس یا کسی قسم کا معاوضہ وصول نہیں کرتی۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لہٰذا آپ کو میری فیس اور دیگر عدالتی اخراجات کے ذیل میں فکرمند ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں آپ سے میں ایک روپیہ بھی وصول نہیں کروں گا۔ بس، میرا آپ سے صرف ایک ہی مطالبہ ہے.....''

میں نے ذرا دیر کو رک کر سوالیہ نظر سے دلاور کو دیکھا تو وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''کیسا مطالبہ وکیل صاحب؟''

''میں سچائی جاننا چاہتا ہوں..... بس!'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''تمہارا کیس غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔''

اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے۔ اس کی آنکھوں میں مجھے اذیت بردار سائے لہراتے دکھائی دیے۔ ان لمحات میں دلاور کرب کی انجانی منازل سے گزر رہا تھا۔ اس کے وجود میں کوئی طوفان امڈ آیا تھا جو اسے ریزہ ریزہ کرنے پر آمادہ نظر آتا تھا مگر اس نے ضبط کے دامن کو بڑی مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ چند پل وہ اسی ہیجانی کیفیت میں مبتلا رہا پھر غراہٹ سے مشابہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''وکیل صاحب! مجھ پر جو بیتی ہے اسے زبان سے بیان کرنا میرے بس سے باہر ہے۔ میرا کلیجا پھٹ جائے گا.....''

''جب کسی معاملے میں زبان ساتھ دینے سے انکار کر دے تو پھر کاغذ اور قلم کا سہارا لینا چاہیے۔'' میں نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم لکھنا پڑھنا جانتے ہو؟''

''وکیل صاحب! میں نے اچھے وقتوں میں پرائمری تک تعلیم حاصل کی تھی۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''اردو کے علاوہ انگریزی پر بھی کسی حد تک دسترس رکھتا ہوں۔''

وہ اس وقت ستاون سال کا تھا۔ اس نے لگ بھگ دس، سال کی عمر میں پرائمری پاس کی ہوگی۔ اگر رف سا حساب بھی لگائیں تو یہ کم و بیش انیس سو تینتیس کا زمانہ تھا۔ اس دور کا پانچ جماعت پاس آج کل کے ایم اے پاس سے زیادہ قابل ہوا کرتا تھا یا کم از کم اسے ایم اے پاس کا ہم پلہ کہا اور سمجھا جا سکتا ہے۔

میں نے اپنی فائل میں سے تین چار سادہ فل اسکیپ کاغذ نکال کر انہیں تہ کیا پھر کانسٹیبل کی نگاہ بچا کر وہ تہ شدہ کاغذ اور ایک قلم دلاور کی جانب بڑھاتے ہوئے آنکھوں کے اشارے سے کہا۔

''ان چیزوں کو اپنے لباس میں چھپا لو.....!''

دلاور نے سمجھ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوراً میرے حکم کی تعمیل کرنے کی کوشش کی لیکن ہتھکڑی لگے ہاتھوں کی مدد سے یہ کام ناممکن کی حد تک مشکل تھا اور وہ بھی کانسٹیبل کی نظر بچا کر..... لہٰذا اس سلسلے میں، میں نے اس کی مدد کی۔ کاغذ اور قلم کو اس کے لباس میں مخفی کرنے کے بعد میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔

''اگر تمہاری زبان نہیں کھل رہی تو اپنی بپتا کو کاغذ پر رقم کر دو۔ میں کل کسی وقت تم سے ملاقات کرنے جیل آؤں گا۔ تم یہ کاغذات مجھے دے دینا۔ سمجھ رہے ہو نا، میں کیا کہہ رہا ہوں؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

اسی لمحے کانسٹیبل کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''وکیل صاحب! دس منٹ پورے ہو گئے..... کیا یہیں پر کھڑے کھڑے اپنے مؤکل کو نچوڑ ڈالیں گے؟ کچھ کام عدالت کے لیے بھی باقی رہنے دیں۔''

میں نے کانسٹیبل کے چبھتے ہوئے جملوں پر کوئی بھی اچھا یا برا ردعمل ظاہر کرنے کے بجائے سرسری انداز میں کہا۔

''کمال ہے..... دس منٹ تو ایسے گزر گئے ہیں جیسے دس سیکنڈ ہوں..... اسی کو کہتے ہیں، وقت پر لگا کر اڑ گیا.....!''

میں دلاور کو تسلی دلاسا دے کر پارکنگ لاٹ کی جانب بڑھا تو کینٹین کے نزدیک اشفاق علی سے سامنا ہو گیا۔ اس نے بڑے معنی خیز انداز میں مجھے سلام کیا تو میں نے اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد متذبذب انداز میں کہا۔

''میں نے آپ کو پہلے کہیں دیکھا ہے.....!''

''میں نے بھی تھوڑی دیر پہلے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''شاید آپ میرے کلائنٹ کو بہلانے پھسلانے کی کوشش میں مصروف تھے لیکن پریشانی

والی کوئی بات نہیں۔ آپ چاہیں تو آیندہ بھی یہ کوشش جاری رکھ سکتے ہیں۔''

میں سمجھ گیا کہ اشفاق علی نے مجھے دلاور سے بات کرتے دیکھ لیا تھا۔ میں نے بے حد سنجیدہ لہجے میں دریافت کیا۔

''اشفاق صاحب! مجھ پر اس مہربانی کی کوئی خاص وجہ؟''

''اوہ..... دلاور نے آپ کو میرا نام بھی بتا دیا ہے۔''

''دلاور سے تو آج میں پہلی مرتبہ ملا ہوں۔'' میں نے اس کی غلط فہمی دور کرنے کی غرض سے کہا۔ ''لیکن آپ کو میں پہلے سے جانتا ہوں۔ آپ نے ابھی تازہ تازہ وکالت کا امتحان پاس کیا ہے اور پچھلے کچھ عرصے سے آپ ارشد وارثی کی فرم میں کام کر رہے ہیں لیکن مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ وارثی صاحب نے اتنا خطرناک کیس ایک جونیئر وکیل کے سپرد کیسے کر دیا؟''

''آپ تو میرے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔'' وہ حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ ''کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟''

''مرزا امجد بیگ۔'' میں نے جواب دیا۔

''اوہ..... آپ تو خاصے مشہور وکیل ہیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''تو کیا میں یہ سمجھ لوں کہ دلاور نے اپنا کیس آپ کو دینے کا فیصلہ کر لیا ہے؟''

''آپ کو فوری طور پر ایسا سمجھنے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میں دلاور کا کیس لڑوں گا یا نہیں، یہ فیصلہ دلاور نے نہیں بلکہ میں نے کرنا ہے اور اس فیصلے سے آگاہی کے لیے آپ کو کل شام تک انتظار کرنا پڑے گا.....''

''اچھا.....!'' اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ''کل شام میں ایسا کیا ہونے والا ہے؟''

''جب ہوگا تو آپ کو پتا چل جائے گا۔'' میں نے مبہم انداز میں کہا۔

''سچ پوچھیں تو میں خود اس کیس سے بیزار ہو چکا ہوں۔'' وہ اکتاہٹ بھرے انداز میں بولا۔ ''ایک تو وکیل صفائی کے لیے اس کیس میں کوئی بھی مارجن نہیں ہے۔ پولیس نے دفعہ تھری زیرو سیون اور تھری سیون سکس کے تحت ملزم کے خلاف بڑا تگڑا چالان تیار کر رکھا ہے اور اس کے مقابل ملزم کی بیوی اور بیٹی بڑے مضبوط قدموں سے کھڑی ہیں اور دوسرے.....'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''دوسرے ملزم کی جیب بالکل خالی ہے۔ اس نے ابتدا میں مجھے تھوڑے سے پیسے دیے تھے۔ اس کے بعد بس، وعدوں پر ٹرخا رہا ہے۔ آپ جانتے ہیں، انسان کو روزانہ بھوک لگتی ہے اور اس کا پیٹ ہر روز کم از کم دو وقت کا کھانا مانگتا ہے۔ دلاور نے شروع میں مجھے جو رقم دی تھی وہ تو محض کیس پکڑنے کی تھی۔ اس کے بعد سے اب تک کے معاملات وعدۂ فردا پر ہی چل رہے ہیں۔ میں بھی یہ سوچ کر اس کیس کے ساتھ چپکا ہوا ہوں کہ چلو..... تھوڑی پریکٹس ہی ہو رہی ہے!''

''آپ کے سوچنے کا انداز بہت افسوس ناک اور منفی ہے اشفاق صاحب۔'' میں نے تلخی بھرے لہجے میں کہا۔ ''اگر آپ نے اپنی روش نہ بدلی تو وکالت کے پیشے میں اوپر جانے کے بجائے نیچے کی جانب سفر کریں گے۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں۔'' وہ سٹپٹائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آخر آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟''

''آپ نے دلاور کے کیس کو کچھ زیادہ ہی مضبوطی کے ساتھ پکڑ رکھا ہے کہ یہ بے چارہ ہل کر نہیں دے رہا۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''سات ماہ پہلے یہ کیس جہاں پر کھڑا تھا، آج بھی ادھر ہی دکھائی دیتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ بڑی افسوس ناک وکالت کر رہے ہیں اور جہاں تک آپ کی منفی سوچ کا معاملہ ہے تو.....'' میں نے تھوڑی دیر رک کر اپنی سانس کو ہموار کیا پھر اس کے کانوں کے کیڑے جھاڑنے کی غرض سے کہا۔

''جب انسان نیا نیا ڈرائیونگ سیکھنا شروع کرتا ہے تو کوئی سیکنڈ ہینڈ مینوئل گاڑی اس کے حوالے کی جاتی ہے تاکہ وہ کم سے کم نقصان کر کے اپنا مقصد حاصل کر سکے۔ یہ کہیں دیکھنے اور سننے میں نہیں آیا کہ کوئی چمچماتی زیرو میٹر آٹومیٹک گاڑی کسی نو آموز کو دے کر کہا جائے کہ جاؤ بچہ..... ڈرائیونگ پر اپنا ہاتھ صاف کرو۔ آپ جس کیس کے ساتھ چپک کر اپنی پریکٹس کو آگے بڑھانے اور چمکانے کی کوشش کر رہے ہیں، اس کا معاملہ بھی ایک نیو برانڈ لگژری آٹو کار کے مانند ہے۔ ایسی گاڑی پر اپنی وکالت کا ہاتھ صاف کرنے کے دوران میں، قدم قدم پر آپ حادثات کا شکار ہی ہوں گے.....!''

بلاشبہ، میری یہ باتیں اشفاق علی کو پسند نہیں آئی ہوں گی۔ وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''امجد صاحب! میں تو ایک جونیئر وکیل ہوں۔ ابھی تو میں نے کوچۂ وکالت میں اپنی جدوجہد کا آغاز کیا ہے۔ آپ بڑے شوق سے اس

لگژری آٹومیٹک گاڑی کو ڈرائیو کریں۔ مجھے بھی کوئی سیکنڈ یا تھرڈ ہینڈ مینوئل گاڑی مل ہی جائے گی۔''

اس کے انداز میں گہرا طنز چھپا ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اس نے میرے تبصرے کا برا منایا تھا، اگرچہ اس کی دل آزاری میرا مقصود نہیں تھا۔ میں نے رسانیت بھرے انداز میں کہا۔

''اشفاق صاحب! میں نے جو کچھ بھی کہا وہ آپ کے بھلے کے لیے کہا ہے لیکن لگتا ہے، آپ مائنڈ کر گئے ہیں۔''

''ایسی کوئی بات نہیں جناب۔'' وہ چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔ ''آپ کا بہت بہت شکریہ۔ میں آپ کی نصیحت پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔''

بات ختم کرتے ہی وہ جانے کے لیے مڑا تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وارثی صاحب کو میرا اسلام کہہ دیجیے گا۔''

''جی اچھا!'' اس نے میری طرف دیکھے بغیر بیزاری سے کہا پھر لمبے ڈگ بھرتے ہوئے وہ وہاں سے رخصت ہو گیا۔

میں اپنی کار کی جانب بڑھ گیا۔

اگلے روز دوپہر کے وقت اتفاق سے میں فری تھا لہٰذا میں نے دلاور سے ملاقات کے لیے جیل کا رخ کیا۔ کوئی ملزم پی سی (پولیس کسٹڈی) میں ہو یا جے سی (جیوڈیشل کسٹڈی) میں، اس سے ملاقات کے طریقہ کار کو میں کئی بار بیان کر چکا ہوں لہٰذا آپ کے قیمتی وقت کا احساس کرتے ہوئے میں اصل معاملے کی طرف آتا ہوں۔

گزشتہ روز میں نے عدالت کے احاطے میں دلاور کے لباس میں کاغذ اور قلم چھپا دیا تھا جس کا اس نے بھرپور استعمال کرتے ہوئے اپنی داستان الم رقم کر ڈالی تھی۔ میری یہ ترکیب خاصی کارگر رہی تھی۔ میں نے کانسٹیبل کی نظر بچا کر دلاور کو کاغذ اور قلم سے اس لیے لیس کر دیا تھا کیونکہ میں جان چکا تھا کہ جیل میں اس کی حیثیت کسی قطار شمار میں نہیں تھی۔ اسے کاغذ اور قلم کے حصول کے لیے جانے کتنے پاپڑ بیلنا پڑتے، ورنہ صاحب ثروت اور بااثر افراد کو جیل کے اندر ہر نوعیت کی سہولت مہیا ہو جاتی ہے۔ میں یہ کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا کہ ہمارے ملک میں ''پیسا پھینک، تماشا دیکھ'' ہر دور میں بڑا زوداثر تعویذ ثابت ہوا ہے۔

اس روز میں نے دلاور سے محض رسمی علیک سلیک کی، اس کے تحریر کردہ تہ شدہ کاغذات کو اپنی پتلون کی جیب میں منتقل کیا اور وہاں سے واپس چلا آیا۔

آفس جانے سے پہلے میں نے دلاور کی خودنوشت کو تین چار مرتبہ آغاز سے انجام تک بڑی توجہ سے پڑھ ڈالا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ دلاور کے ساتھ بڑی شدید نوعیت کی زیادتی کی جا رہی تھی۔ اس کی تحریر سے مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ وہ ایک بیدار مغز اور طریقے سلیقے کا انسان تھا۔ اس نے اپنی زندگی کی کہانی بیان کرتے ہوئے بڑے اختصار کے ساتھ کام لیا تھا مگر وہ تمام اہم نکات اس میں شامل کر دیے تھے جو اس کی مظلومیت اور بے گناہی پر دلالت کرتے تھے۔ اسے عدالت سے باعزت بری کرانے کے لیے مجھے جو انتھک محنت کرنا تھی اس میں ایک بہت بڑا حصہ فیلڈ ورک کا تھا جس کا نیٹ ورک حیدرآباد سے کراچی تک پھیلا ہوا تھا۔ میرے لیے واقعتاً یہ ایک چیلنج کیس تھا اور..... میں نے اس چیلنج کو قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اسی روز شام میں عبیداللہ مجھ سے ملنے آیا۔ آج نازش اس کے ساتھ نہیں تھی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اس کے لیے چائے منگوائی۔ وہ اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بولا۔

''وکیل صاحب! آپ کے چہرے سے جھلکتا اطمینان بتا رہا ہے کہ آپ نے دلاور کے کیس کے حق میں فیصلہ کر لیا ہے؟''

''آپ کا اندازہ درست ہے عبید صاحب!'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ''اگلی پیشی میں ابھی کافی دن باقی ہیں۔ اس دوران میں کسی وقت میں جیل جا کر مختلف نوعیت کے ضروری کاغذات پر دلاور کے دستخط بھی لے لوں گا۔''

میں نے عبیداللہ کو دلاور کے تحریر کردہ جارنل اسکیپ پیپرز کے بارے میں کچھ نہیں بتایا کیونکہ اس گفتگو میں بعض ایسے معاملات کا ذکر تھا جو دلاور کے لیے ایک راز کی حیثیت رکھتے تھے اور میں اپنے مؤکل کے ہر راز کا ہمیشہ امانت دار رہا ہوں۔ میں نے دلاور کو بھی ہدایت کر دی تھی کہ وہ اپنی آپ بیتی کا کسی سے ذکر نہ کرے اور سب کو یہی تاثر دے کہ ہمارے بیچ تمام معاملات زبانی کلامی طے ہوئے ہیں۔ وہ خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کی زندگی کے انتہائی نازک اور حساس پہلو عدالتی کارروائی کے علاوہ ادھر ادھر کہیں زیر بحث لائے جائیں۔ عدالت میں ان پوائنٹس کو اجاگر کرنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ دلاور کی بے گناہی کو ثابت

کرنے میں ان کا کلیدی کردار تھا۔

''وکیل صاحب! آپ کے فیصلے سے مجھے دلی خوشی حاصل ہوئی ہے۔'' وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔ ''اب میں مطمئن ہوں کہ دلاور کو اس وبال سے بہت جلد نجات مل جائے گی۔''

''انشاءاللہ!'' میں نے تہ دل سے کہا۔ ''لیکن اس کامیابی کو حاصل کرنے کے لیے مجھے آپ کے بھرپور تعاون کی ضرورت ہوگی کیونکہ اس کیس کا تنا اور شاخیں اگر کراچی میں ہیں تو جڑیں کراچی سے حیدرآباد تک پھیلی ہوئی ہیں۔ تہمت کے اس قدآور درخت کو زمیں بوس کرنے کے لیے اس کی جڑوں کی کھدائی بہت ضروری ہے۔''

''میں آپ کی ہر طرح کی خدمت اور معاونت کے لیے تیار ہوں۔'' وہ چٹانی لہجے میں بولا۔ ''آپ کسی بھی مرحلے پر مجھے نڈھال یا کمزور نہیں پائیں گے۔''

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔'' میں نے پُروثوق انداز میں کہا۔ ''انشاءاللہ..... فتح ہماری ہی ہوگی۔''

عبیداللہ تھوڑی دیر مزید میرے پاس رکا پھر میری فیس اور دیگر اخراجات کی مد میں کچھ رقم مجھے ایڈوانس میں دے کر دفتر سے رخصت ہوگیا۔

دلاور کے تحریر کردہ ان صفحات سے میں نے اس کے معاملات کے بارے میں جو بھی جان کاری حاصل کی اس کے بارے میں سردست میں آپ کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ یہ معلومات بڑی خطرناک اور سنگین نوعیت کی ہیں۔ عدالتی کارروائی کے دوران میں مختلف مقامات پر ایک سے بڑھ کر ایک سنسنی خیز انکشاف آپ کی راہ دیکھ رہا ہے۔ میری یہ ساری محنت دلاور کی فراہم کردہ ٹھوس معلومات اور عبیداللہ کے پُرخلوص تعاون کی رہینِ منت ہے.....!

☆☆☆

آئندہ پیشی پر میں نے اپنا وکالت نامہ عدالت میں داخل کردیا۔ اس دوران میں، میرا ایک چکر حیدرآباد کا بھی لگا تھا جو خاصا سودمند رہا تھا۔ علاوہ ازیں میں نے جیل جاکر دلاور سے دوبار ملاقات بھی کی تھی اور ضروری کاغذات پر اس کے دستخط لے لیے تھے۔ اس کے رویے میں سرمو فرق نہیں آیا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ جو تعمیری اور مبنی بر مصلحت دروغ گوئی کی تھی اس کے نتیجے میں دلاور نے مجھے اپنا وکیل تو تسلیم کرلیا تھا لیکن اس کے انداز واطوار سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ میرے ہونے یا نہ ہونے کی اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ اپنے معاملات کو ''سپردِ خدا'' کرکے مطمئن ہوبیٹھا تھا اور اس کا اطمینان قابلِ رشک تھا۔ اگر اپنے معبود پر ایسا غیر متزلزل بھروسا ہو تو پھر قدرت انسان کی مدد کے لیے سرگرم عمل ہوجاتی ہے۔

عدالت کی کارروائی کا آغاز ہوا تو جج نے میرے دائر کردہ وکالت نامے کو دیکھنے کے بعد مجھ سے استفسار کیا۔

''تو اب آپ اس کس کو دیکھیں گے.....!''

جج کے اس سوال میں حیرت آمیز بے یقینی پائی جاتی تھی۔ اگرچہ اس استفسار کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی۔ جب میرا وکالت نامہ، ملزم کے دستخط کے ساتھ اس کے سامنے میز پر رکھا تھا اور میں بہ نفسِ نفیس مقدمے کی پیروی کے لیے کمرائے عدالت میں موجود تھا تو پھر صورتِ حال بڑی واضح اور حتمی تھی۔ بہرحال میں جج کی سوچ کو سمجھ سکتا تھا لہٰذا میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''یس، یور آنر!''

اگرچہ اس کیس کو عدالت میں لگے ہوئے کم وبیش سات ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن اشفاق علی کی وکالت میں ابھی تک کوئی قابلِ ذکر کارروائی عمل میں نہیں آسکی تھی۔ میری انٹری کے بعد گویا اس کیس میں جان سی پڑ گئی تھی۔

''ہوں.....'' میرے جواب پر جج نے پُرمعنی انداز میں گردن ہلائی اور عدالت کی کارروائی کا باقاعدہ آغاز ہوگیا۔ استغاثہ کی جانب سے آٹھ گواہوں کی فہرست عدالت میں دائر کی گئی تھی لیکن میں یہاں پر صرف انہی گواہوں کا تذکرہ کروں گا جن کے بیان میں کوئی خاص بات موجود ہوگی۔

سب سے پہلے جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم دلاور نے زخمی لہجے میں صحتِ جرم سے انکار کرتے ہوئے جواب دیا۔

''مجھ پر جو الزامات ہیں، میں نے ویسا کچھ نہیں کیا۔ میں گناہ گار نہیں ہوں۔''

دلاور کے اس چند لفظی جواب میں زمانے بھر کا کرب اور اذیت رچی بسی تھی۔ اس مختصر اظہارِ خیال کے بعد اس نے خاموشی سے گردن جھکالی تھی۔

اس کے بعد ملزم کا بیان ریکارڈ کیا گیا۔ دلاور نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد عدالت کی تاریخ کا نہایت ہی مختصر بیان ریکارڈ کروادیا۔ اس نے گردن اٹھا کر جج کی طرف دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''سر! میں گناہ گار نہیں ہوں۔''

دلاور اس وقت اکیوزڈ باکس کی چوبی ریلنگ کو

تھامے کھڑا تھا۔ جج کو جواب دینے کے بعد اس نے ایک بار پھر گردن جھکالی۔ وکیل استغاثہ نے ملزم پر کڑی اور زہریلی جرح کی۔ ملزم نے بڑے تحمل اور حوصلے سے وکیلِ سرکار کی جرح کا سامنا کیا۔ اس کے کسی بھی انداز سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ پریشانی میں گھرا ہوا ہے۔ ایسا خود اعتمادی مؤکل میں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وکیل استغاثہ نے اپنی جرح موقوف کردی۔

استغاثہ کی جانب سے ملزم کی سب سے چھوٹی بیٹی فوزیہ کو وٹنس باکس میں لایا گیا۔ اس کیس کے چالان کے مطابق فوزیہ ملزم کی زیادتی کا شکار ہوئی تھی اور یہ ملزم کوئی اور نہیں بلکہ فوزیہ کا سگا باپ تھا۔

فوزیہ کی عمر بائیس تیئس سال رہی ہوگی۔ وہ بھرے بدن کی مالک ایک دراز قامت لڑکی تھی۔ اس کی رنگت گندمی اور خال وخط جاذبِ نظر اور دلکش تھے۔ وہ جس نوعیت کے کیس میں، عدالت میں لائی گئی تھی اس کا تو تصور کر کے ہی کوئی لڑکی شرم سے زمین میں گڑ سکتی تھی مگر فوزیہ کے چہرے اور آنکھوں میں مجھے کسی قسم کی شرمندگی یا ندامت دکھائی نہیں دی۔ گویا وہ بھری عدالت میں، اپنے باپ کو فضیل ورسوا کرنے کے ارادے سے وہاں پہنچی تھی اور خم ٹھونک کر بڑی دیدہ دلیری سے وٹنس باکس میں کھڑی تھی۔

جب اس کا حلفیہ بیان ریکارڈ ہو چکا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے وٹنس باکس کے نزدیک پہنچ گیا۔ بیان کے ذیل میں فوزیہ نے جو کچھ بھی کہا، اسے من وعن احاطہ تحریر میں نہیں لایا جاسکتا کیونکہ بنیادی اخلاقیات اس کی اجازت نہیں دیتی۔ عدالت کا معاملہ دیگر ہے کہ وہاں جرح کے دوران میں ہر نوعیت کا سوال پوچھا جاسکتا ہے جس کا جواب دینا بھی لازمی ہوتا ہے۔ میں یہاں پر فوزیہ کی زبان سے ادا ہونے والا صرف ایک جملہ رقم کر رہا ہوں۔ آپ اس جملے کی حدت اور شدت سے خود ہی اندازہ قائم کرلیں کہ اس کا حلفیہ بیان کتنا شرم ناک اور فتنہ انگیز ہوگا۔ اس نے اکیوزڈ باکس میں، گردن جھکا کر کھڑے دلاور کی جانب انگلی اٹھا کر نفرت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

''اگر باپ ایسے ہوتے ہیں تو میری دعا ہے کہ کوئی عورت کسی لڑکی کو جنم نہ دے.....!''

وکیل استغاثہ نے اس روز فوزیہ پر جو جرح کی، میں اس کا مفصل احوال یہاں درج کرنے سے بھی معذرت چاہوں گا۔ بس اتنا سمجھ لیں کہ وکیل استغاثہ اور فوزیہ نے مل کر باپ اور بیٹی کے مقدس رشتے کی دھجیاں اڑا دی تھیں۔

مجرمانہ حملے اور زیادتی کے کیسز میں سب سے خطرناک جرح ڈیفنس کی طرف سے ہوتی ہے۔ وکیل صفائی ملزم کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے ایسے ایسے سوالات کرتا ہے کہ جواب دینے سے پہلے پتھر کو بھی شرم سے پسینا آجائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نوعیت کے پچانوے فیصد کیسز رجسٹر ہی نہیں ہوتے۔

وکیل استغاثہ مظلومہ فوزیہ پر اپنی جرح مکمل کر چکا تو میری جانب دیکھتے ہوئے کندھے اچکا کر بڑی ادا سے بولا۔

''یور وٹنس.....!''

اگر چالان کے مطابق زیادتی کا شکار کوئی غیر متعلق خاتون ہوتی تو یقیناً میں اپنے مؤکل کی بے گناہی کو عدالت کے سامنے لانے کے لیے اس خاتون پر بڑی خوف ناک جرح کرتا مگر یہاں تو معاملہ ریشم کے دھاگے سے بھی زیادہ نازک اور حساس تھا ایک بیٹی اپنے سگے باپ کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی تھی۔ بیٹی کو اپنی عزت کا پاس نہیں رہا تھا لیکن مجھے ایک باپ کی مجبوری کا احساس تھا لہٰذا میں نے خود پر ضبط کرتے ہوئے نہایت ہی معتدل انداز میں کہا۔

''فوزیہ صاحبہ! آپ نے بھری عدالت میں باپ اور بیٹی کے پاکیزہ رشتے کو جتنی بے شرمی، ڈھٹائی اور سینہ زوری سے پامال کیا ہے اس کی مثال ڈھونڈے سے نہیں ملے گی۔ بہت جلدی..... آپ کو اپنی اس نازیبا حرکت پر بری طرح پچھتانا پڑے گا۔''

''اگر سچ بولنا آپ کی نظر میں کوئی گھناؤنا جرم ہے وکیل صاحب تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ آپ کو میرے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خفگی آمیز انداز میں بولی۔

''میں اپنا اچھا برا خوب جانتی ہوں۔''

میں نے اکیوزڈ باکس میں گردن جھکا کر گم صم کھڑے دلاور کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''ملزم آپ کا کیا لگتا ہے؟''

''یہ کیسا سوال ہے؟'' وہ برہمی سے بولی۔

''اگر اردو آپ کی سمجھ میں نہیں آئی تو میں اپنے سوال کو انگریزی میں دہرا دیتا ہوں۔'' میں نے اسے ناپسندیدہ نظر سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''مگر سوال اپنی جگہ پر قائم رہے گا اور آپ اس سوال کا جواب دینے کی بھی پابند ہیں۔''

اب کی بار اس نے مجھے سینگ مارنے کی کوشش نہیں کی اور بڑی بے دردی سے اپنے بالائی ہونٹ کا کباڑا کرتے ہوئے نفرت آمیز لہجے میں بولی۔

''یہ شخص بدقسمتی سے میرا باپ ہے اور اس کی بیٹی کہلانے کا مجھے سخت افسوس ہے.....!''

کوئی بیٹی اپنے باپ کے مقابل کھڑے ہو کر اس قسم کا سفاک اظہارِ خیال کرے تو اس باپ کے دل پر گزرنے والی قیامت کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں رہتا۔ فوزیہ کے جواب پر دلاور کے بدن میں زلزلے کے آثار پیدا ہوئے۔ میں نے اس کے پورے وجود کو لرزتے ہوئے دیکھا۔ وہ کٹہرے کی چوبی ریلنگ کو مضبوطی سے تھامے صبر وضبط کی کڑی منزلوں سے گزرتا رہا مگر اس نے ایک بار بھی گردن اٹھا کر قہر بار نگاہ سے اپنی بیٹی کی طرف نہیں دیکھا۔ دلاور کی برداشت قابلِ دید اور قابلِ داد تھی۔

''فوزیہ صاحبہ! میں آپ پر اس نوعیت کی کوئی جرح نہیں کروں گا جس کے جواب میں آپ کو بے حیائی کا عالمی ریکارڈ قائم کرنے کا کوئی موقع مل سکے، اگرچہ اس سلسلے میں آپ کے وکیل نے آپ کی اچھی خاصی ٹریننگ کر رکھی ہوگی.....'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا پھر پوچھا۔ ''آپ کے کتنے بھائی ہیں؟''

''ایک بھی نہیں.....'' وہ رکھائی سے بولی۔

''آپ کل کتنی بہنیں ہیں؟'' میں نے اگلا سوال کیا۔

''ہم تین بہنیں تھیں۔ میں، سحرش اور شبانہ۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن اب صرف دو ہی ہیں۔''

میں نے اپنی معلومات کی روشنی میں کہا۔ ''یعنی ایک آپ اور دوسری سحرش؟''

''آپ کا اندازہ درست ہے۔'' اس نے کہا۔

''اور شبانہ.....؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''چھ سال پہلے شبانہ کا انتقال ہو گیا تھا۔'' اس نے بتایا۔

''اس ''انتقال'' سے آپ کی مراد ''موت'' ہے یا شبانہ کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کے لیے آپ یہ لفظ استعمال کر رہی ہیں؟'' میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

''آپ جو بھی سمجھ لیں۔'' وہ اکتاہٹ آمیز انداز میں بولی۔

''میرے سمجھنے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا فوزیہ بی بی۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ واضح الفاظ میں

میرے سوال کا جواب دیں۔"

"آبجیکشن یور آنر!" وکیل استغاثہ نے بہ آواز بلند کہا۔ "میرے فاضل دوست اپنے اوٹ پٹانگ سوالات سے خوامخواہ مظلومہ فوزیہ کو ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میری مؤکل نے دوٹوک انداز میں بتایا ہے کہ اس کی سب سے بڑی بہن شبانہ چھ سال پہلے انتقال کر گئی تھیں۔ اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ چھ سال قبل شبانہ کی موت واقع ہو گئی تھی....."

"بہت خوب.....!" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "میرے فاضل دوست! آپ تو شبانہ کی رحلت کو اتنے وثوق سے بیان فرما رہے ہیں جیسے آپ نے اس کی نمازِ جنازہ میں شرکت کی ہو.....؟"

"کیا عجیب بلکہ فضول بات کر رہے ہیں آپ....." وہ تلملا کر بولا۔ "انتقال" ایک سہل سا لفظ ہے۔ جب یہ لفظ کسی انسان کے معاملے میں استعمال ہوتا ہے تو اس کا ایک ہی مطلب ہوتا ہے یعنی..... اس انسان کی موت!"

"اتنی پُرمعنی اور حتمی معلومات فراہم کرنے پر میں تہِ دل سے آپ کا شکر گزار ہوں میرے فاضل دوست!" میں نے وکیل استغاثہ کے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ کی اجازت ہو تو میں بہ زبانِ مظلومہ آپ کے ان فلسفیانہ خیالات کی تصدیق کر لوں.....؟"

میں نے سوالیہ انداز میں اپنی بات مکمل کی تھی اور میرے آخری الفاظ نے وکیلِ سرکار کی طبیعت مکدر کر دی تھی۔ میرے سوال کا سیدھا سادہ جواب دینے کے بجائے وہ خاموش مگر معاندانہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں اسے نظر انداز کر کے مظلومہ فوزیہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"فوزیہ صاحبہ! کیا آپ کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ "چھ سال پہلے شبانہ کا انتقال ہو گیا تھا" کا یہی مطلب ہے کہ آپ کی سب سے بڑی بہن شبانہ آج سے چھ سال قبل یعنی 1974ء میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملی تھیں۔ مطلب وہ فوت ہو گئی تھیں؟"

"جی بالکل۔ میرا یہی مطلب ہے۔" وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

"جب کوئی مسلمان مرد یا عورت وفات پا جاتا ہے تو اس کی تکفین و تجہیز کی جاتی ہے۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ "اس کی نمازِ جنازہ کے بعد تدفین کا عمل مکمل کیا جاتا ہے..... کیا آپ کی بڑی بہن مرحومہ شبانہ کے ساتھ بھی یہ سب کیا گیا تھا؟"

"الحمدللہ..... ہم مسلمان ہیں۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔ "جی بالکل..... شبانہ کی باقاعدہ تدفین کی گئی تھی۔"

"میری معلومات کے مطابق شبانہ آپ کی سب سے بڑی بہن تھی اور بہنوں میں آپ سب سے چھوٹی ہیں۔" میں نے اسے الجھانے کی غرض سے کہا۔ "آپ اس وقت کم و بیش تیئیس سال کی ہیں۔ سحرش آپ سے دو سال بڑی یعنی پچیس سال کی ہے اور آپ کے بیان کے مطابق شبانہ چھ سال پہلے اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں یعنی ان کا انتقال اکیس سال کی عمر میں ہوا۔ اگر وہ آج زندہ ہوتیں تو اس وقت ان کی عمر ستائیس سال ہونا تھی۔ ایم آئی رائٹ؟"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "لگتا ہے، آپ نے ہماری فیملی کے حوالے سے اچھی خاصی ریسرچ کر رکھی ہے....."

"کرنا پڑتی ہے..... یہ سب میرے پیشے کا تقاضائے اول ہے فوزیہ صاحبہ!" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ "اس کے بغیر کام نہیں چلتا۔ اگر میں اتنی باریک بینی سے اپنا ہوم ورک نہ کروں تو آپ جیسے چالاک لوگ تو میری وکالت کی دکان داری ہی ٹھپ کرا دیں۔"

میں غیر محسوس انداز میں اسے گھیرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے ذہنی طور پر الجھا کر میں اس کی زبان سے بہت ہی اہم باتیں اگلوانا چاہتا تھا۔ وہ عام سے لہجے میں بولی۔

"میں تو بالکل بھی چالاک نہیں ہوں۔"

"جی جی..... بالکل....." میں نے طنزیہ انداز میں سر کو تائیدی جنبش دی اور پوچھا۔ "کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گی کہ شبانہ کو کراچی کے کس قبرستان میں دفن کیا گیا تھا؟"

"وہ کراچی میں نہیں....." وہ اضطراری لہجے میں بولی۔ "بلکہ..... حیدرآباد میں دفن ہے....."

فوزیہ نے جیسے تیسے میرے سوال کا جواب تو دے دیا تھا لیکن وہ یکایک حد درجہ پریشان دکھائی دینے لگی تھی۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور تیز لہجے میں دریافت کیا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ شبانہ کا انتقال حیدرآباد میں ہوا تھا اور حیدرآباد کے ہی قبرستان میں اسے دفن کر دیا گیا تھا..... ہیں نا؟"

اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "جی ہاں!"

فوزیہ نے میرے بچھائے ہوئے جال میں قدم رکھنے کے بعد دانہ چگنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے بہ آہستگی اس نادیدہ ہم رنگِ زمین جال کو سمیٹنے کے عمل کا آغاز کر دیا۔

''فوزیہ صاحبہ!'' میں نے اپنے سوالات میں تیزی لاتے ہوئے استفسار کیا۔ ''میری مصدقہ معلومات کے مطابق آپ لوگ آج سے سات سال پہلے مئی 1973ء میں حیدرآباد کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ کر کراچی شفٹ ہو گئے تھے۔ آپ نے بتایا ہے کہ شبانہ کا انتقال چھ سال قبل 1974ء میں ہوا تھا۔ آپ نے سال بتایا۔ میں اس میں اگست کا مہینا بھی شامل کر دیتا ہوں۔ اس حساب کی روشنی میں آپ لوگوں کے کراچی میں رہائش اختیار کرنے کے ایک سال تین ماہ بعد شبانہ کا انتقال ہوا تھا لیکن چند لمحے پہلے آپ نے معزز عدالت کو جو کچھ بتایا ہے وہ اس حساب سے لگا نہیں کھاتا۔ اب یا تو میرا حساب غلط ہے اور یا پھر آپ نے صریحاً جھوٹ بولا ہے.....؟''

فوزیہ میرے سوالات کے چنگل میں بری طرح پھنس چکی تھی۔ اس نے گھبرا کر امداد طلب نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔ اس موقع پر وکیل مخالف نے بڑی مستعدی دکھائی اور نعرۂ مستانہ بلند کرتے ہوئے وہ میدانِ تحفظِ مؤکل میں اتر آیا۔

''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!'' اس نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے برہمی سے کہا۔ ''میری مؤکل کرب اور اذیت کی انتہا سے گزرنے کے بعد انصاف کی طلب میں اس عدالت تک پہنچی ہے اور وکیلِ صفائی نے الٹا اسی دکھیاری کا ٹرائل شروع کر دیا ہے۔ مظلومہ فوزیہ کی بڑی بہن کب فوت ہوئی تھی اور اس کی تدفین کراچی میں ہوئی یا حیدرآباد میں، ان تمام معاملات کا زیرِ سماعت کیس سے کیا تعلق بنتا ہے۔ میرے فاضل دوست خوامخواہ گڑے مُردے اکھاڑ کر اس کیس کو کسی اور ہی سمت میں لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''پچھلے سات ماہ سے زیرِ سماعت یہ کیس ابھی تک ایک ہی سمت میں، ایک ہی کروٹ لیٹا ہوا تھا اور آج سے اس نے چلنا شروع کیا ہے۔'' میں نے وکیل استغاثہ کے اعتراض کے جواب میں کہا۔ ''آپ اس کی سمت کے لیے پریشان نہ ہوں میرے دوست اور جہاں تک گڑے مردے اکھاڑنے کی بات ہے تو.....'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اس کھدائی میں سے میں آپ کو حقائق کے وہ لعل وجواہر نکال کر دکھاؤں گا کہ آپ کی آنکھیں خیرہ اور عقل دنگ رہ جائے گی۔''

''آخر آپ اس سے ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں؟'' اس نے اکھڑے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''بس یہی کہ.....'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ کی یہ مظلوم مؤکل.....'' میں نے وٹنس باکس میں کھڑی فوزیہ کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے واشگاف الفاظ میں کہا۔ ''ناخلف، نافرمان اور بے حس ہونے کے ساتھ ہی دروغ گو درجۂ اول بھی ہے۔''

''آپ میری مؤکل کی انسلٹ کر رہے ہیں۔'' وہ زہرخند لہجے میں بولا۔ پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے فدویانہ انداز میں اضافہ کیا۔ ''یور آنر! میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ڈیفنس ہاتھ دھو کر میری مؤکل کے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے۔ شاید وکیل صفائی کو اندازہ ہو گیا ہے کہ اس کیس میں ان کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ اپنے مؤکل کو کسی بھی صورت میں بچا نہیں سکتے چنانچہ وہ ٹائم پاس کے طور پر زیرِ سماعت کیس سے توجہ ہٹانے کے لیے اس قسم کے حربے استعمال کر رہے ہیں۔''

''بیگ صاحب!'' جج نے براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''کیا آپ فوزیہ کی دروغ گوئی کو ثابت کر سکتے ہیں؟''

''ایک سو ایک فیصد جناب عالی!'' میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''وکیل استغاثہ کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ میں اپنا ٹائم پاس کرنے کے بجائے استغاثہ کی سازش کو فیل کرنے کی تگ ودو میں مصروف ہوں۔ آج اس کیس کے ساتھ میرا پہلا دن ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس کیس کے آخری دن میں اپنے مؤکل کو باعزت بری کرانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ باقی جہاں تک مظلومہ کی دروغ گوئی کو ثابت کرنے کا معاملہ ہے تو.....'' میں سانس ہموار کرنے کی غرض سے تھما پھر جج کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''میرا مؤکل اور اس کیس میں نامزد ملزم دلاور مئی 1973ء میں اپنی فیملی کو لے کر حیدرآباد سے کراچی آ گیا تھا۔ اس کے بعد ملزم اور اس کی فیملی کے کسی فرد کا حیدرآباد جانا نہیں ہوا۔ اب مظلومہ فوزیہ نے بتایا ہے کہ اس کی بڑی بہن شبانہ کو چھ سال پہلے اگست 1974ء میں سیدرآباد کے

کسی قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا تھا۔ یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شبانہ کا انتقال تو کراچی میں ہوا پھر اسے حیدرآباد کے قبرستان میں کیوں دفن کیا گیا؟ اور اس پراسرار سوال کا جواب صرف اور صرف فوزیہ ہی دے سکتی ہے مگر میرے قابل فاضل دوست کو اعتراضات جڑنے ہی سے فرصت نہیں.....!''

جج نے فوزیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بی بی! آپ وکیل صفائی کے سوال کا جواب دینے کی پابند ہیں۔''

''سر! ان وکیل صاحب نے مجھے اتنا زیادہ پریشان کر دیا ہے کہ غلطی سے میرے منہ سے حیدرآباد نکل گیا.....'' وہ میری جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''میں اپنی اس غلطی پر شرمندہ ہوں۔''

میں دل ہی دل میں فوزیہ کی عیاری پر اش اش کر اٹھا۔ اس نے بڑی مہارت کے ساتھ اپنا بیان بدل دیا تھا اور اس کا سارا الزام بھی مجھ ہی پر تھوپنے کی کوشش کی تھی۔

جج نے ایک لمحے کے لیے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور خاصے سخت لہجے میں استفسار کیا۔ ''بی بی! کیا آپ یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ تمہاری بڑی بہن شبانہ کراچی کے قبرستان میں دفن ہے؟''

''جی جی.....'' وہ بڑی سرعت سے سر کو اثبات میں حرکت دیتے ہوئے بولی۔ ''میرے ذہن میں یہی تھا مگر بوکھلاہٹ میں کچھ اور کہہ گئی۔''

''کیا آپ بقائمی ہوش وحواس ہو۔'' جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''اگر آپ کی بوکھلاہٹ ختم ہو گئی ہو تو عدالتی کارروائی کو آگے بڑھایا جائے؟''

''یس سر!'' اس نے جواب دیا۔ ''اب میں نارمل ہوں۔''

''بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ۔'' جج نے مجھ سے کہا۔

''جناب عالی! کیا مظلومہ کے دروغ گو اور راست گو ہونے کے معاملے کو نظر انداز کر کے آگے بڑھنا ہے؟'' میں نے حد درجہ سنجیدگی کے ساتھ سوال کیا۔

میرے استفسار میں ایک خاص نوعیت کی چبھن شامل تھی۔ جج نے چونک کر میری جانب دیکھا اور کہا۔

''فوزیہ اپنی غلط بیانی کا سبب بیان کر چکی ہے اور اس نے اپنے اس غیر ارادی فعل پر عدالت سے معذرت بھی طلب کی ہے۔''

''مظلومہ کی معذرت کافی ہے اور نہ ہی بیان کردہ سبب معقول!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہر حال میں دروغ گو ہے اور دروغ گو رہے گی اور..... میں اپنے اس دعوے کو سچا ثابت کر سکتا ہوں۔''

ان لمحات میں، میں براہِ راست جج سے مخاطب تھا۔ اس سے پہلے کہ جج میری بات کے جواب میں کچھ کہتا، وکیل استغاثہ اچانک بیچ میں کود پڑا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے خاصے جارحانہ اور احمقانہ لہجے میں پوچھا۔

''تو کیا آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ شبانہ حیدرآباد میں دفن ہے اور نہ ہی کراچی میں.....؟''

''میرے فاضل دوست! تدفین کی بات تو بہت بعد میں کی جائے گی۔'' میں نے وکیل استغاثہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''پہلے اس کی موت وحیات کا معاملہ تو کلیئر ہو جائے کیونکہ میں نے شبانہ کے انتقال کی بات نہیں کی۔ یہ آپ کی مؤکل کی چھوڑی ہوئی آتش بازی ہے.....''

''آتش بازی.....!'' وکیل استغاثہ نے منہ بگاڑ کر کہا۔ ''کیا مطلب ہے آپ کا؟ کیا آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ شبانہ ابھی زندہ ہے، اس کا انتقال نہیں ہوا؟''

''آپ کی مؤکل کی بڑی بہن شبانہ بقیدِ حیات ہے یا اللہ کو پیاری ہو چکی، میں اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''البتہ، میں اس بات کو عدالت میں ثابت کر سکتا ہوں کہ مظلومہ نے اپنی بہن کے انتقال کے حوالے سے سراسر جھوٹ بولا ہے۔''

''کیا ثبوت ہے آپ کے پاس اس بات کا؟'' وکیل استغاثہ نے خاصے جارحانہ انداز میں پوچھا۔

''ثبوت.....'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا پھر روئے سخن مظلومہ کی جانب موڑتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا آپ اس بیان پر قائم ہیں کہ آپ کی بہن شبانہ آج سے چھ سال پہلے یعنی 1974ء میں انتقال کر گئی تھیں؟''

لمحاتی تذبذب کے بعد اس نے جواب دیا۔ ''جی ہاں!''

''آٹھ اگست انیس سو چوہتر؟''

''جی بالکل.....'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

اگست کا مہینا اور اس مہینے کی آٹھ تاریخ میرے ذہن کی اختراعات تھیں اور میں نے فوزیہ کی زبان سے سچ اگلوانے کے لیے دانستہ یہ چال چلی تھی تاکہ اسے جھوٹی درجۂ اول ثابت کر سکوں اور میرے اس عمل میں کسی قسم کی بدنیتی اور بے ایمانی شامل نہیں تھی۔

میں نے اپنی فائل میں سے ایک پیپر نکال کر وکیل استغاثہ کی آنکھوں کے سامنے لہرایا اور تیکھے لہجے میں کہا۔

''یہ ہے ثبوت آپ کی مؤکل کی غلط بیانی کا.....'' پھر میں نے جج کی جانب دیکھا اور کھنکھار کر گلا صاف کرنے کے بعد ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''جناب عالی! حیدرآباد سے کراچی شفٹ ہونے کے ایک سال بعد یعنی 1974ء کے آخری مہینے کی دس تاریخ کو شبانہ اچانک گھر سے غائب ہوگئی تھی۔ میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم نے اپنے طور پر شبانہ کو تلاش کرنے کی بھرپور کوشش کی مگر اس تگ ودو میں اسے کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ بالآخر اپنے ایک خیرخواہ کے مشورے پر اس نے بارہ دسمبر کو تھانہ کورنگی میں شبانہ کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرادی۔ یہ تصدیق شدہ نقل اسی رپورٹ کی ہے جو میں نے اپنے ذرائع استعمال کرکے متعلقہ تھانے سے نکلوائی ہے.....'' میں نے مذکورہ رپورٹ کی نقل کو جج کی جانب بڑھاتے ہوئے اپنی بات مکمل کردی۔ ''اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ جو شبانہ آٹھ اگست 1974ء کو اس دنیا سے پردہ فرما چکی تھی، وہ کم وبیش چار ماہ بعد اپنے گھر سے کس طرح غائب ہوسکتی ہے؟''

میرے اس سوال نے وکیل استغاثہ سمیت کمرائے عدالت میں موجود ہر شخص کے ذہن میں کھلبلی مچادی۔ لوگ آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ جج بغور اس کاغذ کا مطالعہ کررہا تھا جو میں نے اس کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ دلاور کے دل ودماغ پر جو قیامت گزری تھی اور گزر رہی تھی اس نے ایک مجبور ولاچار باپ کی زبان پر ٹنوں وزنی قفل ڈال دیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی تحریر میں ایک حیرت انگیز توانائی، ایک جادوئی اثر بھی بھر دیا تھا۔ اس نے اپنی جو بپتا مجھے لکھ کر دی تھی اس کے اندر میرے لیے معلومات کا ایک بیش قیمت خزانہ چھپا ہوا تھا اور میں ان نادر ونایاب معلومات کو دھیرے دھیرے، برمحل استعمال کررہا تھا۔

جج میرے فراہم کردہ پیپر کو پڑھنے کے بعد حقیقت کی تہ میں اتر چکا تھا تاہم تصدیق کی غرض سے اس نے مظلومہ فوزیہ سے پوچھا۔

''بی بی! تم اپنی بہن کی گمشدگی کے ذیل میں درج کرائی جانے والی اس رپورٹ کے بارے میں کیا کہتی ہو؟''

وہ ندامت آمیز لہجے میں بولی۔ ''سر! یہ سچ ہے کہ شبانہ دس دسمبر 1974ء کو اچانک گھر سے غائب ہوگئی تھی۔ ہم نے بدنامی کے خوف سے اس معاملے کو چھپانے کی کوشش کی تھی۔ جو لوگ اس واقعے سے واقفیت رکھتے تھے ان سے غلط بیانی نہیں کی جاسکتی تھی۔ باقی سب کو ہم نے یہی بتایا تھا کہ شبانہ باجی کا انتقال ہوگیا ہے لہٰذا وکیل صفائی کے سوال کے جواب میں بھی میں نے یہی بیان دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی یہ نہیں جانتا کہ شبانہ باجی اس وقت کہاں ہے۔ وہ زندہ بھی ہے یا.....''

بات کے اختتام پر وہ سسک پڑی۔ اس موقع پر وکیل استغاثہ اس کی مدد کو لپکا اور جج سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''جناب عالی! یہ عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ ہمارے معاشرے میں اس قسم کے واقعات کو دبانے اور چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے جن پر لوگوں کی انگلیاں اٹھنے کا اندیشہ ہو۔ مظلومہ کی فیملی نے بھی شبانہ کی پراسرار گمشدگی کے حوالے سے یہی پالیسی اپنائی تھی۔''

''اس نوعیت کی حکمتِ عملی عزت دار لوگ اختیار کرتے ہیں۔'' میں نے وکیل استغاثہ کو آڑے ہاتھوں لیا۔ ''جو بیٹی اپنے باپ کو اور جو بیوی اپنے شوہر کو ایک گھناؤنے جرم کے الزام میں یوں کٹہرے میں لاکر کھڑا کردے اور اس شخص کی بے بسی کا تماشا بنا کر اسے زندہ درگور کردے..... ان لوگوں کے لیے عزت، شرافت، بدنامی جیسے الفاظ بھلا کیا معنی رکھتے ہیں.....؟'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے جج سے مخاطب ہوکر کہا۔

''یور آنر! معزز عدالت کے روبرو یہ ثابت ہوچکا کہ اس کیس میں مظلومہ کی حیثیت کی حامل فوزیہ نے دیدہ ودانستہ غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ جو شخص ایک مرتبہ جھوٹ کا سہارا لے کر حقائق کو توڑنے اور مروڑنے کی کوشش کرتا ہے، اس کی گواہی اور اس کا کردار قابلِ بھروسا نہیں رہتا۔ اس امر کا قوی امکان پیدا ہوجاتا ہے کہ وہ آئندہ بھی دروغ گوئی کرے گا۔ الّا یہ کہ وہ اس حوالے سے اتنا بھی گر سکتا ہے کہ اپنے سگے باپ کو بیچ چوراہے پر کھڑا کرکے اس پر غلاظت باری شروع کردے اور..... مظلومہ فوزیہ ایسا ہی کررہی ہے.....''

''ہوں.....'' جج نے پُرمعنی انداز میں گردن ہلائی پھر دیوار گیر گھڑی کی جانب دیکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

''آپ فوزیہ بی بی سے کچھ اور پوچھنا چاہیں گے؟''

عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں پندرہ منٹ باقی رہ گئے تھے۔ میں نے جج کے استفسار کے جواب میں کہا۔ ''یس سر!'' پھر میں وٹنس باکس میں کھڑی، میرے مؤکل کی سب سے چھوٹی بیٹی اور اس کیس کی مظلومہ فوزیہ کی

جانب متوجہ ہوگیا۔

''فوزیہ بی بی!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''آپ نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے؟''

''میں نے دو سال پہلے گریجویشن کیا تھا۔'' اس نے بتایا۔

''اگر میں غلط نہیں ہوں تو گریجویشن کے بعد آپ نے جاب کرلی تھی.....؟''

''گھر کو چلانے کے لیے یہ ضروری تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ہمارے باپ کی اتنی آمدنی نہیں تھی جس میں چار افراد کو پیٹ بھر کر کھانا اور تن ڈھانپنا نصیب ہو۔ یہ شخص.....'' اس نے نفرت بھرے انداز میں اکیوزڈ باکس میں کھڑے دلاور کی جانب دیکھا اور زہریلے لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ جو کچھ کماتا تھا اس میں سے آدھے کی تو شراب پی جاتا تھا۔ مجبوراً مجھے کمانے کے لیے گھر سے نکلنا پڑا۔''

''اور اسی مجبوری کے تحت آپ سے دو سال بڑی سحرش بھی جاب پر لگ گئی تھی.....'' میں نے چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔

''سحرش انٹر سے آگے نہیں پڑھ سکی تھی۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''یہ سچ ہے کہ پہلے وہ جاب پر چڑھی تھی اور اس کے بعد میں۔''

''میری معلومات کے مطابق آپ دونوں ایک ہی آفس میں کام کرتی ہیں۔'' میں نے فوزیہ کے چہرے پر نگاہ جما کر کہا۔ ''غالباً ''مون انٹر پرائزز'' میں اور یہ آفس ٹاور کے علاقے میں واقع ہے.....؟''

''آپ کی معلومات درست ہیں وکیل صاحب۔''

''ایک اور بات کی تصدیق بھی کردیں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''اگر میں غلطی پر نہیں تو سحرش کی تنخواہ ایک ہزار اور آپ کی تنخواہ ڈیڑھ ہزار روپے ماہانہ ہے یعنی آپ دونوں کی کل آمدنی ڈھائی ہزار روپے ماہانہ ہے؟''

''میں تصدیق کرتی ہوں کہ آپ غلطی پر نہیں ہیں۔''

''مون انٹر پرائزز میں کس نوعیت کا کام ہوتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ بنیادی طور پر سوشل سروس فراہم کرنے کا ادارہ ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''مون انٹر پرائزز کو آپ سماجی خدمت گار سمجھ لیں۔''

''اور اس انٹر پرائزز کے روح رواں ذوالفقار حسین ایک معقول معاوضے کے عوض سماج کی جو خدمت کرتے ہیں اس میں لوگوں کی شادی کرانا، انہیں روزگار فراہم کرنا اور بیرونِ ملک جانے کے خواہش مند افراد کی راہنمائی کرنا شامل ہے۔ یعنی مون انٹر پرائزز بیک وقت میرج بیورو، ایمپلائمنٹ ایکسچینج اور اوورسیز ریکروٹنگ کا ادارہ ہے۔''

''جی..... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے جلدی سے بولی پھر دلاور کی جانب اشارہ کرتے ہوئے نہایت ہی کڑوے الفاظ میں اضافہ کیا۔ ''اس کم ظرف اور احسان فراموش شخص کو بھی زلفی انکل ہی نے صدر کے علاقے میں جاب دلوائی تھی۔''

''زلفی انکل'' سے اس کی مراد اس کا باس ذوالفقار حسین تھا۔ وہ بدبخت اور بدذات اپنے باپ کے لیے جس قسم کے زہریلے جذبات کا اظہار کررہی تھی وہ میرے لیے بالکل نیا اور ناقابلِ یقین تھا مگر یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ یہ کڑوا سچ ایک ٹھوس حقیقت کی شکل میں میرے سامنے موجود تھا۔

جج بار بار وال کلاک کی طرف دیکھ رہا تھا لہٰذا میں نے اپنی جرح کے ایکسلریٹر پر دباؤ بڑھاتے ہوئے تیز لہجے میں استفسار کیا۔ ''فوزیہ بی بی! وقوعہ کی رات یعنی پندرہ مارچ کی شب کیا واقعہ پیش آیا تھا؟''

''میں اس وقت اپنے کمرے میں سو رہی تھی.....'' وہ خود کو انسانیت کے درجے سے گراتے ہوئے بڑی ڈھٹائی سے بتانے لگی۔ ''یہ شخص چپکے سے میرے کمرے میں داخل ہوا لیکن میری آنکھ کھل گئی۔ اتنی رات کو اسے اپنے کمرے میں دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی مگر اس سے پہلے کہ میں اپنی حیرت کے اظہار کے طور پر کچھ کہتی، اس کمینے نے میری ناک پر ایک تہ شدہ کپڑا رکھ کر زور سے دبایا۔ وہ تہ شدہ کپڑا بے ہوشی کی کسی دوا میں بسا ہوا تھا۔ جب اس دوا کے اثرات سانس کے ساتھ میرے جسم کے اندر پہنچے تو میں ہوش وحواس کھو بیٹھی۔ میری بے ہوشی کے دوران میں اس شیطان نے اپنی ہوس پوری کی اور پلٹ کر جانے لگا تو مجھے ہوش آگیا۔ یہ محسوس کرکے میرا دماغ بھک سے اڑ گیا کہ اس نے میری دوشیزگی کو تار تار کرکے مجھے برباد کرڈالا تھا۔ مجھے ہوش وحواس میں دیکھ کر اس نے مجھے پستول دکھا کر دھمکی دی کہ اگر میں نے کسی سے اس واقعے کا ذکر کیا تو یہ مجھے قتل کردے گا۔ دھمکی دیتے ہوئے اس بدذات کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی

کہ اس وقت یہ نشے میں تھا۔ میں نے رات کا باقی حصہ اپنی تباہی کا ماتم کرتے ہوئے گزار دیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں اس کی دھمکی سے ڈر گئی تھی۔ اس وقت میرے پاس آنسو بہانے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا.....'' لمحاتی توقف کر کے اس نے افسردہ سی سانس خارج کی پھر بھرائی ہوئی آواز میں اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

''اگلی صبح میں جاب پر بھی نہیں گئی۔ پچھلی رات مجھ پر جو قیامت گزری تھی اس نے مجھے اندر باہر سے ہلا کر بلکہ دہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے بستر میں گھسی رہی۔ سحرش البتہ آفس چلی گئی۔ میں رات والے واقعے کو یاد کر کے اپنے آپ میں پل پل مرتی رہی پھر جب یہ مردود گھر سے نکلا تو میں نے رو رو کر امی کو اپنی بپتا سنا ڈالی۔ امی کو پہلے تو میری بات پر یقین ہی نہیں آیا۔ امی اس شخص کو نالائق، ناکارہ، نکھٹو، شرابی اور کبابی تو سمجھتی تھیں لیکن وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ یہ لعین اپنی پھول ایسی معصوم سگی بیٹی کو شراب کے نشے میں یوں درندگی سے پامال کر ڈالے گا۔ رات کو جب میری عزت کا ہتھیارا یہ شخص گھر لوٹا تو امی نے اس کی ایسی تیسی کر ڈالی۔ جواب میں اس نے امی پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ وہ تو امی کی خوش قسمتی تھی کہ زندہ بچ گئیں۔ امی نے مجھے ساتھ لیا اور اپنے علاقے کے تھانے میں پہنچ گئیں۔ یہ سمجھا کہ ہم ڈر کر بھاگ گئی ہیں۔ اس وقت تک سحرش آفس سے واپس نہیں آئی تھی لہٰذا یہ شخص آرام سے اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ ہماری رپورٹ پر پولیس نے فی الفور اسے گھر سے گرفتار کر لیا تھا.....'' یہاں تک پہنچنے کے بعد اس نے دور خلا میں گھورتے ہوئے رقت آمیز انداز میں کہا۔

''یا اللہ.....! میں یہ دن دیکھنے سے پہلے مر کیوں نہیں گئی۔ آخر میرا قصور کیا ہے؟ میں اپنی مرضی سے تو اس بدقماش کی بیٹی نہیں بنی..... خدایا! کسی بیٹی کو ایسا درندہ صفت باپ نہ دینا.....'' پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

آپ کو یقین نہیں آ رہا نا کہ کوئی بیٹی اپنے سگے باپ کے خلاف اس حد تک بھی جا سکتی ہے۔ اگر میں اس کیس میں ملزم دلاور کا وکیل نہ ہوتا اور کسی کی زبانی یہ واقعہ مجھ تک پہنچتا تو آپ کی طرح مجھے بھی اس واقعے کی صحت پر شک ہونے لگتا۔ مغربی دنیا کے مادر پدر آزاد معاشرے میں تو سگے بھائی بہن اور سگے باپ بیٹی کے حوالے سے اس نوعیت کے اکا دکا شرم ناک واقعات سننے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے لیکن مشرقی معاشرے خصوصاً برصغیر پاک و ہند کا ایک اپنا مزاج ہے۔ یہاں پر ایسے قابل مذمت واقعات کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن میں تصورات کا نہیں، ایک جیتی جاگتی حقیقت کا تذکرہ کر رہا ہوں۔ فوزیہ نے اپنے سگے باپ کے خلاف جو زہر اگلا اور اس پر جو گھناؤنا الزام لگایا وہ سب کچھ میری نظر کے سامنے تھا اور عدالتی ریکارڈ کا حصہ بھی.....!

عدالت کا وقت ختم ہونے میں چند منٹ رہ گئے تھے چنانچہ میں نے مظلومہ فوزیہ پر اپنی جرح مکمل کرتے ہوئے سرسری لہجے میں استفسار کیا۔

''کیا سحرش آپ کی سگی بہن ہے؟''

فوزیہ اس طرح اچھلی جیسے اس نے ہائی وولٹیج بجلی کے ننگے تار کو چھو لیا ہو۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

''کک..... کیا..... مطلب ہے..... آپ کا.....؟''

اس کی زبان کی لکنت نے مجھے بتا دیا کہ میرے سوال نے اس کی بنیاد میں ایٹمی دھماکا کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے تک وہ بڑے اعتماد کے ساتھ اپنے باپ پر کیچڑ اچھال رہی تھی لیکن میرے استفسار نے گویا اس کے اعتماد کے غبارے میں پن چبھو دی تھی۔ وہ یکا یک بے حد الجھی ہوئی اور پریشان دکھائی دینے لگی تھی۔

''میں نے آپ کے سامنے کوئی معما نہیں رکھ دیا، ایک سادہ سا سوال کیا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ اس کا جواب ہاں یا نہیں میں بہ آسانی دے سکتی ہیں لیکن آپ کے چہرے کے تاثرات سے تو یہی نظر آ رہا ہے کہ جیسے میں نے آپ کو گرم توے پر بٹھا دیا ہو.....؟''

وہ جس تیزی سے بوکھلائی تھی، اسی مستعدی سے سنبھل بھی گئی اور قدرے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''سحرش میری سگی بہن ہے۔ ہم دونوں نے ایک ہی عورت کے پیٹ سے جنم لیا ہے اور ہماری ماں کا نام ہے..... سعیدہ خاتون!''

اس نے میرے سوال کا جواب تو دیا تھا مگر ہوشیاری سے باز نہیں آئی تھی۔ ایسے ہوشیاروں کے لیے میں ڈیڑھ ہوشیار بننے میں کسی کوتاہی سے کام نہیں لیا کرتا۔

''ہر انسان اپنی ماں کے پیٹ ہی سے جنم لیتا ہے.....'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''آج تک یہ سننے میں نہیں آیا کہ کسی بچے یا بچی نے اپنے باپ کے پیٹ سے جنم لیا ہو یا وہ کسی دیوار کے اندر سے نکلا ہو اور یا پھر زمین سے اگا ہو اور..... دو افراد کا آپس میں سگے بھائی

بہن یا سگا بھائی یا سگی بہن ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ان دونوں کی ماں اور باپ بھی ایک ہوں۔ کیا آپ اور سحرش میرے موکل کے نطفے سے ہیں؟''

میرے آخری جملے نے اس کا چہرہ متغیر کر دیا۔ ان لمحات میں وہ منہ کالک بیٹی مجھے خاصی مشکل میں نظر آئی لیکن فوراً سے پیشتر اس نے اپنی اندرونی اور بیرونی کیفیات پر قابو پالیا اور بڑے دھڑلے سے بولی۔

''اس شخص کو.....'' وہ دلاور کی سمت انگلی اٹھا کر زہر خند انداز میں گویا ہوئی۔ ''اپنا باپ کہتے ہوئے مجھے گھن محسوس ہو رہی ہے لیکن یہ ایک شرم ناک حقیقت ہے کہ یہ شیطان میرا، سحرش کا اور شبانہ کا سگا باپ ہے۔''

اس کی کمینگی اور ہٹ دھرمی دیدنی اور افسوس ناک تھی۔ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''فوزیہ بی بی! یا تو آپ جوتوں سمیت میری آنکھوں میں گھس کر دنیائے دروغ گوئی میں عالمی ریکارڈ بنانے کی کوشش کر رہی ہیں اور یا پھر آپ حقیقت سے بے خبر ہیں۔''

''اور حقیقت کیا ہے؟'' وکیل استغاثہ نے اپنی موجودگی کا یقینی احساس دلاتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔

''میرے..... فاضل..... دوست.....!'' میں نے وکیل مخالف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گمبھیر انداز میں کہا۔ ''جس حقیقت کا میں نے ذکر کیا ہے بلکہ ذکر کا آغاز کیا ہے وہ پچھلے بیس سال سے وقت کی گرد میں دبی ہوئی ہے۔ موسموں کی حدت، شدت اور سردی گرمی نے اس طویل عرصے کے دوران میں اس کے اوپر ماہ و سال کی دبیز تہیں چڑھا دی ہیں۔ آپ اسے بھی ایک گڑا مردہ ہی سمجھ لیں اور آپ کو چونکہ گڑے مردے اکھاڑنے سے کافی تکلیف ہوتی ہے لہٰذا آئی ایم رئیلی سوری..... میں آپ کو سردست اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتاؤں گا۔''

اس کے چہرے پر ناگواری نمودار ہوئی اور وہ معاندانہ نظر سے مجھے گھورنے لگا۔ میں نے بے پروائی سے کندھے اچکا دیے اور روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

''جناب عالی! مجھے مقدمہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔''

جج نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں نے وکیل استغاثہ کے سامنے چند سیکنڈ پہلے کون سے گڑے مردے کا تذکرہ کیا ہے۔ تاہم وکیل سرکار کے چہرے کے تاثرات اس امر کی چغلی کھا رہے تھے کہ میرے جیٹے انکار نے اس کے پیٹ میں مروڑ ایسی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ عدالت کا کمرا ایک ایسا اکھاڑا ہوتا ہے کہ جہاں مخالف پارٹی کی تکلیف باعثِ طمانیت قلب و جگر محسوس ہوتی ہے۔ میں وکیل استغاثہ کی حالت کو انجوائے کرنے لگا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

اس روز جب میں اپنے آفس پہنچا تو عبیداللہ کا فون آ گیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے خاصے توانا لہجے میں میری کارکردگی کو سراہتے ہوئے توصیفی انداز میں کہا۔

''وکیل صاحب! آج آپ نے عدالت کے کمرے میں کمال کر دکھایا ہے۔ مجھے اس بات کی بے پناہ خوشی ہے کہ دلاور کے مقدمے کے لیے آپ کا انتخاب

یہ دنیا

یہ بھی عجب دنیا ہے، شادی شدہ طلاق کے چکروں میں اور غیر شادی شدہ شادی کے خیالوں میں۔ بچوں کو بڑا ہونے کی جلدی ہے۔ بڑوں کو بچپن واپس لوٹ آنے کی آرزو۔ نوکری والوں کو اپنے کام اور افسران کی سختیوں سے شکوہ ہے۔ بیکاروں کے لبوں پر روزگار ملنے کی دعائیں ہیں۔ غریبوں کو امیروں کی زندگی پر رشک آتا ہے اور امیر آرام کے چند لمحوں کے خواہش مند۔ مشہور افراد چھپنے کے لیے ٹھکانے کی تلاش میں دکھائی دیتے ہیں اور عام لوگ مشہور بننے کے لیے کوشش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے جس کو جو کچھ عطا فرمایا ہے اس پر شکر کرتا کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ غضب دنیا ہے۔

یہ کیا چیز ہے؟

چاند چہرہ، ستارہ آنکھیں، ناگن زلفیں، پنکھڑی ہونٹ، انگارہ رخسار، موتی دانت، صراحی گردن، لچکیلی شاخ بازو، کمان بھویں، ہرنی کی چال، بل کھاتی کمر، پلکوں کی جھالر۔

یہ شاعروں کی محبوبہ ہے بھائی۔

''عزت یا پیسا''

کسی دوست کو کم آمدنی بتاؤ تو وہ عزت نہیں کرتا اور اگر زیادہ بتاؤ تو ادھار مانگنے آ جاتا ہے۔ اب بندہ عزت بچائے یا پیسا؟

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، حیدر آباد

کر کے میں نے دانش مندی کا ثبوت دیا ہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ بہت جلد آپ دلاور کو باعزت بری کرانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔''

میں نے اپنے لیے اس کی زبان سے ادا ہونے والے تعریفی کلمات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ آج عدالت میں، میں نے کس نوعیت اور کس پائے کی جرح کی ہے۔ میں نے آپ کو عدالت کے کمرے میں تو کہیں نہیں دیکھا.....؟''

''میں وہاں آپ کو اس لیے نظر نہیں آیا کہ مجھے در پردہ رہ کر دلاور کو اخلاقی اور مالی طور پر سپورٹ کرنا ہے۔'' اس نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''میرا ایک خاص آدمی آج عدالت کے کمرے میں موجود تھا۔ تھوڑی دیر پہلے اسی بندے نے مجھے رپورٹ دی ہے۔ ویل صاحب! آپ بہت اچھا جا رہے ہیں..... ویل ڈن سر!''

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

''اگلی پیشی سے پہلے اگر آپ کو کچھ رقم کی ضرورت ہو تو بلا تکلیف بتا دیجیے گا۔'' اس نے اپنایت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں نے آپ سے ہر قسم کا تعاون کرنے کا وعدہ کر رکھا ہے۔''

''عبید صاحب! وکالت کے پیشے میں ''تکلف'' نام کی کوئی چیز وجود نہیں رکھتی۔'' میں نے راست گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے جب بھی پیسوں کی ضرورت پیش آئے گی، میں بلا تکلف اور بلا تردد آپ کو بتا دوں گا۔''

''مجھے خوشی ہوگی۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔

مخصوص الوداعی کلمات کے بعد میں نے ٹیلی فونک رابطہ موقوف کر دیا اور روزمرہ کے دفتری کاموں میں مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

آیندہ پیشی پر استغاثہ کی طرف سے چار گواہوں کو عدالت میں پیش کیا گیا جن میں سے دو انتہائی غیر اہم اور دو نسبتاً قابلِ بیان تھے۔ میں یہاں انہی آخر الذکر دو گواہوں پر اپنی مختصر جرح کا احوال پیش کروں گا لیکن اس سے قبل ایک ضروری بات.....!

استغاثہ کے گواہوں کے وٹنس باکس تک پہنچنے سے پہلے میں نے جج سے درخواست کی ''جناب عالی! میں اس کیس کے انکوائری آفیسر سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

کسی بھی کیس میں تفتیشی افسر کی حیثیت استغاثہ کے گواہ ایسی ہوتی ہے اور وہ ہر پیشی پر عدالت میں حاضر رہنے کا پابند ہوتا ہے۔ میری گزارش پر اس کیس کا آئی او گواہوں والے کٹہرے میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ عہدے کے اعتبار سے ایک اسسٹنٹ سب انسپکٹر تھا۔ اس کا نام فرید خان معلوم ہوا۔ فرید خان کی عمر کم و بیش تیس سال رہی ہوگی۔ وہ ایک گورا چٹا اور سرخ و سفید انسان تھا۔ اگرچہ اس کا عہدہ زیادہ اونچا نہیں تھا تاہم اس کی شخصیت کافی رعب دار اور متاثر کن تھی۔

''فرید صاحب! اگر میں آپ کو محض ''خان صاحب'' کہہ کر مخاطب کروں تو آپ کو اس طرزِ تخاطب پر کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟''

''ہرگز نہیں۔'' اس نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

''خان صاحب! آپ کو مظلومہ کے ساتھ ہونے والی مبینہ زیادتی کی اطلاع کب اور کس نے دی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''پولیس کے روزنامچے کے مطابق اس اطلاع کا اندراج سولہ مارچ کی رات نو بجے کیا گیا تھا۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''اور اطلاع کنندگان میں مظلومہ بہ ذاتِ خود اپنی والدہ کے ہمراہ پولیس اسٹیشن آئی تھی۔ ان دونوں نے بڑے دردناک انداز میں تفصیل سے ملزم کے مذموم کارنامے کو بیان کیا تھا لہٰذا ہمیں مجبوراً فوری کارروائی کرنا پڑی۔''

''اوکے.....'' میں نے فرید خان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے رسانیت بھرے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''آپ جائے وقوعہ یعنی ملزم کے گھر کتنے بجے پہنچے تھے؟''

''ہم دس بجے وہاں پہنچ گئے تھے۔'' اس نے بتایا۔ ''ملزم کی رہائش گاہ تھانے سے تھوڑے ہی فاصلے پر کورنگی کے علاقے میں واقع ہے لہٰذا وہاں تک رسائی حاصل کرنے میں ہمیں کسی تاخیر یا دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ میں ایک کانسٹیبل کے ساتھ ملزم کے گھر پہنچا اور اسے فوراً گرفتار کر لیا۔''

''جس وقت آپ نے ملزم کو گرفتار کیا، اس گھر میں اور کتنے افراد موجود تھے؟'' میں نے ایک اہم سوال کیا۔

''کوئی بھی نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بتایا۔ ''اس وقت ملزم اکیلا ہی بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ ہم چونکہ مظلومہ اور اس کی ماں سعیدہ خاتون کے ساتھ ہی جائے وقوعہ پر پہنچے تھے لہٰذا انہی ماں بیٹی کی معیت میں ہم گھر کے اندر داخل ہوئے اور فوراً سے پیشتر ہم نے اسے

آہنی زیور پہنا دیا۔"

"آپ کی محکمہ جاتی پھرتی قابلِ تعریف ہے خان صاحب!" میں نے طنز آمیز ستائشی نظر سے اس کی جانب دیکھا اور گہری سنجیدگی سے کہا۔ "ملزم کی فیملی چار افراد پر مشتمل ہے جن میں سے دو افراد یعنی مظلومہ اور اس کی والدہ آپ کے ہمراہ تھانے سے اس گھر پہنچی تھیں اور تیسرے فرد کا کہیں ذکر نہیں۔ میرا اشارہ مظلومہ کی بہن سحرش کی طرف ہے۔ کیا ملزم کی گرفتاری کے وقت وہ اس گھر میں موجود نہیں تھی؟"

"جی نہیں!" اس نے پوری قطعیت سے جواب دیا۔ "سعیدہ خاتون نے بتایا تھا کہ اس کی بڑی بیٹی سحرش ابھی اپنے آفس سے نہیں لوٹی....."

"خان صاحب! آپ کو محکمۂ پولیس میں کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"کم و بیش بارہ سال۔" اس نے جواب دیا۔

"یقیناً آپ ایک کانسٹیبل کی حیثیت سے بھرتی ہوئے ہوں گے۔" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی جانب دیکھا۔ "اور اپنی عمدہ کارکردگی کی بدولت بارہ سال میں، بڑی سست رفتاری سے ترقی کرتے ہوئے آپ اے ایس آئی کے عہدے تک پہنچ گئے ہیں۔ اب میں آپ سے جو سوال کرنے جا رہا ہوں، اس کا بہت سوچ سمجھ کر جواب دیجیے گا....."

"میں نے ابھی تک.... ہر سوال کا جواب نہایت ذمے داری سے دیا ہے وکیل صاحب اور آئندہ بھی اسی روش کو اپنائے رکھوں گا۔" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "باقی جہاں تک سحرش کا معاملہ ہے تو وہ جائے وقوعہ پر حاضر نہیں تھی تاہم بعد ازاں ہم نے اس کا بیان بھی لیا تھا۔ استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں اس کا نام شامل ہے۔"

"ہاں، میں نے استغاثہ کے گواہوں کی فہرست دیکھی ہے۔" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "غالباً آئندہ پیشی پر اسے گواہی کے لیے عدالت میں لایا جائے گا۔"

انکوائری آفیسر نے میری آخری بات کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے یاد دہانی کرانے والے انداز میں پوچھا۔ "آپ غالباً مجھ سے کوئی اہم سوال کرنے والے تھے؟"

"غالباً نہیں، یقیناً!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "آپ اپنی بارہ سالہ پولیس سروس کو ذہن میں رکھ کر مجھے بتائیں کہ آج سے پہلے بھی آپ نے مجرمانہ زیادتی کا شکار کسی لڑکی یا عورت کو اپنی ماں کے ساتھ اس طرح تھانے آ کر رپورٹ درج کرواتے دیکھا ہے اور وہ بھی اپنے سگے باپ کے خلاف.....؟"

"ہرگز نہیں..... ایسا کوئی واقعہ میری یادداشت میں محفوظ نہیں ہے۔" آئی او نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "اس نوعیت کے معاملات کو لوگ عموماً چھپانے اور دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجرمانہ حملے کے مقدمات چار پانچ فیصد سے زیادہ رجسٹر نہیں ہوتے اور..... اس مقدمے میں تو مجرمانہ زیادتی کا مرتکب مظلومہ کا سگا باپ ہے۔ اس طرح کا کوئی کیس آج تک میری نظر سے نہیں گزرا۔"

"گویا آپ کی وضاحت کا لبِ لباب یہ ہوا کہ زیرِ سماعت کیس اپنی نوعیت کا ایک منفرد کیس ہے؟"

"جی بالکل یہی بات ہے۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"اب کچھ ذکر تکنیکی امور کا ہو جائے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "خان صاحب! آپ کے پیش کردہ چالان میں کہیں بھی کسی میڈیکل رپورٹ کا ذکر نہیں۔ کیا آپ کو اس کا علم نہیں تھا یا آپ نے ایسے کسی ٹیسٹ کی ضرورت محسوس نہیں کی؟"

مجرمانہ حملے کا نشانہ بننے والی عورت کا میڈیکل ایگزامینیشن بہت ضروری ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں مجرمانہ حملے کا ارتکاب کرنے والے مرد کو بھی ایک مخصوص طبی معائنے سے گزارا جاتا ہے۔ جائے وقوعہ یعنی جس مقام پر یہ زور زبردستی پیش آئی ہو وہاں کی ہر شے بیڈ شیٹ، تکیے، بیڈ، فاعل اور مفعول کے ابدان پر موجود لباس وغیرہ کا لیبارٹری ٹیسٹ بھی اس پراسس کا ایک اہم حصہ ہے۔ 2017ء سے تو ہائی کورٹ نے DNA ٹیسٹ کو بھی لازمی قرار دے دیا ہے لیکن یہ جس دور کا واقعہ ہے اس زمانے میں لوگوں کی اکثریت تو DNA ٹیسٹ کے نام سے بھی واقف نہیں تھی۔

"ان دونوں میں سے کوئی بھی بات نہیں ہے وکیل صاحب!" آئی او نے میرے سوال کے جواب میں کہا۔ "مجھے ان معاملات کا اچھی طرح علم تھا اور مذکورہ ٹیسٹ کی اہمیت کا ادراک بھی لیکن بہت دیر ہو چکی تھی....."

"کیسی دیر خان صاحب؟" میں نے تیز لہجے میں

دریافت کیا۔

''آپ نے جس مخصوص طبی معائنے اور دیگر میڈیکل ٹیسٹ وغیرہ کی طرف اشارہ کیا ہے ان کی موثر پذیری 24 گھنٹے کے اندر ہوتی ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن مظلومہ جب اپنی ماں کے ساتھ اس واقعے کی رپورٹ درج کرانے آئی اس وقت تک اس واردات کو وقوع پذیر ہوئے کم از کم بائیس گھنٹے گزر چکے تھے اور ظالم اور مظلوم نے غسل لینے کے بعد اپنے لباس بھی تبدیل کر لیے تھے حتیٰ کہ اس بیڈ کی چادر اور تکیے بھی تبدیل کر دیے گئے تھے لہٰذا اگر فوری طور پر ہم فوزیہ اور اس کے باپ کو میڈیکل ایگزامینیشن کے لیے کسی اسپتال بھی پہنچا دیتے تو اس سے کوئی کارآمد نتیجہ برآمد ہونے والا نہیں تھا۔''

''میں آپ کی وضاحت سے اتفاق کرتا ہوں خان صاحب!'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''آپ کے چالان کی عمارت کا سینٹرل پلر مظلومہ فوزیہ کا بیان ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا.....؟''

''آپ بجا فرماتے ہیں وکیل صاحب۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''وکٹم جب اپنی زبان سے کوئی شکایت درج کرانے تھانے پہنچتا ہے اور گھر کے تمام افراد اس کی حمایت کے لیے جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں تو ملزم کے خلاف کارروائی کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ وکٹم فوزیہ کے علاوہ اس کی بہن سحرش اور والدہ سعیدہ خاتون بھی اپنے اپنے دلائل کے ساتھ ملزم کے خلاف کمربستہ ہیں اور ان کے علاوہ بھی ہمیں ایسے اور شواہد ملے ہیں جو ملزم کے مجرم ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔''

''آپ کے تعاون کا بہت شکریہ خان صاحب!'' اس تشکرانہ جملے کے ساتھ ہی میں نے اپنی جرح موقوف کر دی۔

مظلوم کے میڈیکل ٹیسٹ اور ظالم کے طبی معائنے کے بارے میں میری معلومات یقیناً انکوائری آفیسر سے کہیں زیادہ تھیں۔ معزز عدالت کے روبرو اس سے سوال جواب کا میرا ایک خاص مقصد تھا اور وہ مقصد حاصل کرنے میں، میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ سولہ مارچ کی رات لگ بھگ دس بجے جب پولیس نے میرے مؤکل کو اس کے گھر سے گرفتار کیا تو اس وقت مظلومہ کی بڑی بہن سحرش کہاں تھی۔

استغاثہ کی جانب سے اگلا گواہ لیاقت علی نامی ایک شخص تھا۔ لیاقت کی عمر چالیس سے متجاوز تھی۔ وہ عام سی شکل وصورت کا مالک ایک سانولا انسان تھا۔ وہ لانڈھی کے علاقے میں رہتا تھا اور صدر میں جوتوں کی ایک دکان پر کام کرتا تھا۔ دلاور سے اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔

لیاقت علی نے حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرایا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا۔ اس نے گواہ کے چہرے پر نگاہ جما کر سوال کیا۔

''لیاقت علی! آپ ملزم کو کتنے عرصے سے جانتے ہیں؟''

''کم وبیش سات سال سے۔'' اس نے جواب دیا۔

''جب سے یہ کراچی آیا ہے اور اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ میں جوتوں والی جس دکان پر کام کرتا ہوں اس کے برابر والی دکان میں یہ بندہ ملازم ہے۔''

''ملزم کی ملازمت کی نوعیت کیا ہے؟''

''دراصل وہ ہر قسم کا گھریلو سامان قسطوں پر دینے والی ایک دکان ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''ملزم اس دکان پر سیلز مین کے طور پر کام کرتا ہے..... مطلب، کام کرتا تھا۔''

''پھر تو آپ دونوں کی روزانہ ملاقات ہوتی ہوگی؟''

''جی بالکل..... دن میں کئی مرتبہ۔''

''لیاقت علی! جس طرح شرع میں کوئی شرم نہیں ہوتی، بہ عین عدالتی معاملات میں بھی سچائی کو بیان کرتے ہوئے کبھی ہچکچانا نہیں چاہیے۔'' وکیل استغاثہ نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''اب میں آپ سے جو سوال کرنے جا رہا ہوں، آپ نے اس کا سچا اور کھرا جواب دینا ہے۔ اس بات کی فکر نہ کریں کہ اس جواب سے اگر آپ کی کوئی کمزوری ظاہر ہو جائے گی تو اس پر یہ عدالت آپ کو سزا سنا دے گی۔ لہٰذا آپ نے کسی ڈر یا خوف میں مبتلا ہوئے بغیر حقیقت کو سامنے لانا ہے۔ آپ میری بات کو سمجھ رہے ہیں نا؟''

''جی وکیل صاحب! آپ کی بات میری سمجھ میں آ گئی ہے۔'' گواہ نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا ہے چنانچہ جھوٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''ٹھیک ہو گیا۔'' وکیل استغاثہ نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا یہ درست ہے کہ ملزم کے ساتھ آپ کی خوب جمتی ہے اور آپ لوگ اکثر ایک ساتھ بیٹھ کر دختر انگور سے دل بھی بہلاتے ہیں؟''

''جی..... یہ سچ ہے.....'' لیاقت علی نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔

''مے نوشی کے دوران میں اکثر انسان مبنی برحقیقت

باتیں کرتا ہے۔ خاص طور پر اپنے مسائل کا تذکرہ کرتا ہے۔'' وکیل استغاثہ نے کریدنے والے انداز میں کہا۔ ''کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گے کہ ملزم آپ سے اپنے کون سے ذاتی مسائل ڈسکس کیا کرتا تھا؟''

''اس کے مسائل کا مرکز اور محور اس کی بیوی اور بیٹیاں تھیں۔'' گواہ نے جواب دیا۔ ''یہ ان سے خوش نہیں تھا اور کہتا تھا کہ اگر اس کا بس چلے تو وہ ان تینوں کو قتل کردے.....''

''وقوعہ سے ایک روز پہلے یعنی چودہ مارچ کی شام ملزم بہت غصے میں تھا۔'' وکیل استغاثہ نے کہا۔ ''اور مے نوشی کے دوران میں اس نے آپ سے ایک درخواست کی تھی۔ معزز عدالت اس درخواست کی حقیقت جاننا چاہتی ہے.....؟''

''اس روز ملزم بہت زیادہ پریشان تھا اور بار بار اپنی بیوی اور بیٹیوں کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔'' لیاقت علی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''پینے کے دوران میں، میں اسے تسلیاں دیتا رہا کہ فکر نہ کرو، سب ٹھیک ہوجائے گا۔ پہلے تو یہ بڑے تحمل سے میری بات سنتا رہا پھر اچانک بھڑک اٹھا اور بڑے خطرناک لہجے میں بولا۔

''لیاقت! خود بخود کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ میرے ذہن میں ایک منصوبہ ہے لیکن اس منصوبے کی تکمیل کے لیے مجھے تمہاری مدد چاہیے۔''

''بولو، مجھ سے تمہیں کس قسم کی مدد چاہیے؟'' میں نے کہا۔

''تمہارا وہ دوست ہے نا، اسلحہ فروش..... کیا نام ہے، اس کا؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''جس کی لکی اسٹار پر ایمونیشن کی دکان ہے.....!''

میں نے تشویش بھرے انداز میں اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''اس کا نام خادم حسین ہے مگر تم اس کا کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''یار! مجھے دو تین دن کے لیے ایک پستول چاہیے۔'' اس نے کہا۔

''وہ کس لیے؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''تم کیا کرنے کا سوچ رہے ہو؟''

دلاور کی فرمائش سن کر میں اس لیے بھی فکرمند ہوگیا تھا کہ چند روز قبل یہ اپنی بیوی اور دونوں بیٹیوں کو جان سے مارنے کی بات کرچکا تھا۔ میری پریشانی کے جواب میں اس نے کہا۔

''ارے یار..... ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میرا

ارادہ کسی کو مارنے وارنے کا نہیں ہے۔ میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ کسی کی زندگی سے کھیل کر خود جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلا جاؤں۔ میں ان حرام زادیوں کو صرف ڈرانا چاہتا ہوں.....''

''پھر.....'' گواہ کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وکیل استغاثہ نے سوال جڑ دیا۔ ''پھر آپ نے اپنے دوست کی منت خوشامد کر کے ملزم کو ایک پستول دلا دیا..... ہیں نا؟''

''جی..... میں اس کی ضد کے آگے مجبور ہو گیا تھا۔'' لیاقت علی نے ندامت آمیز انداز میں کہا۔ ''میں نے ملزم کی بات کا یقین کر لیا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ پستول کے بل پر اپنی معصوم بیٹی کو خوف زدہ کر کے اس کی عصمت دری کرے گا..... کاش! اس وقت مجھے اس کی نیت کا اندازہ ہو جاتا.....!''

''مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!'' وکیل استغاثہ نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اپنی جرح موقوف کر دی۔ اس نے استغاثہ کے گواہ کو جو سبق پڑھایا تھا، وہ بس یہاں تک ہی تھا۔

اپنی باری پر میں جج کی اجازت حاصل کر کے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا اور اپنی جرح کا سلسلہ آغاز کرتے ہوئے گواہ سے پوچھا۔

''لیاقت صاحب! آپ نے ابھی وکیل استغاثہ کے سوالات کے جواب میں معزز عدالت کو بتایا ہے کہ آپ ملزم کو عرصہ سات سال سے جانتے ہیں اور دن میں کئی مرتبہ آپ دونوں کی ملاقات ہوا کرتی تھی کیونکہ آپ لوگ جن دکانوں پر نوکری کرتے تھے وہ صدر کے علاقے میں ایک دوسرے کے برابر واقع ہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''نہیں جناب! حقیقت یہی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''کسی شخص کو سمجھنے کے لیے سات سال کا عرصہ بہت زیادہ ہوتا ہے اور آپ لوگوں کی تو روزانہ کئی بار ملاقات بھی ہوا کرتی تھی۔'' میں نے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ دونوں میں دوستی کا رشتہ قائم ہو چکا تھا؟''

''جی ہاں.....!'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''اور جب دوست ''ہم نوالہ و ہم پیالہ'' بھی ہوں تو دوستی کا یہ رشتہ اور بھی گہرا ہو جاتا ہے۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ دونوں ایک دوسرے کے انڈرویئر فرینڈز یعنی لنگوٹیا یار تھے۔ مطلب، آپ دونوں کا باطن، ظاہر کے مانند ایک دوسرے پر عیاں تھا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

''جی بالکل ایسا ہی تھا۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

''آپ نے وکیل استغاثہ کی جرح کے جواب میں ایک سے زیادہ مرتبہ کہا ہے کہ ملزم اپنی بیوی اور دونوں بیٹیوں سے سخت نالاں تھا اور کئی بار انہیں قتل کرنے کا ارادہ بھی ظاہر کر چکا تھا۔ کیا کبھی آپ نے اس کے دکھ کو جاننے کی کوشش کی؟''

''بہت کوشش کی وکیل صاحب۔'' وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''میں تو چاہتا تھا کہ وہ خوش رہے۔ اگر اس کے درد کا کوئی علاج میرے پاس ہے تو میں ضرور کروں مگر اس نے اپنے گھریلو مسائل کے حوالے سے کبھی زبان نہیں کھولی۔ میں جان نہیں سکا کہ اس کی ذہنی اذیت کا سبب کیا تھا۔''

''آپ اس حقیقت کو تو تسلیم کرتے ہیں نا کہ ملزم اپنی بیوی اور بیٹیوں کی وجہ سے کسی کرب سے گزر رہا تھا؟'' میں نے پوچھا۔ ''یہ الگ بات کہ آپ ملزم کے کرب سے واقف نہیں تھے.....!''

''جی..... یہ سچ ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

''تو کیا میں یہ سمجھوں کہ ملزم کے خانگی معاملات کے علاوہ آپ اس کی خارجی مصروفیات کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں؟''

''جی..... باقی وہ اپنی ساری باتیں مجھ سے کیا کرتا تھا۔''

''یہ بھی کہ ملزم کراچی آنے سے پہلے حیدرآباد میں چوڑیاں بنانے والے ایک کارخانے میں کام کرتا تھا؟''

''جی ہاں!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''کیا ملزم نے کبھی آپ کے سامنے اپنے کسی کارنامے کا ذکر کیا؟'' میں نے معنی خیز انداز میں سوال کیا۔

اس نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''کیسا کارنامہ؟''

''یہی کہ حیدرآباد میں یا کراچی میں.....'' میں نے ڈرامائی انداز میں پوچھا۔ ''یہ غیر عورتوں کے پاس جاتا رہا ہو..... نامحرم عورتوں کے ساتھ اس کے غیر شرعی تعلقات ہوں.....؟''

''نہیں جناب!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ اس قسم کا بندہ نہیں ہے..... کم از کم میں نے ملزم کو ایسا نہیں پایا۔''

وکیل استغاثہ اس نوعیت کی جرح کے جواب میں

مجھے کھا جانے والی نظر سے گھور رہا تھا۔ میں نے اس کا پھینکا ہوا ڈائنامیٹ کیچ کر کے پھٹنے سے پہلے اسی کی جانب اچھال دیا تھا۔ استغاثہ کے گواہ لیاقت علی کو میں اپنے مؤکل اور اس کیس کے ملزم دلاور کے حق میں استعمال کرنے جا رہا تھا۔

''تو آپ کے بیان سے معزز عدالت یہ سمجھے کہ ملزم کوئی بدکردار انسان نہیں ہے.....؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''جی بالکل.....'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ ''میں نے اس کے اندر ایسی کوئی عادت نہیں دیکھی۔''

''لیاقت صاحب! آپ نے مرنے کے بعد کس کو جان دینا ہے؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ ''ظاہر ہے، اپنے اللہ کو۔''

''اسی اللہ کو حاضر و ناظر جان کر اپنے دل و دماغ سے پوچھ کر معزز عدالت کو بتائیں کہ آپ کی نظر میں جو شخص بدکردار نہ ہو..... جس نے کبھی زنا نہ کیا ہو..... وہ اپنی سگی بیٹی کے ساتھ بدفعلی کر سکتا ہے.....؟''

''آبجیکشن یور آنر!'' وکیل استغاثہ زخمی سانپ کے مانند پھنکارا۔ ''مظلومہ فوزیہ نے اپنے بیان میں بڑی وضاحت کے ساتھ بتایا ہے کہ وقوعہ کی رات ملزم نشے میں تھا اور شراب کو ام الخبائث اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اس کے نشے میں انسان رشتوں کی پہچان بھول جاتا ہے۔ جائز و ناجائز اور گناہ و ثواب کی اس کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ وہ حلال اور حرام کی تمیز فراموش کر بیٹھتا ہے اور اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر وہ ہر شرمناک کھیل کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور..... وقوعہ کی رات بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ ملزم نے پہلے پستول دکھا کر اپنی سگی بیٹی کو ڈرایا پھر اس کی عزت کا جنازہ نکال دیا۔''

''اس وقت آپ بھی جذبات سے مغلوب ہو کر استغاثہ کی نمازِ جنازہ پڑھا رہے ہیں میرے فاضل دوست!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ ٹکا کر زہریلے لہجے میں چوٹ کی۔

پستول دکھا کر اپنی سگی بیٹی کو ریپ کرنے کی بات استغاثہ کے گواہ لیاقت علی نے بھی تھوڑی دیر پہلے کی تھی مگر وہ دراصل وکیل استغاثہ کے استفسار کے ردِعمل کے طور پر تھا۔ اس کو گواہ کی ذاتی رائے نہیں کہا جا سکتا تھا اسی لیے میں نے گواہ پر اس حوالے سے کوئی سخت جرح نہیں کی تھی لیکن اب تو ''اللہ دے اور بندہ لے۔'' والا معاملہ تھا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' وہ غرایا۔

''پولیس نے اس مقدمے کا جو چالان پیش کیا ہے اور مظلومہ نے اپنا جو حلفیہ بیان ریکارڈ کرایا ہے اس کے مطابق.....'' میں نے بڑے دھیمے اور موثر انداز میں وکیل مخالف کی گت بناتے ہوئے کہا۔ ''وقوعہ کی رات آپ کی مظلومہ اور ڈیفنس کی ملعونہ فوزیہ اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہی تھی کہ ملزم کی آمد کی آہٹ پر اس کی آنکھ کھل گئی۔ اتنی رات کو اپنے کمرے میں ملزم کو دیکھ کر اسے حیرت ہوئی مگر قبل اس کے کہ وہ اپنی حیرت کا اظہار کر پاتی، ملزم نے اس کی ناک پر بے ہوشی کی دوا میں بسا ہوا ایک تہ شدہ کپڑا رکھ کر زور سے دبا دیا تھا جس کے نتیجے میں وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئی پھر اس کی بے ہوشی کے دوران میں ملزم نے اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنا ڈالا اور جب ملزم پلٹ کر جانے لگا تو اس نے پستول دکھا کر آپ کی مظلومہ کو دھمکی دی کہ اگر اس نے اس واقعے کے بارے میں کسی کو بتایا تو وہ اسے قتل کر دے گا اور آپ.....'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر طنزیہ انداز میں اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اور آپ نے ابھی ملزم کی مبینہ کارروائی کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے وہ تو چالان کے سراسر خلاف جاتا ہے۔ آپ فرما رہے ہیں کہ ملزم شراب کے نشے میں مظلومہ کے کمرے میں داخل ہوا اور پستول دکھا کر اس کی عزت کا جنازہ نکال دیا.....؟''

''اٹ از جسٹ اے سلپ آف ٹنگ۔'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ''یہ میری زبان کی غلطی ہے۔ میں کہنا وہی چاہ رہا تھا جو چالان میں درج ہے مگر الفاظ کی ترتیب الٹی ہو کر زبان سے پھسل گئی.....''

''میرے فاضل دوست! یہ سلپ آف ٹنگ'' بعض اوقات ''ہینگ مین مسٹیک'' بھی بن جایا کرتی ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اس لیے اپنی زبان کو پھسلن زدہ راہوں پر بے مہار نہ چھوڑ دیا کریں.....!'' پھر میں نے اپنا روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''جناب عالی! وکیل استغاثہ نے ام الخبائث کے اثرات بد پر جو سیر حاصل لیکچر دیا ہے وہ زیر سماعت کیس سے کوئی رشتہ ناتا نہیں رکھتا۔ اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں استغاثہ کے گواہ پر اپنی جرح مکمل کر لوں؟ بہ شرط یہ کہ میرے فاضل دوست کو کوئی اعتراض نہ ہو.....؟''

میرے ان تیز و تند کلمات پر وکیل سرکار پیچ و تاب کھا کر رہ گیا تاہم وہ منہ سے کچھ نہیں بولا۔ جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''یس صاحب! یو آر پرمیٹڈ.....!''

''لیاقت صاحب!'' میں نے وٹنس باکس میں کھڑے لیاقت علی کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا سوال دہرا دیا۔ ''جو شخص آپ کی نظر میں بدکردار نہ ہو..... جس نے کبھی زنا نہ کیا ہو..... کیا وہ اپنی سگی بیٹی کے ساتھ بدفعلی کر سکتا ہے؟''

''میں سمجھتا ہوں، نہیں.....'' وہ پوری قطعیت سے بولا۔ ''ہرگز نہیں!''

میں نے استغاثہ کے گواہ پر اپنی جرح کو فل اسٹاپ لگاتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''دیٹس آل یور آنر۔''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے اکیس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

''دی کورٹ از ایڈ جارنڈ!''

آخری مرتبہ عبیداللہ سے فون پر میری جو بات ہوئی تھی اس میں عبید نے مجھے بتایا تھا کہ پچھلی پیشی پر کرائے عدالت میں اس کا ایک آدمی موجود تھا جس نے اسے عدالتی کارروائی کی رپورٹ دی تھی۔ آج کی کارروائی کے دوران میں لاشعوری طور پر میری نگاہ مذکورہ شخص کی تلاش میں رہی تھی لیکن میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پایا تھا، سوائے اس کے کہ میں نے جس چشمے والے گنجے شخص کو گزشتہ پیشی پر کرائے عدالت میں دیکھا تھا، وہ آج بھی حاضرینِ عدالت کے اندر موجود تھا۔

☆☆☆

میں توقع کر رہا تھا کہ اس پیشی پر ملزم کی بڑی بیٹی سحرش کو گواہی کے لیے عدالت میں لایا جائے گا لیکن آج گواہی دینے سب سے پہلے جو شخص وٹنس باکس میں پہنچا اس کا نام خادم حسین تھا۔

تھوڑی دیر پہلے پیش کار نے میرے استفسار پر مجھے بتایا تھا کہ سحرش کا نام آج بھگتائے جانے والے گواہوں میں شامل ہے۔ استغاثہ کے مطابق کچھ ہی دیر میں سحرش عدالت پہنچ جائے گی۔ یہ سن کر میں مطمئن ہو گیا تھا۔

خادم حسین کی عمر کا تخمینہ میں نے چالیس اور پچاس کے درمیان لگایا۔ اندازے میں دس سال کے فرق کا سبب یہ تھا کہ خادم حسین ایک پستہ قامت اور فربہ انسان تھا اور اس کی توند کسی مٹکے کے مانند باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ جن افراد کا قد حد سے زیادہ چھوٹا یا حد سے زیادہ بڑا ہو وہ حد سے زیادہ دبلے یا موٹے ہوں ان کی عمر کا اندازہ قائم کرنے میں انسان سے اکثر غلطی ہو جاتی ہے۔

پہلے وکیل استغاثہ نے اپنے گواہ پر جرح کی، پھر میری باری آئی۔ میں نے خادم حسین سے چند ایک اہم سوال کیے۔ یہ وہی اسلحہ فروش تھا جس سے لیاقت علی نے ملزم کو پستول دلایا تھا۔

''خادم حسین!'' میں نے بڑے منفرد انداز میں اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے والدین نے یہ سوچ کر آپ کا نام ''خادم حسین'' رکھا تھا کہ آپ قول و فعل میں خود کو حسینی ثابت کرو گے مگر آپ کا عمل بتاتا ہے کہ آپ حسین کے شعار کے خلاف کام کر رہے ہیں۔''

''اللہ نہ کرے کہ ایسا ہو.....'' وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے توبہ کرنے والے انداز میں بولا۔ ''آپ کو میرے کس عمل سے ایسا لگا؟''

''امام الشہدا حضرت حسین ابن حیدر نے میدان کربلا میں اپنے نانا جان کا وعدہ وفا کر کے دکھایا تھا۔'' میں نے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ قربانی کمٹ منٹ کا درس دیتی ہے مگر آپ کیسے خادم حسین ہیں کہ آپ نے اپنے کاروباری اصولوں کی دھجیاں اڑا دی ہیں.....؟''

''میں کچھ نہیں سمجھا جناب.....'' وہ حیرت بھری الجھن سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''پتا نہیں، آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں؟''

''ری لیکس مسٹر خادم حسین.....!'' میں نے اس کی مشکل کو آسان کرتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ ایک اسلحہ فروش ہیں۔ اپنی دکان میں بیٹھ کر آپ آتشیں ہتھیاروں کی خرید و فروخت کا کام کرتے ہیں۔ اس کاروبار کا بنیادی اصول یہ ہے کہ آپ کسی بھی شخص کو اس وقت تک کوئی ہتھیار فروخت نہ کریں جب تک آپ مذکورہ شخص کے پاس متعلقہ ہتھیار کا لائسنس نہ دیکھ لیں۔ کیا آپ نے ملزم کو پستول دیتے وقت اس امر کی تصدیق کی تھی کہ وہ ایک لائسنس ہولڈر ہے اور پستول رکھنے کا مجاز ہے؟''

''نن..... نہیں.....'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کوئی بھی ایرا غیرا، نتھو خیرا آپ کی جان پہچان کے کسی بندے کے ساتھ دکان پر آئے گا تو آپ لائسنس دیکھے بغیر اسے کوئی گن اٹھا کر دے دیں گے؟'' میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔ ''کیا یہ آپ کے

کاروباری اصولوں کی خلاف ورزی نہیں ہے؟''

خادم حسین نے بڑے تحمل سے میری بات سنی۔ جب میں خاموش ہوا تو اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

''ایسی کوئی بات نہیں وکیل صاحب.....''

''پھر کیسی بات ہے؟'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے سوال کیا۔

اس نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا۔

''پہلی بات تو یہ کہ لیاقت علی، ملزم کو میری دکان پر لانے سے پہلے مجھ سے ایک ملاقات کر کے گیا تھا اور اس نے مجھے صورت حال سے آگاہ کرنے کے بعد کہا تھا... میں اپنے دوست کی خواہش پوری کرنا چاہتا ہوں مگر اس طرح کہ اس میں کوئی خطرہ نہ ہو لہٰذا تم میری مدد کرو...'' میں نے لیاقت کی مجبوری کا احساس کرتے ہوئے کہا... ٹھیک ہے، میں ایسا بندوبست کر دیتا ہوں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی سلامت رہے.....''

''تو آپ نے ایسا کون سا بندوبست فرمایا تھا؟'' اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ''آپ اس انتظام کو معزز عدالت کے سامنے بھی بیان کریں ذرا.....!''

''ملزم میرے کسی دوست کے ہمراہ میری دکان پر آتا یا تن تنہا، یہ تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں لائسنس دیکھے بغیر اسے کوئی ہتھیار فروخت کرتا یا دو چار دن کے لیے دے دیتا.....''

''ایک منٹ خادم حسین!'' میں نے اسے ٹوک دیا اور کہا۔ ''مگر آپ نے اس روز ملزم کو ایک پستول دیا تھا جس کے بل پر ملزم نے استغاثہ کے مطابق اپنی بیٹی کو دھمکایا تھا اور اسی پستول سے اس نے اپنی بیوی پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ آپ اس حقیقت سے کس طرح انکار کر سکتے ہیں کہ آپ نے ملزم کو کوئی پستول نہیں دیا تھا؟''

''آپ اگر مجھے بات پوری کرنے دیں تو آپ کو آپ کے ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔'' وہ خفگی آمیز لہجے میں بولا۔ ''میں نے اس روز ملزم کو ایک ڈمی پستول دیا تھا اور مذکورہ پستول کے اندر گولیاں بھی ڈمی ہی تھیں اور اس کی سادگی دیکھیں کہ اس نے اپنا کام نکالنے کے بعد وہ ڈمی پستول مجھے واپس بھی کر دیا تھا۔''

''تو آپ معزز عدالت کو یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ آپ نے ملزم کو جو پستول دیا تھا وہ صرف ڈرانے دھمکانے کے کام ہی آ سکتا تھا؟''

''بالکل..... اور ملزم کی ضرورت بھی یہی تھی لیکن میں نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ ڈمی پستول ہے اور یہ بات لیاقت علی کے علم میں بھی نہیں تھی۔''

''آپ تو بڑے کاریگر انسان ہیں خادم حسین!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''کرنا پڑتا ہے وکیل صاحب!'' اس نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''جس طرح جیولری کا کاروبار کرنے والے ڈکیتی کے ڈر سے اپنے شوکیسز میں نقل بہ مطابق اصل زیورات کے سیٹ سجا کر رکھتے ہیں بالکل اسی طرح ہم بھی ڈمی اسلحہ اپنے ریکس میں سجا کر رکھتے ہیں اور اصلی ہتھیاروں کو چھپا کر تاکہ ڈاکو گن دکھا کر گنز نہ لوٹ لے جائیں۔''

میں نے مزید ایک دو سوالات کے بعد استغاثہ کے گواہ پر اپنی جرح ختم کر دی۔ خادم حسین کی وضاحت نے میرے مؤکل پر عائد کردہ الزامات میں قدرے نرمی پیدا کر دی تھی۔

اس روز بھی وہ گنجا چشمے والا کمرائے عدالت میں موجود تھا۔ اب تو مجھے یقین ہو چلا تھا کہ یہی عبیداللہ کا خاص آدمی ہے جو اسے عدالتی کارروائی کی رپورٹنگ کرتا ہے۔ میں مذکورہ شخص کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ سحرش عدالت پہنچ گئی۔ وکیل استغاثہ نے فوراً سے پیشتر سحرش کو گواہی کے لیے پیش کر دیا۔

سحرش ایک گوری چٹی اور دبلی پتلی دراز قامت لڑکی تھی۔ اس کی عمر پچیس سال تھی۔ وہ فوزیہ کی بہ نسبت بلاشبہ زیادہ حسین اور پُرکشش تھی۔ سحرش نے حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرا دیا۔ فوزیہ کی طرح اس کا بیان بھی ملزم کے خلاف جاتا تھا۔ وکیل استغاثہ نے جرح کے دوران میں اس آتشیں بیان میں کلیاں پھندنے لگا کر اسے مزید واہیات بنانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ وکیل استغاثہ کا پورا زور یہ ثابت کرنے پر تھا کہ ملزم ایک بدمزاج، لڑاکا، شرابی، نکما اور شکی مزاج شخص تھا۔ اس نے اپنے رویوں سے بیوی اور دونوں بچیوں کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی حتیٰ کہ سب سے بڑی بیٹی شبانہ بھی ملزم کی سختیوں کی وجہ سے گھر سے بھاگنے پر مجبور ہوئی تھی..... وغیرہ وغیرہ۔

اپنی باری پر میں وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں جرح شروع کی۔ میں غیر محسوس انداز میں اسے اپنے سوالات میں اس طرح جکڑنے کا ارادہ رکھتا تھا کہ وہ ہل نہ سکے اور نہ ہی اس کی

والدہ محترمہ کے ملنے کی گنجائش باقی رہے کیونکہ اس کے بعد ملزم کی بیوی سعیدہ خاتون کو آیندہ پیشی پر گواہی کے لیے عدالت میں حاضر ہونا تھا۔ میں اس کی ''مرمت'' میں استعمال ہونے والے اوزاروں کو دھیرے دھیرے ''ارینج'' کرتا جارہا تھا.....

''سحرش صاحبہ! آپ کو مون انٹر پرائزز میں کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کم وبیش چار سال۔'' اس نے بتایا۔

''آپ کی چھوٹی بہن فوزیہ بھی اسی آفس میں کام کرتی ہے؟''

''جی..... میں نے ہی فوزیہ کو کام پر لگوایا تھا۔''

''مطلب آپ جس دلدل میں خود دھنسی ہوئی تھیں وہیں پر لاکر اپنی چھوٹی بہن کو بھی پھینک دیا تھا؟'' میں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

''آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟'' وہ تڑخ کر بولی۔

''مون انٹر پرائزز ایک سوشل سروسز فراہم کرنے کا ادارہ ہے۔ وہاں پر ایسا کوئی کام نہیں ہوتا جس کے لیے دلدل کا لفظ استعمال کیا جائے.....''

میں نے اس کی خفگی کو اپنی جرح کے جوتے کی نوک پر مارتے ہوئے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھا دیا۔

''سحرش صاحبہ!'' میں نے بڑی رسانیت سے اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''سولہ مارچ کی رات جب آپ کے والد کو پولیس نے گرفتار کیا، اس وقت آپ کہاں تھیں؟''

''مم..... میں..... اپنے آفس میں تھی.....'' اس نے گڑبڑائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''میرے مؤکل کی گرفتاری پولیس کے ریکارڈ کے مطابق سولہ مارچ کی رات، دس بجے عمل میں آئی تھی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنسناتے ہوئے پوچھا۔ ''مون انٹر پرائزز میں اس وقت آپ کون سا کام کررہی تھیں؟''

''مون انٹر پرائزز میں مختلف قسم کے کام ہوتے ہیں اور بعض اوقات کام کی زیادتی کے باعث اسٹاف کو دیر تک آفس میں رکنا پڑتا ہے۔'' وہ اکتاہٹ آمیز انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ کو مون انٹر پرائزز کے اوقات کار سے کیا تکلیف ہے؟''

سحرش نے آخری جملہ بڑے ٹیڑھے انداز میں ادا کیا تھا مگر میں اس کے وار کو بڑے ظرف سے سہہ گیا اور معتدل انداز میں کہا۔ ''مجھے تو کوئی تکلیف نہیں لیکن میرا مؤکل اس پر کڑھتا رہتا تھا.....!''

''ابا کو تو ہماری نوکری ہی سے خدا واسطے کا بیر تھا۔'' وہ نفرت آمیز انداز میں اپنے باپ کو گھورتے ہوئے بولی۔ ''یہ ہمارے کردار پر شک کرتا تھا اور ہمارے ساتھ ساتھ امی کو بھی ستاتا تھا۔ کوئی ایسا دن نہیں تھا جب ہمارے گھر میں دنگا فساد برپا نہ ہو۔ اس بے غیرت کو اتنی بھی شرم نہیں تھی کہ اگر ہم نوکری کے لیے گھر سے باہر قدم نہ نکالتیں تو فاقوں کی نوبت آجانا تھی۔ خود تو کما کر ہمیں کھلانے کے قابل تھا نہیں، ہمیں بھی جاب پر جانے نہیں دیتا تھا.....''

''آپ دونوں بہنیں اور آپ کی والدہ حق پر ہیں یا میرا مؤکل دلاور، اس بات کا فیصلہ عدالت نے کرنا ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ میرے چھوٹے چھوٹے چند سوالات کے جوابات دے دیں گی تو میں آپ کو فارغ کردوں گا۔''

''پوچھیں، آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟'' اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''مون انٹر پرائزز کے پروپرائٹر مسٹر ذوالفقار عرف زلفی انکل کو آپ کب سے جانتی ہیں؟'' میں نے ٹھوس لہجے میں پوچھا۔

''کافی عرصے سے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''وہ امی کے ایک پرانے جاننے والے ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ امی نے انہیں منہ بولا بھائی بنایا ہوا ہے۔''

''منہ بولے رشتے اکثر خون کے آنسو رلاتے ہیں۔'' میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا پھر وٹنس باکس میں کھڑی سحرش سے دریافت کیا۔ ''کیا میرا مؤکل بھی انکل زلفی کو اپنا بھائی سمجھتا تھا؟''

''میرا خیال ہے، ان دونوں میں محض جان پہچان کا رشتہ ہے۔'' اس نے گول مول جواب دیا۔

''کیا یہ سچ ہے کہ جب آپ لوگ حیدرآباد میں تھے تو اس وقت بھی زلفی انکل کا آپ کے گھر میں آنا جانا تھا؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''کراچی میں آکر آباد ہونے کا مشورہ بھی زلفی ہی نے آپ کی امی کو دیا تھا اور اس سلسلے میں بھرپور تعاون بھی کیا تھا؟''

''ہاں، یہ بات درست ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''ابا چوڑیوں کا کام چھوڑ کر گھر میں بیٹھ گیا تھا اور ہمارے لیے حیدرآباد میں جابز کے زیادہ مواقع تھے اور نہ ہی تعلیم حاصل کرنے کی آسانیاں، اس لیے انکل کا حیدرآباد سے کراچی شفٹ ہوجانے کا مشورہ امی کو پسند

آیا اور امی نے ابا کو بھی کسی طرح راضی کرلیا۔''

''ٹھیک ہوگیا.....'' میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''مون انٹر پرائزز میں آپ دونوں بہنوں کی جاب اور آسان قسطوں پر گھریلو سامان دینے والی شاپ پر ملزم کی نوکری بھی انکل زلفی ہی کی رہین منت ہے؟''

''جی، بالکل!'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

''انکل زلفی کے ہم لوگوں پر بے انت احسانات ہیں۔''

''بہت خوب.....!'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اگر میں کچھ غلط کہوں تو آپ فوراً مجھے ٹوک دیجیے گا۔ کیا آپ کو مون انٹر پرائزز سے ایک ہزار روپے اور آپ کی چھوٹی بہن فوزیہ کو پندرہ سو روپے تنخواہ ملتی ہے؟''

''جی ہاں!''

''ملزم کی تنخواہ کتنی تھی؟''

''ابا کی تنخواہ تو بارہ سو روپے تھی مگر اس نے کبھی چار پانچ سو سے زیادہ گھر میں نہیں دیے۔'' اس نے بتایا۔ ''باقی کی رقم یہ مے نوشی میں اڑا دیا کرتا تھا۔''

''مطلب یہ کہ آپ لوگوں کی کل آمدنی تین ہزار روپے تھی؟''

''جی..... کم وبیش تین ہزار روپے۔''

''آپ لوگ کورنگی والے جس مکان میں اس وقت رہتے ہیں وہ ملزم کے نام ہے یا آپ کی امی کے نام؟''

''وہ امی کے نام پر ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اگر یہ گھر ابا کے نام پر ہوتا تو یہ بندہ اسے کب کا شراب میں بہا چکا ہوتا.....!''

میں نے سحرش کے منافقانہ تبصرے کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکالنے کے بعد بڑے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''ابھی ہم جس مکان کا تذکرہ کر رہے ہیں، وہ میری معلومات کے مطابق کم وبیش ایک سو اسّی گز کے پلاٹ پر تعمیر شدہ ہے۔ مکانیت کے لحاظ سے اس میں تین بیڈ رومز، ڈرائنگ اور ڈائننگ روم ہے۔ آپ کے خیال میں اس وقت آپ کے مکان کی مارکیٹ ویلیو کیا ہوگی؟''

بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ''کم از کم آٹھ لاکھ۔''

''سحرش صاحبہ! اپنے خدا کو حاضر وناظر جان کر بتائیں کہ صرف تین ہزار روپے ماہانہ آمدنی میں سے رقم بچا کر آٹھ لاکھ مالیت کا گھر کس طرح بنایا جاسکتا ہے.....؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''تین ہزار روپے تو چار افراد کے ماہانہ اخراجات ہی میں گم ہوجاتے ہوں گے۔ اس میں بچت کا کیا سوال؟''

''آپ سے کس نے کہہ دیا کہ ہماری آمدنی صرف تین ہزار روپے ماہانہ ہے؟'' اس نے بگڑے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''تھوڑی دیر پہلے آپ ہی نے تو اس حساب کی تصدیق کی ہے۔''

''اس اماؤنٹ میں امی کی آمدنی شامل نہیں تھی۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔

''اوہ.....'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے سوالیہ نظر سے استغاثہ کی گواہ سحرش کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''تو آپ کی امی بھی خیر سے جاب کرتی ہیں؟''

''نہیں۔ وہ گھر میں رہ کر ہی کام کرتی ہیں۔''

''کس نوعیت کا کام؟'' میں نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔

''وہ کپڑے سلائی کرتی ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''اوہ.....'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تو آٹھ لاکھ مالیت کا وہ مکان سلائی مشین کی کمائی سے بنایا گیا ہے۔ بھئی..... آپ کی امی کی سلائی مشین تو بڑی کراماتی ہے۔ کیا کسی پہنچے ہوئے بابا نے اس مشین پر کوئی خاص دم کیا ہوا ہے؟''

میرے تلخ سوال کا جواب دینے کے بجائے وہ ناپسندیدہ نظر سے مجھے گھورنے لگی۔ میں اسے اور اس کے دیکھنے کو نظر انداز کر کے جج کی جانب مڑا اور بہ آواز بلند کہا۔

''جناب عالی! مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہوگیا۔ اگلی پیشی دس روز بعد تھی۔

دو روز بعد عبیداللہ مجھ سے ملنے دفتر آیا اور میری ضرورت کے مطابق اس نے مجھے ادائی بھی کی۔ اس کے بعد ہمارے بیچ دلاور کے کیس کے حوالے سے گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہ ایک مرتبہ پھر بڑے زور وشور سے میری کارکردگی کو سراہنے لگا تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''عبید صاحب! آپ کا جو بندہ ہر پیشی پر عدالت میں موجود ہوتا ہے اور بعد ازاں آپ کو عدالتی کارروائی کی رپورٹنگ کرتا ہے، کیا وہ چشمہ لگاتا ہے اور اس کی چندیا نمایاں نظر آتی ہے؟''

''نہیں تو.....'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟''

میں نے مذکورہ شخص کا حلیہ اور خال وخط کی تفصیل بیان کرنے کے بعد ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ''وہ بھاری

جثے کا مالک ایک دراز قامت انسان ہے۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ اور سر فارغ البال۔ صرف اس کی کھوپڑی کے گرداگرد بالوں کی ایک جھالر دکھائی دیتی ہے.....''

اس نے میری بات گہری توجہ سے سنی اور میرے خاموش ہونے پر سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''وکیل صاحب! آپ نے تو ذوالفقار کی شخصیت کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔''

''کیا.....!'' عبید کی بات سن کر مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ بے ساختہ میری زبان سے نکلا۔ ''آپ کا مطلب ہے، ذوالفقار المعروف بہ زلفی انکل؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

میں نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔ ''وہ ہر پیشی پر عدالت کے کمرے میں کیوں موجود ہوتا ہے؟''

''آپ پتا لگانے کی کوشش کریں۔'' وہ معنی خیز مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجاتے ہوئے بولا۔ ''آپ ایک ذہین اور جہاں دیدہ وکیل ہیں۔ مجھے یقین ہے، آپ کو ذوالفقار کی کمرائے عدالت میں باقاعدہ آمد کی وجوہات تک رسائی حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی.....''

میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

''میں سمجھتا ہوں، یہ کیس اب ایک دو پیشیوں کی مار ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آپ کو اس کیس کے ختم ہونے سے پہلے میرا ایک کام کرنا ہے۔''

میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کون سا کام؟''

''آپ نے دلاور کو اس بات کے لیے راضی کرنا ہے کہ باعزت رہائی کے بعد وہ کراچی کو اپنے ذہن سے نکال دے اور سیدھا حیدرآباد آجائے۔ میں اس کی رہائش کا بڑا معقول بندوبست کردوں گا۔'' وہ اپنے منصوبے کی تفصیلات سے مجھے آگاہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ کیس جس سمت کو جارہا ہے اس میں آپ کی کامیابی اور سعیدہ خاتون اینڈ کمپنی کی ذلت کے امکانات بڑے روشن ہیں۔ اس صورتِ حال میں دلاور کا کراچی میں رہنا کسی بھی طور مناسب نہیں ہوگا۔''

''میں آپ کا کام کرنے کی کوشش کروں گا۔'' میں نے کہا۔

''صرف کوشش نہیں.....'' وہ ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے ہر قیمت پر میرا یہ کام کرنا ہے۔ آپ اسے میری خواہش سمجھ لیں۔''

عبیداللہ کے ساتھ اس عرصے میں خاصے خوشگوار دوستانہ تعلقات قائم ہوچکے تھے لہٰذا میں اس کی خواہش کو رد نہ کرسکا اور میں نے تسلی بخش انداز میں کہا۔ ''اوکے..... آپ کا کام ہوجائے گا عبید صاحب!''

''بہت بہت شکریہ بیگ صاحب!'' وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔ ''آپ بس دلاور کو اپنے ساتھ لے کر میرے پاس حیدرآباد آجایئے گا۔ باقی سب میں سنبھال لوں گا۔''

''سمجھ گیا!'' میں نے مختصر جواب دیا۔

وہ میرا شکریہ ادا کرکے رخصت ہوگیا۔

عبیداللہ ڈے ون سے دلاور کے کیس میں دامے، درمے، سخنے ہر نوعیت کی گہری دلچسپی لے رہا تھا۔ وہ اخلاقی اور مالی دونوں طریقوں سے دلاور کی بھرپور مدد کرتا دکھائی دیتا تھا اور اس تعاون کے اسباب کے ذیل میں اس نے پہلی ملاقات میں مجھے اپنے والد عبداللہ اور دلاور کی دیرینہ رفاقت اور پھر دلاور کی پراسرار ناراضی کی ایک دلچسپ کہانی بھی سنائی تھی۔ میں اس کہانی کی تصدیق کے لیے دلاور سے کوئی سوال نہیں کرسکتا تھا کیونکہ عبیداللہ نے مجھے اس سلسلے میں پابند کررکھا تھا۔ بہرحال میرے حساب سے یا تو عبیداللہ ایک انسان دوست اور اعلیٰ اخلاقی اوصاف کا حامل شخص تھا اور یا پھر اس کا دلاور کے ساتھ کوئی قریبی رشتہ تھا..... کیا رشتہ؟ یہ فی الحال میں نہیں جانتا تھا لیکن مجھے امید تھی کہ میں بہت جلد جان جاؤں گا.....!

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں ملزم کی اہلیہ سعیدہ خاتون کھڑی تھی۔ سعیدہ کی عمر پچاس کے اریب قریب تھی لیکن اس نے خود کو خاصا سنبھال کررکھا ہوا تھا۔ وہ دیکھنے میں اپنی بیٹیوں کی آپا نظر آتی تھی۔ وہ ایک پُرکشش اور جاذب نگاہ عورت تھی اور..... مزے کی بات یہ کہ انکل زلفی بھی اس وقت کمرائے عدالت میں موجود تھا..... اس بات سے بے خبر کہ میں نے اس کی خاص خبر رکھی ہوئی ہے۔ میرے تئیں وہ اس کیس کی ''ہیڈ لائنز'' میں تھا۔

میں دھیرے دھیرے اس کیس کو ایک ایسے موڑ پر کھینچ لایا تھا کہ آج کی عدالتی کارروائی نتیجہ خیز ثابت ہوسکتی تھی۔ سعیدہ نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیٹی

بردروغ بیان ریکارڈ کرادیا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔

کم وبیش پندرہ منٹ تک وکیل سرکار اور سعیدہ باہمی سوال وجواب کے ذریعے میرے مؤکل دلاور کو اس دنیا کا کمینہ اور ذلیل ترین انسان ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف رہے۔ میں نے ان کی لغویات کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے آؤٹ کردیا کیونکہ آج میں جس موڈ کے ساتھ عدالت آیا تھا، وہ ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ مجھے ہر صورت میں آج اس کیس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک کر اسے زمین کے پیٹ میں اتارنا تھا۔ سعیدہ کی حجامت بنانے کے لیے میں نے صفائی کے ایک دھانسو قسم کے مستند گواہ کو بھی اسٹینڈ بائی، عدالت کے کمرے کے باہر حاضر رکھا ہوا تھا۔

وکیل استغاثہ نے سعیدہ کو فارغ کیا تو بقول کسے، میں اس کی جان کو لپٹ گیا اور اس کے چہرے پر نگاہ گاڑ کر بڑے جارحانہ انداز میں اپنی جرح کا آغاز کیا۔

''سعیدہ صاحبہ! میں نے سنا ہے، آپ کی مشین کو کسی فقیر کی دعا ہے جو اس کی دن دوگنی، رات چوگنی کمائی سے آپ نے آٹھ لاکھ مالیت کا مکان بنالیا ہے؟''

''یہ کیا بے ہودگی ہے؟'' وہ ایک دم ہتھے سے اکھڑ گئی۔

''پتا نہیں، کس کس طرح کے لوگ وکیل بن گئے ہیں.....''

''آپ وکلا کی اقسام پر بعد میں ریسرچ فرمالیجیے گا۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''فی الحال یہ بتایئے کہ سلائی مشین کی کمائی کی بدولت آپ نے کس طرح ایک سو اسی گز کے پلاٹ پر آٹھ لاکھ مالیت کا گھر تعمیر کرلیا؟''

وہ برہمی سے بولی۔ ''آپ کون ہوتے ہیں مجھ سے یہ سوال کرنے والے؟''

''میں ایک خاص قسم کا وکیل ہوں۔'' میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''جو اس کیس پر اتارا گیا ہوں۔''

''آپ خود کو وکیل کم اور ایکسائز انسپکٹر زیادہ ثابت کرنے کی کوشش کررہے ہیں.....!'' وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی دیدہ دلیری سے بولی۔

اس موقع پر جج نے مداخلت کرتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''بی بی! آپ وکیل صفائی کے سوال کا سیدھا جواب دیں۔ فضول قسم کی جرح وبحث سے پرہیز کریں تو یہ آپ کے حق میں بہتر ہوگا۔''

وکیل استغاثہ نے اس کی اچھی خاصی تیاری کروا رکھی تھی کیونکہ مظلومہ فوزیہ کے بعد سعیدہ استغاثہ کی سب سے اہم گواہ تھی۔ پھر اسے عورت ہونے کا ایڈوانٹیج بھی حاصل تھا لہٰذا جج کی ڈانٹ کے جواب میں وہ گلوگیر آواز میں اپنا دکھڑا سنانے کھڑی ہوگئی۔ اس کا روئے سخن جج ہی کی جانب تھا اور وہ اپنے جذباتی ڈائیلاگ سے مسندِ انصاف پر متمکن اس شخص کو متاثر کرنے کی بھرپور کوشش کرنے لگی۔

''سر! میں نے کئی سال تک دن رات اپنی آنکھیں پھوڑ کر سلائی کا کام کیا ہے اور میری دو معصوم بچیوں نے صبح سے شام دفتری کام کیا ہے، تب کہیں جا کر یہ مکان بنا ہے اور ان وکیل صاحب کی اطلاع کے لیے یہ بھی بتاتی چلوں کہ اس گھر کی تعمیر میں زلفی بھائی کے بھی دو لاکھ لگے ہوئے ہیں۔ اس بھلے مانس شخص نے ابھی تک اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ نہیں کیا لیکن ظاہر ہے، یہ دو لاکھ روپے تو ہمیں ہر صورت لوٹانا ہیں.....'' اس نے لمحاتی توقف کیا پھر میری جانب دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں ایک گہری چوٹ کی۔

''وکیل صاحب! کسی پر انگلی اٹھانا بہت آسان کام ہے لیکن کسی کے درد کو سمجھنا بہت مشکل۔ کون کس حال میں زندہ ہے، اس کے بارے میں آپ جیسا خردماغ وکیل کیا جانے..... قبر کا احوال مُردے ہی کو معلوم ہوتا ہے۔''

ان لمحات میں سعیدہ بہت اچھی اداکاری کررہی تھی۔ میں نے اس کے لیے ایک ٹائٹل بھی سوچ لیا..... ملکۂ جذبات سعیدہ خاتون!

''سعیدہ صاحبہ!'' میں نے اس کی تقریر دلگیر سے متاثر ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''آپ بڑی خوش قسمت ہیں کہ آپ کو ایک طلسماتی سلائی مشین کے ساتھ ہی ایک دیالو قسم کا منہ بولا بھائی بھی میسر ہے۔ براہِ مہربانی یہ بتادیں کہ کورنگی والے مکان کے علاوہ بھی آپ کے نام پر کوئی پراپرٹی ہے؟''

''آپ بھی کمال کرتے ہیں وکیل صاحب! آخر آپ کو ہوکیا گیا ہے؟'' وہ غصیلی نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ ''میں نے ابھی بتایا ہے نا کہ کتنی مشکل سے ایک مکان بنانے میں کامیاب ہوئی ہوں جس کے اندر میں دو لاکھ کی مقروض بھی ہوں.....''

''ہاں یا نہیں..... میں جواب دیں!'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے روکھے انداز میں استفسار کیا۔ ''کورنگی

والے آٹھ لاکھ مالیت کے مکان کے علاوہ آپ کی کوئی پراپرٹی ہے یا نہیں؟''

''نہیں..... نہیں..... نہیں!'' وہ حلق کی پوری قوت سے چلائی۔

میں نے اس کی چلاہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی فائل میں سے چند کاغذات نکال کر جج کو دیے پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جناب عالی! دو سال پہلے استغاثہ کی گواہ اور میرے مؤکل کی بیوی سعیدہ خاتون نے گلشن اقبال کے ایک رہائشی پروجیکٹ میں دو لگژری اپارٹمنٹ بک کرائے تھے جو اب تکمیل کے آخری مراحل میں ہیں۔ موصوفہ نے مذکورہ اپارٹمنٹس کی مکمل ادائیگی کر دی ہے۔ میں نے اپنے ذرائع استعمال کر کے متعلقہ ڈاکیومینٹس کی یہ نقول حاصل کی ہیں جو سعیدہ خاتون کو ان دو اپارٹمنٹس کی مالک ثابت کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر اپارٹمنٹ کی قیمت پانچ لاکھ روپے ہے یعنی دو سال میں بصورتِ اقساط استغاثہ کی گواہ سعیدہ خاتون نے اس رہائشی پروجیکٹ کے بلڈر کو کل مبلغ دس لاکھ روپے ادا کیے ہیں۔ اب اگر استغاثہ کی گواہ آپے سے باہر آنے کی کوشش نہ کریں تو.....'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''تو میں ان سے یہ پوچھنے کی جسارت کرنا چاہتا ہوں کہ جو عورت پہلے سے دو لاکھ کی مقروض ہو اور اس کا کوئی مستحکم ذریعۂ آمدنی بھی نہ ہو وہ دس لاکھ مالیت کے دو لگژری اپارٹمنٹس کس طرح خرید سکتی ہے؟ استغاثہ کی گواہ کا جو بھی جواب ہو میں اس پر مزید کوئی سوال نہیں اٹھاؤں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ سلائی مشین کا نہیں بلکہ مالِ حرام کا چمت کار ہے اور اسی بے راہ روی سے میرا مؤکل اپنی بیوی اور دونوں بیٹیوں کو روکنا چاہتا تھا چنانچہ اس غیر منذ شخص کو اپنے راستے کا پتھر سمجھ کر انتہائی گھناؤنے الزامات کے ساتھ اس خطرناک مقدمے میں الجھا دیا گیا ہے.....''

''آپ جھوٹ بولتے ہیں..... بکواس کرتے ہیں.....'' سعیدہ ایک دم پھٹ پڑی۔ ''آپ کو ہماری کردار کشی کرنے کا حق کس نے دیا ہے۔ میں آپ پر ایسا خوف ناک مقدمہ کروں گی کہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے آپ کو چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا..... آپ مجھے بہت ہلکا لے رہے ہیں۔ آپ کو اندازہ نہیں کہ میری پہنچ کہاں تک ہے.....؟''

''اندازہ ہے اسی لیے تو میں نے آپ کی دم پر پاؤں رکھا ہے۔'' میں نے اٹل لہجے میں کہا۔ ''تھوڑی دیر پہلے آپ کسی مسکین بلی کے مانند ''میاؤں، میاؤں'' کر کے اپنی مظلومیت ثابت کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ میں نے جیسے ہی آپ کی دکھتی ہوئی رگ پر انگلی رکھی تو آپ فوراً کسی شیرنی کی طرح غرانے لگی ہیں۔ اب میں بھی کسی رعایت سے کام نہیں لوں گا۔ شرافت کی زبان آپ جیسی بازاری عورتوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔''

''آپ کیا بگاڑ لیں گے میرا؟'' وہ تنتنائی۔

''میں بھری عدالت میں یہ ثابت کر دوں گا کہ آپ ایک آبرو باختہ عورت ہو اور اپنی دونوں بیٹیوں کو بھی بدکاری کے اسی دھندے میں ڈال رکھا ہے۔'' میں نے شرافت کی زبان کو کسی حد تک بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا۔ ''اور اس مذموم کام میں آپ کا منہ بولا بھائی زلفی ایک دلال کا کردار ادا کر رہا ہے۔ اس کے آفس میں نصف درجن سے زیادہ لڑکیاں کام کرتی ہیں۔ وہ ایک سپلائر ہے۔ مون انٹر پرائزز کی آڑ میں وہ جسم فروشی کا اڈا چلا رہا ہے۔ آپ کے حیدر آباد کے زمانے سے زلفی سے تعلقاتِ ناجائز ہیں اور وہی آپ لوگوں کو حیدر آباد سے کراچی لایا تھا۔ میرا مؤکل تم لوگوں کے گندے کھیل کو سمجھ گیا تھا اور تمہیں سمجھانے کی کوشش کرتا تھا کہ بدکاری اور بے حیائی کی راہ ترک کر کے سیدھے راستے پر آ جاؤ مگر تمہارے جسموں کو گناہ کا چسکا لگ گیا تھا۔ اس بدکاری کے بدلے میں تمہیں بہت زیادہ پیسا مل رہا تھا۔ تم عیش و آرام کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں اسی لیے..... اسی لیے تم ماں بیٹیوں نے ایک گہری سازش کے تحت اس بے چارے کو ایک ایسے مقدمے میں الجھا دیا کہ اس کی ساری زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزر رہے۔ میری ایک بات کا جواب دو سعیدہ خاتون!''

''تم جواب کی بات کرتے ہو۔'' وہ انتہائی بدتمیزی سے بولی۔ ''میں تمہارا منہ نوچ لوں گی۔''

''آرڈر پلیز.....'' جج نے رعب دار آواز میں کہا۔

کرائے عدالت میں لحاتی بھنبھناہٹ کے بعد سناٹا چھا گیا۔ دو لگژری اپارٹمنٹ کی ملکیت کے کاغذات کو دیکھ کر جج بہت کچھ سمجھ چکا تھا اور اب تو معاملہ پراپرٹی سے کہیں آگے عزت و آبرو کے مراحل میں داخل ہو چکا تھا۔ لہٰذا جج نے کرنٹ افیئرز کو اہمیت دیتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

''بیگ صاحب! ابھی آپ نے استغاثہ کی گواہ اور اس

کی بیٹیوں کے کردار کے حوالے سے جو کچھ کہا ہے اس سلسلے میں آپ کوئی ٹھوس ثبوت عدالت میں پیش کر سکتے ہیں؟''

''ایک ثبوت تو لیگل ڈاکیومینٹس کی صورت میں اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے سر۔'' میں نے نہایت ہی مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ''ان خاتون کی نہ تو کوئی لاٹری لگی اور نہ ہی کوئی پرائز بانڈ نکلا، پھر اتنا زیادہ پیسا ان کے پاس کہاں سے آ گیا۔ ایسا صرف اسی صورت ممکن ہے جب کوئی منشیات کے دھندے میں ملوث ہو اور یا پھر جسم فروشی کو اپنا پیشہ بنا لے۔ اگر استغاثہ کی گواہ میرے ایک سوال کا جواب دے دے تو استغاثہ کی عمارت دھڑام سے زمیں بوس ہو جائے گی۔''

''آپ سوال پوچھیں۔'' جج نے مجھ سے کہا پھر سعیدہ کی جانب دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''بی بی! آپ عدالت کے وقار کا پاس کرتے ہوئے نہایت ہی شائستہ الفاظ میں وکیل صفائی کے سوال کا جواب دیں۔''

''سعیدہ صاحبہ! اگر میرا مؤکل واقعتاً ایک ہوس پرست انسان تھا تو اس نے سوتیلی بیٹی کی عزت کو برباد کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی جب کہ وہ ملزم کے لیے ایک ایزی ٹارگٹ تھی اور وہ بھی الگ کمرے میں بالکل اکیلی سوتی تھی۔''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا، لکنت زدہ لہجے میں مجھ سے مستفسر ہوئی۔ ''کک..... کون سی..... سوتیلی..... بیٹی.....؟''

''میں سحرش کی بات کر رہا ہوں.....'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''سحرش میری سوتیلی بیٹی نہیں ہے۔'' وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ''سحرش اور فوزیہ کو میں نے ہی جنم دیا ہے۔''

''بے شک! آپ نے ان دونوں لڑکیوں کو جنم دیا ہے اور آپ ان کی سگی ماں ہیں لیکن یہ دونوں دو الگ مردوں سے ہیں۔'' میں نے اس کی طبیعت صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے آپ کی نہیں ملزم کی سوتیلی بیٹی سحرش کی بات کی ہے جس کے باپ کا نام طفیل ہے۔''

سعیدہ کے چہرے پر زلزلے کے آثار پیدا ہوئے۔ وہ بکھری ہوئی آواز میں بولی۔ ''اس بے بنیاد دعوے کا کوئی ثبوت ہے آپ کے پاس؟''

''میں ثبوتوں کا ماؤنٹ ایورسٹ اپنے ساتھ لے کر چلتا ہوں سعیدہ خاتون۔'' میں نے اس کے کانوں کے کیڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''آپ کا سابق شوہر اور سحرش کا باپ طفیل اس وقت عدالت کے کمرے کے باہر موجود ہے جسے میں نے گواہی کے لیے حیدر آباد سے یہاں بلایا ہے۔ آپ نے طفیل کے جیل چلے جانے کے بعد میرے مؤکل سے شادی کر لی تھی اور وہ بھی طفیل سے طلاق لیے بغیر..... اب آپ خود اندازہ لگا لیں کہ اس وقت آپ بے حیائی اور بے غیرتی کے کس مقام پر فائز ہیں؟''

''یہ استغاثہ کی گواہ کے پہلے شوہر کا کیا معاملہ ہے بیگ صاحب؟'' جج نے مجھ سے پوچھا۔

''جناب عالی! میرے مؤکل سے نکاح کرنے سے پہلے سعیدہ، طفیل نامی ایک شخص کی بیوی ہوا کرتی تھی جو اس منہ کالک سحرش کا سگا باپ ہے۔ وہ بدنصیب ایک ناکردہ جرم کے الزام میں لمبے عرصے کے لیے جیل چلا گیا تھا۔ سعیدہ نے ملزم سے جھوٹ بولا کہ اس نے طفیل سے طلاق لے لی تھی۔ سادہ لوح دلاور نے سعیدہ کی بات کا یقین کر لیا اور اسے سحرش کے ساتھ اپنانے کو تیار ہو گیا۔ دلاور کی بیوی عالیہ کا کچھ عرصہ پہلے انتقال ہو گیا تھا جس [illegible] سے اس کی سات سالہ ایک بچی شبانہ تھی۔ دلاور نے دونوں بچیوں کو ایک جیسا پیار دیا اور اس دوران میں سعیدہ کے بطن سے دلاور کی بیٹی فوزیہ پیدا ہوئی پھر جب یہ لوگ حیدر آباد سے کراچی شفٹ ہوئے تو شبانہ بیس سال کی، سحرش اٹھارہ سال کی اور فوزیہ سولہ سال کی تھی۔ سعیدہ نے سب سے پہلے شبانہ کو بدکاری کی ترغیب دینا شروع کی۔ وہ اس لائن پر نہ آ سکی اور چھ سال پہلے وہ گھر سے فرار ہو گئی کیوں کہ اس نے بھانپ لیا تھا کہ دلاور کی اپنی بیوی کے سامنے بالکل نہیں چلتی لہٰذا اس نے فرار ہی میں اپنے لیے نجات محسوس کی تھی اور اب میں.....'' میں نے سانس ہموار کرنے کے لیے لمحاتی توقف کیا پھر بہ آواز بلند کہا۔

''معزز عدالت کی اجازت سے اپنے گواہ طفیل کو کٹہرے میں لانے کی اجازت چاہوں گا جس کے بارے میں سعیدہ نے سوچ لیا تھا کہ وہ تمام عمر جیل میں سڑے گا۔ طفیل کی خوش قسمتی اور سعیدہ کی بدبختی کہ وہ دو ماہ پہلے ہی رہا ہوا ہے۔ وہ اپنی بیوی سعیدہ اور بیٹی سحرش کو تلاش کر رہا تھا کہ اتفاق سے میرے ہتھے لگ گیا اور میں اس شخص کو حیدر آباد سے کراچی لے آیا ہوں..... دیٹس آل یور آنر۔''

''گواہ کو پیش کرنے کی اجازت ہے۔'' جج نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

آیندہ پندرہ منٹ میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوگیا۔ طفیل کی گواہی نے سعیدہ کو تیورا کر کٹہرے کے فرش پر گرنے پر مجبور کر دیا۔ جج نے سعیدہ کی ابتدائی طبی امداد کے لیے متعلقہ عدالتی عملے کو احکامات صادر کیے اور اس کے ساتھ ہی انکوائری آفیسر فرید خان کو اس بات کا پابند کیا کہ وہ فتنے کی جڑ ذوالفقار عرف زلفی کو اگلی پیشی پر حاضر کرے۔ میں اس موقع پر چپ نہ رہ سکا۔

''جناب عالی!'' میں نے کراری آواز میں کہا۔ ''بے حیا آنٹی سعیدہ کا منہ بولا بھائی اور اس کی جائی ہوئی دو منہ کالک بچیوں کا انکل زلفی اس وقت کمرائے عدالت میں موجود ہے۔''

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر زلفی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر عدالت کے دروازے کی طرف دوڑ لگا دی لیکن مزے کی بات یہ کہ متعلقہ عدالتی عملے نے اس شیطان صفت انسان نما درندے کو دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی قابو کر لیا۔ اس کے بعد عدالت کے کمرے میں جو کچھ ہوا ہوگا، اس کا آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں.....

میں صرف آپ کو اتنا بتا سکتا ہوں کہ اگلی پیشی پر عدالت نے میرے مؤکل دلاور کو باعزت بری کر دیا تھا۔

☆☆☆

حیدرآباد لے جانے کے لیے مجھے دلاور پر زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ اس کیس کے حوالے سے وہ میرا اس قدر ممنونِ احسان ہو چکا تھا کہ میرے ایک ایک لفظ کے سامنے وہ کسی بے دام غلام کے مانند بچھا جا رہا تھا۔ جب ہم حیدرآباد میں عبیداللہ کے گھر پہنچے تو ہم دونوں کو ایک جھٹکا لگا۔ اس جھٹکے میں حیرت، استعجاب اور الجھن..... سب کچھ شامل تھا۔

عبیداللہ اور اس کی بیوی نازش نے ہمارا پرتپاک استقبال کیا تو دلاور نازش کو دیکھتے ہی پتھر کا بت بن گیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی جادوگر نے اس پر سحر پھونک دیا ہو۔ میں خود بھی پریشان تھا کہ آخر اسے ہوا کیا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ عبیداللہ اور نازش کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ میں ایک معما تہمت کو نمٹا کر آیا تھا اور یہاں پر ایک معما سچویشن میری منتظر تھی.....!

کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے..... اور دلاور کے لبوں سے لرزیدہ صدا جدا ہوئی۔ ''شبانہ بیٹی..... تم..... یہاں.....؟''

اس کے بعد وہ دونوں کمان سے نکلے ہوئے تیروں کے مانند ایک دوسرے کے سینے میں پیوست ہوگئے۔ باپ اور بیٹی کے سنگم کا یہ منظر بیک وقت بڑا رقت آمیز، دل فریب اور مسحور کن تھا۔ چھ سال سے بچھڑے ہوئے باپ بیٹی کا ملاپ اچانک اور غیر متوقع طور پر ہوگیا تھا اور اس تمام تر بکھیڑے کے پیچھے عبیداللہ کی جدوجہد کو اولیت حاصل تھی۔

عبیداللہ نے دانستہ مجھے اپنی بیوی کا نام غلط بتایا تھا تاکہ میں ایک خاص وقت سے پہلے اس کی حقیقت سے واقف نہ ہو سکوں۔ وہ نازش نہیں، شبانہ تھی جو چھ سال قبل اپنی عزت بچا کر کراچی سے حیدرآباد اپنے ماموں ریاست علی کے پاس آ گئی تھی۔ ریاست علی جوانی میں حیدرآباد کا نامی گرامی پہلوان رہ چکا تھا۔ اب وہ ریٹائرلائف گزار رہا تھا اور معاشرے میں اس کی بڑی عزت تھی۔ پانچ سال پہلے ریاست علی نے اپنی بھانجی شبانہ کی شادی، عبیداللہ سے کر دی تھی۔ آدھے گھنٹے کے بعد شبانہ اور دلاور نارمل ہوگئے۔

''بیگ صاحب!'' عبیداللہ نے مجھ سے کہا۔ ''میں والد کے سائے سے محروم ہوگیا تھا۔ انکل دلاور کی شکل میں میری محرومی کا ازالہ ہوگیا ہے۔ اب یہ تاحیات اسی گھر میں ہمارے ساتھ رہیں گے۔''

''اس فیصلے سے آپ کے مغفور باپ کی روح کو بہت سکون ملے گا عبید صاحب۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ان کی زندگی میں نہ سہی، چلیں ان کی وفات کے بعد ہی دلاور نے اس گھر کے در و دیوار اور ان در و دیوار کے اندر بسنے والے مکینوں سے اپنی ناراضی ختم کر دی ہے۔''

''اور اس نیک کام کا سہرا آپ کے سر سجتا ہے بیگ صاحب!'' عبید تشکرانہ نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا۔ ''یہی بات میں آپ کے لیے بھی کہہ سکتا ہوں۔''

''تم دونوں نے اپنا اپنا کام کیا ہے۔'' دلاور نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں نے اپنا معاملہ سپردِ خدا کر دیا تھا۔ اسی مالک نے دو فرشتوں کو آپ دونوں کی انسانی شکل میں میری مدد کے لیے زمین پر اتار دیا تھا۔''

میں دلاور کی فلاسفی سے صد فیصد متفق ہوں۔ اگر انسان خلوصِ نیت کے ساتھ صرف اپنے کام پر توجہ دے تو مشکل مراحل میں امدادِ غیبی اس کا مقدر ٹھہرتی ہے.....!

(تحریر: حسام بٹ)

زمرد، زمرد پکارتا ہوا بے تاب شہزادوں جیسے ہی اسے ڈھونڈتے ہوئے زنانہ سوئمنگ پول کے سامنے پہنچا، وہ حیرت اور خوف سے ساکت ہو کر رہ گیا۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں باہر کو ابل آئیں۔

اس کی بیوی، اس کی سابقہ محبوبہ، اس کی مقصود حیات نیم عریاں حالت میں بے حس و حرکت اِدھر اُدھر ڈول رہی تھی۔ اس کے سینے سے خون ابل ابل کر پانی کو سرخ کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کی دنیا اور زندگی کسی ظالم اور سنگ دل نے برباد کر دی تھی۔

وہ زمرد، زمرد چلاتا ہوا سوئمنگ پول میں کود پڑا اور اس کے بے جان وجود کے پاس جا کر اس کے چہرے اور سینے کا جائزہ لینے لگا۔ اسے دیوانگی کے عالم میں پکارنے لگا لیکن اس کے ساکت اور سرد ہونٹ کیا جواب دیتے۔

وہ تیزی سے پانی میں ہاتھ مارتا ہوا باہر نکلا اور چلا کر

جدید دور کے ہتھیاروں سے لیس ایک حسینہ کا انتقام

رقابت اور حسد کا اگر دنیا میں کوئی وجود ہوتا تو یقینا مسلسل بھڑکنے والی آگ ہوتا... اور یہ کتنی حیرت کی بات ہے کہ یہ آگ محض ایک جذبہ بن کر انسان کے دل میں یوں گھر کر لیتی ہے کہ زندگی فقط جہنم بن کر رہ جاتی ہے... کچھ ایسا ہی حال اس کا بھی ہوا جو محبت کے چھن جانے پر پل پل جینے اور مر جانے کی اذیت میں مبتلا تھی...

آلۂ قتل

انجم فاروق ساحلی

خواتین ڈائجسٹ

جنوری 2020

Download

www.pklibrary.com

ملازموں کو آوازیں دینے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد ملازم اور مہمان جمع ہو گئے۔ نمکین آنسوؤں کا ذائقہ اس کے منہ میں آ گیا۔ آج شام زمرد کی سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائی جانے والی تھی مگر کسی ستم گر اور سنگ دل نے ''گل محل'' کی خوشیوں کو لوٹ لیا تھا۔ صفِ ماتم بچھ گئی۔ گل دوستوں کے حلقے میں رو رہا تھا۔ زمرد کی لاش کو سفید چادر سے ڈھک دیا گیا تھا۔ رشتہ داروں کی سسکیوں سے فضا گونجنے لگی۔ زمرد کی ماں بہنوں اور سہیلیوں کا برا حال تھا۔ وہ بے حد حسین، خوش گفتار اور مجسمۂ حسنِ سلوک تھی۔

اس وقت شہزاد گل کا نیا دوست انسپکٹر عمران تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گل کے پاس پہنچا اور اسے تسلی دی پھر تالاب کے کنارے آ کر ماہرانہ انداز سے تالاب اور اردگرد کا جائزہ لیا۔ پول میں کودنے کے مقام کی سیدھ میں کسی کے قدموں کے نشانات دیکھنے کی کوشش کی لیکن ہلکی پھوار پڑ چکی تھی۔ یہ امکان بھی معدوم ہو گیا۔

اب انسپکٹر عمران نے محدب عدسہ نکال لیا۔ وہ ایک ماہر سراغ رساں تھا۔ اس نے محدب عدسے سے گھاس کا جائزہ لیا تو خون کے کچھ دھبے نیچے گھاس کی جڑوں میں پھیلے ہوئے دکھائی دیے۔ اس سے انسپکٹر عمران نے یہ اندازہ لگایا کہ زمرد گل نہا کر باہر نکلی۔ وہ اپنے اتارے ہوئے کپڑوں کی طرف بڑھنا چاہتی تھی۔ جو کچھ دور اب بھی اسٹینڈ پر لٹک رہے تھے لیکن اس وقت قاتل سامنے آیا اور اس نے اس کے سینے پر گولیاں ماریں جس سے وہ لڑکھڑا کر پھر سوئمنگ پول میں جا گری اور لاش بن کے پانی میں تیرنے لگی اور خون سطحِ آب پر پھیلنے لگا۔

انسپکٹر عمران نے اندازہ لگایا کہ تالاب کے داخلی مقام کے سامنے جو سرخ پھولوں والا درخت لگا ہوا ہے، قاتل اس کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ وہ سامنے آیا اور بے آواز فائر کر کے زمرد کے دل کو نشانہ بنایا۔ اس لیے اسے چیخنے کا موقع بھی شاید نہ مل سکا۔ کچھ دیر بعد دیگر..... عملہ اور پوسٹ مارٹم والے آ گئے۔ تصاویر اتریں۔ لاش معائنے کے لیے چلی گئی۔ پارک کے درختوں اور جھاڑیوں سے انگلیوں کے نشانات نہ مل سکے۔ تالاب کے اردگرد کی تمام اشیا پر بھی ایکسپوزر پاؤڈر چھڑک کر جائزہ لیا گیا لیکن صرف شہزاد گل اور زمرد گل مرحومہ کے نشانات ہی مل سکے۔

''آپ کی بیگم کی کسی سے دشمنی یا رنجش تو نہیں تھی؟'' انسپکٹر عمران نے گل کو الگ کرتے ہوئے پوچھا تو گل نے زور زور سے انکار میں سر ہلاتے ہوئے تردید کی۔ انسپکٹر عمران نے لیڈیز کانسٹیبلو بلوالیں کیونکہ مہمانوں میں عورتوں کی تعداد کافی زیادہ تھی۔ زمرد کی سہیلیاں بھی کافی تھیں اور شہزاد گل چونکہ ماڈلنگ کرتا تھا، کمرشل اشتہارات بنواتا تھا لہٰذا سالگرہ پارٹی میں خواتین پیش پیش تھیں۔ ان کی تعداد مردوں سے زیادہ تھی۔

اگلے روز پوسٹ مارٹم کی رپورٹ مل گئی۔ اسے تین چار گز کے فاصلے سے چھوٹے پستول کی مدد سے قتل کیا گیا تھا۔ انسپکٹر عمران نے کمروں کی تلاشی لی، پوری عمارت چھان ماری، باغ کو بھی کھنگالا گیا لیکن آلۂ قتل نہ ملا۔ پولیس سٹپٹا کر رہ گئی۔ قتل کے بعد داخلی دروازے بند کر دیے گئے تھے اور مہمانوں کے علاوہ ملازمین، ڈرائیور کسی کو بھی باہر جانے کی انسپکٹر عمران کی طرف سے اجازت نہیں تھی۔ مہمان اپنے اپنے گھروں میں حادثے کی اطلاعات موبائل فون پر بھیج چکے تھے۔ کچھ مردوں اور عورتوں کے موبائل فون بھی انسپکٹر عمران نے اچانک لے کر چیک کیے لیکن کوئی سراغ نہ ملا۔ قاتل بے حد ہوشیار تھا اور سالگرہ اور کوٹھی کے پورے ماحول سے واقف تھا۔ اس نے بڑی چالاکی سے اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنایا تھا۔

اِدھر اُدھر کے لوگ جن کو فون پر حادثے کی اطلاع ہوئی وہ بھی افسوس کے لیے آنے لگے۔ مالی اور خدمت گار قسم کے لوگ غمگین اور بجھے بجھے تھے۔ جب شہزاد گل اور ان کی مالکن بگھی پر بیٹھ کر پرانے باغ اور علاقے کی سیر کو نکلتے تو انہیں بخشش مل جایا کرتی تھی۔ کچھ غریب لوگ پانی کی کمی کی وجہ سے گل محل کے بڑے ٹیوب ویل پر کپڑے دھونے بھی آیا کرتے تھے۔

دور کے مہمان اور رشتے داروں کے آنے کے بعد زمرد گل کو گل پاشی کرتے ہوئے پرانے قبرستان کے مخصوص ایریے میں جہاں گل محل کے بزرگوں کی قبریں تھیں، آنسوؤں، آہوں اور سسکیوں کے ساتھ سپردِ خاک کر دیا گیا۔

پھولوں اور پتیوں پر شہزاد کے آنسو گرنے لگے اس وقت انسپکٹر عمران نے نرمی سے شہزاد گل کو سمجھاتے ہوئے پیچھے ہٹایا۔

..... قاتل کو گالیاں اور برا بھلا کہا جا رہا تھا۔ ایک فلم پروڈیوسر بھی غم سے نڈھال تھا۔ وہ دونوں میاں بیوی کو بھی اپنی نئی فلم میں کاسٹ کر چکا تھا۔ اب شہزاد کا کام کرنا بھی ممکن نہ تھا۔ اس پر تو قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ ابھی اسے سنبھلنے کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔ زمرد اور شہزاد نے لو میرج کی تھی۔ کچھ خوابوں کی تعبیر انہیں مل گئی تھی اور کچھ ابھی ان کی آنکھوں میں ہی بسے ہوئے تھے کہ کسی ظالم نے ظلم کی انتہا کر دی۔

''میں قاتل کو گرفتار کرنے کی پوری کوشش کروں گا اور جلد ہی وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوگا۔'' انسپکٹر عمران نے

شہزاد گل کو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ شہزاد گل اثبات میں سر ہلانے لگا۔

''ہاں آپ کے فن سراغ رسانی کی دھوم ہے۔ میں نے آپ کے کارنامے پڑھے بھی ہیں اور سنے بھی ہیں۔ مگر میں تو برباد ہوگیا۔ اب میں کس کے سہارے زندگی بسر کروں گا۔'' شہزاد گل نے دردناک لہجے میں کہا۔

''شہزاد میاں! صبر اور ہمت سے کام لو، اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کرلو۔ یہ دنیا تو فقط ایک امتحان گاہ ہے۔ ہر خواہش یہاں پوری نہیں ہوتی۔ لوگ ہمیں گولہ بارود سے کھیلنے والے مشینی لوگ سمجھتے ہیں۔ جیسے ہم کسی اور دنیا سے آئے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے۔ ہمارا فرض ہمیں مسلسل قربانی کا سبق سکھاتا ہے۔ جذبات کی، وقت کی، جان کی۔ آپ کی مدد مجھے یاد ہے۔ ''میری گاڑی کے دونوں ٹائر مجرم نے فائرنگ کر کے پھاڑ دیے تھے اور میں نے آپ کی گاڑی میں لفٹ لے کر اس کا تعاقب کرتے ہوئے اسے گرفتار کرلیا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے آپ کوئی غیر نہیں ہیں بلکہ میرے اپنے گھر میں صفِ ماتم بچھ گیا ہے۔''

انسپکٹر عمران کی ناصحانہ گفتگو سن کر شہزاد کی حالت کچھ سنبھل گئی۔ اس نے رومال سے آنسو پونچھے اور انسپکٹر عمران کے گلے لگ گیا۔ جیسے اسے کسی چٹان کا سہارا مل گیا ہو۔ اس کا اپنا وجود لاغر اور بے وزن ہو رہا تھا۔

''ارمانوں کو دفن کرنا پڑتا ہے اس لیے کہ انسان مجبور محض زیادہ ہے۔ اختیار و ارادہ محدود ہے۔'' انسپکٹر عمران نے اسے پھر سمجھایا۔

☆☆☆

انسپکٹر عمران نے آلۂ قتل کو تلاش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اس کے اسسٹنٹ رؤف، ابراہیم اور اسرار بھی کوٹھی میں آچکے تھے۔ لوگوں سے مختلف سوالات کیے جا رہے تھے۔ ان کی مصروفیات اور شہزاد گل سے تعلق واسطوں کے لحاظ سے صورتِ حال پر غور کرتے ہوئے قاتل کو جاننے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

لیکن کامیابی ابھی قانون سے دور تھی۔ اس وقت انسپکٹر عمران نے تمام ملازمین کو بلا کر مختلف سوالات کیے اور آخر ایک سراغ ایسا مل گیا جس کی مدد سے وہ آگے بڑھ سکتے تھے۔

مالی حضرات چونکہ ہر سال سالگرہ والے دن صبح ہی صبح صفائی ستھرائی، پودوں اور پھولوں کی دیکھ بھال اور انہیں گل دانوں میں سجانے کے لیے کارکردگی دکھانے میں مصروف ہوتے تھے، اس لیے انہوں نے چار مہمانوں کے علی الصباح تالاب کی طرف جانے کا تذکرہ اور اقرار کرلیا۔ کیونکہ ظاہر ہے قاتل آسمان سے ٹپک کر واپس تو نہیں اڑ گیا تھا۔ اس لیے انسپکٹر عمران جاننے کے لیے بے چین تھا کہ تالاب کی طرف صبح کون لوگ گئے تھے۔ مالی پہلے تو ہچکچائے اور انکار کیا لیکن انسپکٹر عمران نے دال میں کالا دیکھ کر ڈرایا دھمکایا تو انہوں نے اقرار کیا کہ معزز مہمانوں میں چار تالاب کی طرف صبح صبح دیکھے گئے تھے۔ مالی پولیس کی تحقیق و سوالوں سے خائف تھے اس لیے وہ انکار کر کے جلد جان چھڑانے کے لیے.... انکاری تھے جبکہ ... دو لڑکیاں نیلم اور الماس ... اور دو مرد حضرات دوسری طرف نکل گئے تھے۔ ایک کا نام ندیم اور دوسرے کا احمد کمال تھا۔

اس وقت احمد کمال ہی انسپکٹر عمران کے سامنے میز کی دوسری طرف بیٹھا تھا۔ انسپکٹر عمران آرام دہ کرسی پر جھولتے ہوئے اپنی تیز نظریں اس پر مرتکز کر چکا تھا۔

''مسٹر کمال احمد صاحب! آپ علی الصباح تالاب کی طرف کیا کرنے گئے تھے جبکہ وہ خواتین کا سوئمنگ پول ہے۔ مردانہ تالاب عمارت کی دوسری جنوبی سمت واقع ہے۔ آپ شمال کی طرف کیوں گئے؟'' اس کا لہجہ سخت تھا۔ کمال احمد ایک ٹھنڈی آہ بھرتا ہوا کہنے لگا۔

''میں صبح کی سیر کا عادی ہوں میں اس طرف نہیں تھا۔ میں دوسری طرف ایک زخمی پرندے کو گرتا پڑتا دیکھ کر اس کے پیچھے آیا تھا کہ اگر میرے بس میں کچھ ہو تو میں اس کا خیال کروں لیکن وہ پرندہ.....'' کمال احمد نے انگلی سے تالاب کے پچھلے مغربی کنارے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہاں نڈھال ہو کر گر پڑا۔ میں نے اس طرف آ کے اسے تالاب میں گرتے دیکھا اور کچھ نہ کرسکا۔ وہ سطحِ آب پر تھا۔ میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ پانی کی سطح پر اس کا تھوڑا سا خون پھیل گیا۔ اگر اس طرف جائزہ لیا جائے تو میرے بیان کی تصدیق ہوجائے گی۔''

''مجھے پرندوں سے ہمدردی اور دلچسپی ہے۔ میں قدرتاً نرم مزاج واقع ہوا ہوں۔ میں نے ایک بار بچپن میں اپنے والد کے پنجرے کو کھول کر خوش رنگ پرندے اڑا کر آزاد کر دیے تھے۔

یہاں تک کہہ کر احمد کمال رک گیا۔ اس کی اداس سی نگاہ سامنے درخت پر چہچہاتے ایک پرندے کی طرف اٹھ گئی تھی وہ پُراشتیاق نگاہوں سے اس کا نغمہ موسیقی سننے لگا۔ انسپکٹر عمران نے محسوس کیا کہ وہ واقعی اچھے جذبات کا نرم خو آدمی ہے۔ یہ قاتل نہیں ہوسکتا لیکن اسے یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ بعض لوگ اپنے آپ پر ایسا خول چڑھا لیتے ہیں کہ انہیں پڑھنا ممکن نہیں

ہوتا کہیں معصومیت کی آڑ میں کچھ اور نہ ہو۔ اسسٹنٹ اسرار، انسپکٹر عمران کا اشارہ پا کر تالاب کے مغربی کنارے پر آیا اور تالاب میں کود کر پرندے کی لاش نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔

احمد کمال پرندے کی لاش دیکھ کر اداس اور مضمحل دکھائی دینے لگا۔ انسپکٹر عمران نے اسے کسی گڑھے میں دفن کرنے کا اشارہ کیا۔ احمد کمال انسپکٹر عمران کا اشارہ پا کر اٹھ گیا اور ندیم کو قریب بلا کر انسپکٹر عمران کے سامنے بٹھا دیا گیا۔ اس کام کے لیے رؤف اور ابراہیم متحرک تھے۔ انسپکٹر عمران نے ندیم کے قریب آتے وقت اس کا جائزہ لیا۔ وہ خوش شکل، خوش پوش اور چہرے مہرے سے ہوشیار آدمی معلوم ہوتا تھا۔ آنکھوں کی چمک اس کی ذہانت اور چالاکی کی غماز تھی۔ نقش و نگار اور لباس کے لحاظ سے وہ کوئی اداکار ہی معلوم ہوتا تھا۔

اس نے تعارف کرواتے ہوئے بتایا کہ وہ نیا روڈ مینگ ہیرو ندیم مغل ہے۔ جو راشد مقبول پروڈیوسر کی فلم میں شہزاد گل کے ساتھ ہی ایک رول ادا کرنے والا تھا کہ یہ المناک حادثہ پیش آ گیا۔ اس نے اپنے ہولڈر میں سگریٹ جماتے ہوئے کہا۔

''آپ علی الصباح زنانہ تالاب کی طرف کیوں گئے تھے؟'' انسپکٹر عمران کا لہجہ اس بار بھی سخت تھا۔

ندیم مغل نے انسپکٹر عمران کے کرخت لہجے کو سن کر ایک تنقیدی سی نگاہ ڈالی اور پہلو بدل کر بولا۔ ''انسپکٹر صاحب! ایسا بس اتفاقاً ہی ہوا۔ میری دوست روحی نے رات مجھ سے کہا تھا کہ میں عقبی باغ میں صبح ہی صبح تم سے ملوں گی اور پھر اپنے مستقبل کے بارے میں تبادلہ خیال کروں گی۔

''روحی کو بھی نہانے کا شوق ہے وہ شہزاد کی مسز زمرد گل صاحبہ سے ملنے اس طرف آ نکلیں اور میں جو باغ میں ادھر ادھر اسے تلاش کر رہا تھا، ڈھونڈتا ہوا ادھر آ گیا۔ بس یہ ہے اس طرف آنے کی وجہ ورنہ ہم آرٹسٹک لوگ فلموں، ڈراموں میں کتنا ہی خون خرابا کریں، عملی زندگی اس کے برعکس ہوتی ہے۔ مجھے باجی کی موت کا بے حد افسوس ہے۔ قاتل بدترین سلوک کا مستحق ہے۔'' ندیم مغل کے لہجے میں جوش اور انتقامی ولولہ سا پیدا ہو گیا۔

''کہیں آپ شہزاد گل کی شادی سے قبل زمرد کے پرستار تو نہیں تھے؟''

انسپکٹر عمران نے اس پر تیز نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

''نہیں..... نہیں..... ایسا ہرگز نہیں۔ ہمارا آپس میں میل جول نہیں تھا۔'' ندیم مغل کے چہرے پر تناؤ پیدا ہو گیا۔ ''کسی کو بلاوجہ ملوث کرنا اچھی بات نہیں ہوتی۔'' اس کے لہجے میں تلخی آ گئی۔

''ہمیں ہر پہلو سے سوچنا اور جائزہ لینا پڑتا ہے۔ انسانی چہروں کو پڑھنے کے لیے ہمیں طرح طرح کے سوالات کرنا پڑتے ہیں۔ آپ غصے کو قابو میں رکھیں۔'' انسپکٹر عمران نے اسے اٹھتا ہوا دیکھ کر سرزنش کی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''آپ نے فائر کی آواز تو نہیں سنی تھی؟'' انسپکٹر نے آخری سوال کیا۔

ندیم مغل نے نفی میں سر ہلایا اور دور نکلتا چلا گیا۔

اب انسپکٹر عمران کے اشارے پر لڑکی نیلم کو بلا کر سامنے بٹھایا گیا۔ رؤف اور اسرار کچھ فاصلے پر مؤدب انداز میں سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ انسپکٹر عمران نے محسوس کیا جیسے دوسری حسینۂ عالم اس کے سامنے آ بیٹھی ہے۔ زمرد گل کے بعد نیلم بھی کسی ہیرے کے مانند جگمگاتی ہوئی بے حد خوبصورت اور جاذب نظر لڑکی تھی۔ جس کا حسن جاں سوز کسی کو بھی دیوانہ بنا سکتا تھا اور انسپکٹر عمران یہ تو سمجھ ہی چکا تھا کہ مہمانوں میں ٹی وی اور فلم آرٹسٹوں کی تعداد کافی زیادہ ہے۔ ماڈلز بھی موجود ہیں۔ مقتولہ اور شہزاد گل کا پروفیشن ہی ایسا تھا۔ وہ فلم، ماڈلنگ اور کمرشل اشتہارات وغیرہ سے منسلک تھے۔

لڑکی نیلم کی اداؤں سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کوئی فلمی سین عکس بند کروا رہی ہے۔ سنہری بالوں کو جھٹکتے ہوئے کہنی میز پر ٹکا کر چاند چہرہ ہتھیلی پر جما لیا۔ جیسے کیمرا اسے ایکسپوز کرنے والا ہو۔ ''فرمائیے انسپکٹر صاحب'' اس نے دوسرے ہاتھ سے ہولڈر میں سگریٹ جما دیا۔

''آپ کسی زمانے میں شہزاد گل کی دوست رہ چکی ہیں۔ آپ کو تسلیم ہے؟'' انسپکٹر عمران نے اس کے باطن میں جھانکنے کے لیے نظریں اس پر مرکوز کر دیں۔

''بالکل دوست رہ چکی ہوں اور اب بھی ہوں، اس میں چھپانے والی کوئی بات نہیں۔ زندگی دو جمع دو چار نہیں ہوتی۔ یہ مختلف مراحل اور مختلف تجربات سے گزرتی ہے۔ کسی کو ایک کامیابی ملتی ہے تو کسی کو دوسری۔ شہزاد گل کے علاوہ مرحومہ مسز شہزاد زمرد بھی میری دوست تھیں۔ ہماری مثلث دوستی کی شکل میں برقرار تھی کہ کسی نے.....'' نیلم نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''کیا شہزاد گل ایک زمانے میں آپ کا آئیڈیل رہا ہے؟'' انسپکٹر عمران نے اسے کریدا۔

''صرف دوست رہا ہے۔'' اس نے خود اعتمادی سے پھر فلمی انداز اختیار کرتے ہوئے سگریٹ کا لمبا کش کھینچا پھر دھواں اگلا تو ماحول دھندلا گیا۔ اس کا چہرہ چھپ گیا۔

انسپکٹر عمران نے سگریٹ نوشی سے منع کر دیا۔ نیلم نے

سگریٹ ہولڈر ایش ٹرے میں رکھ دیا۔ اس کا ہاتھ سگار اور سنہری لائٹر سے کھیلنے لگا۔

''آپ علی الصباح اس طرف کیوں آئیں؟ تالاب کے کنارے زمرد گل کا مرڈر ہوا ہے۔ آپ شبہے سے بری نہیں ہیں۔'' انسپکٹر عمران نے اسے گھورتے ہوئے سوال کیا۔ نیلم اپنی باغی کیفیت کو اداکاری میں چھپا لیتی تھی۔ اس سوال پر چونک کر اس نے انسپکٹر عمران کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ انسپکٹر عمران کو ماننا پڑا کہ اس کی خود اعتمادی بھرپور تھی۔ وہ اب بالکل سنجیدہ تھی اور تن کر بیٹھ چکی تھی۔

''میں اس قانونی سوال کا مکمل جواب دوں گی۔ زندگی بھی ایک فلم ہی ہے جس میں ہم اپنا اپنا رول ادا کرتے ہیں۔ انسپکٹر صاحب! مجھے علی الصباح جوگنگ اور ورزش کرنے کی عادت ہے۔ میں اس ارادے سے بستر چھوڑ کر باہر نکلی، میں نے زمرد گل کا ورزش کلب کئی بار دیکھا تھا۔ اس مرتبہ میں وہاں جا کر اس کے ساتھ ہی ورزش کرنا چاہتی تھی۔'' نیلم نے انگلی سے تالاب کے دائیں جانب ایک چار دیواری کی طرف اشارہ کیا۔

''میں لیڈیز جم کے باہر زمرد گل کا انتظار کرنے لگی لیکن وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کا بندر بھی درختوں پر صبح کے وقت پھدکتا ہوا نظر آیا کرتا ہے لیکن وہ بھی غائب تھا۔ مجھے عجیب سا احساس ہوا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی تالاب کی طرف بڑھنے لگی۔''

نیلم نے ایک احاطے کی طرف اشارہ کیا۔ ''مجھے بندر کو دیکھنے کی بھی خواہش تھی کیونکہ یہ بندر کسی زمانے میں میرے والد صاحب کے پاس تھا، وہ اسے شکار پر اپنے ہمراہ ساتھ لے کر جایا کرتے تھے۔ بندر ہوشیار تھا۔ جب میرے حالات خراب ہوئے، والد صاحب انتقال کر گئے اور ایک دن زمرد نے بندر خریدنے کی خواہش ظاہر کی تو میں نے پالتو بندر اسے فروخت کر دیا تھا۔ مجھے بچپن سے ہی اس سے لگاؤ تھا۔

''میں نے بندر کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا اور ایک جگہ بے ہوش پایا پھر میں تیزی سے تالاب کی طرف بھاگی تو سامنے کا منظر دیکھ کر کلیجا منہ کو آ گیا۔ سر چکرا گیا پھر میں جیسے تیسے گرتے پڑتے اپنے کمرے تک پہنچی اور بیڈ روم میں بند ہو گئی اسی وجہ سے ابتدائی تفتیشی سوالات میں بھی کسی بات کا اقرار نہ کیا۔''

نیلم غمزدہ انداز میں سر جھکا کر سوچ میں پڑ گئی۔ انسپکٹر عمران کے لیے مشکل ہو رہا تھا کہ اس کے چہرے اور اعضا کی حرکات و سکنات سے حقیقت اور اداکاری کا فرق محسوس کرے۔ وہ ایک بڑی اداکارہ ثابت ہو رہی تھی۔

انسپکٹر عمران نے پینترا بدلا۔ ''مس نیلم صاحبہ! آپ کی اور زمرد گل کی دوستی کب کیسے اور کس جگہ ہوئی؟ دوستی کی مدت کتنے برس سے اور کبھی جھگڑا وغیرہ تو نہیں ہوا۔ حسد تو فنکاروں میں عام ہے۔ کیا آپ دونوں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش نہیں کرتی تھیں۔ ہوسکتا ہے آپ کسی وجہ سے ان سے خائف ہوں، انہیں پسند نہ کرتی ہوں۔'' اس نے جامع سوال سامنے رکھا۔

نیلم کچھ دیر خاموشی سے ماضی کا سفر طے کرتی رہی۔ وہ پرانی یادداشتیں یکجا کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ ماضی کی تلخیاں یاد آتے ہی وہ کچھ مضمحل اور اداس ہو گئی تھی۔ ''اکثر فنکاروں کا ماضی تلخ ہی ہوتا ہے۔'' اس نے کہا پھر چونک کر جھکا ہوا سر اٹھایا اور انسپکٹر عمران کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ''انسپکٹر صاحب!'' وہ پہلو بدل کر خود اعتمادی سے بولی۔

''فنکاروں کی زندگی کٹھن ہوتی ہے۔ زندگی کی بے رحم سڑک پر انہیں سایہ مشکل سے ملتا ہے۔''

''فلسفیانہ تمہید سے آگے بڑھیں۔'' انسپکٹر عمران نے جلدی سے کہا۔

''ہاں تو..... میں نے اور زمرد نے فنکارانہ زندگی کا آغاز سمن آباد چودھری کالونی سے کیا۔ پہلے گول چکر سے اندر دائیں ہاتھ چودھری کالونی آباد ہے۔ ہمارے گھر آمنے سامنے تھے۔ دونوں گھروں پر غربت کا سایہ تھا بلکہ آسیب زیادہ موزوں لفظ ہوگا۔ ہم نے اپنی محنت اور ہمت سے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ پھر چھوٹی چھوٹی ملازمتیں کیں مگر غربت کے بھیانک سائے سے نجات نہ ملی۔

''معاشرے کی ٹھوکروں نے بتایا کہ زندگی کتابی باتوں سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ حالات کے جبر اور تنگ دستی سے تنگ آ کے ہم دونوں نے ماڈلنگ اور فلم انڈسٹری میں قدم رکھ دیا۔ ہماری تصویروں کو پسند کیا گیا۔ ہمارا حسن و جمال جو غربت میں جلا ہوا تھا، اب نکھر کر سامنے آ گیا۔ ایک اسٹار میکر نے جب انواع و اقسام کے پھل اور رنگ برنگے کھانے کی میز پر ہمیں بٹھایا اور پھر اپنی لمبی موٹر کار میں ڈیفنس کی سیر کروائی تو ماڈلنگ کی دنیا کے رنگ ہماری آنکھوں کے سامنے بکھر گئے۔

''گھر والے ناراض ہوئے۔ بزرگوں کا کہنا تھا کہ

لوگ طرح طرح کے طعنے دے رہے ہیں۔ باتیں بنا رہے ہیں کہ ان کی لڑکیاں آوارہ ہوگئیں۔ نئی نئی کاروں میں، نئے نئے لوگوں کے ساتھ گھومتی پھرتی ہیں۔ حالانکہ ان شریف زادوں کی لڑکیاں جو گل چھپ چھپ کے کھلا رہی تھیں وہ کسی کو نظر نہ آئے۔

''ماڈلنگ کے بعد ڈراموں اور فلموں کی دنیا میں داخلہ مل گیا تو وہاں بھی ہم دونوں نے اکٹھے کام کیا، پھر الگ الگ بھی ہوگئیں۔ شیشہ دلوں میں بھی بال تو آ ہی جاتا ہے۔ پروڈیوسرز کو ایک دوسرے کے ہاتھ سے نکالنے اور اپنی طرف مائل کرنے کے خدشات نے ہمیں ایک دوسرے سے الگ کر دیا۔ ہمارے درمیان کچھ تلخیاں بھی ہوئیں۔ فلموں کی کاسٹ میں ردوبدل بھی ہونے لگا۔ کبھی وہ خوش ہوئی، کبھی میں ناخوش۔ اسی طرح سلسلہ چلتا رہا لیکن ہماری دوسری سہیلیوں نے ہماری صلح کروا دی اور اب میں زمرد کی سالگرہ میں شرکت کے لیے آئی اور جب تالاب پر گئی تو خون خشک ہوگیا۔ زمرد کی لاش دیکھ کر میں سہم گئی۔ ہم نے فلموں میں مار کٹائی، اموات، ہنگامہ خیزی گھیراؤ جلاؤ کے مناظر فلمبند کروائے لیکن ایک اصلی لاش اور وہ بھی جس سے زندگی کے رشتے ناتے جڑے ہوئے تھے، دیکھ کر میں تو دہشت زدہ ہوگئی۔''

نیلم نے مڑ کر تالاب پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے آپ آرام کر سکتی ہیں۔ اگر دوبارہ ضرورت ہوئی تو بلا لیا جائے گا۔ قاتل کو بڑے گھر بھیج کر ہی میں اپنے گھر جاؤں گا۔'' نیلم اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنی چمکیلی تیز نگاہوں سے انسپکٹر عمران کے پُرعزم چہرے کو دیکھتی ہوئی دور ہٹنے لگی۔

اب انسپکٹر عمران کے اشارے پر اسسٹنٹ فرحان لڑکی الماس کو قریب لے آیا۔ وہ کچھ نروس معلوم ہوتی تھی۔ گھبراہٹ اور اضمحلال نے اسے بے چین کر رکھا تھا۔ انسپکٹر عمران نے اسے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ لڑکی سنبھلی تو اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔ یہ لڑکی بھی شوبز سے تعلق رکھتی تھی اور کمرشل اشتہارات میں آج کل کامیابی کے جھنڈے گاڑ رہی تھی۔ بس فلموں سے دو قدم پیچھے تھی۔ اس نے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''مجھے بھی تالاب میں تیراکی کا شوق ہے اور زمرد باجی سے تیراکی کی ابتدائی مشق کرنے کے لیے اس طرف آتی تھی لیکن جب میں نے باجی کی لاش تیرتی ہوئی دیکھی تو مجھ پر خوف طاری ہوگیا میں بھاگ کر عقبی برآمدے سے عمارتی حصے میں جا کر اپنے کمرے میں بند ہوگئی۔ کتنی ہی دیر تک میں بستر پر نڈھال پڑی رہی۔ باجی زمرد نے میرے سر پر دستِ شفقت رکھ دیا تھا۔ میں دربدری کی ٹھوکریں کھانے کے بعد ان کی حوصلہ افزائی سے آگے بڑھی۔ میرے دل میں ان کے لیے محبت ہی محبت ہے، نفرت کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ یہ خون کی ہولی تو اس قاتل نے کھیلی ہے جو باہر سے چاہے خوبصورت ہو لیکن اندر سے بدصورت ہے۔'' انسپکٹر عمران نے کچھ پوائنٹس نوٹ بک میں لکھے اور اس لڑکی کو بھی فارغ کر دیا۔ اب وہ اٹھ کھڑا ہوا اور تالاب کے کنارے ٹہلنے لگا۔ پھر اس نے اپنے اسسٹنٹ سے کچھ رپورٹس موصول کیں۔ وہ بھی گھوم پھر کر ملازموں اور مہمانوں سے پوچھ گچھ کرتے پھر رہے تھے۔ شہزاد گل مرد وخواتین کے درمیان غمزدہ کھڑا تھا۔ آرٹسٹ اس کے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ جانتا تھا کہ غم بھی کبھی بٹتا ہے۔ وہ بانٹنے کی چیز نہیں، سہنے کی چیز ہے۔

اس وقت انسپکٹر عمران کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے زمرد کی یادوں سے نکل کے تالاب کی طرف دیکھا۔ انسپکٹر عمران اسے تنہا قریب بلا رہا تھا۔

''ایک دل کا زخم اور پھر سوالات کی چبھن۔'' شہزاد بڑبڑاتے ہوئے خوبصورت عورتوں کے حصار سے نکلا جو اسے مختلف طریقوں سے اپنی طرف متوجہ کر رہی تھیں۔ وہ مالا سے ٹوٹے ہوئے موتی کی طرح انسپکٹر عمران کی طرف آیا۔ خوبصورت مالا دور کھڑی ناپسندیدہ نظروں سے انسپکٹر کو دیکھ رہی تھی۔

شہزاد انسپکٹر عمران کے قریب آ کے تھکے تھکے قدموں اور جھکے ہوئے کندھوں کے ساتھ اس کا ساتھ دینے لگا۔ انسپکٹر عمران نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے سوال کیا۔ ''مسٹر شہزاد گل صاحب! مجھے ابھی ابھی رپورٹس سے معلوم ہوا ہے کہ آپ بھی علی الصباح تالاب کی طرف گئے تھے اور آپ نئے فلمی اداکار سلیمان علی سے بے حد خائف ہیں۔'' انسپکٹر عمران نے خوبصورت لڑکیوں سے کچھ دور چند اور خوبصورت مہمانوں کے درمیان مسکراتے ہوئے ایک وجیہہ اور اسمارٹ نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔ وہ حسینوں کا دلہا بنا ہوا تھا۔ وہ مکالمے یاد... کر رہا تھا۔ اس کی ایک شوٹنگ جو اس عمارت کے عقبی باغ میں ہونے والی تھی۔ جس کی اجازت زمرد نے بہ مشکل شہزاد سے حاصل کی تھی۔

شہزاد گل کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور پسینے کے ننھے منے قطرے بھی چمکنے لگے۔ وہ چند لمحے اضمحلال کے عالم میں خاموش پھٹی پھٹی نظروں سے سلیمان علی کو دیکھتا رہا پھر گویا ہوا۔ ''انسپکٹر صاحب! فنکاروں کے اندر کشمکش، پسند ناپسند کا جذبہ، جونیئر کو اپنے برابر نہ سمجھنے کا نظریہ تو ہوتا ہی ہے مگر ہم اپنا لہو جلانے والے دوسروں کا خون کس طرح بہا سکتے ہیں۔ میں

علی الصباح کھڑکی سے سلیمان کو زمرد کا پسندیدہ گانا گنگناتے سن کر باہر نکلا، میں اسے پھر سرزنش کرنا چاہتا تھا لیکن پھر واپس چلا آیا کہ مہمان ہے برا مان جائے گا۔ زمرد بھی خفا ہوگی۔ اتنی سی بات ہے۔

"عمران صاحب! میں چھوٹے موٹے اختلافات کے باوجود اپنی بیوی، شریک حیات زمرد بیگم کے جسم پر ایک خراش تک برداشت نہیں کرسکتا تھا اور قاتل میرے سامنے آگیا تو میں اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا دبادوں گا۔"

"مجھے آپ کے جذبات اور حادثے کی شدت سے انکار نہیں شہزاد! لیکن ظاہر ہے قاتل اس عمارت میں موجود ہے باہر سے اس کے آنے کا کوئی امکان دکھائی نہیں دے رہا۔ آلۂ قتل بھی غائب ہے۔

"میرے اسسٹنٹس نے عمارت کے اردگرد گھوم پھر کر کسی کے باہر سے اندر آنے کے امکانات کا جائزہ لیا ہے لیکن ایسے کوئی آثار نہیں ملے۔ قاتل اچھا پلانر ہے اور اس نے گزشتہ سالگرہ ماحول کو ذہن میں رکھتے ہوئے موت کا جال بچھایا لیکن میں بھی اسے قانون کے جال میں پھانس ہی لوں گا۔"

"ایسا ضرور ہو..... ایسا ضرور ہو۔" شہزاد گل کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"اب آپ بتایئے کہ آپ کا جھگڑا کیوں زمرد بیگم کے ساتھ بڑھا اور آپ نے اسے قتل تک کی دھمکی دے دی کہ اگر اس نے سلیمان علی سے میل جول بند نہ کیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا، میں تم دونوں کو ہی....."

انسپکٹر عمران نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

شہزاد گل اس طرح اچھلا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

"کیا یہ سچ ہے کہ آپ کے منہ سے یہ الفاظ نکلے اور آپ نے خود ہی تالاب کے کنارے جا کر اپنے جذبۂ رقابت کی آگ کو ٹھنڈا کردیا اور آلۂ قتل کسی سوچی سمجھی جگہ چھپا دیا۔ آخر یہ آپ کی رہائش گاہ ہے آپ اس کے چپے چپے سے واقف ہیں۔" انسپکٹر عمران نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

"میرے دوست انسپکٹر عمران! مجھے آپ سے اس الزام کی توقع نہیں تھی۔ میرے منہ سے غصے کی وجہ سے کچھ نکل گیا تھا لیکن ایسا کس گھر میں نہیں ہوتا۔ ہم فرشتے نہیں، انسان ہیں، خطا کار ہیں۔ فنکاروں کے دل اور جذبات نازک ہوتے ہیں۔ انہیں ٹھیس بھی جلدی پہنچ جاتی ہے لیکن غصہ اترنے پر وہ اپنی آگ میں خود ہی جلتے رہتے ہیں۔ وہ ارتکاب قتل نہیں کرتے۔ وہ گھر نہیں جلاتے۔ وہ نشہ نہیں بیچتے۔"

شہزاد گل نے جذباتی لہجے میں کہا۔ پھر بڑبڑانے لگا۔

"یہ ضرور خادمہ نسرین کی ہی حرکت ہے۔ اسے دروازوں سے کان لگا کر سننے کی عادت ہے۔ انسپکٹر صاحب! نسرین سے یہ بھی پوچھیے گا کہ اس نے زمرد اور سلیمان کی جو گفتگو باغ میں چھپ کر سنی تھی، اس میں میرے خلاف بھی جذباتی ردعمل موجود تھا۔"

شہزاد گل نے غصے سے سرخ ہوتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ بھی بلند ہوگیا۔ اس کا دوست وقار بھٹی جو ایڈووکیٹ تھا تیزی سے نزدیک آنے لگا۔

☆☆☆

انسپکٹر عمران رات کے وقت گل محل کے مہمان خانے میں ٹہلتے ہوئے خفیہ محکمے کے اہلکاروں سے رپورٹس موصول کرنے لگا۔ گفتگو موبائل فون پر ہو رہی تھی۔ اس نے چند بڑے فنکاروں کے متعلق کوائف جمع کرنے اور ان کے معاملات اور تعلقات وغیرہ کی چھان بین پر میل، فی میل دونوں کو کلیئر کردیا تھا۔ وہ زمرد گل سے رقابت اور بغض رکھنے والے افراد کو جاننا چاہتا تھا۔ ایک اطلاع نے اسے چونکا دیا۔ لیڈی انسپکٹر ریحانہ نے ایک سراغ نکال لیا تھا جسے مدنظر رکھتے ہوئے آگے بڑھا جاسکتا تھا۔

"ہاں جناب دونوں میں تلخ کلامی ہوئی، دونوں کا راستہ الگ الگ ہوگیا۔ ایک کو زندگی نے خوشیاں دیں اور دوسرے کے حصے میں غم اور ناکامی آئی۔"

"ٹھیک ہے، شاباش! مس ریحانہ آپ نے اپنی صلاحیتوں سے خوب کام لیا ہے۔ میں بھی منطق قیاسی کے ذریعے آپ کے قریب قریب ہی تھا۔" انسپکٹر عمران نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے مزید جستجو کا تقاضا کیا۔

اس وقت اسسٹنٹ فرحان جو سر درد کی وجہ سے لیٹا ہوا تھا۔ اٹھ کر بیدار ہوگیا۔ وہ انسپکٹر عمران کا بے تکلف اسسٹنٹ اور دوست تھا۔ انسپکٹر عمران نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا اور اسے آلۂ قتل ڈھونڈنے کا کام سونپا پھر چند لمحے کچھ سوچتا ہوا کھڑکی سے گل محل کے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے مقامات دیکھ کر باہر نکل آیا۔ وہ دوسری منزل کی سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے ڈائننگ ہال میں جا رہا تھا۔ وہاں سے گل محل کے مختلف مقامات کی طرف کئی راستے نکلتے تھے۔ اچانک کسی منحوس الو کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی اور انسپکٹر عمران کی نگاہ ڈائننگ ہال کی ایک کھڑکی سے باغ کی طرف اٹھ گئی۔ مغربی دیوار کی کھڑکی سے درختوں اور جھاڑیوں کا دور تک پھیلا ہوا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ ایک الو ادھر چیختا ہوا پر پھڑپھڑا رہا تھا۔ اس وقت ایک سیاہ بلی کہیں سے نکل کر اس کے سامنے گزرتی راستہ کاٹتی ہوئی

ڈائننگ ہال کے ایک کھلے دروازے سے باہر نکل گئی۔ انسپکٹر عمران بھی اس دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اسے پرانی روایات یاد آئیں تو وہ مسکرا اٹھا۔ کالی بلی اور چیختے الو کو منحوس اور کسی حادثے کا پیش خیمہ سمجھا جاتا تھا لیکن وہ جو عمر بھر خطروں سے کھیلتا آیا تھا، سیاہ رات اور کالی بلی سے کیا ڈرتا۔

انسپکٹر عمران راہداری سے گزر کر عقبی برآمدے کو عبور کرتا ہوا جیسے ہی چکر کاٹنے کے لیے باہر نکلا کوئی شے دھڑام سے اس کے سامنے گری۔ وہ فرش پر گر کر گھسٹتا چلا گیا۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا تو دوسری منزل کی چھت سے کسی سیاہ پوش نے ایک وزنی گملا گرایا تھا اور اگر وہ فرش پر پھیلے ہوئے پانی سے پھسل کر آگے نہ جا گرتا تو سر پھٹ جاتا۔ انسپکٹر عمران نے فوراً ایک نزدیکی درخت کی آڑ لے لی اور پستول نکال لیا۔ ادھر چھت پر چھپے سائے نے بھی انسپکٹر عمران پر فائر کیا جو درخت کے تنے کے کچھ پرخچے اڑاتا ہوا گزر گیا۔ پستول بے آواز تھا۔ انسپکٹر عمران نے دو جوابی فائر کیے۔ جس سے چھت کی پتھریلی منڈیر سے پتھروں کے ریزے اور ٹکڑے چمک کے ساتھ بکھرے لیکن سیاہ سایہ چھت پر موجود لوہے کی ٹینکی کی آڑ میں ہو گیا۔

اس نے غصے کے عالم میں پھر دو فائر کیے۔ انسپکٹر عمران برق سرعت سے پیچھے ہٹا اور تنے کے پیچھے گھوم کر دوسری طرف سے فائر کر دیا لیکن سایہ بھی بے حد چالاک تھا وہ بھی فوراً ٹینکی کی سیاہ مضبوط چادر کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔ دونوں کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہونے لگا۔

گولیوں کے چھت پر لگنے سے جو شور پیدا ہوا اس سے گارڈ اور چوکیدار بھاگ کر اس طرف آنے لگے۔ سیاہ سائے نے بھاگتے قدموں کو دیکھ کر پسپا ہونے میں ہی عافیت سمجھی۔ انسپکٹر عمران نے اپنے اسسٹنٹ کو بھی صورت حال سے آگاہ کر دیا لیکن سیاہ سایہ بچ کر گل محل کے افراد میں گھل مل چکا تھا۔

البتہ ادھر ادھر ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے انسپکٹر عمران نے دوسری منزل کے زینے کے پاس واقع پرانے اسٹور روم سے سیاہ لبادہ، سیاہ نقاب اور سیاہ ریوالور جو خالی تھا ڈھونڈ لیا۔ ریوالور اب بھی گرم تھا۔ اسے منتقم مزاج قاتل نے استعمال کیا تھا۔ انسپکٹر عمران نے لمبی نال والے ریوالور کو نال سے تھام رکھا تھا۔ اسسٹنٹ فرحان نے لباس پر ایکسپوزر پاؤڈر چھڑکا اور انگلیوں کے نشانات پستول کے دستے سے بھی اٹھانے کی کوشش کی لیکن قاتل چالاک اور محتاط تھا اس نے دستانے پہن رکھے تھے۔ انہیں کامیابی نہ ہوئی۔

انسپکٹر عمران نے مہمانوں اور ملازموں کا جائزہ لیا اور پھر عمارتی حصے کے گرد ایک چکر کاٹا۔ سی سی ٹی وی فوٹیج کیمروں نے دو ایک جگہ سیاہ پوش سائے کو ایکسپوز کیا تھا لیکن منظر واضح نہ تھا۔ سایہ کافی محتاط تھا۔ اسے کیمروں کے مقامات سے بھی پوری آگاہی تھی۔ ایک جگہ اس نے پتھر مار کر کیمرا ہی ناکارہ کر دیا تھا۔ چکر کاٹتے وقت کوئی خلافِ معمول بات یا مزید واقعہ نہ ہوا۔ انسپکٹر عمران کی انگلی لوڈڈ ریوالور کے ٹریگر پر تھی۔ عمارت کے عقبی باغ میں دور دور سرخ سرخ آنکھوں والے قد آور اور جسیم کتے گھومتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ چھت پر ڈیوٹی دینے والا محافظ اپنے کمرے میں بے ہوش ملا تھا۔ اس کے سر پر کسی اوزار سے ضرب لگائی گئی تھی۔ خون اب تک اس کے سر سے رس رس کر خوفناک منظر پیش کر رہا تھا۔ انسپکٹر تیز نگاہوں سے ماحول کا جائزہ لیتا ہوا ریوالور ہاتھ میں لیے واپس پلٹا اور سیڑھیاں چڑھتا ہوا دوسری منزل پر آ کر اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔ وہ یہ بات سمجھ چکا تھا کہ گل محل کی کوئی ہستی باہر ہونے والی تحقیقات سے باخبر ہو چکی ہے اور اب اس کی جان کے درپے ہے۔ اسسٹنٹ فرحان بھی ادھر ادھر بھٹک کر اپنے بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ اسے بھی سیاہ سائے کا سراغ نہ ملا۔

انسپکٹر عمران دیر تک بستر پر لیٹا کیس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا ہوا متعلقہ شخصیات کے متعلق بھی سوچتا رہا پھر اسے نیند آ گئی۔ اسرار کو انہوں نے باہر راہداری میں متعین کر دیا تھا کیونکہ گرم ریوالور پھینکنے والا قاتل پھر کوئی سرگرمی دکھا سکتا تھا۔

☆☆☆

علی الصباح انسپکٹر عمران نے کمرے کی عقبی کھڑکی کھولی۔ ٹھنڈی خوش گوار ہوا کا جھونکا پھولوں کی خوشبو کے ساتھ اندر در آیا۔ انسپکٹر عمران تازگی اور فرحت محسوس کرتے ہوئے واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں سے فارغ ہو کر فرحان کے بستر پر نگاہ ڈالی تو وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ انسپکٹر عمران مہمان خانے کے داخلی دروازے سے باہر نکلا۔ وہ باغ میں صبح کی چہل قدمی کرنا چاہتا تھا۔ درختوں پر پرندے چہچہا رہے تھے اور منظر سہانا تھا۔ کئی کھڑکیاں عقبی سمت کھلتی تھیں جن میں شیشے لگے ہوئے تھے۔

انسپکٹر عمران راہداری کی ایک کھڑکی سے ہٹ کر زینے کے پاس آیا اسی لمحے اسے احساس ہوا کہ اس کے جوتے کا ایک تسمہ کھلا ہوا ہے۔ وہ بے اختیار جھک کر تسمہ باندھنے لگا۔ اسی لمحے اس کی نگاہ کھڑکی سے اندر آتی سورج کی چمکیلی روشنی میں ایک بے رنگ سے تار پر جم کر رہ گئی جو دوسرے اسٹیپ پر جنگلے کے دونوں سروں پر بندھا ہوا تھا۔ انسپکٹر عمران نے جائزہ لیا۔ تار سخت اور تنا ہوا تھا۔ یہ پیانو کا تار تھا جو بہ مشکل دکھائی دیتا

ہے۔ قدرت نے اسے اتفاقاً بچالیا تھا۔ قاتل نے اسے مجروح کرنے یا مارنے کے لیے ایک انوکھی چال چلی تھی۔

اگر اس کا تسمہ نہ کھلا رہ جاتا اور وہ جھک کر تسمہ باندھتے وقت تار کو اچانک نہ دیکھ لیتا تو تار سے الجھ کر سیڑھیوں پر لڑھکتا ہوا نیچے جا گرتا اور زخمی ہو کر دوسری دنیا میں جا پہنچتا۔

انسپکٹر عمران واپس پلٹ گیا۔ فرحان بیدار ہو کر انگڑائی لے رہا تھا۔ انسپکٹر عمران نے کٹر اور ایکسپوزر پاؤڈر نکالا۔ فرحان حیران ہو کر انسپکٹر عمران کو دیکھنے لگا۔ انسپکٹر عمران نے باہر آ کے تار کو ایک سرے سے کاٹ دیا پھر جنگلے پر پاؤڈر چھڑک کر انگلیوں کے نشانات تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ قاتل بے حد محتاط تھا۔

کچھ دیر کے بعد اسسٹنٹ فرحان نے تالاب کی تہ کا پورا جائزہ لیا لیکن وہاں بھی آلۂ قتل نہ مل سکا۔ انہیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ آلۂ قتل گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھا۔

☆☆☆

اسرار سر جھکائے انسپکٹر عمران کے سامنے کھڑا تھا۔

''تم اس وقت کہاں جا سوئے جب قاتل زینے پر آیا اور پیانو کا تار جنگلے پر لگا کر چلا گیا؟'' انسپکٹر عمران نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''جج..... جناب..... مم..... میں.....'' وہ اٹک کر رک گیا۔

''جلدی بولو۔'' انسپکٹر عمران گرجا۔

''جناب! بات یہ ہے کہ میرے پیٹ میں اچانک ایسا مروڑ اٹھا پھر مجھے بھاگ کر راہداری کے آخری سرے پر بنے ہوئے واش روم میں جانا پڑا۔ مجھے کچھ دیر ڈیوٹی سے دور رہنا پڑا بس اس دوران۔'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر پھر شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔

انسپکٹر عمران کا غصہ اترا تو اس نے اسے علاج معالجے کا مشورہ دے کر چلتا کر دیا۔ کیس کا سرا ہاتھ نہ آنے پر وہ کچھ جھلایا ہوا تھا۔ قاتل ابھی تک اندھیرے میں تھا۔

☆☆☆

سارجنٹ فرحان نے باہمی مشورے کے بعد زمرد گل کے علاوہ فلم انڈسٹری کے چیدہ چیدہ فنکاروں کے موبائل اچانک لے کر کالز کا جائزہ لیا لیکن کوئی مشکوک بات سامنے نہ آ سکی۔ زمرد گل کے اسٹڈی روم میں اس کے کمپیوٹر، انٹرنیٹ سسٹم، ریکارڈ کا پورا جائزہ لیا گیا لیکن وہاں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

☆☆☆

اس وقت انسپکٹر عمران کا ایک اسسٹنٹ کامران جو سمن آباد میں متحرک تھا، گل محل میں آیا اور سیدھا انسپکٹر عمران کے پاس جا کر اپنا منہ اس کے کان سے لگا دیا۔ انسپکٹر عمران کافی افراد کے درمیان کھڑا بات چیت کر رہا تھا۔

انسپکٹر عمران اس کی بات سن کر چونک اٹھا اور اس نے پھر چند مہمانوں کو اپنی ٹیبل پر سوالات کرنے کے لیے بلایا اور ان کی آوازیں اپنے جدید موبائل میں ریکارڈ کر لیں۔ پھر اس نے اپنا موبائل اسسٹنٹ کامران کو دے دیا۔ کامران موبائل لے کر چلا گیا۔ ایک گھنٹے کے بعد ہی انسپکٹر عمران کو فرحان کے موبائل سیٹ پر جو رپورٹ دی گئی وہ حوصلہ افزا اور آگے بڑھنے کے لیے ایک گرین سگنل تھی۔ کامران لیڈی انسپکٹر ریحانہ کا خاوند تھا۔ دونوں مل کر کام کرتے تھے۔

فنکار بے حد مصروف لوگ تھے۔ انہیں ماڈلنگ اور شوٹنگ پر جانا تھا۔ انہوں نے میزبان شہزاد گل کے سامنے انسپکٹر عمران سے استدعا کی کہ وہ اب واپس اپنے گھروں میں جانا چاہتے ہیں۔ اگر نہ گئے تو لاکھوں کروڑوں کا نقصان ہو سکتا ہے۔ تفتیش جاری رکھی جائے لیکن جب بھی ضرورت ہو انہیں بلا لیا جائے۔

انسپکٹر عمران نے کہا کہ آپ لوگ کل صبح تک صبر کر لیں۔ میں انشاءاللہ کل صبح قاتل کو سب کے سامنے بے نقاب کر دوں گا۔ اگر آپ لوگ چلے گئے تو کیس خراب ہو جائے گا۔ قاتل رخنے پیدا کرے گا۔ چھپ جائے گا۔ حقائق کو روپے پیسے سے بدلنے کی کوشش کرے گا۔ براہ مہربانی پروڈیوسر حضرات سے معذرت کے ساتھ کہہ دیں کہ کل صبح تک صبر کر لیں۔ فنکاروں نے کوئی جواب نہ دیا۔ انہیں یہ جواب شاید پسند نہیں آیا تھا۔ نیلم نے بھی اپنی مصروفیت موبائل فون کے ذریعے انسپکٹر عمران کو سمجھائی لیکن وہ کسی کو باہر جانے کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ قاتل جیل کے دروازے کے پیچھے ہوگا تو سب کے لیے گھر کا دروازہ کھول دیا جائے گا۔

☆☆☆

''اب میرے راستے کی رکاوٹ ختم ہو چکی ہے امی جان۔'' الماس موبائل فون پر اپنی والدہ سے بات کرتے ہوئے انہیں معاملات درست ہونے کی خوش خبری سنا رہی تھی۔

''وہ کس طرح بیٹی! ہم لوگ تو بے حد پریشان ہیں۔ تمہارا باپ اسپتال میں بیمار پڑا ہے، اس کا آپریشن ہونے والا ہے۔ چھوٹی بہن کی شادی خطرے میں پڑ گئی ہے۔ مکان کا کرایہ بھی چڑھ چکا ہے۔ تمہارے چھوٹے بہن بھائی وبائی امراض کا شکار ہیں۔ زندگی بڑے مسائل میں پھنسی ہوئی ہے۔ صرف تمہارا ہی سہارا تھا لیکن وہ ناگن زمرد تو تمہیں لے کر ہی بیٹھ گئی ہے۔ وہ بظاہر تو تمہاری ہمدرد اور سرپرست تھی لیکن اندر

ہی اندر تمہیں کام سے دور کرتی چلی گئی۔ ہمارے کئی اشتہارات کے معاہدے اس نے پروڈیوسروں سے مل مل کے کینسل کروا دیے ورنہ زندگی کی گاڑی آگے بڑھنے لگی تھی۔ اب جب ہمارے ہاتھ میں ہی کچھ نہیں تو ہمارا تو برا حال ہی ہوگا۔'' الماس کی والدہ نے سارے مسائل اگل دیے۔

''امی..... جان! میں نے آپ سے کہا نا کہ اب حالات سدھر جائیں گے۔ میڈم زمرد اب اس دنیا میں نہیں رہی۔ کئی پروڈیوسروں نے پھر مجھ سے رابطہ قائم کرلیا ہے۔ بس اس قتل کے کیس سے جان چھوٹے تو باہر نکل کے پھر ایڈوانس ملنے شروع ہوجائیں گے۔ ابھی الماس کو زنگ تو نہیں لگا۔''

الماس نے الماری کے شیشے میں اپنے سراپا پر نظر ڈالتے ہوئے والدہ سے کہا پھر جب وہ فون بند کرکے اسے جیب میں رکھ کے کھڑکیوں کے پردے حبس کی وجہ سے کھسکانے کی خاطر آگے بڑھی تو ٹھٹک کر رک گئی۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

کھڑکیوں کے رنگین خوبصورت پردوں میں حرکت پیدا ہوئی اور انہیں درمیان سے ہٹا کر انسپکٹر عمران کمرے میں آگے بڑھ آیا۔ پردوں کے عقب میں ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ الماس حیرت اور خفگی سے دیکھنے لگی۔ ''آپ یہاں کیوں چھپے کھڑے تھے؟'' اس نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

''قاتل تک پہنچنا آسان نہیں ہوتا۔ ہمیں ہر جگہ قاتل کی خوشبو سونگھنے کے لیے گھسنا پڑتا ہے۔''

''پھر آپ نے قاتل کو ڈھونڈ لیا؟'' الماس نے طنزیہ لہجے میں انسپکٹر عمران پر تنقیدی نگاہ ڈالی۔

''شاید ڈھونڈ لیا۔ ہوسکتا ہے وہ آپ ہی ہوں۔''

''میں..... میں کس طرح قاتل ہوسکتی ہوں، میری میڈم سے کوئی دشمنی یا رنجش نہیں تھی۔ یہ تو ان کے کسی پرانے دشمن کا کام ہے جس نے اپنے جذبات میں انتقام کی آگ روشن رکھی اور اسے بجھانے کے لیے پلاننگ کرتے ہوئے زمرد باجی کو قتل کردیا۔ پھر آلۂ قتل بھی ابھی تک پولیس تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔'' الماس نے غصے سے سلگتے ہوئے کہا۔

''آپ نے اپنی راہ میں کانٹا بننے والی باجی سے تیراکی سیکھنے کا شوق ظاہر کیا، اس کی خوشامد کی۔ پچھلی تینوں سالگرہ تقریبات میں آپ کو برابر مدعو کیا گیا تھا۔ باغ اور عمارت کا چپا چپا آپ کا دیکھا بھالا ہوا تھا۔ آپ نے اپنی راہ میں آنے والی حریفہ کو دانستہ راستے سے ہٹانے کے لیے تالاب میں قتل کرنے کا پروگرام بنایا۔ آپ کامیاب ہوئیں آلۂ قتل کو چھپانے کے سلسلے میں لیکن جلد ہی میں آلۂ قتل ڈھونڈ کر ہی دم لوں گا۔''

''آپ نے میری والدہ سے ہونے والی گفتگو چھپ کر سنی اور اس سے فوراً غلط نتیجہ نکال لیا۔ آپ کے پاس کوئی ثبوت نہیں۔'' الماس کی زہریلی آواز میں تمسخر تھا۔

''آپ اب اس کمرے سے باہر نہیں جاسکیں گی۔'' انسپکٹر عمران نے وسل بجا کر اسسٹنٹ فرحان کو بلوایا اور کمرے کو گھیر لیا گیا۔ اس کا جائزہ لے کر الماس کو کمرے میں بند کرکے باہر سے چٹخنی لگا دی گئی۔ الماس غصے سے پولیس کو کوستی ہوئی اپنے کزن وکیل افتخار بخاری سے موبائل فون پر بات کرنے لگی۔ کمرے میں آلۂ جاسوس ڈکٹافون چھپا کر لگا دیا گیا تھا۔

☆☆☆

رات گہری ہوتی جارہی تھی اور انسپکٹر عمران کو صبح مجرم کو گرفتار کرنا تھا۔ جو زمرد گل کو قتل کرنے کے بعد اس پر بھی دو تین قاتلانہ حملے کرچکا تھا۔

رات کے کھانے پر مہمان انسپکٹر عمران کو ناپسندیدہ نگاہوں سے گھور رہے تھے۔ ان کی زندگی معطل ہوگئی تھی اور وہ قیدی بن کر رہ گئے تھے۔ صبح الماس اور نیلم کے دوست وکیل عدالت سے اس پابندی اور قید کو ختم کرنے کے لیے آرڈر لے کر آنے والے تھے۔ لوگ گھروں کو لوٹنے کے لیے بے چین تھے۔ آج تیسرا روز تھا وہ جبس بے جا کا شکار ہوکر رہ گئے تھے۔ کھانے سے فارغ ہوکر مہمان اپنے اپنے کمروں کی طرف لوٹ گئے۔

انسپکٹر عمران اور اس کے اسسٹنٹ عمارت میں مختلف مقامات پر گھوم رہے تھے کہ قاتل کوئی خطرناک حرکت نہ کر بیٹھے۔ آخری رپورٹ کے بعد انسپکٹر عمران سمجھ چکا تھا کہ قاتل کون ہے لیکن ابھی تک وہ آلۂ قتل تلاش نہیں کرسکے تھے۔ اس سلسلے میں وہ ناکامی سے دوچار تھے۔ رات بھر وہ آلۂ قتل کو تلاش کرتے رہے لیکن آلۂ قتل نہ مل سکا۔ وہ جھنجلاہٹ اور مایوسی کا شکار ہوگئے۔ آلۂ قتل کے بغیر کیس بے حد کمزور تھا لیکن جب صبح کا سورج طلوع ہوا تو تھکا تھکا انسپکٹر عمران صبح کی سیر کے لیے تالاب کی طرف نکلا اور گھومتے گھومتے ایک جگہ سانپ کی پھنکار سن کر حیرت انگیز طور پر کامیابی سے ہمکنار ہوکر لوٹا۔

رات کے وقت قاتل نے پھر انسپکٹر عمران پر قاتلانہ حملہ کیا لیکن اسے ناکام لوٹنا پڑا۔ مہمان خانے کے باہر اسسٹنٹ رؤف اور ابراہیم حفاظت کے طور پر پہرا دے رہے تھے۔

انسپکٹر عمران عمارت کا آخری راؤنڈ لے کر اپنے کمرے میں آکر چائے پینے کے بعد بستر پر چلا گیا۔ اس وقت باہر سیاہ پوش قاتل حرکت میں آیا اور اس نے دور سے دو گول پتھر پھینک کر رؤف اور ابراہیم کو بے ہوش کردیا۔ پتھر ان کے سروں پر لگے تھے۔ قاتل انسپکٹر عمران کے مہمان خانے کی

دائیں جانب والی کھڑکی پر باہر راہداری میں آیا۔ پتھر کی ضرب سے شیشہ توڑا اور کسی پلاسٹک پستول میں بھرے بیٹری تیزاب کی بوچھاڑیں بستر پر مارنے لگا لیکن پھر جیسے ہی انسپکٹر عمران نے بستر کے نیچے سے فائر کیا، وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ انسپکٹر عمران نے پچھلی طرف آکر ماحول کا جائزہ لیا۔ دوسرا سیاہ لبادہ، سیاہ نقاب اور تیزاب بھرا کھلونا پستول پھینک کر قاتل مہمانوں میں شامل ہو چکا تھا۔ اس وقت اچانک عمارت کی لائٹ بجھ گئی تھی۔ قاتل نے کسی روشن بلب کو اتار کر ہولڈر میں دھاتی سکہ رکھ کے بلب پھر لگایا تو فیوز اڑ گیا۔ اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر قاتل اندھیرے میں غائب ہوگیا۔ ٹارچیں لہراتے اس کے اسسٹنٹ اور عمارت کے چوکیدار، گارڈ سیاہ سائے کا روپ دھارنے والے کو تلاش کرنے لگے لیکن انہیں کامیابی نہ ہوئی۔

☆☆☆

صبح ناشتے کے فوراً بعد انسپکٹر عمران نے تمام مہمانوں کو بڑے ہال میں جمع ہونے کا حکم دے دیا۔ لوگ برے برے منہ بناتے پولیس کو برا بھلا کہنے لگے کہ ابھی تو نیند بھی پوری نہیں ہوئی۔ انسپکٹر عمران ہال کے وسطی مقام پر ایک گول میز کے گرد گھومتے ہوئے مہمانوں پر طائرانہ نگاہ ڈال کر رک گیا۔ تمام متعلقہ افراد جمع ہو کر کرسیوں اور صوفوں پر بیٹھ چکے تھے۔

نیلم، سلیمان علی، شہزاد گل، ندیم اور احمد کمال اگلی نشستوں پر تھے۔ انسپکٹر عمران کے اسسٹنٹ ہال کے داخلی دروازوں اور کھڑکیوں کے پاس چوکس کھڑے تھے۔ نیلم بے چینی سے گھڑی پر نگاہ ڈالنے لگی۔ اس وقت رؤف اور ابراہیم انسپکٹر عمران کے اشارے پر ہال سے باہر گئے اور جلد ہی الماس کو ساتھ لے کر واپس آگئے، اسے بھی پہلی قطار میں خالی کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ وہ غصے اور اشتعال کے عالم میں منہ پھلا کر انسپکٹر عمران کو گھورنے لگی۔

''ہمارے ملک کی پولیس تمیز سے عاری ہے۔ میرا کزن اسے عدالت میں بلوا کر جواب بھی طلب کرے گا۔ اس نے میرے ساتھ جو نازیبا سلوک کیا ہے، میں رات بھر سو نہیں سکی۔'' الماس بڑبڑانے لگی۔

''میرا تو پورا شیڈول ہی اس انسپکٹر کے بچے نے برباد کر دیا ہے۔'' نیلم نے آواز سن کر زہر خند لہجے میں کہا۔

''انتظار کی گھڑیاں ختم۔'' انسپکٹر عمران نے سب پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور اگلی قطار کے سامنے آکر ٹہلنے لگا۔ ''مسٹر شہزاد گل، آپ کے گل محل میں جو حادثہ پیش آیا وہ افسوس ناک ہے۔ یہ جذبات اور رقابت کا ہی شاخسانہ ہے۔ زندگی کے بہت سے حادثات اور المیے جذبات پر قابو نہ رکھنے سے ہی وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

''اس کہانی کا سرا سمن آباد لاہور سے ملا جہاں دو سہیلیوں نے غریب گھرانوں میں آنکھ کھولی۔ جدوجہد کی، تعلیمی مراحل طے کیے، ملازمتیں کیں۔ قدرت نے انہیں حسن و شباب کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔ اس دولت نے انہیں کمرشل اشتہارات اور شوبز کی دنیا میں داخل کر کے دنیاوی دولت سے بھی بہرہ مند کیا۔

''ایک لڑکی ایک اشتہارات بنوانے والے خوبصورت اور کامیاب لڑکے سے عشق کرنے لگی۔ دونوں کی دوستی کچھ عرصہ چلی لیکن کاروباری اور جذباتی مراحل طے کرتے ہوئے اس لڑکے کی محبوبہ کی سہیلی کی رال ٹپک پڑی اور اس نے اپنی سہیلی کے عاشق لڑکے پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیے۔ اسے اپنے حسن کے جال میں پھانس لیا۔ اس کی جوانی کی شراب نے اسے مدہوش کر دیا۔ اس کی جذباتی گفتگو اور مکاکموں کی ادائیگی نے لڑکے کو اس کی سابقہ محبوبہ بھلا دی لہٰذا اس نے پہلی لڑکی کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کو فراموش کرنا شروع کر دیا۔

''دونوں سہیلیوں کی سمن آباد میں سوئمنگ پول کے سامنے والے باغیچے میں ملاقات ہوئی۔ وہاں کا مالی جو ضعیف ہو چکا تھا، ان دونوں کی باتیں سن کر دیک گیا۔ وہ جھاڑیوں کی دوسری جانب رفع حاجت سے فارغ ہوا تھا کہ لڑکیوں کے جھگڑنے کی آوازوں نے اسے غور سے سننے پر مجبور کر دیا۔ ایک لڑکی نے جس کا دل ٹوٹ چکا تھا، دوسری فاتح لڑکی کو دھمکیاں دیں۔ وہ مسکرا کر آگے بڑھ گئی۔

''کامیابی فاتح لڑکی کے قدم چومنے لگی۔ دوسری پیچھے رہ گئی۔ عاشق لڑکے اور فاتح لڑکی کی شادی ہوگئی۔ وہ ہر سال سالگرہ منانے لگے اور اس مرتبہ.....'' انسپکٹر عمران یہاں تک کہہ کر رک گیا۔ کمرے میں سناٹا طاری ہوگیا۔ مہمان لڑکیوں کو گھورنے لگے۔ لڑکیاں پہلو بدلنے لگیں۔ ''علی الصباح مس الماس زمرد گل باجی سے تیراکی سیکھنے کے لیے تالاب کی طرف گئیں۔'' انسپکٹر عمران پھر رکا۔ اس وقت الماس پھر اٹھی۔

''میں نے کچھ نہیں کیا۔ میرے پاس کوئی آلۂ قتل نہیں، یہ بے بنیاد الزام ہے۔''

''علی الصباح شہزاد گل صاحب بھی تالاب کی طرف گئے۔ وہ اپنی بیگم سے ناراض تھے کیونکہ ان کی بیگم کے سلیمان علی سے تعلقات چل رہے تھے چنانچہ.....'' انسپکٹر عمران پھر رکا۔

''سراسر غلط، بے کار اور جھوٹا اندازہ۔'' شہزاد گل غصے

سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''بیٹھ جایئے۔'' انسپکٹر عمران مسکرایا۔ ''آپ نے اور الماس نے قتل نہیں کیا۔''

''پھر قاتل کون ہے.....؟ کس نے گل محل پر قیامت ڈھائی ہے؟'' مہمانوں کی طرف سے شور بلند ہوا۔

''قاتل کون ہے؟ قاتل یہ آپ کے سامنے مس نیلم کھڑی ہیں۔'' انسپکٹر عمران کی آواز سے کمرے میں بم سا پھٹا۔ نیلم غصے سے چنگاریاں برساتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں اس کا موٹا سگار، سنہری لائٹر اور نیا فونٹین پین تھا۔ وہ کچھ کرنا چاہتی تھی کہ اس کے پیچھے کھڑے اسسٹنٹ فرحان نے وہ اشیا جھپٹ لیں۔ وہ چپکے سے قریب چلا آیا تھا۔ اس نے وہ اشیا انسپکٹر عمران کے سامنے لے جا کر شیشے کی گول میز پر ڈال دیں۔

''یہ کیسی بدتمیزی ہے۔ اسٹوپڈ، نان سنس۔'' نیلم دہاڑی۔

''یہ آلۂ قتل ہے تمہارا مس نیلم!'' انسپکٹر عمران کی آواز سے لوگ اچھل ہی پڑے اور پھٹی پھٹی نظروں سے ان اشیا کو گھورنے لگے۔

''وہ پیچھے رہ جانے والی سہیلی یہی نیلم صاحبہ ہیں۔ آگے نکلنے والی مس زمرد گل مرحوم صاحبہ تھیں۔ عاشق لڑکا آپ کے سامنے کھڑا ہے۔''

انسپکٹر عمران نے شہزاد گل کی طرف اشارہ کیا۔ شہزاد تلملا اٹھا۔ کچھ مہمان آگے بڑھ کے قریب چلے آئے۔ ''یہ تو بے ضرر اشیا ہیں۔''

''یہ ابھی خطرناک ہو جائیں گی۔'' انسپکٹر عمران نے ڈرامائی لہجے میں کہا۔ انسپکٹر عمران نے سگار کی نال کے نیچے گول مٹھ نما حصے سے ذرا آگے ایک چھوٹے سے فولڈنگ ہک میں لائٹر کے سرے کو پھنسا دیا۔ پھر موٹا فونٹین پین جو اندر سے دہرا سسٹم رکھتا تھا، اسے سگار کی نال کے آگے فٹ کر دیا۔

لائٹر نے سگار میں اٹکنے کے بعد موٹے ٹریگر کی صورت اختیار کر لی۔ انسپکٹر عمران نے ٹریگر دبایا تو سگار کی مٹھ میں موجود میکنزم حرکت میں آ گیا اور پین (قلم) کے کھوکھلے حصے میں موجود جان لیوا گولی فائر کی صورت میں نکلی۔ پھر اس نے موٹے سگار کی نال کے شروع میں لگا ہوا ہک سیدھا کیا۔ اس میں لائٹر کا ہک پھنسایا اور پھر سگار کی پتلی نالی کو جوڑ سے کھینچ کر ایک حصہ الگ کر کے جب نئے فونٹین پین کی نب دبا کر کھوکھلے حصے کو سگار کے آگے جوڑا تو وہ ایک پستول نما شے بن گئی۔ اسی لمحے انسپکٹر عمران نے ایک فائر کیا۔ گولی نیلم کے سر سے گزر کر ایک قمقمے پر لگی اور وہ چور چور ہو گیا۔ نیلم کا رنگ اڑ گیا اور چہرہ تاریک پڑ گیا۔ لائٹر ٹریگر کا کام دیتا تھا۔

''یہی وجہ ہے کہ آلۂ قتل کا پتا نہیں چل رہا تھا۔ ہم تلاش کر کر کے تھک گئے لیکن اس کا سراغ نہیں ملتا تھا۔ نیلم نے مجھے مارنے کی کئی مرتبہ کوشش کی کیونکہ میرے اسسٹنٹ کامران اور لیڈی انسپکٹر ریحانہ اس کے کردار اور بچپن کے واقعات کی تحقیق کرتے پھر رہے تھے۔ مالی تک بھی جا پہنچے۔ مالی نے کہا کہ وہ اندھا ہے۔ آوازوں سے جان سکتا تھا لڑکیوں کے متعلق۔ چنانچہ میں نے نیلم، الماس اور چند اور لڑکیوں کی آوازیں ریکارڈ کر کے بھیجیں۔ اس طرح معاملے کے پس منظر سے آگاہی ہوئی۔

''آپ کو آلۂ قتل کا علم کس طرح ہوا؟'' مہمانوں کے علاوہ اسسٹنٹ کے منہ سے بھی بے اختیار نکلا۔

''میں عادت کے مطابق سیر کرنے کے لیے تالاب کے سامنے خوش نما پھولوں کی کیاریوں اور سرسبز و شاداب جھاڑیوں کے درمیان بنی روشوں کی طرف نکل گیا۔ وہاں میں نے ایک گھنی شاداب جھاڑی کے پاس مس نیلم کو ٹہلتے دیکھا۔ وہ حوض کی مچھلیوں کو دیکھتے ہوئے کسی سوچ میں گم تھیں۔ انہیں مجھ سے خطرہ تھا۔ میں دوسری تیسری بار بھی بچ گیا تھا۔ صبح میں قاتل کو بے نقاب کرنے والا تھا۔

''اس وقت میں نے سانپ کی پھنکاریں سنیں۔ ایک لمبا سا سیاہ سانپ جھاڑی کے سوراخ سے نکل کر نیلم صاحبہ کی طرف لپکا۔ اس وقت جان بچانے کے لیے نیلم صاحبہ نے اپنی ان تینوں اشیا کو یکجا کیا اور آلۂ قتل مجھے دکھائی دیا جس سے بے آواز دو فائر کر کے اس نے سانپ کے پرخچے اڑا دیے۔''

''لیکن ایسا آلۂ قتل اس کے پاس آیا کہاں سے؟'' چند مہمانوں نے فوراً سوال کیا۔

''ایسی جدید، ماڈرن اور خطرناک اشیا یورپ کی طرف بنتی ہیں۔ کسی نے تحفتاً بھیجا ہوگا۔ بہتر وہی بتائے گی۔'' انسپکٹر عمران نے قیاس کیا۔

نیلم کے ہاتھ باندھ دیے گئے تھے۔ وہ مچلتے ہوئے کہنے لگی۔ ''زمرد اپنی موت کا آلۂ قتل خود تھی۔ اس نے میری آرزوؤں، امنگوں اور جذبات کا گلا گھونٹا تھا۔ اپنے محبوب شہزاد گل کی خاطر میں نے ماں باپ کو ناراض کیا۔ گھر بار چھوڑا۔ کیا نہیں کیا لیکن اس نے میرا سب کچھ چھین لیا۔ آپ لوگ اس آلۂ قتل کو بار بار دیکھ رہے ہیں۔ اپنی موت کا آلہ وہ خود تھی۔ جذبہ رقابت اور حسد سے بڑا آلۂ قتل دنیا میں کوئی نہیں۔''

نیلم نے سر جھکا لیا۔ شہزاد اسے سلگتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا پھر اس نے نفرت سے منہ موڑ لیا۔

⌘⌘⌘

میں نے جمی کو اس کی نانی کے گھر کی طرف آتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں مچھلیاں تھیں۔ اس نے عقبی پورچ میں لگے اسکرین ڈور پر دستک دی اور مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ میرے لیے اتنا ہی کافی تھا۔

''تم کیا لے کر آئے ہو؟'' اس کی نانی کی کرخت آواز گونجی۔ وہ باہر آئی اور اپنے نواسے کو گھورتے ہوئے بولی۔ ''مچھلی..... تم مچھلی لے کر آئے ہو؟''

''میں انہیں اندر لے کر نہیں آرہا۔'' جمی نے کہا۔ اس

خود غرض

شاہ زین رضوان

مغربی معاشرے کی جہاں سب سے بڑی خوبی انسانی آزادی کو تسلیم کیا جاتا ہے وہیں سب سے بڑی برائی بھی اسے ہی کہا جاتا ہے کیونکہ بے جا آزادی جو ایک سے دوسرے کو بے پروا کردے وہ خودغرضی میں بدل جاتی ہے اور پھر کوئی بھی کسی بھی رشتے کا احساس نہیں کرتا... وہ بھی اپنی غرض میں اندھی ہو کر خوبصورت رشتوں کو طوفان کی نذر کر آئی تھی...

محبت کرنے والے والدین کی بے بسی اور خودغرض اولاد کا فسانہ

کی نظریں مجھ پر تھیں۔ ''میرا خیال تھا کہ تم ہمارے لیے یہ مچھلی پکاؤ گی۔''

''ٹھیک ہے۔ تم انہیں صاف کرو لیکن ان کا کچرا میرے صحن میں مت پھینکنا۔ میں انہیں فرائی کردوں گی۔'' پھر اس نے میرا کندھا تھپتھپایا۔ ''امینڈا! تم میری مدد کرو گی یا جمی کی؟''

''میں جمی کی مدد کروں گی۔'' میں دروازے سے باہر آئی اور اس کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔

اس نے پہلے مجھے دیکھا اور بولی۔ ''تمہیں اپنے کپڑے خراب کرنے کی ضرورت نہیں۔ اندر آؤ۔ میں تمہیں کچھ دکھاتی ہوں۔''

میں جمی کے پاس باہر رکنا چاہ رہی تھی لیکن مسز ڈگلس سے کوئی بحث نہیں کرسکتا تھا، یہاں تک کہ ڈیڈی بھی نہیں جو پیٹھ پیچھے اس کا نام لے کر پکارتے تھے۔ لہٰذا میں اندر چلی گئی۔ وہ میرے ساتھ کچن میں گئی اور فش فرائی کا ایک باکس اٹھایا پھر اسے واپس رکھ دیا۔

''ہم ان مچھلیوں کو بیک کریں گے۔'' اس نے کیبنٹ سے چار بڑے پین نکالے۔ ''تم فریزر سے فرنچ فرائز کا ایک بیگ لے آؤ۔''

میں نے وہ بیگ لاکر اسٹوو پر رکھ دیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور اپنے چشمے کو ناک پر جماتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہاری سالگرہ کے تحفے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔'' پھر اس نے میری پونی ٹیل اٹھائی اور بولی۔ ''تمہیں اپنے بالوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ تم کتنے سال کی ہوگئی ہو؟''

''پندرہ سال۔''

''یعنی تم جمی سے دو سال چھوٹی ہو لیکن وہ بھی تمہاری کلاس میں ہے کیونکہ وہ دو مرتبہ فیل ہوچکا ہے۔ تمہیں اس لڑکے سے دور رہنا چاہیے۔ تم میری بات سن رہی ہو؟ اس کے جسم میں گندا خون ہے۔''

وہ مجھے یہ بات نہ جانے کتنی بار بتا چکی تھی کہ اس کا اکلوتا نواسہ اس کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ اس کے باپ کے جسم میں گندا خون ہے جو اسے مار رہا ہے جبکہ ہر کوئی جانتا تھا کہ جمی کے باپ کو پھیپھڑوں کا کینسر ہے جو اسے آہستہ آہستہ موت کی طرف لے جارہا ہے۔ اسے یہ بیماری طویل عرصے تک سگریٹ پینے کی وجہ سے ہوئی۔ یہ اچھی بات تھی کہ جمی سگریٹ نہیں پیتا تھا اور مجھے تو سگریٹ کے نام سے ہی نفرت تھی۔

میں اس کے پیچھے چلتی ہوئی لیونگ روم سے گزری جو گلاب کے پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ وہ مجھے اوپر کی منزل پر لے گئی جہاں دو گیسٹ روم تھے۔ ایک کو گلابی اور دوسرے کو سبز رنگ سے سجایا گیا تھا۔ اس کے بیڈروم میں اسکائی بلیو رنگ اور اسی رنگ کا قالین، پردے اور بستر کی چادریں تھیں۔

''میں تمہیں سالگرہ کے موقع پر اپنا ایک کوٹ تحفے میں دینا چاہ رہی تھی۔'' اس نے الماری کھولتے ہوئے کہا۔ ''لیکن فر کی وجہ سے وہ بہت گرم ہوگا۔'' یہ کہہ کر اس نے الماری بند کردی۔ ''پھر میں نے سوچا کہ تمہیں کوئی زیور دیا جائے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی وینٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ایک بینچ پر بیٹھ گئی۔ اس نے مجھے بھی اپنے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا اور مجھے جیولری دکھانے لگی۔

میرا دماغ دوبارہ جمی کی طرف چلا گیا۔ اس دن وہ اسکول نہیں گیا تھا اور وہ اکثر ایسا ہی کرتا تھا، جب اس کے باپ کی طبیعت زیادہ خراب ہوتی۔ لڑکے اسے دلدل کا چوہا کہتے جبکہ وہ کسی دلدل کے قریب نہیں رہتا تھا۔ میں جانتی تھی کہ وہ میرے بارے میں بھی پیٹھ پیچھے ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ میرے پاس اچھے کپڑے یا ڈیزائنر جینز نہیں تھیں اور میں صرف دو مرتبہ مال گئی تھی۔

''میں اس کے بارے میں سوچ رہی تھی۔'' مسز ڈگلس نے ایک سنہری چین دکھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ ایک نیکلس ہے۔'' اس نے وہ ہار میری گردن پر رکھا اور نفی میں سر ہلا دیا پھر اسے واپس جیولری باکس میں رکھ کر ایک چاندی کا ہار نکالا اور میری گردن پر رکھ دیا۔

''یہ ٹھیک رہے گا۔ ذرا اپنی گردن موڑو۔''

میں نے اس کے کہنے پر عمل کیا تو اس نے اس کی چین میری گردن میں باندھ دی اور میرا منہ آئینے کی طرف کرتے ہوئے بولی۔ ''تم چاندی میں اچھی لگتی ہو۔''

میں نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو وہ بولی۔ ''تمہاری گردن بہت خوبصورت ہے اور آنکھیں بھی بہت پیاری ہیں اور یہ بھی اچھا ہے کہ یہ نیلی نہیں ہیں۔ میں جن بُرے لوگوں کو جانتی ہوں، ان سب کی آنکھیں نیلی ہیں۔''

میری آنکھیں بادامی جبکہ جمی اور اس کے باپ کی نیلی تھیں۔ اس کے علاوہ میرے چہرے میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ایک دفعہ آئینہ دیکھتے ہوئے خیال آیا کہ میں بھی خوبصورت نظر آسکتی ہوں۔ اس کے لیے میں نے لپ اسٹک لگائی اور ہلکا سا میک اپ کیا لیکن اس پر میرے ڈیڈی

ناراض ہوگئے۔ لہٰذا مجھے خوبصورت نظر آنے کے لیے انتظار کرنا پڑے گا۔

میں نے نیکلس کے لیے مسز ڈگلس کا شکریہ ادا کیا اور کھڑی ہوگئی۔ ہم کچن میں گئے۔ چولہا جلایا اور فرائز بنانا شروع کردیے۔ جلد ہی جمی کی مچھلی کے علاوہ سب چیزیں تیار ہوگئیں۔ میں پورچ میں گئی تو وہ مچھلی چھیل چکا تھا۔ جمی نے ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے پاس صرف تین ہی قمیصیں تھیں۔ مسز ڈگلس اس کے لیے ایک یا دو قمیصیں خرید سکتی تھی۔ اس نے اسے ہمارے ساتھ بیٹھ کر مچھلی کھانے کی اجازت دے دی، یہی بہت تھا۔

میں نے بہت تھوڑی مچھلی کھائی اور صفائی کرنے میں مسز ڈگلس کی مدد کرنے لگی۔ میں نے چور نظروں سے جمی کی طرف دیکھا جو اپنے باپ کے لیے کھانا پیک کر رہا تھا۔ میں نے اس کے جانے سے پہلے کام ختم کیا۔ مسز ڈگلس نہیں چاہتی تھیں کہ میں جمی کے ساتھ جاؤں جبکہ میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ میں نے اسے ہوم ورک دینا ہے۔ اس نے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے ہمارے باہر نکلتے ہی دروازہ بند کردیا۔ میں نے جمی کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھے تو پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

''ڈیڈی کی طبیعت بہت خراب ہے۔'' اس نے کھانے کا لفافہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔ ''انہیں بہت درد ہو رہا ہے۔''

''درد کی گولیاں لینے کے باوجود؟''

''ہم آج کلینک گئے تھے۔ انہوں نے کچھ اور دوائیں بھی دیں لیکن کوئی فرق نہیں پڑا۔''

جب ہم شہر کے قریب پہنچے تو میں نے اس جھونپڑی نما مکان کی طرف دیکھا جہاں جمی اپنے باپ کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کے برابر والی گودی کمزور ہو چکی تھی اور میں نہیں جانتی تھی کہ کس چیز نے اسے کنال میں گرنے سے روک رکھا ہے۔ جھونپڑی میں اندھیرا تھا۔

''شاید وہ سو رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

جمی نے مجھے بتایا کہ وہ لوگ موم بتی کی بچت کر رہے ہیں کیونکہ بجلی کل سے بند کردی گئی ہے۔ ''تمہاری نانی کوئی مدد کیوں نہیں کرتی؟ اس کے پاس بہت پیسا ہے۔''

''ہونہہ..... نانی؟'' اس نے منہ موڑ کر بڑے مکان کی طرف دیکھا۔ ''اس نے صرف ایک مرتبہ مجھے وہاں رات گزارنے کی اجازت دی تھی جس روز میری ماں کی تدفین تھی۔''

میں نے مڑ کر اس بڑے سفید مکان کی طرف دیکھا۔ اس کی تمام لائٹیں جل رہی تھیں اور پورے گھر پر نیا رنگ ہوا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں ایک دفعہ جمی کے گھر گئی تھی۔ وہاں سیاہ چولہا تھا جس میں سردیوں کے موسم میں لکڑیاں جلائی جاتیں لیکن گرمیوں کے لیے کوئی ائرکنڈیشنر نہیں تھا۔ صرف دو پنکھے لگے ہوئے تھے۔ اب وہ بھی بجلی کے بغیر کام نہیں کر رہے ہوں گے۔ مجھے ان سائیس ڈالر کا خیال آیا جو میں نے بچا کر رکھے تھے اور سوچنے لگی کہ کیا وہ جمی کے گھر کی بجلی بحال کرنے کے لیے کافی ہوں گے.....؟ شاید نہیں۔

جمی مجھے دیکھ کر مسکرایا اور میں نے اپنے اندر ایک سنسناہٹ محسوس کی۔ ''میں نہیں جانتا کہ کیا سوچ رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''یہی کہ ایک لڑکا، لڑکی کے ساتھ گھر جا رہا ہے۔''

لہٰذا ہم واپس گھر کی جانب چلنے لگے۔ مجھے امید تھی کہ وہ میرا ہاتھ پکڑے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ نظریں نیچی کیے چلتا رہا۔ ہم اس کی نانی کے گھر کے پاس سے گزرتے ہوئے میرے گھر کے فرنٹ پورچ میں آگئے۔

''مچھلی لانے کا شکریہ۔'' میں نے کہا۔ ''کیا تمہیں ہوم ورک چاہیے؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ ''میں ایسا نہیں سمجھتا۔''

جب اس نے سر اٹھایا تو میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں گیلی ہو رہی تھیں لیکن وہ اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''تم سے پھر ملاقات ہوگی۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

میں گھر کے اندر گئی تو دیکھا کہ ڈیڈی کرسی پر بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ میں نے باتھ روم میں جا کر اپنے دانت صاف کیے اور ہوم ورک کرنے بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد مما نے کمرے میں جھانکا اور پوچھنے لگیں کہ کیا میں نے مسز ڈگلس کے ساتھ کھانا کھا لیا ہے۔

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ میں اطمینان کرنا چاہ رہی تھی کہ تم نے ڈنر کرلیا ہے۔''

اس رات میں دیر تک جاگتی رہی۔ میں سوچ رہی تھی کہ کس طرح میں اور جمی پیسے جمع کر کے اس کے گھر کی بجلی بحال کروا سکتے ہیں لیکن کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آیا۔ اس قصبے میں بچوں کے لیے کوئی جز وقتی کام نہیں تھا۔ البتہ ہم خلیج کے پار سینٹ لوئیس میں کوشش کر سکتے تھے لیکن اس کے لیے ہمیں دو میل لمبا پل پار کرنا پڑتا۔ ہم یہ کر سکتے تھے۔ وہاں کئی چھوٹی دکانیں تھیں۔ میں نے پہلے اس بارے میں کیوں نہیں سوچا؟

نیچے کی منزل سے ایک آواز آئی تو میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

وہی آواز دوبارہ آئی تو میں سمجھ گئی کہ کوئی بیرونی دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ میں نیچے جانے لگی لیکن اس سے پہلے ہی مما دروازے پر پہنچ چکی تھیں۔ انہوں نے پوچھا کون ہے؟

''جوائس! یہ میں ہوں مسز ڈگلس۔ دروازہ کھولو۔''

میری ماں نے دروازہ کھولا اور مسز ڈگلس اندر آگئی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور ڈیڈی کے پاس جا کر بولی۔

''فریڈی! اٹھ جاؤ۔'' اس نے ڈیڈی کا کندھا پکڑ کر ہلایا۔

''اٹھ جاؤ فریڈی..... مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

ڈیڈی نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا اور دوبارہ سو گئے۔

''میری انگوٹھی سنک میں گر گئی ہے۔ اپنے اوزار لے کر آجاؤ۔'' یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ میری ممی نے دروازہ بند کیا اور ڈیڈی کے پاس آئیں۔ وہ اب اٹھ کر بیٹھ چکے تھے۔ انہوں نے مما سے پوچھا کہ کیا ہوا۔ تب مما نے پوری بات بتائی پھر مجھ سے کہا کہ کچن میں جا کر کافی بناؤں۔

ڈیڈی بڑبڑاتے ہوئے بولے۔ ''بے وقوف عورت..... الٹی سیدھی حرکتیں کرتی ہے اور ہمیں اس کی ہر بات ماننا پڑتی ہے۔'' انہوں نے اس کے لیے کچھ بُرے الفاظ بھی استعمال کیے لیکن مما نے انہیں روک دیا کیونکہ میں وہاں موجود تھی۔ میں اپنے کمرے میں واپس چلی گئی تاکہ ڈیڈی اپنی بھڑاس نکال سکیں۔

میں نے نیچے کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی اور سمجھ گئی کہ ڈیڈی اپنے اوزاروں سمیت جا رہے ہیں۔ قصبے کے سبھی لوگ مسز ڈگلس کے بارے میں باتیں کرتے تھے لیکن وہ جو کہتی وہی کرتے۔ میں بھی ان میں شامل تھی۔ میرے والدین بھی اس کی ہر بات مانتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جب یہ بوڑھی عورت مرے گی تو ان کے لیے بھی کچھ چھوڑ کر جائے گی۔ اس نے یہ بات مجھے بتائی تھی۔ شاید اس نے ہر ایک سے یہی کہا ہوگا۔ اسی لیے سب اس کے ساتھ بہت اچھے تھے۔ مجھے اس نیکلس کا خیال آیا جو مسز ڈگلس نے دیا تھا اور میں سوچنے لگی کہ اگر میں اسے بیچ دوں تو کیا ان پیسوں سے جمی کے گھر کی بجلی بحال ہو جائے گی؟

دوسرے روز صبح میں نے ڈیڈی کو کچن ٹیبل پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ ان کے دائیں ہاتھ پر تولیا بندھا ہوا تھا۔ اس پر خون بھی لگا ہوا تھا۔ مما نے تولیا ہٹایا اور دوا لگا کر پٹی کر دی۔ ڈیڈی نے مجھے دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی۔ وہ مجھے تھکے ہوئے لگ رہے تھے۔

''گزشتہ رات پانا چلاتے ہوئے اپنا ہاتھ زخمی کر لیا۔'' مما نے کہا۔ ''نشے کی حالت میں کام کرنا کوئی عقل مندی نہیں۔''

''میں نے پہلے کافی پی تھی۔''

''کیا اس نے تمہیں کام کرنے کا معاوضہ دیا؟''

''تم مذاق کر رہی ہو۔''

مجھے اسکول جانے کی جلدی ہو رہی تھی۔ میں نے جلدی جلدی اپنا لنچ تیار کیا اور باہر نکل کر اسکول بس کا انتظار کرنے لگی۔ مجھے جمی کے آنے کی امید تھی لیکن وہ بہت کم بس سے سفر کرتا اور عام طور پر ریل کی پٹری کے ساتھ چلتا ہوا اسکول پہنچتا لیکن وہ نہیں آیا اور اسکول میں بھی کسی نے اس کے بارے میں بات نہیں کی۔

جب میں واپسی میں اسکول بس سے اتری تو میری نظر ایک پولیس کار پر گئی جو مسز ڈگلس کے گھر کے باہر کھڑی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں سڑک پار کرتی، سوٹ میں ملبوس ایک شخص ڈیڈی کے ساتھ گھر سے باہر آیا اور وہ ایک گہرے نیلے رنگ کی کار میں سوار ہو گئے۔ جب وہ کار میرے پاس سے گزری تو ڈیڈی نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔ وہ کچھ پریشان لگ رہے تھے۔

ایک اور سوٹ میں ملبوس شخص اور خاکی وردی میں پولیس آفیسر ہمارے گھر میں موجود تھے۔ سوٹ والا کچن ٹیبل پر بیٹھا ہوا تھا اور مما اسے بتا رہی تھیں۔ ''وہ اس کے گھر گیا اور پائپ میں سے انگوٹھی نکالنے میں اس کی مدد کی۔''

مما نے مجھے دیکھا تو یونیفارم والا میری طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ''یہ تمہاری بیٹی ہے؟''

''ہاں۔''

''اوپر جاؤ۔'' پولیس والے نے کہا۔ ''اگر ہمیں ضرورت ہوئی تو تمہیں بلا لیں گے۔''

میری ماں نے سر ہلایا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ میں اوپر چلی گئی اور سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر ان کی باتیں سننے لگی۔ میں نے یہ الفاظ سنے۔

''اس کا قتل ہو گیا ہے..... کوئی زبردستی گھر میں داخل نہیں ہوا۔ وہاں سے ایک پانا بھی ملا ہے.....''

جس آدمی نے آخری بار مقتولہ کو دیکھا، اسی پر سب سے پہلے شبہ کیا جاتا ہے۔

میری ماں نے کہا کہ ہاتھ زخمی ہونے کے بعد اس نے اپنا پانا وہیں چھوڑ دیا ہوگا لیکن پولیس آفیسر قائل نہ ہوا پھر وہ مجھ سے بات کرنے اوپر آیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں مقتولہ کے نواسے جمی ڈگلس کو جانتی ہوں؟

''ہاں، وہ میری کلاس میں پڑھتا ہے۔''

''کیا وہ آج اسکول آیا تھا؟''
''نہیں۔''
''گزشتہ روز؟''
''نہیں۔''
''وہ آخری بار اسکول کب آیا تھا؟''
''جمعے کے روز..... اس کے والد بہت بیمار ہیں۔''
سوٹ والے نے مجھ سے پوچھا کہ جمی کہاں رہتا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ یقین سے نہیں کہہ سکتی۔ کرسچین جانے والی ریلوے لائن کی طرف۔ جھوٹ بولتے ہوئے میرے الفاظ حلق میں اٹک رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ وہ جمی سے کیا چاہتے ہیں لیکن اس نے نہیں بتایا۔

اس رات مما اور میں نے اکیلے کھانا کھایا لیکن ہم سے زیادہ نہیں کھایا گیا۔ اسی وقت ہم نے گھر کے باہر کسی کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ مما تیزی سے بیرونی دروازے کی طرف لپکیں اور ڈیڈی گھر میں داخل ہوئے۔ وہ دونوں گلے ملے اور مما ان سے لپٹ کر رونے لگیں۔

کھانا کھانے کے دوران میں ڈیڈی نے بتایا کہ اب وہ مشتبہ نہیں رہے۔ ''انہیں پائپ پر میرا خون نظر آیا لیکن وہ میرے پانے سے ہلاک نہیں ہوئی۔ وہ اس کا پانا تھا۔ اس کے گھر میں مکمل ٹول بکس موجود ہے۔ انہیں اس کے ناخنوں کے نیچے خون نظر آیا جو میرا نہیں تھا۔ اس کے علاوہ انہیں آلۂ قتل پر انگلیوں کے نشانات بھی ملے ہیں جو میرے نہیں تھے۔''

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔ ''پولیس جمی ڈگلس کو تلاش کر رہی ہے۔ کیا آج تم نے اسے دیکھا؟''

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ مما نے ڈیڈی کو بیئر دی اور میں نے پوچھا کہ وہ جمی کو کیوں تلاش کر رہے ہیں؟

''اس بوڑھی عورت نے ایک ہفتہ قبل پولیس کو بتایا تھا کہ جمی اس کی چیزیں چراتا ہے۔''

اگلے چند گھنٹے بہت سست رفتاری سے گزرے۔ میں جمی کو بتانے کے لیے باہر جانا چاہ رہی تھی لیکن کوئی راستہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ کسی سہیلی کے ساتھ ہوم ورک کرنے کا بہانہ بنا دوں لیکن وہ مجھ سے اس کا نام پوچھتے جو میرے پاس نہیں تھا لہٰذا میں نے انتظار کرنا مناسب سمجھا تاکہ وہ دونوں سونے کے لیے چلے جائیں۔

نصف شب کے قریب میں بستر سے اٹھی۔ لباس تبدیل کیا اور دبے قدموں نیچے اتری۔ میں نے ایکسٹرا چابی لی اور بیرونی دروازے سے باہر نکل گئی۔ اس رات پورا چاند تھا اور اس کی روشنی میرے لیے کافی تھی۔ جمی کے گھر میں اندھیرا تھا۔ میں دروازے پر دستک دینے کے لیے آگے بڑھی۔

''امینڈا!'' جمی کی سرگوشی سن کر میں اچھل پڑی۔ وہ تاریکی سے نکل کر آیا تھا اور میری طرح ہی خوفزدہ تھا۔ ''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''پولیس تمہاری تلاش میں ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' وہ مجھے جھونپڑی کے دوسری طرف اندھیرے میں لے گیا۔ ''وہ یہاں اطراف میں مجھے تلاش کر رہے ہیں۔ کیا تم نے ابھی کسی کو دیکھا ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''وہ واپس آئیں گے۔'' اس نے کہا۔ ''میں کچھ چیزیں لینے آیا ہوں۔''

میں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکی لیکن جب وہ بولا تو میں نے اس کی سانس اپنے چہرے پر محسوس کی۔ ''میں ڈیڈی کے ساتھ اسپتال میں تھا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ انہیں وہاں رکنا ہوگا۔ پولیس وہاں بھی آ گئی اور میں بڑی مشکل سے نکل سکا۔''

اس نے ایک قدم پیچھے ہٹایا اور بولا۔ ''تم گھر جاؤ۔''

''لیکن..... لیکن.....''

''تم مجھ سے پوچھنا چاہتی ہو کہ کیا ہوا تھا؟''

''نہیں۔''

اس نے گہری سانس لی اور بولا۔ ''اس نے مجھے دو دفعہ تھپڑ مارا۔''

''کیوں؟''

''اس نے مجھے اپنے ناخنوں سے زخمی کیا۔'' وہ مڑا تو مجھے اس کی گردن پر نشانات نظر آئے۔

''لیکن کیوں؟'' میں نے دوبارہ پوچھا۔

''میں نے ڈیڈی کی دواؤں کے لیے پیسے مانگے تھے۔'' اس نے اپنا سر جھکا لیا پھر نرم آواز میں بولا۔ ''وہ ہمیشہ مجھے تھپڑ مارتی تھی۔''

میں نے کہا۔ ''پولیس والوں کا خیال تھا کہ میرے ڈیڈی نے اسے قتل کیا ہے۔ کیا تم نے وہاں کسی اور شخص کو دیکھا؟''

وہ نرم آواز میں بولا۔ ''میں گرمی کی وجہ سے نہیں سو سکا۔ میں نے اسے تمہارے ڈیڈی کو لاتے ہوئے اور انہیں واپس جاتے ہوئے دیکھا۔ میں نے اس کے پاس جا کر پوچھا کہ وہ ٹھیک تو ہے تو اس نے مجھے اور میرے باپ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا پھر اس نے مجھے دوبارہ تھپڑ مارا اور.....'' اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے گہرا سانس لیا۔ ''ہم ہفتے میں دو تین مرتبہ بھوکے رہتے ہیں کیونکہ تمام پیسے دواؤں پر خرچ ہو جاتے ہیں۔''

جمی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے کہا۔

''میرے اندر کمینگی ہے اور میں مطلبی ہو جاتا ہوں جیسا کہ میں نے کئی بار چاہا کہ اپنے باپ کو مار ڈالوں تا کہ اسے تکلیف سے نجات مل جائے۔ اسی طرح میں اپنے آپ کو نہیں روک سکا۔ نانی نے مجھے کمینگی دکھانے پر مجبور کر دیا اور اب میری زندگی ختم ہو گئی ہے۔''

میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ مجھ سے سانس لینا محال ہو رہا تھا پھر اس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''میں تم سے ایک مرتبہ اور ملنا چاہ رہا تھا۔''

میں نے اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کیے۔ میں بمشکل کہہ سکی۔ ''ایک اور مرتبہ؟''

''مجھے یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی ہوگی۔''

''ہاں۔ تمہیں یہی کرنا چاہیے لیکن کہاں جاؤ گے؟''

''پہلے میں نیو اورلینز جاؤں گا۔ مجھے فرنچ کوارٹرز میں ملازمت مل سکتی ہے، وہاں عمر کی کوئی قید نہیں۔ میں وہاں جا چکا ہوں۔ میں نے وہ جگہ دیکھی ہے۔ وہاں کام کرنے والے نوجوان لڑکے سڑکوں پر رہتے ہیں جب تک کہ ان کا کوئی ٹھکانا نہ ہو جائے۔ میں بھی ایسا کر سکتا ہوں۔ میں وہاں گم ہو جاؤں گا۔''

اس نے ایک سیکنڈ کے لیے چاروں طرف دیکھا اور بولا۔ ''میں ایک بات بتانا چاہ رہا ہوں اور وہ یہ کہ میں تمہیں کبھی نہیں بھولوں گا۔''

''مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔''

اس نے پلکیں جھپکائیں اور اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ ''مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے تمہارے ساتھ جانا ہے۔''

اس نے میرے ہاتھ پکڑ لیے اور آہستہ سے اپنا سر میری طرف جھکا دیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ میرے ہاتھوں کو بوسہ دے رہا تھا۔

''مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔'' میں نے دوبارہ کہا۔

''میں آج رات جا رہا ہوں۔'' اس نے اپنے پیچھے رکھا ہوا ایک پرانا سوٹ کیس دکھایا۔ میں نے اپنی آنکھیں صاف کیں اور کہا کہ میں دس منٹ میں اپنا سامان باندھ سکتی ہوں۔

ہم ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔ مجھے امید تھی کہ میری آنکھوں نے اسے وہ سب بتا دیا جو میں اب تک نہیں کہہ سکی تھی اور میں نے وہی چیز اس کی آنکھوں میں دیکھی۔ اس نے آہستہ سے سر ہلا دیا اور میں نے اس سے کہا کہ وہ یہیں میرا انتظار کرے۔

''میں دس منٹ انتظار کروں گا پھر تمہیں لینے آ جاؤں گا۔''

میں تیزی سے گھر کی طرف گئی تاہم مجھے دس منٹ سے زیادہ لگ گئے۔ میں نے بستر کے نیچے سے اپنا سوٹ کیس نکالا اور اس میں ضرورت کی چیزیں رکھنے لگی۔ میری کوشش تھی کہ کوئی چیز بھول نہ جاؤں۔ میں نے اپنی بہترین جینز اور سفید بلاؤز بھی رکھ لیا جو ممانے سالگرہ پر مجھے دیا تھا۔ پھر میں نے مسز ڈگلس کا دیا ہوا نیکلس اتار کر جیب میں رکھا۔ شاید ہم نیو اورلینز میں اسے بیچ کر کچھ رقم حاصل کر سکیں۔ اسی طرح باتھ روم سے اپنے بہترین کپڑے اور دوسرا ضروری سامان سوٹ کیس میں رکھا اور بچائے ہوئے ستائیس ڈالرز دوسری جیب میں رکھ لیے۔

جمی ایک بڑے درخت کے پیچھے میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا پھر میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ ہم ریل کی پٹری پار کر کے پاس کرسچین کی طرف بڑھنے لگے۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے اپنی ماں کے بارے میں سوچا۔ میں انہیں اور ڈیڈی کو بہت یاد کروں گی لیکن میں نے اپنے دل کو سمجھایا کہ میں کبھی بھی واپس آ سکتی ہوں۔ میں نے کچھ نہیں کیا تھا۔ صرف اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ بھاگ رہی تھی۔

پسنجر ٹرین پاس کرسچین پر نہیں رکتی تھی لیکن وہ دو مال گاڑیوں کا اسٹاپ تھا۔ ہم سورج نکلنے سے پہلے دوسری مال گاڑی میں سوار ہو گئے۔ اس کے ڈیڈی ٹرین یارڈ میں کام کرتے تھے۔ اس لیے جمی کو یارڈ کے بارے میں بہت کچھ معلوم تھا اور وہ جانتا تھا کہ ٹرین میں کس طرح سوار ہونا ہے۔ ہم ایک خالی بوگی میں بیٹھ گئے۔ میں نے کاغذ کا تھیلا کھولا جو میں اپنے ساتھ لائی تھی۔ ہم نے کارن بریڈ کھائی جو میری ممانے گزشتہ روز بنائی تھی۔ اس کے ساتھ دو گارنولا بار بھی تھیں البتہ ہم نے سیب آئندہ کے لیے بچا لیے۔

نیو اورلینز بہت زیادہ دور نہیں تھا اور جمی نے ٹرین سے اترنے میں میری مدد کی۔ اس کے ہاتھ میری کمر پر تھے۔ میرا ہاتھ پکڑے وہ مجھے ٹرین یارڈ سے باہر لے گیا۔ اس کے بعد ہم ایک دوسری سڑک پر چلنے لگے جیسے ہم یہیں کے رہنے والے ہوں۔ وہاں کی عمارتیں پرانی تھیں۔ میں نے سوچا کہ شاید یہ گودام ہیں۔ ان میں ایک گیراج بھی تھا۔

ہم نے پسنجر ٹرین کا اسٹیشن تلاش کیا اور اپنے سوٹ کیس وہاں لاکر میں رکھوا دیے۔

''تمہیں معلوم ہے کہ فرنچ کوارٹرز کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یقیناً میں جانتا ہوں۔'' جمی نے بلند و بالا عمارتوں کی

طرف دیکھتے ہوئے کہا اور زیادہ تیزی سے چلنے لگا۔ مجھے بہت اچھا لگا کہ میں کہیں بھی رکے بغیر اس کے ساتھ اسی رفتار سے چل سکتی ہوں۔ میں اپنے آپ کو بالکل آزاد محسوس کر رہی تھی۔ ہم کارنر پر رک کر ایک دوسرے کا بوسہ لیتے اور ہماری رفتار اسی وقت سست ہوئی جب ہم کنال اسٹریٹ پر پہنچ گئے۔ جمی نے سڑک کے پار اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہی فرنچ کوارٹر ہے۔''

نہر پر واقع عمارتیں دیکھنے میں ایک جیسی لگتی تھیں۔ ان میں سے کچھ پانچ اور چھ منزلہ بھی تھیں۔ ان کی پہلی منزلوں پر اسٹور تھے۔ جب ہم نے سڑک پار کی تو دیکھا کہ کوارٹر کی عمارتیں مختلف تھیں۔ زیادہ تر میں لوہے کی سیاہ بالکونیاں تھیں۔ ان عمارتوں کے دروازے فٹ پاتھ پر کھل رہے تھے۔ ان میں زیادہ تر لکڑی کے تھے۔ ان پر مختلف رنگ کا پینٹ ہوا تھا۔

ہم بوربن اسٹریٹ پہنچے تو صبح کا سورج پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا۔ دکانوں اور بار کے باہر لوگ ربر کے پائپ سے فٹ پاتھ اور سڑک دھو رہے تھے جن پر بہت زیادہ ردی اور کوڑا کرکٹ پھیلا ہوا تھا۔

''ہر روز صبح کو یہی ہوتا ہے۔'' جمی نے کہا۔ ''وہ رات بھر یہاں پارٹی کرتے ہیں۔'' اس نے ایک بار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو، اس میں کوئی بیرونی دروازہ نہیں ہے۔ یہ کبھی بند نہیں ہوتا۔''

میری آنکھوں کے سامنے بہت سی دکانیں اور بار مختلف ناموں کے ساتھ موجود تھے۔ یہاں تک کہ بوربن اسٹریٹ کی بغلی سڑکیں بھی دکانوں اور چھوٹے ریستوران سے بھری ہوئی تھیں۔ جمی نے کام کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔ ان کا رویہ دوستانہ تھا اور زیادہ تر ہم پر مسکرا رہے تھے لیکن فی الوقت ان کے پاس ہمارے لیے کوئی کام نہیں تھا۔

ایک بڑے گرجا گھر کے سامنے چوک میں گھاس پر بیٹھ کر ہم سوچنے لگے کہ دوپہر کے کھانے کا کیا انتظام کریں۔ ہم کوئی مہنگی چیز نہیں خرید سکتے تھے اور ریستوران کی کھڑکیوں میں رکھی ہوئی اشیا بہت مہنگی تھیں۔ ہم نے بڑی احتیاط سے اپنی رقم جیبوں سے نکالی اور اسے گننے لگے۔ میرے پاس ستائیس اور جمی کے پاس انتیس ڈالرز تھے۔

گرجا کی گھنٹی دس مرتبہ بجی تو ہم اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک جانب چل دیے۔ ہماری نظر گھوڑے پر بیٹھے اینڈریو جیکسن کے مجسمے پر گئی۔ ''یہ جیکسن اسکوائر ہے۔'' جمی نے مجھے بتایا پھر اسکوائر کی سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ واقعی پرانے اپارٹمنٹ ہیں۔''

''کیا ہم وہاں رہ سکتے ہیں؟''

''میرا خیال ہے کہ یہ بہت مہنگے ہوں گے۔''

میں نے اسے اپنے قریب کیا اور بولی۔ ''ہم ایک دن وہاں ضرور رہیں گے۔''

فرنچ کوارٹر میں کچھ تنگ گلیاں تھیں۔ ان میں بھی دکانیں بنی ہوئی تھیں۔ گرجا کے برابر والی گلی میں ہمارا سامنا کچھ دوسرے لوگوں سے ہو گیا۔ ان میں بلی، سام، جوڈی، بیٹی اور لوئی شامل تھے۔ ان کا تعلق بالترتیب اوریگون، فلوریڈا، پنسلوانیا اور جارجیا سے تھا۔ وہ سب نوعمر تھے اور ان میں سے اکثر کے جسم پر ٹیٹو بنے ہوئے تھے۔

جمی نے ان سے کام کے بارے میں پوچھا۔ لوئی نے مجھ پر ایک نظر ڈالی اور بولا۔

''تمہارے پاس سونے کی جگہ ہے؟''

''نہیں۔''

''اگر تم اس گلی میں اندھیرا ہونے سے پہلے واپس آؤ تو میں تمہیں کچھ جگہیں دکھاؤں گا۔''

بیٹی نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور بولی۔ ''یہاں سونے کے لیے بہت سی جگہیں ہیں اور انہیں تلاش کرنا مشکل نہیں ہے۔ ہم سب ساتھ رہتے ہیں۔ اسی میں تحفظ ہے۔''

فلوریڈا سے تعلق رکھنے والے سام نے کہا۔ ''گھاٹ کے نزدیک بھی کئی جگہیں ہیں یا تم آرمسٹرانگ پارک میں بھی سو سکتے ہو۔ ہم قبرستانوں میں بھی جاتے ہیں۔ وہاں تم قبروں کے درمیان بھی سو سکتے ہو۔ قبرستان میں کوئی بھی تمہیں پریشان نہیں کرے گا۔''

بلی نے کہا۔ ''سڑکوں پر بھیک نہ مانگنا۔ ورنہ پولیس والے پیچھے لگ جائیں گے۔ اس کے علاوہ سب ٹھیک ہے۔ بس سیاحوں کو تنگ نہیں کرنا۔''

بیٹی بولی۔ ''پولیس والے سیاحوں کو بدمعاشوں سے بچانے میں مصروف ہیں۔ وہ ہماری طرف دیکھتے بھی نہیں۔''

ہمیں ڈیکٹر اسٹریٹ پر وینڈی کا فاسٹ فوڈ ریستوران مل گیا۔ وہاں ہمارے زیادہ پیسے خرچ نہیں ہوئے۔ وہاں سے باہر آئے تو خوش قسمتی سے جمی کو ایک بگھی ڈرائیور مل گیا جو اپنے گھوڑے کو پانی پلا رہا تھا۔ جمی نے اس سے کام کے بارے میں پوچھا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں اپنے گودام میں ہمیشہ آدمیوں کی ضرورت رہتی ہے جہاں ہم اپنے خچر باندھتے ہیں۔''

''میں پہلے بھی جانوروں کے ساتھ کام کر چکا ہوں۔'' جمی نے کہا۔

اس آدمی نے جمی کو سر سے پاؤں تک دیکھا پھر کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ تم اسی سڑک پر سیدھے چلے جاؤ جب تک ایلی سین فیلڈ نہ آجائے۔ وہاں سے دو بلاک آگے رائل اسٹریٹ آئے گی۔ تم دائیں جانب مڑ جانا۔ ایک بلاک آگے جانے کے بعد میری اسٹریٹ آئے گی۔ اس کے کونے پر وہ گودام ہے اور اس پر نیلا رنگ ہوا ہے۔ وہاں تم سینڈی کے بارے میں پوچھنا اور اسے بتانا کہ جارج نے تمہیں بھیجا ہے۔''

جمی نے سر ہلا دیا۔ ''تم سمجھ گئے نا؟'' جارج نے پوچھا۔

''ہاں۔''

سینڈی ایک عمر رسیدہ شخص تھا اور اس کے چہرے پر گھنی ڈاڑھی تھی لیکن اس کی سبز آنکھوں میں جوانوں جیسی چمک تھی۔ ''اس کام میں بہت کم اجرت ملتی ہے۔'' اس نے جمی کو بتایا پھر اس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''کیا تم ٹیلی فون کالز کا جواب دے سکتی ہو؟''

''جی جناب۔''

''ٹھیک ہے۔ تم صبح نو بجے سے دو بجے تک یہ ڈیوٹی انجام دینا لیکن اس میں بھی کم سے کم اجرت ملے گی۔'' پھر وہ جمی سے بولا۔ ''تم بیلچے سے ردی ہٹاؤ گے اور دوسرے چھوٹے موٹے کام کرو گے۔ ٹھیک ہے؟''

''ہاں۔''

''ٹھیک ہے۔ جب تم آؤ گے تو دیکھ لیں گے۔'' سینڈی نے کہا اور گفتگو ختم ہو گئی۔

جمی اور میں تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے فرنچ کوارٹرز کی جانب روانہ ہوئے، جب ایک پولیس کار ہمارے پاس سے گزری تو جمی خوفزدہ ہو گیا۔ وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ ہم فرنچ کوارٹرز کی تنگ گلیوں تک نہ پہنچ گئے۔

''ہم پولیس کو نظر نہیں آتے۔'' لوئی نے کہا۔ ہم اس وقت گلی میں گرجا کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے ہوئے تھے۔ ''سیاحوں کو تنگ مت کرو تو کوئی تمہاری شکایت نہیں کرے گا اور ہم اپنی زندگی جیتے رہیں گے۔''

بیٹی نے کاغذ کی تھیلی سے ڈرنک کی بوتل نکالی اور مجھے ایک گھونٹ لینے کے لیے کہا لیکن میں نے انکار کر دیا۔ اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''تم گودی میں سونا چاہو گی یا آرمسٹرانگ پارک میں؟''

''پارک نسبتاً ٹھنڈا ہے۔'' لوئی نے کہا۔ ''گودی میں بہت بدبو ہے۔''

''ہم پارک میں کس طرح داخل ہو سکیں گے؟'' جمی نے پوچھا۔

لوئی نے ایک جانب اشارہ کیا اور بولا۔ ''تم اس سڑک اور لینز ایونیو پر جاؤ اور چلتے رہو۔ تم سیدھے پارک پہنچ جاؤ گے۔ تمہارے پاس گھڑی ہے؟''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔

''گڈ! ہم آدھی رات کو تمہیں سامنے والے گیٹ کے باہر ملیں گے۔ گو کہ وہ مقفل ہو گا لیکن میں تمہیں بتاؤں گا کہ اندر کیسے داخل ہونا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ اور بیٹی وہاں سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد جمی نے کہا۔ ''کھانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

ہم نے ایک بار پھر وینڈی، سے سستا کھانا کھایا اور سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے لگے۔ یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ رات دس بجے کے بعد بھی سب دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ بوربن اسٹریٹ پر اتنا رش تھا کہ اسے ٹریفک کے لیے بند کر دیا گیا۔ میں نے مضبوطی سے جمی کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ ایک آدمی کلب کے باہر کھڑا آواز لگا کر لوگوں کو اندر جانے کی ترغیب دے رہا تھا۔ اس نے جمی کا بازو پکڑ کر کہا۔ ''کیا تمہیں کام کی تلاش ہے؟''

جمی نے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں۔ میرے پاس کام ہے۔''

''ایک گھنٹے کے دس ڈالر ملیں گے۔'' اس آدمی نے اپنی جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی۔ اس میں سب سے اوپر پچاس ڈالر کا نوٹ رکھا ہوا تھا۔

''کیا کام کرنا ہو گا؟'' جمی نے پوچھا۔

''کچھ پرانا فرنیچر اٹھانا ہے۔ یہ جز وقتی کام ہے۔ تم چاہو تو شام یا صبح میں کر سکتے ہو۔ میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں دکھاتا ہوں۔''

جیسے ہی جمی نے کہا..... ٹھیک ہے دکھاؤ تو اس شخص نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا کہ میری جلد میں خارش ہونے لگی اور میں نے جمی کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس آدمی نے ایک ساتھی کو بلا کر اپنی جگہ پر کھڑا کیا اور ہمیں لے کر بار کے عقب میں ایک گلی کی طرف بڑھا۔ کچھ دور جا کر وہ ایک عمارت میں داخل ہوا اور دوسری منزل پر جا کر تیسرے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس آدمی نے آگے بڑھ کر لائٹ جلائی۔ وہ ایک اسٹور روم کے مانند لگ رہا تھا جس کے تین کونوں میں فرنیچر کا ڈھیر

لگا ہوا تھا۔

جونہی جمی اس آدمی کی جانب بڑھا، اس نے جمی کے چہرے پر زوردار ضرب لگائی اور وہ زمین پر گر پڑا۔ اس کے چہرے سے خون بہنے لگا پھر اس آدمی نے جمی کو ایک ٹھوکر ماری اور میرا بازو پکڑ کر دروازے کی طرف کھینچنے لگا۔ وہ مجھے گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا اور کمرا۔۔۔ مقفل کر دیا۔ میں چیخنے لگی تو اس نے میرے منہ پر تھپڑ مارا پھر اس نے برابر والا دروازہ کھولا اور مجھے اندر دھکیل دیا۔ کمرا خالی تھا۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔ اس کی بھوکی نظریں میرے جسم پر تھیں پھر وہ اپنی بیلٹ کھولنے لگا۔

میں نے دروازے پر ایک زوردار آواز سنی۔ میں پیچھے ہٹی تب تک وہ آدمی اپنی بیلٹ کھول چکا تھا۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور جمی اندر داخل ہوا۔ اس نے اس آدمی کے منہ پر لگاتار مکّے برسانا شروع کر دیے۔ اس آدمی نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن جمی نے اسے نیچے گرا دیا اور اسے مارتا رہا جب تک وہ حرکت کرنے کے قابل نہ رہا۔

جمی آہستہ آہستہ اٹھا۔ اس آدمی کی قمیص سے اپنے ہاتھ پر لگا ہوا خون صاف کیا اور اپنی سانسوں کو درست کرنے لگا۔ میں نے اس آدمی کی طرف دیکھا اور بولی۔

''ہمیں چلنا چاہیے۔''

جمی نے سر ہلایا اور میں نے اسے کھڑے ہونے میں مدد دی۔ جمی نے ایک کپڑے سے اپنا چہرہ اور ہاتھ صاف کیے پھر وہ اس آدمی کے قریب گیا اور اس کی جیب سے نوٹوں کی گڈی نکال کر اپنی جیب میں رکھ لی۔ پھر وہ مجھے لے کر سیڑھیوں سے نیچے آیا اور ہم گلی سے نکل کر بوربن اسٹریٹ کی طرف بھاگنے لگے۔ وہاں سے ہم ایک اور سڑک پر پہنچے اور دو بلاک کا فاصلہ طے کرنے کے بعد سانس لینے کے لیے رک گئے۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''ٹرین اسٹیشن۔'' جمی نے جواب دیا۔

''کیا ہم واپس جا رہے ہیں؟''

''ہرگز نہیں۔'' جمی نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی ہمارا تعاقب نہیں کر رہا تھا اور نہ ہی کوئی پولیس کار نظر آ رہی تھی۔

''مجھے کپڑے تبدیل کرنا ہیں۔'' جمی نے کہا اور دوبارہ چلنا شروع کر دیا۔ دو بلاک کے بعد اس کی رفتار آہستہ ہوگئی۔ اب وہ پُراعتماد انداز میں چل رہا تھا۔

''ہم نیو اورلینز میں ہی رہیں گے۔'' اس نے کہا۔

جب ہم کنال اسٹریٹ پہنچے تو وہ سڑک پار کرتے ہوئے عمارتوں کو دیکھ کر چلّایا۔ ''ہم یہاں رہیں گے۔''

جمی نے اپنی جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور انہیں گننے لگا۔ وہ تقریباً چھ سو ڈالرز تھے۔ اب ہمیں سڑکوں پر سونے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم کہیں بھی ایک چھوٹا کمرا کرائے پر لے سکتے تھے۔

اسٹیشن پر بہت رش تھا۔ جمی مردوں کے باتھ روم میں کپڑے بدلنے چلا گیا۔ ایک عورت اپنی گود میں بچہ لیے ہوئے مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے وہ کچھ پریشان نظر آئی۔ میں نے اس سے وجہ پوچھی تو وہ بولی۔ ''سمندری طوفان۔''

''کیسا طوفان؟'' میں نے پوچھا۔

''خلیج میکسیکو میں طوفان آیا ہوا ہے اور اس کا رخ ہماری طرف ہے۔''

اسٹیشن کے ایک کونے میں ٹی وی لگا ہوا تھا۔ جب جمی واپس آیا تو ہم ٹی وی دیکھنے لگے۔ نیوز کاسٹر اپنے عقب میں اسکرین کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

''پیش گوئی کے مطابق یہ طوفان مغربی سمت سے نیو اورلینز کی جانب بڑھ رہا ہے جس کے نتیجے میں ہمیں آندھی اور سمندری لہروں کا سامنا ہو سکتا ہے۔ مسی سپی اور الباما گلف کوسٹ میں اس طوفان کی شدت زیادہ ہوگی اور وہاں تیز ہوائیں، بارش اور سمندری طوفان کا خطرہ ہے۔''

میں نے ممی ڈیڈی کے بارے میں سوچا لیکن میرے ڈیڈی ہمیشہ طوفان سے پہلے وہاں سے چلے جاتے تھے۔ وہ اب بھی چلے جائیں گے۔ ''امید کرنی چاہیے کہ ہمارے بند مضبوط رہیں گے۔'' نیوز کاسٹر نے کہا۔ ''وہ ہمیں کیٹیگری تھری کے طوفان سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔''

جمی نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اسٹیشن سے باہر لے آیا اور بولا۔ ''قسمت ہمارا ساتھ دے رہی ہے امینڈا۔ طوفان میں ڈوبنے سے بہتر ہے کہ یہاں چھپ کر رہا جائے۔ پولیس بھی یہی سمجھے گی کہ ہم طوفان میں بہہ گئے۔ اب ہمیں کوئی تلاش نہیں کرے گا۔ ہم یہاں بالکل محفوظ ہیں۔''

یہ کہتے ہوئے اسے ایک لمحے کے لیے بھی اپنے بیمار باپ کا خیال نہیں آیا۔ شاید اس کے اندر کی کمینگی ایک بار پھر سر اٹھا رہی تھی۔ وہ تو یہی چاہتا تھا کہ اس کا باپ مر جائے تاکہ اس کی تکلیف ختم ہو۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ اسے واقعی اپنے باپ سے ہمدردی تھی یا وہ خودغرض بن کر سوچ رہا تھا۔

⌘⌘⌘

محفلِ شعر و سخن

❁ شہیر اسامہ سیال.....کوئنس روڈ، سکھر

عجیب لوگ بستے ہیں تیرے شہر میں محسن
مرمت کانچ کی کرتے ہیں پتھر کے اوزاروں سے

❁ دل افگار.....حیدر آباد

رات بھر ہوتی رہی برسات دل جلتا رہا
دل پہ انجانا سا کوئی تیر چلتا رہا.....!
وقت کے دریا سے لمحوں کے نہ موتی چن سکے
بے خبر ہم اور سورج عمر کا ڈھلتا رہا

❁ رخسانہ شکیل.....آزاد کشمیر

مچل مچل کے ابھرتی ہے جب چراغ کی لَو
میں سوچتا ہوں کہ ان لرزشوں میں تُو تو نہیں

❁ محمد شہباز اکرم نوئی.....ڈھپئی پاک پتن شریف

نہ لفظوں کی شرارت نہ حروف کی جادوگری
بس اتنی سی بات کہ تجھ پہ مر گیا ہے کوئی
زمانے کی رسمیں اور قبیلوں کی روایات آہ
تیرے عشق میں جو نہ کرنا تھا وہ بھی کر گیا کوئی

❁ محمد نصیر .....کوئنس روڈ، سکھر

کوئی تو بات ہے آخر میری مہمان نوازی میں
کہ غم ایک بار آتے ہیں تو پھر واپس نہیں جاتے

❁ زرین خان.....حیدر آباد

یہ جو ڈوبی ہیں میری آنکھیں اشکوں کے دریا میں
یہ مٹی کے انسانوں پر بھروسے کی سزا ہے

❁ محمد انور ندیم.....اسلام نگر، جویلی لکھا، اوکاڑہ

ساری دنیا سے دور ہو جائے
جو ذرا تیرے پاس ہو بیٹھے

❁ شہزادہ محمد اسلم.....اوکاڑہ

سہمے ہوئے لوگوں پہ مکانوں کی چھتوں پر
اک تیغ نئے خوف کی سو بار گری ہے
کیا حشر بپا ہے کہ اندھیرے میں اچانک
ہمسائے پہ ہمسائے کی دیوار گری ہے

❁ سید ظفر عباس.....بھوآنہ

دل کی ضد تھی کہ شکایت نہیں کرنی ورنہ
تم سے تو وہ گلے ہیں کہ ..... بس رہنے دو

❁ وزیر محمد خان.....بٹل ہزارہ

یہ ٹوٹ کے بکھرا ہے کہ ٹوٹا ہے بکھر کے
ہم دل کی تباہی کا سبب ڈھونڈ رہے ہیں

❁ لبنیٰ وکیل.....کوئٹہ

بس کہنا کہ سہولت سے نہیں جی پایا
میری نسلوں کو میرے دکھ نہ بتائے جائیں

❁ عظیم احمد.....جھنگ سٹی

آدمیت ہی جب اس دور میں پامال ہوئی
اپنی اک ذات کے لٹنے کا مجھے غم کیوں ہو
اس کے سائے میں جب انسان کو دم لینا ہے
خونِ انساں ہی میں ڈوبا ہوا پرچم کیوں ہو

❁ شاہد علی ..... فیصل آباد

یہ فخر تو حاصل ہے بُرے ہیں کہ بھلے ہیں
دو چار قدم ہم بھی تیرے ساتھ چلے ہیں

❁ صبا سحر ..... کراچی

زندگی تیرے تعاقب میں لوگ
اتنا چلتے ہیں کہ مر جاتے ہیں

❁ منیر شگفتہ ..... وہاڑی

ڈبو چکا ہے امنگوں کو جس کا سناٹا
بلا رہا ہے اسی بزم سے قیاس ہمیں
یہ پوچھنا ہے کب آدم زمیں پہ اترے گا
جو لے چلے کوئی کامل، خدا کے پاس ہمیں

❁ انجم کمال ..... حیدرآباد

ذرا آنکھیں کھلی رکھنا تماشا ہونے والا ہے
کہ دریا اب کوئی دم میں کنارا ہونے والا ہے
مری وحشت اترتی جا رہی ہے میرے دشمن میں
یہ سر کا بوجھ لگتا ہے کچھ ہلکا ہونے والا ہے

❁ طاہر مجاہد ..... چھالیہ

چمپہ جیسا روپ ہے تورا سورج مکھی بال
ساگر جیسے نین ہیں تورے ہرنی جیسی چال

❁ طیب اسد ..... ڈیرہ اسماعیل خان

قبریں ہی جانتی ہیں کہ اس شہر جبر میں
مر کر ہوئے ہیں دفن کہ زندہ گڑے ہیں لوگ

❁ امتیاز احمد ..... منڈی بہاؤالدین

جو کچھ کہیں رکھا تھا کہیں رکھ رہے ہیں اور
ہر چیز کو کہیں سے کہیں کر رہے ہیں ہم
یوں ہو رہا ہے جیسے نہیں ہو رہا ہے کچھ
یوں کر رہے ہیں جیسے نہیں کر رہے ہیں ہم

❁ نوشہ گلزار ..... بھکر

ذات کے میدان میں جنگ ہے گھمسان کی
میرا ہی لشکر ادھر، میرا ہی لشکر ادھر
ایک طرف تیرگی، ایک طرف روشنی
صبح کے پیکر ادھر، رات کے پتھر ادھر

❁ ریاض بٹ ..... حسن ابدال

پیار جنت سے اس لیے ہے مجھے
یہ میری ماں کے قدم چومتی ہے

❁ نادیہ ریاض ..... نواب شاہ

جب چاند کو بدلی میں چھپا لیتی ہیں زلفیں
اس وقت تیرے حسن کا ہوتا ہے سماں اور

❁ محمد کمال انور ..... اورنگی ٹاؤن، کراچی

اے شمع تیری عمر طبعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

❁ فیاض ملک ..... کوئٹہ

مصروفیت بہت تھی وصال و فراق میں
میں دل کو اہتمام سے فرصت میں لے گیا
یک جائی تجربہ تھی ہوس نذر انتشار
اک لمحہ سکوں تھا کہ وحشت میں لے گیا

❁ سلیم قادر ..... سیانوال راجھا

یہی فن ہے میرا دنیا مجھے سادہ سمجھتی ہے
بڑی دانائی سے میں اس کو نادانی میں رکھتا ہوں
میرے اشکوں سے واقف ہیں مری جلتی ہوئی آنکھیں
نہ پوچھو شعلگی کیسی میں اس پانی میں رکھتا ہوں

❁ ماریہ چودھری ..... پاکپتن شریف

رکھا جو میں نے ہجر میں بھی قرب کا سرور
اس نے قرار جاں کا قرینہ بدل دیا
چاہی جو میں نے وجہ طلب میں سپردگی
اس نے نظام وصل ہی سارا بدل دیا

❁ ثاقب کمال ..... کراچی

ہم کو ناویب تمنا یہ کہاں لے آئی
اب تری یاد بھی ایسی ہے کہ جیسے تو ہے

❁ ناہید یوسف ..... اسلام آباد

کب تک لیے پھروں گا یونہی قتل گاہ میں
زخموں کے انتظار میں دکھتا ہوا بدن

❁ زبیر خان ..... لیہ

اس سے رشتے عجیب ہیں میرے
اک محبت کا، اک جدائی کا

❁ میمونہ عزیز ..... لاہور

تماشا ذات کا مستور ہونے کے لیے تھا
میں اتنا خوش، بہت رنجور ہونے کے لیے تھا
کہاں میں اور کہاں گوشہ نشینی کا یہ اعلان
یہ سارا سلسلہ مشہور ہونے کے لیے تھا

❁ عمران شیروانی.....لاہور

چھپے ہیں اشک دروازوں کے پیچھے
چھتوں نے سسکیاں ڈھانپی ہوئی ہیں

❁ محمد آریز ملک.....گلستانِ جوہر، کراچی

دشمن کے جو لشکر ہیں وہ خونخوار بہت ہیں
موسم کے بدلنے کے بھی آثار بہت ہیں

❁ امجد ریاض.....چیچہ وطنی

مجھ کو تھا وشواس ملے گا مورے من کا میت
پیار کی بازی کھیل گئی میں ہار ہوئے یا جیت

❁ مدحت رضوان.....کراچی

سب گوارا ہے تھکن، ساری دکھن ساری چبھن
ایک خوشبو کے لیے ہے یہ سفر جیسا بھی ہے

❁ وسیم خان.....خانیوال

میں جسے شرطِ ادب کہتا ہوں، تُو فرطِ حیا
عشق اور حسن میں حائل ہے وہ دیوار بھی

❁ شاہینہ مہتاب.....چنیوٹ

رسائی اصل میں ہے انتہائے سرشاری
مسافرانِ محبت تھکن سے چُور نہ تھے

❁ جواد خان.....میانوالی

بلا رہے ہیں افق پر وہ زرد رو ٹیلے
کہو تو ہم بھی فسانوں کے راز ہو جائیں

❁ حنظلہ شاہد.....سکھر

ابہام کی اک دھند میں لپٹے تھے سبھی لفظ
مفہوم پھر اس زلفِ گرہ گیر سے نکلا

❁ نعیم احمد.....بہاولپور

تورا اشارہ پائے تو یہ سمے ٹھہر سا جائے
تو جو کہے تو ڈوبا سورج واپس مڑ کر آئے

❁ صبا حمید.....ٹنڈو الہیار

سبب کیا ہے کہ نہیں ہو رہا ہے کچھ یہاں
جو ہو رہا ہے بہر سمت بے سبب کیا ہے

❁ محمد ریاض انصاری.....لاہور

نمٹ رہا ہوں ابھی دوسروں سے، اس کے بعد
میں اپنے آپ کو بھی خوار کرنے والا ہوں

❁ عاصم خان.....کراچی

یقیں تو ایک ناپختہ سی شے ہے زندگی میں
سو ہم نے خود کو خاصا خوش گماں رکھا ہوا ہے

❁ محمد یوسف.....روہڑی

آنکھیں مدرا برساتی ہیں بول میں امرت دھار
امرت دھار سے لہجے میں ہے تیکھے پن کا پیار

❁ آصف خان.....مری

عاشق ہیں بڑی چیز ہے یہ درد کی دولت
ہم بھی ہیں کسی صاحبِ ثروت کے برابر

❁ یمنیٰ جاوید.....کراچی

مکھ پر لالی کان میں بالی گلے میں چندن ہار
تورے روپ کی سندرتا میں بولے پی کا پیار

❁ شگفتہ ریاض.....راولپنڈی

خوب ہے یہ زندگی جس کی محبت میں ہیں
وہ جو ہیں آرام سے، وہ بھی مصیبت میں ہیں

❁ ندا علی.....میر پور خاص

پھر سے آمادہ ہے وہ حسن تماشے کے لیے
ہم ابھی پہلے ہی منظر سے نہیں نکلے ہیں

❁ پرویز خان.....میر پور ماتھیلو

کھلیں تو کیسے نگاہوں پہ صبح کے اطوار
سمجھ میں کچھ نہیں آتا مزاجِ شب کیا ہے

❁ علی نواز بلوچ.....کوئٹہ

جھوٹی ساری ریت رسم ہے جھوٹا سب سنسار
اپنی ذات سے پریم ہے سچا باقی سب بے کار

❁ جنید احمد ملک.....گلستان جوہر، کراچی

اور کیا یہ کسی نیکی کا صلہ دے گا ہمیں
وقت کا کام بھلانا ہے بھلا دے گا ہمیں

دنیا گول ہے... اور حقیقت بھی یہی ہے ہر چیز گھوم کر اپنے مرکز پر واپس آجاتی ہے... اور دولت تو ویسے بھی گردش میں رہتی ہے آج یہاں تو کل وہاں... اس کے ساتھ بھی تو ایسا ہی ہوا جو اس کی زندگی کا سرمایا تھا بچھڑنے کے باوجود اپنا چکر مکمل کرکے اس کے پاس واپس لوٹ آیا تھا کیونکہ... دنیا گول ہے۔

خدا کی قدرت کا منفرد اور دلچسپ قصہ

طریقہ

اعتزاز سلیم وصلی

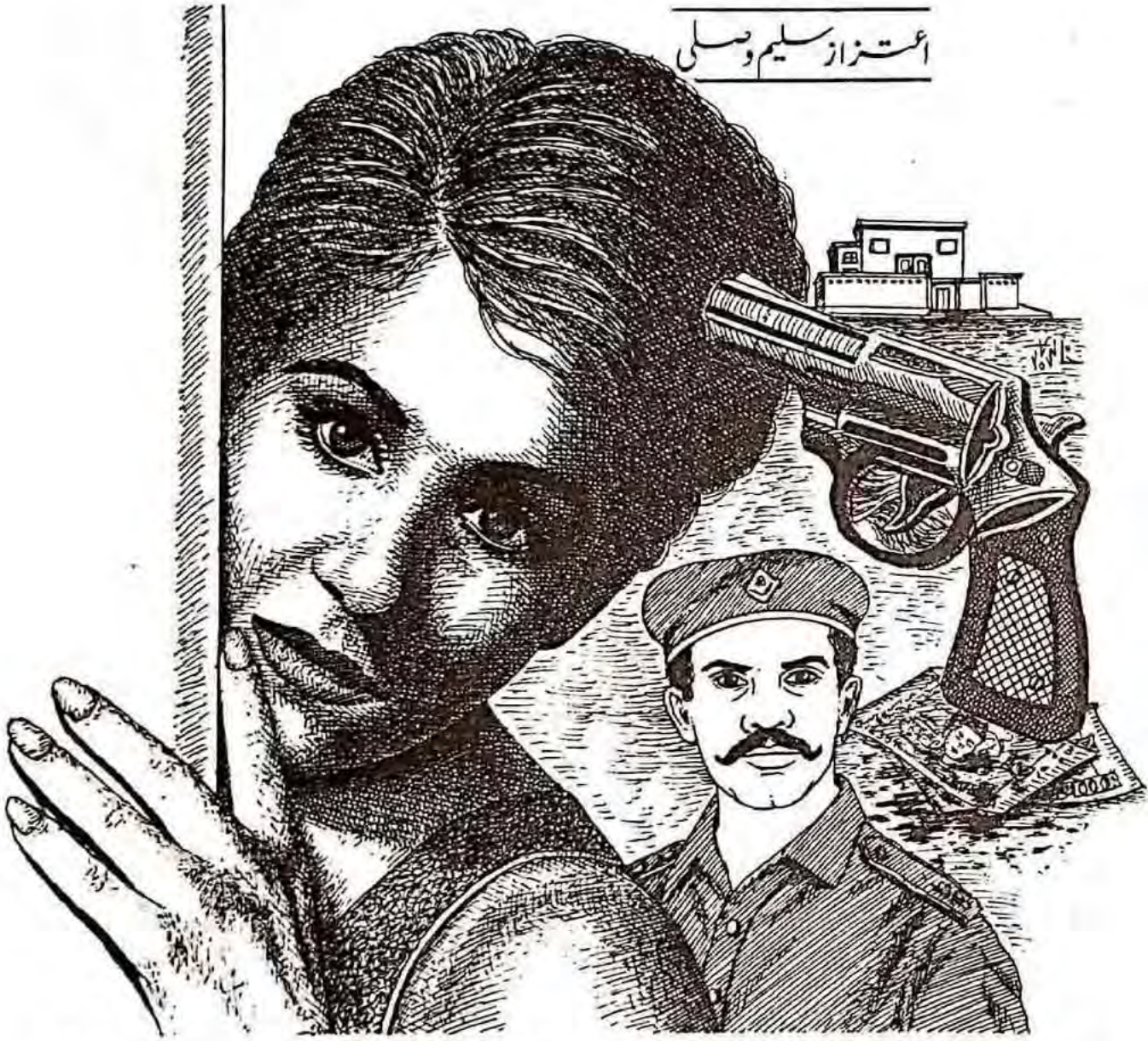

''جی وہ سامنے والا گھر ہے۔'' اس نے نیلے گیٹ والے گھر کی طرف اشارہ کیا۔ انسپکٹر جابر نے اس جانب قدم بڑھا دیے۔ اس کے چہرے پر پولیس والوں کی روایتی سختی دکھائی دیتی تھی۔ بڑی بڑی مونچھوں اور کرخت نقوش کا مالک جابر روایتی پولیس والا ہی تھا۔ اس پراپرٹی ایجنٹ کی مدد سے وہ کافی دنوں سے گھر تلاش کر رہا تھا۔ اسی سلسلے میں آج وہ اس کالونی میں آیا تھا جہاں زیادہ گھر نہ تھے۔ یہ کالونی دو تین سال پہلے آباد ہوئی تھی۔ اس گھر کی تعمیر بھی چند

ماہ پہلے مکمل ہوئی تھی۔

''اس کا مالک کون ہے؟'' جابر نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

''شیراز صاحب ہیں۔ اس طرح کے کام پہلے کرتے رہے ہیں..... کافی جائداد خرید رکھی ہے انہوں نے۔ آج کل قیمت ذرا بڑھی ہوئی ہے تو بیچنا شروع کر دی ہے۔'' پراپرٹی ایجنٹ، ذیشان نے تفصیل بتائی۔

''اس گھر کا کیا مانگ رہے ہیں؟''

''یہ تو آپ پر منحصر ہے کہ کس قیمت پر لیتے ہیں۔''

''مطلب؟''

''اگر ساری رقم ایک ساتھ ادا کریں تو تقریباً پندرہ لاکھ میں یہ گھر آپ کا ہوگا۔ اگر اقساط کی شکل میں کریں تو ظاہر ہے قیمت زیادہ ہو گی..... یعنی پندرہ سے دو تین اوپر۔'' جابر نے سر ہلا دیا۔ گھر اسے پسند آیا تھا۔ یہ تین کمروں کا مکان تھا۔ پینٹ کچھ دن پہلے ہوا تھا جس کی وجہ سے ایک مخصوص بو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔

''میں ایسا کرتا ہوں کل اپنی بیگم کو لے کر آتا ہوں، اگر اسے پسند آ گیا تو ٹھیک..... پرسوں تمہیں چیک دے دوں گا۔ رقم قسطوں کی شکل میں ہی ادا کروں گا۔ تم اس حوالے سے تفصیل بتا دینا۔''

''تفصیل کیا بتانا سر جی! آپ دو لاکھ مجھے پرسوں جمع کروا دیں، چیک کی بہ نسبت کیش بہتر رہے گا کیونکہ مجھے بھی اپنا کمیشن لینا ہوتا ہے تو بینک کے چکر کے بجائے سیدھا پکڑ لوں گا۔ میں آپ کو کاغذات دے دوں گا۔ باقی قسطوں کی تفصیل شیراز صاحب سے مل کر طے کر لیں گے۔'' ذیشان نے کہا۔ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد اس نے جانے کی اجازت مانگی۔ جابر بھی اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔ گاڑی واپس سڑک پر لا کر اس نے سیل فون نکالا اور سویرا کا نمبر ملایا۔

''کیا ہو رہا ہے میری جان؟'' دوسری طرف سے آواز سنائی دیتے ہی اس نے محبت سے پوچھا۔

''جناب کا انتظار ہو رہا ہے..... ضرور اپنی بیگم صاحبہ کے پاس ہوں گے۔'' سویرا کی غصے سے بھری آواز سنائی دی۔

''ارے نہیں میری جان..... میں تو گھر ڈھونڈ رہا تھا ہمارے لیے۔ ایک گھر پسند آیا ہے مجھے، کل مل کر دیکھ لیں گے۔ تمہیں لینے آؤں گا، تیار رہنا۔'' سویرا اس کی دوسری بیوی تھی جس سے اس نے دو ماہ پہلے چھپ کر شادی کی تھی۔ پہلی بیوی نازیہ اس کے چچا کی بیٹی تھی جس سے جابر کے دو بیٹے تھے..... سویرا سے اس کی ملاقات ایک کیس کے سلسلے میں ہوئی تھی۔ اس کی زلفوں کے جال میں پھنس کر جابر دل ہار بیٹھا تھا۔ سویرا کی صرف ایک بوڑھی ماں تھی۔ ابھی تک وہ اپنے گھر میں ہی رہ رہی تھی مگر دو ہفتے سے اس نے نئے گھر کی رٹ لگا رکھی تھی جس کی وجہ سے جابر کو کافی پریشانی ہوئی مگر اپنی پیاری بیوی کی فرمائش پوری کرنا اس کی مجبوری تھی۔

''کس وقت آئیں گے؟'' سویرا نے خوش ہو کر پوچھا۔

''کل صبح ہی آ جاؤں گا..... گھر اچھا ہے، امید ہے تمہیں بھی پسند آئے گا۔'' اس نے گاڑی پولیس اسٹیشن کی طرف موڑ دی۔ چند منٹ مزید باتیں کرنے کے بعد اس نے کال منقطع کر دی اور ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز کر لی۔

☆☆☆

''تمہارا نام کیا ہے؟'' اس عورت نے شانزے کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

''شانزے.....'' اس نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔ نہ جانے کیوں وہ اس عورت کے سامنے گھبراہٹ کا شکار تھی۔

''اگلے ایک ماہ کے لیے اس نام کو بھول جاؤ۔ تمہارا نام عابدہ ہے اور تمہارا اس دنیا میں میرے سوا کوئی نہیں۔ میں تمہاری خالہ ہوں اور میرا نام پروین ہے.....'' اس نے چند باتیں اور بتائیں اور کہا۔ ''ان باتوں کو یاد کر لو— گھبراؤ گی تو کام ٹھیک سے نہیں ہو گا جس میں ظاہر ہے میرا بھی نقصان ہے اور تمہارا بھی۔'' شانزے نے اثبات میں سر ہلایا۔ پروین سے اس کی ملاقات اس کی دوست صبا نے کروائی تھی۔ شانزے کو پیسوں کی اشد ضرورت تھی۔ اس سلسلے میں اس نے اپنی دوست صبا سے ذکر کیا اور صبا اسے پروین کے پاس لے آئی۔ پروین بھی اس کا فرضی نام تھا۔ یہ عورت بہت چالاک نظر آتی تھی۔ اس نے شانزے کو صاف بتا دیا۔

''کام غیر قانونی ہے۔ دھوکا دے کر فرار ہونا ہے..... جسم بھی کسی کے حوالے کرنے کی نوبت آ سکتی ہے مگر میں کوشش کروں گی کام پہلے مکمل ہو جائے۔'' شانزے کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ اس نے دل ہی دل میں خدا سے معافی مانگی اور پروین کے ساتھ کام کرنے پر راضی ہو گئی۔ اس نے دس بارہ دن بعد دوبارہ رابطہ کرنے کا کہا۔ نو دن بعد پروین کی کال آئی۔

''ایک بندہ ہاتھ لگا ہے، کل اس سے ملنا ہے۔ ایڈریس بھیج رہی ہوں، کل صبح آ جانا۔'' اگلی صبح اتوار

تھا۔ وہ دس بجے تیار ہو کر ایڈریس پر پہنچ گئی۔ یہ دو کمروں کا چھوٹا سا مکان تھا۔ پروین وہاں پہلے سے موجود تھی۔ شام تک پروین نے اس کی تربیت کی اور اسے اس کے حصے کا کام سمجھایا۔ شانزے کو کچھ اعتماد محسوس ہوا۔ مغرب کی اذان کے بعد ایک اٹھائیس سال کی عمر کا شخص گھر میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ پروین کی دوست تھی۔ انہیں کمرے میں بٹھا کر پروین اس کے پاس کچن میں آئی اور کہا۔

''پانچ منٹ بعد چائے لے کر آ جانا۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہلکا سا میک اپ کیے وہ خوبصورت لگ رہی تھی..... پانچ منٹ بعد جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو اس شخص نے عجیب نظروں سے اسے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے ان کی نظریں ملیں..... شانزے کے پورے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اگر پروین اور دوسری عورت کمرے میں نہ ہوتیں تو شاید وہ اسے بھنبھوڑ ڈالتا۔ چائے میز پر رکھنے کے بعد وہ واپس مڑی۔ جاتے جاتے اس کے کانوں میں کچھ جملے پڑے.....

''خالہ! آپ پریشان نہ ہوں۔ میں اسے ہمیشہ خوش رکھوں گا۔ میرا بھی دنیا میں کوئی نہیں۔ جہیز وغیرہ میں نے لینا نہیں۔ باقی شادی کے اخراجات کے لیے میں جلد آپ کو پیسے دے جاؤں گا۔'' صاف محسوس ہو رہا تھا کہ شانزے کے حسین چہرے کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ اس کے جانے کے بعد پروین نے اسے واپس بھیج دیا۔ بعد میں اسے علم ہوا..... وہ گھر کرائے پر حاصل کیا گیا تھا اور پروین کی دوست اس ڈرامے میں رشتے کروانے والی کا کردار ادا کر رہی تھی۔ یہ شکار بھی اسی نے جال میں پھنسایا تھا۔ گویا ان کی ضرورت کی رقم جلد انہیں ملنے والی تھی۔

☆☆☆

''اور کوئی راستہ نہیں شہزادے۔'' جمیل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے سر جھکا لیا۔ جس چیز سے وہ برسوں سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا، آج ... وہی سامنے تھی۔

''میں یہ نہیں کر سکتا جمیل ..... میں بزدل ہوں۔'' اس نے اعتراف کیا۔

''یار شہزاد! بزدل کوئی بھی نہیں ہوتا، حالات ایسے ہو جائیں تو پھر بزدلی اور شرافت کو بھول کر کچھ کرنا پڑتا ہے۔ آج تیری ماں بستر پر ہے..... بلڈ کینسر کے علاج میں تو لاکھوں لگیں گے اور تیری جیب میں ایک روپیہ بھی نہیں۔'' وہ اسے گھیر رہا تھا۔ شہزاد بے بس تھا..... اس کا جال رفتہ رفتہ اسے جکڑ رہا تھا۔

''پر میرا ایسا کسی کام کا تجربہ نہیں۔ آپ کہتے ہیں ایک بنگلے میں گھس کر ڈکیتی کرنی ہے۔ میں نے تو کبھی پستول کو بھی ہاتھ میں نہیں پکڑا، چلانا تو دور کی بات.....''

''ابے یار کون تجھے کہہ رہا ہے وہاں ''دھائیں، دھائیں'' کر۔ تجھے بس ہمارا ساتھ دینا ہے، ایک آدمی اور ہے۔ اصل کام ہم کریں گے۔'' اس نے آنکھ دبائی۔

شہزاد ایک... مڈل کلاس فیملی سے تھا۔ ان کے حالات سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں شاید تین دن ہی ٹھیک رہتے ہوں گے۔ اس کا باپ ایک سرکاری کالج میں جونیئر کلرک تھا۔ ایمانداری سے کام کرنے کی وجہ سے جونیئر ہی رہا، نہ کبھی ترقی کر سکا اور نہ گھر کے حالات میں ترقی لا سکا۔ شہزاد نے گریجویشن مکمل کیا مگر کوئی جاب نہ مل سکی۔ شہزاد کی چھوٹی بہن دوسرے شہر میں ایک پارلر پر کام سیکھنے کے ساتھ ساتھ معمولی تنخواہ پر نوکری بھی کر رہی تھی جبکہ سب سے چھوٹی بہن ابھی میٹرک میں تھی۔ گھر کا اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے سارا بوجھ شہزاد کے کندھوں پر آن پڑا۔ اس نے سہارا دینے کی بھرپور کوشش کی۔ کئی جگہوں پر معمولی نوکریاں کیں۔ ہوٹل کے ویٹر سے لے کر ایک میڈیکل اسٹور کے کاؤنٹر بوائے تک..... حالات شاید سدھر جاتے مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ شہزاد کی ماں کو بلڈ کینسر نے لپیٹ میں لے لیا۔ علاج مہنگا تھا۔ ہر ماہ میں خون چڑھنا..... پھر اسپتال کے چکر، ڈاکٹروں کی فیس اور دواؤں کا خرچ۔ گھر کا بجٹ بھی ملکی بجٹ کی طرح خسارے میں چلا گیا۔ جو چند گھر رشتے داروں کے تھے، وہ بھی انہی کی طرح بہ مشکل گزارہ کرنے والے تھے اس لیے قرض ملنا بھی تقریباً ناممکن تھا۔

شہزاد جس میڈیکل اسٹور پر نوکری کرتا تھا، وہاں اس کی ملاقات جمیل سے ہوئی۔ جمیل کالج میں اس کا کلاس فیلو تھا۔ دونوں میں اچھی دوستی تھی۔ شہزاد کے حالات جاننے کے بعد اسے حقیقی معنوں میں افسوس ہوا مگر وہ جس راستے پر تھا اس راستے پر شہزاد کو لے جانا بہت مشکل تھا۔ چھوٹی موٹی چوریوں سے لے کر بڑے بنگلوں میں گھس کر وارداتیں کرنے والا جمیل اس کے حالات ایک واردات میں ہی بدل سکتا تھا۔ سوچ سمجھ کر اس نے یہ پیشکش شہزاد کے سامنے رکھی۔ شہزاد کا سر نفی میں ہل گیا لیکن جمیل نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ اسے امید تھی کہ شہزاد ان کے ساتھ مل جائے گا۔ آخر جب حالات نے شہزاد کے کندھوں کو بالکل ہی جھکا دیا تو اس نے جمیل کی آفر قبول کر لی۔ جرم کے راستے پر آنے

والے آدمی کی طرح اس نے بھی یہی سوچا کہ پہلی واردات کے بعد دوبارہ کبھی نہیں کرے گا لیکن انسان جو سوچتا ہے اگر وہی ہو تو تقدیر نام کا لفظ انسان اپنی زندگی سے نکال دے۔ شہزاد کے لیے بھی تقدیر کا منصوبہ کچھ اور تھا۔

☆☆☆

پہلی تاریخوں کا چاند تھا۔ بہت مدھم سہی مگر روشنی زمین کو چھو ضرور رہی تھی۔ سڑک کے پار مہران گاڑی ایک درخت کے نیچے آ رکی۔ سامنے بنگلے کی لائٹس آف تھیں۔ چاند کی مدھم روشنی اس درخت کے پتوں سے گزر کر مہران پر پڑ رہی تھی۔

''کیا خیال ہے، سب سو چکے ہوں گے؟'' ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے جمیل نے ساتھ بیٹھے اپنے دوست منور سے پوچھا۔

''ہاں، میرا خیال ہے سو چکے ہوں گے۔ ایک عورت اور اس کا بیٹا ہی ہوتا ہے اس وقت تو.....''

''شوہر کے بارے میں کیا خبر ہے؟''

''کل اس کی فلائٹ تھی۔ دبئی چلا گیا ہے..... کاروباری بندہ ہے اکثر ملک سے باہر رہتا ہے۔'' پچھلی سیٹ پر بیٹھا شہزاد حیرت سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ان دونوں کی پلاننگ زبردست تھی۔ سیکیورٹی سے لے کر بنگلے کے مالکان تک..... وہ ہر چیز کی مکمل خبر رکھتے تھے۔

''تم کہہ رہے ہو صرف ایک چوکیدار ہو گا..... کیا خیال ہے سیکیورٹی کیمرے اور الارم وغیرہ بھی تو ہو سکتا ہے؟'' جمیل نے ایک اور اعتراض کیا۔

''سیکیورٹی کیمرے ہیں۔ ان کی ریکارڈنگ ضائع کر دیں گے..... تمہیں کمپیوٹر استعمال کرنا آتا ہے نا؟'' منور نے پیچھے مڑ کر اسے دیکھا۔

''ہاں آتا ہے۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''بس پھر نکلو باہر اب .....اور وقت ضائع کرنا مناسب نہیں۔'' تینوں باہر آ گئے۔ پلان کے مطابق شہزاد آگے بڑھا اور گیٹ پر جا کر بیل بجائی۔ کچھ دیر انتظار کیا مگر کوئی جواب نہ آیا۔ اگلی بار اس نے دو تین بار بیل بجائی۔ کچھ دیر بعد ایک پٹھان چوکیدار باہر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں کلاشنکوف تھی۔ آنکھوں میں نیند تھی، شاید وہ سو رہا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' اس کا انداز جارحانہ تھا۔

''خان صاحب! ہماری گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ کافی دیر سے یہاں کھڑے ہیں..... پانی مل سکتا ہے؟'' شہزاد نے رٹائی گئی بات دہرائی۔

''تو ہم کیا کریں..... دفع ہو جاؤ۔'' وہ پیچھے مڑا۔

''خان صاحب! پانی مانگا ہے، اتنا غصہ کس بات کا۔'' شہزاد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ واپس مڑا اور خونی نظروں سے اسے دیکھا۔

''تمہارا دماغ خراب ہے..... بولا نا دفع ہو جاؤ۔'' اس کی ساری توجہ شہزاد پر تھی۔ ابھی اس نے کچھ اور کہنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ پسٹل سے لگائی گئی منور کی ایک ضرب کافی ثابت ہوئی۔ وہ نیچے گر گیا۔ منور نے تسلی کے لیے ایک بار پھر دستے کو اس پر آزمایا۔

''اب یہ دو تین گھنٹے کے لیے ہوش میں نہیں آئے گا۔'' خوش قسمتی سے سڑک ویران پڑی تھی۔ وہ اسے گھسیٹ کر بنگلے کے اندر لے آئے۔ گیٹ بند کر کے انہوں نے رسی کی مدد سے چوکیدار کو باندھ دیا۔ کچھ دیر بعد وہ تینوں بیڈروم کے سامنے کھڑے تھے جہاں گھر کی مالکن سو رہی تھی۔

''تم اسے قابو کرو..... میں اس کے بیٹے کو دیکھتا ہوں۔'' جمیل نے منور کو اشارہ کیا اور شہزاد کی طرف مڑ کر کہا۔ ''تم ان سیکیورٹی کیمروں کو کنٹرول کرنے والا کمپیوٹر تلاش کرو اور کیمرے آف کر دو۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا اور ایک کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے دل کی دھڑکن قابو سے باہر تھی اور ماتھے پر پسینا چمک رہا تھا۔ تھوڑی کوشش کے بعد اس نے کمپیوٹر تلاش کر لیا۔ ریکارڈنگ اڑانے کے بعد اس نے سیکیورٹی کیمروں کو بند کر دیا۔ اتنی دیر میں جمیل اور منور، ان ماں بیٹے کو ایک جگہ پر باندھ چکے تھے۔ وہ دونوں خوفزدہ تھے اور ان کا ہر حکم ماننے پر تیار تھے۔ انہیں مزید وہاں ایک گھنٹا لگ گیا۔ جیولری اور کیش انہوں نے ایک بیگ میں ڈال لیا۔ اپنا کام مکمل کرنے کے بعد وہ باہر نکل آئے اور بھاگتے ہوئے گاڑی میں بیٹھے۔ ابھی انہوں نے دس بارہ کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا تھا کہ سامنے پولیس کا ناکا دکھائی دیا۔

''یہ کمینے کہاں سے آ گئے؟'' منور بڑبڑایا اور جمیل سے کہا۔ ''گاڑی روک لینا۔ چند سوال ہی پوچھیں گے۔'' شہزاد کی سانس اٹکنے لگی۔ قریب جا کر انہوں نے گاڑی روک لی۔ ایک سپاہی بھاگتا ہوا ان کی طرف آیا۔

''کدھر سے آ رہے ہو چودھری؟'' اس نے پولیس والوں کے انداز میں بات شروع کی۔

''کام تھا قریب ہی.....''

''کیا کام؟''

''طبیعت خراب تھی ایک دوست کی.....اس کا پتا کرنے گئے تھے انسپتال۔'' جمیل نے تھوڑا پیچھے موجود ایک اسپتال کا نام لیا۔

''کاغذات دکھاؤ گاڑی کے.....'' اب کی بار جمیل کے پاس کوئی جواب نہ تھا کیونکہ گاڑی چوری کی تھی۔ اس نے منور کی طرف دیکھا۔ وہ پریشان نظر آتا تھا۔ شہزاد کا دل ڈوبنے لگا۔ جیل کی سلاخیں آنکھوں کے سامنے آگئیں۔ سپاہی کو شک پڑ گیا۔

''نیچے اترو۔'' اس نے حکم دیا۔ وہ تھوڑا آگے بڑھا۔ اسی لمحے جمیل نے اچانک کار کا دروازہ اَن لاک کر کے ایک جھٹکے سے کھولا جو پوری قوت سے سپاہی کو لگا۔ وہ چیختا ہوا پیچھے جا گرا۔ رات کی خاموشی ٹوٹ گئی۔ مہران کے ٹائر چیخے اور گاڑی ایک جھٹکے سے پولیس کے اسٹاپ بورڈ کو گراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ دوسرے سپاہیوں کی چلائی گئی گولیاں کار کی باڈی میں لگیں۔

''وہ پیچھے آ رہے ہیں۔'' شہزاد کی لرزتی ہوئی آواز نے خوفناک خبر سنائی۔ پولیس وین فل اسپیڈ سے پیچھے آ رہی تھی۔ مہران کا انجن اتنا طاقتور ہرگز نہیں تھا کہ اس کا مقابلہ کر سکتا۔ یہ دوڑ صرف آٹھ کلو میٹر چلی.....جیسے ہی پولیس کی وین قریب آئی، جمیل کے ہاتھ مہران کو قابو نہ کر سکے۔ گاڑی ایک جھٹکے سے سڑک کے کنارے لگی۔ اس نے اچانک بریک لگائے.....گاڑی کے رکتے ہی وہ باہر نکلے مگر بھاگنے کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ پولیس کے سپاہی ہاتھوں میں اسلحہ لیے ان کے سر پر پہنچ چکے تھے۔ شہزاد کے لیے وہ رات بہت خوفناک تھی۔ گھریلو حالات..... ماں کی صورت اور رشتے داروں کے طعنے.....اس کا دماغ پھٹنے لگا۔

☆☆☆

انسپکٹر جابر کے سامنے شہزاد کا باپ، اکبر علی بیٹھا تھا۔ اس کے بوڑھے ہاتھ کپکپا رہے تھے اور چہرے پر جھریاں آج کچھ زیادہ نمایاں ہو رہی تھیں۔ ساری زندگی کی کمائی گئی عزت صرف ایک دن میں برباد ہو گئی تھی.....عزت کے ساتھ ساتھ اب بیٹے کا مستقبل بھی خطرے میں تھا۔

''او بابا جی! کس لیے بیٹھے ہو ادھر؟'' جابر کی کرخت آواز کمرے میں گونجی۔

''صاحب جی.....میرا بیٹا مجرم نہیں ہے۔''

''او کیسے مجرم نہیں ہے.....'' اس نے زور سے میز پر ہاتھ مارا۔ ''جنگلے میں ڈکیتی کی ہے پھر پولیس والوں کے

سامنے سے گاڑی لے کر فرار ہونے لگا تھا۔ تم کہتے ہو مجرم نہیں ہے۔''

''پہلی غلطی ہے جی۔ اب سمجھاؤں گا۔''

''اب کیا فائدہ سمجھانے کا..... جائے گا آٹھ دس سال کے لیے اندر تو خود سمجھ جائے گا۔'' اس نے بے رحمی سے کہا تو اکبر تڑپ اٹھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔

''آپ بڑے افسر ہیں۔ کچھ کریں، بچا لیں اسے۔ اس کی ماں بیمار ہے، اس کے علاج کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی.....''

''پیسوں کی ضرورت تو مجھے بھی ہے۔'' جابر نے بات کاٹی۔ ''تو کیا میں اب گھر گھر جا کر ڈکیتیاں کروں؟''

''آپ جو کہیں گے میں کرنے کو تیار ہوں، بس میرے بیٹے کو چھوڑ دیں۔''

''ایف آئی آر تو ابھی درج نہیں کی میں نے۔ کچھ کرنا ہے تو کر لو۔'' جابر نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''وضاحت سے بتا دیں۔''

''دو لاکھ لوں گا۔ ایک دن کے اندر اندر دے دو۔ ریکارڈ بھی چھپا لوں گا اور ساری بات بھی..... سب کچھ میرے ذمے۔''

''دو لاکھ.....'' اکبر کے منہ سے نکلا۔ اتنے پیسوں کا بندوبست کرنا وہ بھی اتنی جلدی، اس کے لیے ناممکن حد تک مشکل تھا۔

''ہاں جی دو لاکھ..... کل دے دو اور لے جاؤ اپنے شہزادے کو۔'' جابر اٹھ گیا۔ اکبر علی بھی کھڑا ہو گیا۔ پولیس اسٹیشن سے باہر آتے ہوئے وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ اس کا دماغ سوچوں سے بھرا ہوا تھا۔

''دو لاکھ کہاں سے آئیں گے؟'' اس نے خود سے پوچھا..... جواب نفی میں تھا۔ گھر پہنچ کر چھوٹی بیٹی اور بیوی کی سوالیہ نظروں کے جواب میں وہ نظر چرا گیا۔

''انسپکٹر صاحب سے بات ہوئی ہے۔ کل تک کا وقت لیا ہے۔ کچھ بہتر ہوگا..... دعا کرو۔'' لیکن یہ وقت صرف دعاؤں کا نہیں تھا۔ دو لاکھ کا بندوبست کرنے کے لیے بھی کچھ کرنے کی ضرورت تھی۔ بیٹی کے کمرے میں چلے جانے کے بعد اس نے بیوی کو سب بتا دیا۔ سکینہ گھریلو عورت تھی۔ اسے باہر کی دنیا کا کچھ علم نہ تھا۔

''شہزاد کو بچا لو اکبر..... میرے بیٹے کو باہر لے آؤ۔ سب کچھ بیچ دو پر کسی طرح دو لاکھ کا بندوبست کر لو۔'' آنسوؤں نے اس کی آنکھوں کو گھر سمجھ لیا تھا۔ ان آنسوؤں کو لے کر اس کی آنکھیں بہت امیر تھیں۔ اتنے آنسو بہہ جانے کے باوجود یہ پانی ختم نہ ہوا تھا۔ اکبر کے پاس بیچنے کو تھا ہی کیا؟ جائداد اس نے بنائی ہوتی تو آج شہزاد جیل میں نہ ہوتا۔ کافی دیر سوچنے کے بعد آخر اس نے سکینہ کے سامنے مسئلے کا حل رکھا۔

''اور تو کچھ نہیں میرے پاس بیچنے کو، بس یہ ایک گھر ہے۔ تین چار لاکھ کا بک جائے گا۔ باقی پیسے کہیں جمع کروا کے کوئی فلیٹ لے لیں گے یا کرائے پر رہ لیں گے۔'' سکینہ کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ ایک گھر ان کا باقی تھا، وہ بھی بیٹے کے لیے قربان کر دیا۔ وہ مکان جو اچھا گاہک ملنے پر پانچ چھ لاکھ تک چلا جاتا..... ایمرجنسی میں صرف ساڑھے تین لاکھ کا بیچ دیا گیا۔

رقم لے کر اکبر اس گھر آیا جو اب ان کا نہیں رہا تھا۔ سکینہ کے پاس بستر پر بیٹھ کر اس نے ڈیڑھ لاکھ الگ کیے۔ وہ چھوٹی بیٹی کو پکڑا دیے۔

سکینہ کی ناک سے اچانک خون بہنے لگا تھا۔ وہ جو پیسے دیکھ رہی تھی، اس کی ناک سے بہنے والے خون نے اوپر والے چند نوٹوں کو سرخ کر دیا تھا.....

اگلی صبح شہزاد گھر آ گیا تھا۔

☆☆☆

''یہ رہے آپ کے دو لاکھ۔'' جابر نے ذیشان کے سامنے دو لاکھ روپے رکھے۔

''اور یہ ہے آپ کے کاغذات۔'' اس نے لفافے میں بند کاغذات اسے پکڑائے۔ ''میرا کام مکمل..... یہ دو لاکھ آج میں شیراز صاحب کو دے دوں گا۔ باقی کی اقساط وہ خود آپ سے وصول کرتے رہیں گے۔ کسی کام کی وجہ سے مصروف تھے ورنہ خود آ جاتے میرے ساتھ۔''

''اب ہم شفٹ کب ہو سکتے ہیں اس گھر میں؟'' جابر نے پوچھا۔

''یہ چابیاں پکڑیں۔'' اس نے جیب سے چابیاں نکال کر جابر کو پکڑائیں۔ ''چاہے تو شام کو ہو جائیں۔ کوئی مسئلہ نہیں۔''

''میں آج شام فرنیچر وغیرہ بھجوا دیتا ہوں۔ کل بیگم کو لے آؤں گا۔'' اس کی بات سن کر ذیشان نے اثبات میں سر ہلا دیا اور پیسے لے کر باہر نکل گیا۔ جابر نے اپنا کام مکمل کیا اور پولیس اسٹیشن سے باہر آ کر ایک دوست کو کال کی۔ وہ فرنیچر کا آرڈر پہلے ہی دے چکا تھا۔ پانچ بجے فرنیچر بھیجنے کا کہہ کر وہ مطمئن ہو گیا۔ گھر کی چابیاں اس نے فرنیچر والے

کی دکان پر بھجوا دیں۔

ساڑھے پانچ بجے کا وقت تھا جب اسے کال موصول ہوئی۔ ''جابر صاحب! آپ کا بتایا گیا ایڈریس غلط ہے۔ اس پتے پر تو کوئی اور خاندان موجود ہے۔'' دوسری طرف سے فرنیچر والے کی آواز سنائی دی۔

''نہیں یار..... ٹھیک سے چیک کرو۔ نیلے گیٹ والا گھر ہے۔''

''میں پورا علاقہ دیکھ چکا ہوں صاحب۔ نیلے گیٹ والا بس وہی گھر ہے، وہاں کوئی اور صاحب موجود ہیں۔'' جابر کی چھٹی حس نے خطرے کی گھنٹی بجائی۔

''تم وہیں رکو، میں آرہا ہوں۔'' اس نے گاڑی نکالی اور گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا..... جس کے سامنے فرنیچر سے بھرا ٹرک کھڑا تھا یہ وہی گھر تھا جس کی پہلی قسط وہ ذیشان کو دے چکا تھا۔ اس نے ٹرک ڈرائیور سے کہا۔

''یہی تو گھر ہے۔''

''نہیں صاحب جی۔ یہاں تو کوئی اور خاندان موجود ہے۔'' وہ الجھ گیا۔ آگے بڑھ کر اس نے دستک دی۔ کچھ دیر بعد ایک پختہ عمر کا شخص باہر آیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے جابر کی طرف دیکھا۔

''جی؟''

''آپ کون؟'' جابر کو اپنا سوال احمقانہ محسوس ہوا۔

''یہ سوال میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں..... آپ میرے گھر کے سامنے کھڑے ہیں۔''

''یہ گھر میرا ہے..... شیراز کے پراپرٹی ایجنٹ کو ایڈوانس جمع کروا چکا ہوں اس کا۔''

''کون شیراز؟ یہ گھر میں نے خود تعمیر کروایا ہے۔ آج ہی دبئی سے یہاں واپس شفٹ ہوا ہوں فیملی سمیت۔ آپ کو شاید غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''ابے مجھے غلط فہمی نہیں ہوئی..... دو لاکھ دیے ہیں میں نے۔''

''تمیز سے بات کرو مسٹر.....''

''تیری تمیز کی تو.....'' جابر کے منہ سے گالیوں کا طوفان ابل پڑا۔ ''پولیس انسپکٹر ہوں میں۔ فراڈ کیا ہے تم لوگوں نے۔ کاغذات ہیں میرے پاس اس گھر کے۔''

''تمہیں ان گالیوں کا جواب دینا ہوگا۔ تمہارے علاقے کا ڈی ایس پی میرا کزن ہے۔ میں کرواتا ہوں تمہارا علاج۔'' غصے سے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا..... جابر کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ سامنے والا شخص اس شہر کا کوئی غریب شہری نہ تھا بلکہ دبئی سے آیا تھا۔ ظاہر ہے اس کے پاس روپے پیسے کافی ہوں گے اس لیے اسے دبانا ممکن نہیں تھا۔

''آپ ذیشان کو جانتے ہیں؟'' اس بار اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''نہیں..... میں نہیں جانتا۔''

''میں معذرت چاہتا ہوں، مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔'' اس نے بمشکل اس شخص کو منایا جس کا نام سیف اللہ معلوم ہوا تھا۔ اگلے دو ہفتے اس نے ذیشان اور شیراز کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں لگا دیے۔ ذیشان نے اسے بڑی چالاکی سے بے وقوف بنایا تھا۔ وہ اس زعم میں تھا کہ پولیس والے کے ساتھ کون دھوکا کرے گا..... اس لیے اس کے بارے میں تفصیل اکٹھی نہ کی اور اعتبار کرلیا جس کے جواب میں اسے دو لاکھ کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ صرف وہی نہیں..... شہر میں ذیشان کے کئی شکار اسے ملے تھے جنہیں اسی طرح کسی اور کا گھر دکھا کر لوٹا گیا تھا۔ شیراز نام کا کوئی شخص جائداد کے کاروبار میں بھی نہ تھا جس سے ثابت ہوا کہ وہ ایک فرضی کردار تھا۔ ذیشان پوری پلاننگ سے کام کرتا تھا، یہاں تک کہ اس کے پاس مکان کی ڈپلی کیٹ چابیاں بھی ہوتی تھیں۔ کاغذات بھی جعلی ثابت ہوئے۔ اس نے ہر ممکن کوشش کی ذیشان کو ڈھونڈنے کی مگر ناکام رہا۔ ذیشان نے شاید شہر بدل لیا تھا کیونکہ اس شہر کے ہر پولیس اسٹیشن سے جابر نے مدد طلب کی تھی۔ رشوت سے حاصل کیے گئے پیسے ضائع ہوگئے تھے.....

☆☆☆

شانزے اس شخص کے ساتھ کمرے میں اکیلی تھی۔ یہ پروین کی ہی پلاننگ تھی جس کے مطابق وہ کچھ دیر کے لیے گھر سے باہر گئی تھی اور شانزے کو گھر میں تنہا رہنا تھا۔ ''آج وہ پیسے دینے آرہا ہے۔ میں ذرا تیس چالیس منٹ کے لیے باہر ہوں گی تم اسے بہلا لینا۔ حد سے باہر نہیں جانے دینا۔'' پروین نے اسے مزید سمجھایا پھر اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر بولی۔ ''کیا بات ہے؟''

''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' وہ منمنائی۔

''گھبراؤ مت۔ میں آس پاس ہی رہوں گی۔ تم تھوڑا میک اپ کرلو۔ اتنا تو کرنا پڑے گا۔ پیسے لے کر ہم نے غائب ہی ہونا ہے۔'' شانزے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس اقرار کے نتیجے میں وہ اب اس شخص کے ساتھ کمرے

میں تنہا تھی۔ وہ اس صورتِ حال سے خوش نظر آتا تھا۔

''آپ کے لیے چائے لاؤں؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں.....'' وہ بولا۔ ''کچھ دیر یہیں بیٹھ جاؤ۔ خالہ آگئی تو میں پیسے پکڑا کر چلا جاؤں گا۔'' اس نے گہری سانس لی اور تھوڑے وقفے کے بعد بولا۔ ''اب تو ساری عمر تمہارے ہاتھ کی چائے پینی ہے۔'' شانزے اس بات پر شرما بھی نہ سکی۔ وہ صوفے پر بیٹھا تھا۔ اچانک اٹھ کر اس کے پاس آ گیا۔

''کوئی آجائے گا۔'' وہ گھبرائی۔

''کوئی نہیں آتا۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر شانزے کے کندھے پر رکھ لیا۔ شانزے کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ ہونٹوں کا لمس اسے اپنے رخسار پر محسوس ہوا۔ اس نے گھبرا کر منہ پیچھے کرلیا۔

''اب تو ساری زندگی ساتھ رہیں گے۔'' وہ مجبوراً پیچھے ہٹ گیا۔

''آپ کرتے کیا ہیں؟'' اس نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

''مختلف کام..... ویسے پراپرٹی ایجنٹ ہوں۔'' وہ مسکرایا۔ وہ خوش دکھائی دیتا تھا۔ ''کل ایک سودا طے کیا ہے، کافی نفع ہوا ہے۔'' اسی دوران پروین اندر داخل ہوئی۔

''ارے بیٹا! مجھے ذرا بازار میں کام تھا۔ آؤ میرے کمرے میں آجاؤ۔ عابدہ! کچھ لے کر آؤ ان کے لیے۔'' شانزے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ وہ اٹھ کر پروین کے ساتھ چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس جا رہا تھا تو آتے وقت اس کے ہاتھ میں جو پیسوں والا... بیگ تھا، وہ اب پروین کے قبضے میں تھا۔

''دو لاکھ دے گیا ہے کمینہ..... تین مانگے تھے میں نے۔ چلو خیر ہے۔ یہ بیگ پکڑو اور باہر نکلو، میں ذرا یہاں اپنی موجودگی کی نشانیاں مٹا دوں....'' پروین نے پیسوں والا... بیگ شانزے کو پکڑایا۔ شانزے باہر نکل آئی۔

''دو لاکھ.....'' اس نے زیرلب دہرایا۔ اس کا حصہ بہ مشکل پچاس ہزار بنتا تھا۔ وہ صرف چارہ تھی، اصل پلان تو پروین کا تھا۔

''خطرہ تو میں نے مول لیا ہے۔ خود کو بچنے کے لیے پیش کیا ہے۔'' دماغ میں سوچ ابھری۔ قریب سے ٹیکسی گزر رہی تھی۔ پروین اندر تھی۔ بیگ اس کے پاس تھا۔ پروین اس کے بارے میں بہت کم جانتی تھی۔ اصل ایڈریس کسی کے پاس نہ تھا..... اسے فیصلہ کرنے میں دو منٹ لگے۔ اس نے ٹیکسی والے کو اشارہ کیا اور اس میں بیٹھ گئی۔ جتنی دیر میں پروین باہر آتی..... وہ وہاں سے غائب ہو چکی تھی۔

اگلے دن جب پراپرٹی ایجنٹ ذیشان وہاں پہنچا تو بہت خوش دکھائی دیتا تھا۔ اس کا اصل نام کچھ اور تھا مگر اپنی دو نمبر دنیا میں اس نے ذیشان کے نام سے شہرت پائی تھی۔ یہ اس کی تیسری شادی تھی۔ اپنی پہلی دو بیویوں کو وہ بیچ چکا تھا۔ پراپرٹی ایجنٹ کا کام بھی وہ کبھی کبھار کیا کرتا تھا۔ اس وقت اس کا حلیہ ایسا تھا کہ کوئی بھی اسے پہچان نہ سکتا۔ گھر کے گیٹ پر جا کر اس نے دیکھا، باہر کوئی شخص کھڑا گیٹ بند کر رہا تھا۔

''بھائی! خالہ پروین گھر میں ہیں؟'' اس نے قریب جا کر پوچھا۔

''کون خالہ پروین؟''

''وہی جو یہاں رہتی ہیں۔''

''اچھا..... وہ کمینی عورت جو میرا کرایہ لے کر بھاگ گئی ہے..... تم جانتے ہو اس کو؟'' ذیشان کا سر گھوم گیا۔ اسے دو لاکھ کا چونا لگ گیا تھا۔

''نہیں..... بس ادھار لیا تھا اس نے مجھ سے کچھ..... وہ واپس لینا ہے۔''

''اب نہیں ملنے والا..... کتیا غائب ہو گئی کہیں۔'' مالک مکان نے پروین کی شان میں کئی گالیاں پیش کیں۔ ذیشان کندھے جھکائے وہاں سے چل دیا..... دھوکا پلٹ آیا تھا..... کسی نہ کسی طریقے سے۔

☆☆☆

اکبر علی کے سامنے اس کی بڑی بیٹی بیٹھی تھی۔ ''آپ نے مجھے بتایا تک نہیں کہ گھر بک گیا ہے؟''

''بس بیٹا..... تم دوسرے شہر میں تھیں اور شہزاد جیل میں تھا۔ اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہ تھا۔''

''بتایا تو ہوتا..... میں کوئی راستہ نکال لیتی۔'' اس نے گہری سانس لی۔ ''خیر..... میں نے کچھ قرض لیا ہے امی کے علاج کے لیے۔ واپس کر دوں گی قسطوں میں۔'' اس نے بیگ سے نکال کر اکبر کے سامنے رکھا۔

''کتنے پیسے ہیں یہ؟''

''دو لاکھ.....'' اس نے زپ کھولی۔ پیسے نکالتے ہوئے اکبر کی نظر نوٹوں پر پڑی..... چند نوٹ کسی کے خون سے سرخ تھے.....

⌘⌘⌘

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ رفیق واحدی کی بیٹی شاہینہ ابھی تک سوئی نہیں تھی۔ اس کے لحاف کے اندر آج پھر تھوڑی تھوڑی روشنی ہو رہی تھی۔ کسی وقت باتوں کی مدھم آواز بھی رفیق واحدی کے کانوں تک پہنچتی تھی۔ آج وہ پھر اسی خبیث راشد فورمین سے باتیں کر رہی تھی۔ یہ راشد تو باپ بیٹی کی جان سے چمٹ کر رہ گیا تھا۔ ایک سال سے شاہینہ کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ شروع میں تو شاہینہ نے اسے گھاس نہیں ڈالی تھی لیکن پھر وہ بتدریج اس کے گھیرے میں

کسی کی چاہت میں دولت سے منہ موڑنے والے ایک عاشق کا ماجرا

کفّارہ

نادانیاں ہر ایک سے ہوتی ہیں مگر ان کا احساس ہر دل میں نہیں جاگ سکتا... اور جہاں جاگ جائے وہاں انسان کا ضمیر اسے اطمینان سے رہنے نہیں دیتا... کچھ ایسا ہی معاملہ انہیں بھی درپیش تھا جو اپنی غلطیوں کو سدھارنا چاہتے تھے۔

صبا معتصل

کِرن ڈائجسٹ

جنوری 2020

Download

www.pklibrary.com

آتی چلی گئی تھی۔ رفیق واحدی کا دماغ چٹخنے لگا۔ ایک دم اس کے سینے میں انگارے سے بھر گئے اور وہ اپنا لحاف پھینک کر بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''شاہینہ.....'' وہ اتنے زور سے گرجا کہ اس مختصر سے گھر کی دیواریں کانپ سی گئیں۔

شاہینہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ موبائل فون ابھی تک اس کے ہاتھ میں ہی تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ فون بند کرتی، رفیق واحدی نے فون اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ وہ فون کان سے لگا کر دہاڑا۔

''تو اس طرح باز نہیں آئے گا..... حرامزادے میں جان سے مار دوں گا تجھے..... میں تیرا خون کر ڈالوں گا۔ میری معصوم بچی کی زندگی تباہ کرنے پر تُلا ہوا ہے تو۔ میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔''

''چاچا! میری بات تو سن.....'' دوسری جانب سے راشد بوکھلاہٹ سے بولا۔ چاچا واحدی پھر دہاڑا۔

''بہت سن لی ہیں تیری..... اور سنا بھی لی ہیں۔ بس اب ایک ہی حل ہے حرامزادے! یا میں تجھے مار ڈالوں یا تو مجھے مار ڈالے۔'' اس کے ساتھ ہی چاچا واحدی نے فون اتنے زور سے پٹخا کہ فرش پر اس کے ایک درجن ٹکڑے بکھر گئے۔

پھر اس نے اپنی خوبصورت بیٹی کے بال مٹھی میں جکڑے اور آتشیں لہجے میں پھنکارا۔

''مجھے لگتا ہے کہ اب پانی سر سے گزر گیا ہے۔ اب یہاں خون خرابا ہو کر ہی رہنا ہے۔ تو بھی بدنصیب اولاد ہے، بدنصیب، منحوس.....'' اس نے ایک دو ہتڑ شاہینہ کے سر پر مارا۔ وہ چارپائی پر جا گری۔ وہیں بیٹھ کر چہرہ ہاتھوں میں چھپایا اور کچھ دیر تک آنسو بہانے کے بعد بولی۔

''ابا جی وہ..... بڑا آدمی ہے، ہم اس سے ٹکر لیں گے تو اچھا نہیں ہوگا۔''

''کیا بڑا آدمی ہے..... کوئی رئیس زادہ ہے، کہیں گورنر لگا ہوا ہے..... کیا ہے وہ، کیا ہے؟ دو ٹکے کا فورمین..... ایسے بڑے آدمی یہاں گلیوں میں رلتے پھرتے ہیں۔''

''ابا جی! آپ نہیں سمجھ رہے۔ وہ..... ہمیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔''

''بکواس بند کر..... چپ ہو جا..... نہیں تو سر توڑ دوں گا تیرا..... تو صاف صاف کیوں نہیں کہتی کہ اب تیری مت بھی ماری جا رہی ہے۔ تو چڑ چڑ باتیں کرنے لگی ہے اس کے ساتھ..... کیا پتا کہ میل ملاقاتیں بھی شروع کر دی ہوں۔''

''ایسا کچھ نہیں ہے ابا جی۔ آپ.....''

شاہینہ کی بات ادھوری رہ گئی۔ واحدی نے شیشے کا ایک جگ فرش پر مار کر توڑا اور بکتا جھکتا کمرے سے نکل گیا۔

☆☆☆

رفیق واحدی کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ محلے میں اسے چاچا واحدی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ آٹھ دس سال پہلے بس کے ایک حادثے میں اس کی بیوی اور بیٹا جاں بحق ہو گئے تھے۔ اس حادثے کے بعد سے ہی چاچا واحدی کچھ نیم دیوانگی کی کیفیت میں رہنے لگا تھا۔ وہ غصے میں ہوتا تو اول فول بھی بولتا..... اس قسم کے دورانیے میں اس کی سگریٹ نوشی بھی بہت بڑھ جاتی۔ واحدی کی زندگی کا واحد سہارا اب اس کی بیٹی شاہینہ ہی تھی۔ وہ بلا کی خوبصورت تھی۔ جیسے کسی کیچڑ میں موتی چمک رہا ہو یا ویرانے میں چودھویں کا چاند روشنی بکھیرتا ہو۔ واحدی نے اپنی بیٹی کو بہت سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ اس کو ایک الہامی سا یقین تھا کہ اس کی شاہینہ کی شادی کسی بڑے اونچے گھرانے میں کسی ایسے امیر زادے سے ہوگی جو لاکھوں میں ایک ہوگا۔

واحدی کے اس یقین کی وجہ تین چار سال پہلے کا ایک واقعہ تھا۔ واحدی اپنی بیٹی کے ساتھ اپنے پیر و مرشد کے آستانے پر سلام کرنے گجرات گیا تھا۔ مرشد نذر شاہ نے شاہینہ کو دیکھ کر اس کے سر پر پیار دیا تھا اور پھر پیش گوئی کی تھی کہ اسے ایک خوبصورت رئیس زادہ بیاہنے آئے گا۔ بہار کی ایک چمکیلی صبح کو وہ اپنی لمبی سیاہ گاڑی میں سوار شاہینہ کے راستے سے گزرے گا۔ اسے دیکھ کر رک جائے گا..... اور پھر کہیں نہیں جا سکے گا..... وہ شاہینہ کی محبت میں گرفتار ہو کر اسے اپنی شریکِ حیات بنائے گا۔

''یہ کب ہوگا مرشد سائیں؟'' چاچا واحدی نے بے تاب ہو کر پوچھا تھا۔

''ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے واحدی..... شرط صرف یہ ہے کہ خود تک پہنچنے والی خوشیوں کا انتظار صبر سے کیا جائے، یقین رکھا جائے اور دعا کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔''

اس روز کے بعد سے چاچا واحدی کو یقین ہو گیا تھا کہ نہ صرف شاہینہ کے بلکہ اس کے اپنے دن بھی بدلنے والے ہیں..... اور کوئی راج کمار جیسا نوجوان ضرور ان کے دروازے پر خوش بختی کی دستک دینے والا ہے۔ اگلے ایک ڈیڑھ برس میں خاندان برادری کے اندر سے ہی شاہینہ کے

لیے درجن بھر رشتے آئے مگر واحدی نے ٹھکرا دیے۔ واحدی کے خاندان میں زیادہ تر مزدور پیشہ اور دستی کام کرنے والے لوگ ہی تھے۔ کوئی کارپینٹر، کوئی رنگ ساز، کوئی مکینک ..... واحدی خود بھی بجلی کے کام سے وابستہ تھا۔ اس کا شمار اچھے اور تجربہ کار الیکٹریشنز میں ہوتا تھا۔ تاہم جب سے بیوی بچے والا حادثہ ہوا تھا، وہ کوئی ٹھیکا وغیرہ نہیں لے سکا تھا اور بطور کاریگر ہی زیرِ تعمیر عمارتوں میں کام کرتا تھا۔

واحدی کی مشکلات کا آغاز کوئی ایک سال قبل ہوا۔ ان کی کالونی کے قریب ہی مین روڈ پر ایک پلازا تعمیر ہو رہا تھا۔ واحدی بھی وہاں کام کر رہا تھا۔ یہ ستائیس اٹھائیس سالہ نوجوان راشد بھی وہیں فورمین تھا۔ اس نے آتے جاتے کہیں شاہینہ کو دیکھ لیا اور پھر ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گیا۔ اب یہ بات بڑھتے بڑھتے اتنی بڑھ گئی تھی کہ راشد کا سوچ کر واحدی کے سارے جسم میں انگارے بھر جاتے۔ اسے اس کی شکل سے نفرت ہو گئی تھی۔ کسی وقت واحدی جب بھرے ہوئے سگریٹ کے کش لے رہا ہوتا تو اس کا دل چاہتا کہ وہ بیس ہزار روپے تنخواہ لینے والے اس گھمنڈی فورمین کو جان سے ہی مار ڈالے۔

وہ اپنی شاہینہ سے بہت پیار کرتا تھا۔ اس کی اچھی زندگی کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اس رات اس کے دل کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ اس کے ذہن میں ایک خطرناک منصوبہ پروان چڑھنے لگا۔ زیرِ تعمیر پلازا کے جس عارضی کیبن میں راشد فورمین رہائش پذیر تھا، وہ واحدی نے اندر سے دیکھ رکھا تھا۔ اسے راشد کے سارے معمولات کا بھی بڑی اچھی طرح علم تھا۔ وہ ہر کام اپنے وقت پر کرنے کا عادی تھا۔ پانچ بجے چھٹی ہوتی تھی۔ ٹھیک سوا پانچ بجے راشد اپنے کیبن میں چلا جاتا تھا۔ وہاں منہ ہاتھ دھو کر اور صاف ستھرا لباس پہن کر وہ چھ بجے کے لگ بھگ باہر نکلتا تھا اور ایک قریبی باغ میں چہل قدمی کرتا۔ اس کے رات کے کھانے اور سونے وغیرہ کا بھی ایک فکس ٹائم تھا۔ محنت کش لوگوں میں اس طرح کی ٹائمنگ کم ہی دکھائی دیا کرتی ہے۔

اس کو ایک اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے کہ چاچا واحدی کے پاس راشد کے کیبن کی ایک متبادل چابی موجود تھی۔ یہ چابی تب سے اس کے پاس تھی جب ایک مرتبہ اس نے کیبن کی چھت کا پنکھا ٹھیک کیا تھا۔

اگلے روز صبح واحدی کی آنکھوں میں سرخی دہک رہی تھی اور اس کے سنکی دماغ میں چنگاریاں سی بھری ہوئی تھیں۔ وہ معمول کے مطابق زیرِ تعمیر پلازا پر پہنچا اور روزمرہ کے کام میں مصروف ہو گیا۔ نو بجے کے قریب وہ خاموشی سے ان رہائشی کیبنوں کی طرف چلا گیا جہاں ہیڈ مستری، فورمین اور اوورسیئرز وغیرہ رہتے تھے۔ یہ "ورکنگ آورز" تھے، ان کیبنوں کی طرف سناٹا تھا۔ وہ خاموشی سے لاک کھول کر راشد کے کیبن میں داخل ہو گیا۔ اس کیبن کی چھت کے نیچے سے ایک دیوار کے ساتھ بجلی کی وہ بھاری کیبل گزرتی تھی جو آگے جا کر کنکریٹ مکس کرنے والی بڑی بڑی مشینوں کو چلاتی تھی۔ فورکور کی ہائی وولٹیج اس تار میں ہائی وولٹیج کا کرنٹ دوڑتا تھا۔ اس عارضی کیبن کے ایک کونے میں لوہے کی وہ الماری بھی پڑی ہوئی تھی جس میں راشد کے کپڑے اور دیگر ذاتی سامان موجود تھا۔ اپنے پروگرام کے مطابق چاچا واحدی نے ایک جگہ سے بجلی کے اس موٹے تار کو چھیل دیا۔ پھر اپنے دستانے ہاتھوں پر چڑھائے اور لوہے کی الماری کو فقط چند انچ پیچھے کھسکا کر ننگے تار کے ساتھ اٹیچ کر دیا۔ اب بظاہر دیکھنے میں یہی لگ رہا تھا کہ الماری کو پیچھے کھسکایا گیا ہے اور الماری کے ایک کونے نے رگڑ کھا کر تار کو چھیل دیا ہے۔

اب یہ الماری موت کا پھندا تھی، اس میں ..... مہلک کرنٹ دوڑ رہا تھا۔ شام کو سوا پانچ بجے کے لگ بھگ راشد اپنے کیبن میں داخل ہو کر اس الماری کو چھونے والا تھا۔

بالکل مختصر سا کام تھا مگر چاچا واحدی کچھ ہانپ سا گیا تھا۔ اس نے دو تین منٹ کیبن کے اندر ہی ٹھہر کر خود کو سنبھالا اور پھر احتیاط سے باہر نکل کر کیبن کا دروازہ مقفل کر دیا۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ شام کو پیش آنے والے اس حادثے کے وقت وہ یہاں سائٹ پر موجود ہو۔ اپنے پروگرام کے مطابق وہ بڑے فورمین کے پاس پہنچا، اسے چیف فورمین بھی کہا جاتا تھا۔ سارا الیکٹرک ورک بھی اسی کی زیرِ نگرانی تھا۔

"جناب! ایک دن کی چھٹی چاہیے۔ گجرات جانا ہے، ضروری کام ہے۔" اس نے بڑے فورمین سے کہا۔

"رات تک واپس لوٹ آؤں گا۔"

تھوڑی سی نکتہ چینی کے بعد اسے چھٹی مل گئی۔ اس کی اندرونی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ جب بھی وہ اضطرابی کیفیت میں مبتلا ہوتا تھا، اس کی سوچوں کا رخ جیسے خود بخود ہی اپنے پیر سائیں کی طرف ہو جاتا تھا اور قدم بے ساختہ گجرات کی طرف اٹھ جاتے تھے۔ چیف فورمین سے اجازت لے کر واحدی تیزی سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اسے ہر صورت گجرات کے لیے ساڑھے آٹھ بجے

روانہ ہونے والی بس پکڑنی تھی۔ گھر آکر اس نے بیٹی کو اطلاع دی اور ضرورت کی ایک دو چیزیں اپنے چھوٹے سے چرمی بیگ میں ڈال لیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ کوسٹر میں سوار مرشد نذر شاہ کے آستانہ شریف کی طرف رواں دواں تھا۔ اسے یقین تھا کہ جب وہ لوٹے گا تو راشد کی ''حادثاتی موت'' کا واقعہ رونما ہوئے دو تین گھنٹے گزر چکے ہوں گے اور کوئی نہ کوئی فون پر اسے اس حادثے کی اطلاع بھی کر چکا ہوگا۔ راشد کا خیال آتے ہی اس کے تن بدن میں جیسے پھر سے آگ لگ گئی۔ اب بھی اس کے دل میں اس کے لیے کسی قسم کی ہمدردی کے جذبات ناپید تھے۔ سفر کے دوران میں اس نے یہ بھی تہیہ کیا کہ اس دفعہ وہ پیر صاحب کو شاہینہ کی بڑھتی عمر کا عذر دے کر ان سے یہ گزارش کرے گا کہ کوئی ایسے وظائف یا چلّہ بتائیں جس سے اس اَن دیکھے رئیس زادے تک ان کی رسائی جلد از جلد ہو جائے۔

گجرات کے مضافات میں ایک چھوٹی سی مسجد سے منسلک یہ ایک چھوٹا سا ہی احاطہ تھا جس میں پیر صاحب کا حجرہ شریف تھا۔ واحدی چار پانچ مہینے بعد ایک دفعہ آستانے پر حاضری دینے ضرور آتا تھا۔ آج بھی فروری کی نیم گرم دھوپ نے آستانے کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ صحن میں لگے اونچے درختوں کے پتے ہوا کے میٹھے جھونکوں میں متحرک تھے اور فضا میں ایک پُرکیف سا ترنم چھوڑ رہے تھے۔ وہاں کا منظر ہمیشہ کی طرح ہی تھا۔ ایک طرف ''نوردین بابا'' ٹاٹ کے ٹکڑے پر مشتمل اپنی چھوٹی سی کتابوں، مسواکوں اور ٹوپیوں کی دکان سجائے بیٹھا تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ بابا شمس، برکت والے پانی کا گھڑا لیے زمین پر بیٹھا تھا اور آستانے سے فارغ ہو کر جانے والوں کو پیالے بھر بھر کر دے رہا تھا۔ فرہاد جو پیر صاحب کا شاگرد بھی تھا، وہیں سفیدے کے درخت کے نیچے ایک چھوٹی سی چوبی میز پر دینی تعلیمات کے چھوٹے چھوٹے کتابچے لگائے بیٹھا تھا۔ ٹوپیوں کی دکان والے نوردین سے اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ وہ جب بھی آستانے پر آتا، کچھ وقت اس کے ساتھ ضرور گزارتا تھا۔ آج بھی وہ سب کو دور سے سلام دعا کرتا ہوا حجرے کی طرف بڑھ گیا۔ پیر صاحب ہمیشہ واحدی کو صبر کی تلقین کرتے رہے تھے لیکن آج خلافِ معمول انہوں نے اس کی حاجت کے پیشِ نظر اسے کچھ وظائف لکھ کر دیے۔ وہ حجرے سے باہر آیا تو سیدھا نوردین کے پاس ہی آکر بیٹھ گیا۔ ایک دوسرے کے حال احوال پر مبنی سوالات کا سلسلہ شروع ہوئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی جب آستانے پر دو سیاہ رنگ کی بھاری بھر کم جیپیں آکر رکیں۔ اسلحہ بردار گارڈز کے درمیان بارعب شخصیت اور اونچے شملے والا ایک چودھری شاہانہ چال چلتا ہوا حجرے میں داخل ہو گیا۔

''یار نوردین..... یہ ان چودھری لوگوں کا کیا معاملہ ہے۔ پچھلی دفعہ بھی یہ جیپیں ادھر کھڑی ہوئی تھیں جب میں آیا تھا۔'' واحدی نے رازداری سے استفسار کیا۔

''او یار واحدی! ان کا معاملہ بھی بڑا خراب ہوا پڑا ہے۔ کوئی ڈیڑھ سال پہلے چودھری کا گبرو سپوت باپ کی بڑی حویلی اور دولت کو لات مار کر لاہور چلا گیا تھا۔ دراصل..... وہ وہاں کسی لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو گیا ہے اور اب اپنا آپ منوانے کے لیے اسی کے شہر میں پتا نہیں کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہے۔''

''اچھا تو اب ان کا کوئی رابطہ نہیں ہے اس سے؟''

''ہاں، اب تو کافی عرصے سے کوئی خبر نہیں آئی اس کی۔ کوئی سال بھر پہلے بس ایک خط ہی آیا تھا اس کا جس میں اس نے بتایا تھا کہ وہ لاہور شہر میں فورمین لگا ہوا ہے اور اب زندگی کو اپنی مرضی سے بسر کرنا چاہتا ہے کیونکہ وہ جس لڑکی سے پیار کرتا ہے، وہ اسے ایک جاگیردار نہیں بلکہ اپنے ہی جیسا شخص دیکھنا چاہتی ہے۔ وہ اس لڑکی کو بتانا چاہتا تھا کہ بے شک وہ جاگیردار ہے مگر ضرورت پڑنے پر اپنے بل بوتے پر اپنی محنت سے اپنی روزی کما سکتا ہے۔''

اس تفصیل پر واحدی کا ماتھا ٹھنکا۔ اس کے چہرے پر سوچ کی لکیریں ابھر آئیں اور اضطراب ظاہر ہونے لگا۔ نوردین نے ایک گاہک کو نمٹایا تو واحدی نے فوراً اس سے اس گمشدہ لڑکے کا نام پوچھا۔

''یار نام اس کا..... ارشد یا راشد کر کے کچھ ایسا ہی ہے.....'' نوردین نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا پھر یکدم بولا۔

''اوہو! ٹھہرو..... میرے پاس تو تصویر بھی ہے اس کی.....'' نوردین یہ کہہ کر اپنا چھوٹا سا چوبی صندوق کھولنے لگا۔ دل میں اٹھتا وہم حقیقت کا روپ دھارنے لگا تو واحدی کے جسم پر جیسے کپکپی سی طاری ہو گئی اور پھر..... اس کی پھیلی ہوئی حیران آنکھیں اس پاسپورٹ سائز تصویر پر منجمد ہو کر رہ گئیں جو ایک اخبار کے اشتہارِ گمشدہ میں چھپی تھی۔ یہ اور کوئی نہیں، راشد ہی تھا..... وہی راشد..... جس کی موت کی خبر کا وہ بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ ہاں..... راشد فورمین کے روپ میں وہی امیر زادہ، وہی ''راجکمار'' جس کا اسے اپنی بیٹی کے لیے شدت سے انتظار تھا۔ شاید اسے پہچاننے میں اس نے بہت دیر کر دی تھی۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ اس نے تڑپ

کر ٹائم دیکھا۔ اس کی کلائی کی گھڑی ڈیڑھ بجے کا وقت بتا رہی تھی۔ وہ دیوانوں کی طرح بھاگا۔ بس اسٹاپ تک جاتے کچے پکے راستے پر وہ دوڑتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا۔ ''وہ میری بیٹی کے لیے آیا ہے..... وہ تو میری بیٹی کے لیے ہی آیا ہے۔'' بس چلنے میں ابھی آدھ گھنٹا باقی تھا۔ اس نے بے چینی کے عالم میں ڈرائیور کو دوبارہ مخاطب کر کے کہا۔

''صاحب لوگو! خدا کے واسطے جلدی کرو..... وہ میری بیٹی کے لیے آیا ہے۔'' ڈرائیور اور بس میں موجود لوگ اسے اس کے دیوانے پن پر گاہے بگاہے تاسف بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ سفر کے دوران بھی کبھی وہ رونے لگتا اور کبھی خود کلامی کی کیفیت میں کہتا۔

''اسے کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ اسے ہر صورت بچنا چاہیے۔ وہ..... وہی تو ہے۔ وہ میری بیٹی کے لیے آیا ہے۔''

بس نے ساڑھے چار بجے کے قریب اسے لاہور پہنچایا۔ واحدی نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر رکشا کیا اور اس زیرِ تعمیر پلازا کی جانب روانہ ہوا۔

''بھائی..... میرے بھائی! میں بڑی مشکل میں ہوں۔ بڑی ایمرجنسی ہے۔ مجھے اسے بچانا ہے۔ وہ میری بیٹی کے لیے آیا ہے۔'' واحدی بار بار پیچھے سے رکشے والے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نیم دیوانگی کے عالم میں اس سے التجا کرتا۔

''او بابا..... چلا تو رہا ہوں۔ اب ہوائی جہاز تو ہے نہیں جو لے کر اڑ پڑوں۔'' رکشے والے نے جھنجلا کر کہا۔ پھر ایسا ہوا کہ پلازا سے تقریباً دو کلومیٹر پہلے ایک سگنل پر ٹریفک بری طرح جام تھا۔ واحدی کو جیسے اپنی سانس رکتی محسوس ہوئی۔ گھڑی میں پانچ بج کر پانچ منٹ ہو چکے تھے۔ وہ ایک جست لگا کر رکشے سے باہر نکلا۔ سو کا نوٹ رکشے والے کی طرف اچھالا اور بقایا لیے بغیر منجمد گاڑیوں کے درمیان اندھا دھند دوڑنے لگا۔ ایک دو دفعہ وہ رُکی ہوئی گاڑیوں سے ٹکرا کر بری طرح سے سڑک پر گرا بھی۔ پاؤں سے جوتی بھی اتر چکی تھی۔ گھٹنوں اور کہنیوں سے کپڑا اڑا ہوا تھا اور سرخ گوشت جھانک رہا تھا..... اب وہ پلازا کے سامنے والی بڑی شاہراہ پر تھا۔ پلازا اس سے محض چند گز کے فاصلے پر تھا۔ اب اس کی نظریں سب کچھ بھول کر اس عمارت پر ٹکی ہوئی تھیں اور اسے پتا ہی نہ چلا کہ کب ایک تیز رفتار کار نے اسے اچھال کر گرین بیلٹ پر پھینک دیا۔

☆☆☆

واحدی کی آخری سانسیں تھیں۔ لوگوں کے جھرمٹ میں اسے چند شناسا چہرے بھی نظر آئے جن میں ایک راشد فورمین کا بھی تھا اور پھر اس کی نظروں میں بس راشد کا چہرہ ہی رہا اور باقی سب کچھ جیسے دھند میں لپٹ گیا۔ راشد کے چہرے پر پریشانی تھی، کرب تھا۔ اسپتال لے جانے کے لیے اس نے واحدی کو اٹھانے کی کوشش کی تو اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے اسے منع کیا اور اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ واحدی نے راشد کے کانوں میں سرگوشی کی، بس چند لمحوں کی سرگوشی تھی وہ اور پھر واحدی کی آنکھیں ایک پُرسکون تاثر کے ساتھ بند ہوتی چلی گئیں۔

☆☆☆

آج عید کی شاپنگ کے لیے شاہینہ اور راشد خصوصاً لاہور جا رہے تھے۔ اُن کا وہاں دو دن کے قیام کا ارادہ بھی تھا۔ لینڈ کروزر کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھی خوبرو شاہینہ کی روشن پیشانی پر سوچ کی لکیریں نمایاں ہو رہی تھیں۔ بالآخر وہ بولی۔ ''راشد! ہماری شادی کو تین ماہ ہو چکے ہیں لیکن میرے ذہن میں ایک سوال اٹکا ہوا ہے۔ آج میں آپ سے ایک بات پوچھ کر رہوں گی جسے آپ اکثر ٹال دیتے ہیں۔''

''بھئی ایسی کیا بات ہے جو میں نے تمہیں نہیں بتائی؟''

''یہی کہ بابا نے آخری وقت آپ کے کان میں کیا کہا تھا؟''

اس نے امید بھری نگاہوں سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے پُروقار شخصیت کے حامل اپنے شوہر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''بھئی یہی کہا تھا کہ..... میں تم سے شادی کر لوں۔''

راشد سامنے ونڈ اسکرین پر نظریں جمائے ہوئے بولا۔

''لیکن یہ بات چھپانے والی تو نہ تھی۔'' شاہینہ نے اعتراض کیا۔

''تو بتانے والی بھی نہ تھی..... پتا تو ہے کہ شادی تو میں نے ہر صورت میں تم ہی سے کرنی تھی۔'' اس نے ابرو اچکاتے ہوئے کہا۔ ''بے شک مجھے ساری زندگی کے لیے محنت مزدوری ہی کرنا پڑتی۔ تمہیں منانے اور پانے کے لیے میں ہر مصیبت سے گزر سکتا تھا۔''

دھوپ تیز ہو رہی تھی، راشد نے بلیک سن گلاسز پہن لیے اور شاہینہ..... یہ کبھی نہ جان سکی تھی کہ اس کے والد نے آخری وقت میں راشد سے کیا کہا تھا۔ وہ جانتی بھی کیسے؟ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کے خاوند راشد کے لیے اس کے بابا کی نفرت نے کیا جنونی شکل اختیار کی تھی اور انہوں نے کس طرح راشد کی زندگی ختم کرنے کی کوشش کی تھی اور پھر کس طرح آخری وقت میں اس کی زندگی بچائی بھی تھی۔

⌘⌘⌘

آتش زیرپا

طاہر منیر

وہ جو طاقت کے نشے میں گم تھے... مقامات اور خواہشات کے بے ہنگم ریلوں میں بہے چلے جا رہے تھے مگر... ایک روز انہی سرور اور رنگینیوں نے ہر رشتے کو بے رنگ اور تار تار کر دیا جبکہ دوسری جانب سفر در سفر اختیار کرنے والے چند بے بس لوگوں کی مجبوریاں رفتہ رفتہ ان کی طاقت بنتی جا رہی تھیں۔ وہ سب مسافر تھے اور زندگی کے ہر پل سے نتیجہ نچوڑ لینا چاہتے تھے۔ تلخ تجربات نے ان کے احساسات میں چبھن اور کرب کی کرچیوں کا زہر بھر دیا تھا۔ ہر شخص جینے کی خواہش میں موت سے برسرپیکار تھا اور قاتل وقت کا جوش بھی کسی کی محبت کے چراغ کو تیز آندھیوں سے بچانے کے لیے ایک طوفان سے لڑ رہا تھا کیونکہ استحصال کی صورت کوئی بھی ہو قابلِ نفرت ہے۔ وہ محض نامکمل بے جان پُتلے نہیں بلکہ جیتے جاگتے انسان تھے اور جو مکمل انسان کہلاتے تھے ان میں بچی کھچی انسانیت بھی حیوانیت کا روپ دھارنے میں مصروف تھی۔

معاشرے کے ناسوروں کے ہاتھوں جنم لینے والے سرد انتقام کی لرزہ خیز روداد

لاہور کی معروف شاہراہ پر واقع تھیٹر ہال کی رونق اپنے عروج پر تھی۔ آج یہاں پیش کیے جانے والے ایک کمرشل کامیڈی پلے کا گولڈن جوبلی شو تھا۔ ایک طویل عرصے بعد کسی کمرشل تھیٹر کا کوئی پلے گولڈن جوبلی تک پہنچا تھا..... ورنہ تو ایک عرصہ ہو چکا تھا کہ کمرشل تھیٹر کی رونقیں تقریباً ختم ہو گئی تھیں۔ یہی وہ تھیٹر تھا جو پہلے آرٹس کونسل کی زیر نگرانی سنجیدہ نوعیت کے آرٹ ڈرامے پیش کرتا تھا لیکن جب کمرشل تھیٹر آیا اور کامیڈی ڈرامے نے لوگوں کی توجہ حاصل کی تو پھر یہ جگہ کامیڈی ڈراموں کے لیے مختص کر دی گئی۔ جس دور میں مسکراہٹ ارزاں ہو وہاں ''کامیڈی'' جیسے فن کو ایک نعمت کی طرح قبول کیا جاتا ہے۔ کامیڈی تھیٹر نے بھی ایک طویل عرصہ وہ عروج دیکھا جسے فن کی معراج کہا جا سکتا تھا..... لیکن پھر یہ فن..... فن کی سرحدوں سے باہر نکل کر ایک ''کاروبار'' بنا اور جب فن کاروبار بن جائے تو پھر اسے دیکھنے کے لیے شائقین نہیں آتے..... گاہک آتے ہیں..... بہرحال اس ''طریقہ کار'' سے فن کو کیا نقصان ہوا اس کی کسے فکر تھی۔ اب کبھی کبھی اِکا دُکا کوئی اچھی پیشکش منظر عام پر آتی تو لوگ یہاں کا رخ کرتے..... مگر اب وہ عروج کی رونقیں کہاں۔

عین اسی زمانے میں اچانک ہی ایک کامیڈی پلے کو عید کے دنوں میں زبردست پذیرائی ملی۔ حالانکہ اس میں بھی ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی..... سوائے اس کے کہ اس میں محض جگت بازی کے بجائے تھوڑا کہانی پر بھی دھیان دیا گیا تھا..... مگر صرف یہی ایک وجہ نہ تھی..... بلکہ اس کی شہرت کی اصل وجہ ''نیناں'' کی ڈانس پرفارمنس بھی تھی۔ پچھلے چند سالوں سے عوام کی شکایتوں پر کمرشل تھیٹر پر پیش کیے جانے والے بے ہودہ گانوں پر ناچ کو لے کر کئی بار پابندیاں لگائی گئیں لیکن پھر کچھ عرصے بعد ان پابندیوں کو ہوا میں خاک کی طرح اڑا دیا جاتا..... عید کے شو میں ایک ڈراما پروڈیوسر نے اس پابندی کا ایسا توڑ نکالا کہ قانون بھی نہیں ٹوٹا اور تماش بینوں کے لیے رقص کا انتظام بھی ہو گیا۔

یہ ترکیب اتنی کامیاب ہوئی کہ ان کا ڈراما آج گولڈن جوبلی تک آ پہنچا تھا۔ اس وقت بھی تھیٹر کا ہال فل تھا۔ تین فنکار شائقین کو ہنسانے کے بعد اسٹیج کے پیچھے چلے گئے۔ اب وہ وقت تھا جب اسٹیج پر نیناں کی انٹری تھی۔ ہال تالیوں اور سیٹیوں سے گونج رہا تھا..... ہیوی ساؤنڈ سسٹم پر ایک گانے کا ابتدائی میوزک شروع ہوا..... تو نیلگوں مدھم روشنی میں نیناں نے اسٹیج پر انٹری دی۔ تماشائیوں کے شور میں میوزک کی آواز دب گئی۔ نیناں اسٹیج کے عین وسط میں ٹانگوں کو خم دیے اور دونوں بازو سر کے اوپر اٹھائے کسی مورتی کی طرح ساکن کھڑی ہو گئی..... ہال میں شور تھما..... میوزک کی آواز بلند ہوئی اور پھر اسٹیج آنکھوں کو چندھیا دینے والی تیز روشنیوں میں نہا گیا۔ ایک لمحے کو جیسے ہال میں موجود ہر شے تھم سی گئی پھر اس سکوت کو چھنچھناہٹ کی آواز نے توڑنا شروع کیا۔ یہ آواز نیناں کے پیروں میں بندھے گھنگروؤں سے ابھر رہی تھی جنہیں وہ آہستہ آہستہ اسٹیج کے فرش پر مار رہی تھی۔ پھر اچانک ہی ساؤنڈ سسٹم سے ابھرنے والی ڈھول کی تیز تھاپ نے جیسے ہر کسی کو سکوت کے طلسم سے آزاد کر دیا۔ نیناں کا جسم میوزک پر تھرک اٹھا۔ اس کے چہرے پر دوپٹے کا پلو اب بھی گرا ہوا تھا..... جسے اچانک ہی گھومتے ہوئے اس نے سر سے نوچ کر دور پھینک دیا۔ ہال میں پھر سے سیٹیاں گونجیں اور کئی تماشائی اپنی سیٹوں سے اٹھ کر اسٹیج کے پاس آ کر ناچنے لگے۔ رقص ہو رہا تھا..... لیکن پابندی کا قانون نہیں ٹوٹا تھا۔ کیونکہ پابندی صرف اداکاراؤں کے رقص کے بارے میں تھی..... مگر یہاں تیز بھڑکیلا نسوانی لباس پہنے جسم کو میوزک کی بیٹ پر لچکتے ہوئے وہ تھرکتا وجود جس کا نام نیناں تھا..... وہ عورت نہیں تھی۔

☆☆☆

رات کے اس پُرہول سناٹے میں کریم پارک کی سنسان ذیلی سڑک پر ایک چنگ چی رکشا یوں بھاگ رہا تھا جیسے وہ کسی ریس کے مقابلے میں حصہ لے رہا ہو۔ حالانکہ اس وقت دور دور تک ایسی کسی ریس میں اس کا کوئی مخالف فریق نظر نہیں آ رہا تھا۔ اوپر سے ٹوٹی پھوٹی سڑک پر جو گڑھا یا اسپیڈ بریکر سامنے آیا، ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ''ہاکو'' نے اسے یوں پھلانگا جیسے دیکھا ہی نہ ہو..... اور اس طرح کے ہر جمپ پر جہاں خود رکشا کے انجر پنجر نے احتجاج کیا وہیں رکشے میں بیٹھی سواریوں نے بہ آواز بلند ''ہاکو'' کے ایسے خونی رشتوں کو گالیاں دیں جن کا اس معاملے میں دور دور تک کوئی قصور نہ تھا۔

رکشے میں موجود سواریاں بھی کوئی عام سواریاں نہیں تھیں۔ یہ مردانہ گالیاں اور سریلی چیخیں مارتی سواریاں خواجہ سراؤں کا وہ گروپ تھا جو رات کے اس پہر ایک فنکشن سے واپس لوٹ رہا تھا۔ اچانک ہاکو نے رکشے کے فل بریک یوں لگائے کہ رکشا الٹتے الٹتے بچا اور سواریاں گرتے گرتے بچیں۔ بریک کے بعد گھوم کر رکشا اور سواریوں کی چیخیں ایک ساتھ گونجی تھیں۔ ایک لمحے کے توقف بعد ہاکو کی شان میں مزید گستاخیاں نکالنے کا سلسلہ شروع ہوا ہی چاہتا تھا کہ ہاکو ان

سب سے بے نیاز اپنی جگہ سے اترا اور سڑک پر اس سمت بھاگ کر گیا جہاں کسی کو بچانے کی خاطر اس نے بریک لگا کر رکشے کا رخ موڑا تھا۔ ویسے تو یہاں کافی اندھیرا تھا لیکن رکشے کی ہیڈ لائٹ عین اسی جگہ پڑ رہی تھی۔ ہاکو کے سامنے سڑک پر لیٹی ہوئی بادی النظر میں وہ ایک لڑکی نظر آئی کیونکہ اس کا لباس لڑکیوں جیسا تھا..... لیکن قریب پہنچنے پر اس کے بالوں اور چہرے پر پھیلے ہوئے بے ڈھنگے میک اپ سے وہ لڑکی معلوم نہیں ہو رہی تھی..... بہر حال وہ جو بھی تھا، اس وقت بے ہوشی کی حالت میں سڑک پر گرا ہوا تھا اور ہاکو اگر فوری بریک نہ لگاتا تو اس سے ٹکرا کر اسے زبردست نقصان پہنچا سکتا تھا..... رکشے میں سے ایک خرانٹ سی آواز آئی۔

"وے ہاکو! اب تجھے کیا موت پڑ گئی ہے رے.....؟"

ہاکو نے بے ہوش شخص کی نبض چیک کی اور رکشے کی سمت آواز دی..... "میں کہیا باجی جی..... ذرا ادھر تو آؤ..... یہ تو..... آپ کی برادری کا لگتا ہے۔"

رکشے میں سے پہلے ایک جوان خواجہ سرا اچھل کر باہر نکلا اور پھر ایک بوڑھا۔ جوان نے سرخ ریشمی زنانہ لباس پہن رکھا تھا لیکن بوڑھے نے سفید کرتہ اور تہ بند پہن رکھا تھا اور سر پر ایک چوکور رومال باندھا ہوا تھا۔ سفید بالوں کی ایک ننھی سی چٹیا اس کی گردن کے پیچھے چھوٹی سی دم کی طرح جھول رہی تھی..... اور منہ میں موجود پان کی پیک ہونٹوں سے باہر تک چھلکتی دکھائی دے رہی تھی۔ سرخ لباس والا ہاکو کے پاس پہلے پہنچا اور پھر نیچے گرے وجود کو دیکھ کر چونک گیا۔

"ہائے میں مرگئی..... وے ہاکو..... تو نے اسے ٹکر ماری ہے؟"

"اوہ نہیں باجی..... یہ میرے "رشکے" سے نہیں ٹکرایا پہلے سے ہی یہیں پڑا تھا..... میں جو بریک نہ لگاتا تو کچلا گیا تھا یہ تو....."

بوڑھے خواجہ سرا نے جھک کر اس بے ہوش وجود کو ٹٹولا۔ پھر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دور دور تک کوئی نہ تھا۔

"چھیناں باجی! اس کا کیا کریں؟" سرخ لباس والے نے بوڑھے سے پوچھا۔

ایک لمحہ سوچنے کے بعد بوڑھے نے جس کا نام چھیناں تھا ہاکو سے کہا۔ "چل نامراد! اب دیکھتا رہے گا اسے یا اٹھا کر رکشے میں ڈالے گا بھی....."

ہاکو فوراً جھکا اور بے ہوش وجود کو اٹھا کر رکشے کی سمت بڑھ گیا۔

☆☆☆

اسٹیج پر سفید روشنی کا ایک دائرہ تھا جو فرش پر "ڈیسڈی مونا" کے مردہ وجود کو روشن کر رہا تھا..... ایک ہلکی سی "دھم" کی بیٹ کے ساتھ روشنی کا ایک اور دائرہ پیدا ہوا اور اس نے اسٹیج کے ایک کونے میں کھڑے "اوتھیلو" کی پوزیشن واضح کر دی۔ اوتھیلو جیسے پانی پر قدم رکھتا ہوا آگے بڑھا۔ روشنی کا دائرہ اس کے ساتھ ہی تھا۔ وہ ڈیسڈی مونا کی لاش کے قریب آکر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اس نے لاش پر ہاتھ پھیرا اور ایک کربناک سی فریاد کے انداز میں دونوں بازو اوپر اٹھا دیے۔ چند لمحے اس کے بازو ہوا میں ہی معلق رہے پھر اس نے دونوں ہاتھ نیچے گرا کر اپنے منہ پر رکھ لیے۔ موسیقی نے المیہ آہنگ بھرا اور اس پورے منظر کو جیسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ اوتھیلو منہ پر ہاتھ رکھے بالکل ساکت تھا۔ اچانک المیہ موسیقی تھم گئی اور مخصوص کورڈز کے ساتھ اوتھیلو نے جیب سے خنجر نکالا اور اپنے سینے میں گھونپ کر مونا کی لاش کے اوپر گر گیا۔ ہر قسم کی آواز تھم گئی..... اور ایک مختصر سے سکوت کے بعد اندھیرے میں ڈوبا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

اسٹیج پر سرخ بھاری پردہ گرتا چلا گیا۔ جیسے ہی پردے نے اسٹیج اور شائقین کے درمیان اپنی دیوار کھڑی کی..... اسٹیج پر موجود ساکت زندگی برق رفتاری سے حرکت میں آگئی۔ اوتھیلو کے گیٹ اپ میں موجود تیمور اور مونا کے کردار میں "مینا آفندی" تیزی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ دروازوں سے "گروپ" کے لوگ اسٹیج پر آکر اگلے سین کی مناسبت سے سیٹ میں تبدیلیاں کرنے لگے۔ ایک سمت سے ڈائریکٹر سہیل صدیقی بھی اندر داخل ہوئے۔ تیمور اور مینا ایک ساتھ باتیں کرتے ہوئے اسٹیج کی عقبی طرف جا رہے تھے..... صدیقی صاحب نے قریب سے گزرتے ہوئے نوجوان تیمور کے کندھے پر تھپکی دے کر اسے مسکرا کر داد دی۔ تیمور نے مینا کی طرف دیکھا جو اس کی طرف دیکھتے ہوئے پہلے سے ہی مسکرا رہی تھی۔ مینا کی جھلمل کرتی اور مسکراتی آنکھوں کو دیکھ کر تیمور کے اندر ایک دم ہی ایک غم کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پتا نہیں مینا کی آنکھوں میں کیا تھا کہ پہلی بار سے لے کر آج تک..... اس نے جب بھی اس کی آنکھوں میں دیکھا، اس کے اندر موجود ہر احساس کے اوپر ایک اجنبی سا غم کسی بادل کی طرح چھا جاتا۔

عقبی اسٹیج پر پہنچ کر دونوں اپنے اپنے میک اپ روم کی طرف چلے گئے۔ کچھ دیر بعد ہی تماشائیوں کی تالیوں کی مسلسل لیکن دھیمی گونج نے بتایا اسٹیج پر ڈرامے کا آخری سین ختم ہو چکا ہے۔ تیمور تیزی سے اٹھ کر باہر نکلا۔ اسی لمحے مینا

آفندی بھی اپنے کمرے سے باہر نکل آئی..... اور اس کے ساتھ ہی ڈرامے کے سارے اداکار وہاں جمع ہو گئے اور پھر اپنے ڈائریکٹر صدیقی صاحب کے پیچھے ایک سیدھی لائن کی صورت میں اسٹیج پر آ کر ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے سر کو جھکائے تماشائیوں سے داد وصول کرنے لگے۔

☆☆☆

شیکسپیئر کے اوتھیلو کی کامیاب پرفارمنس کے بعد ڈائریکٹر صدیقی نے سبھی فنکاروں اور کریو ممبران کو ایک پارٹی دی۔ اس پارٹی میں سبھی نے تیمور اور مینا کی پرفارمنس کو خوب سراہا۔ وہیں صدیقی صاحب نے دعویٰ کیا کہ اگر یہ دونوں اداکار اسی طرح محنت سے اپنا کام کرتے رہے تو بہت جلد پرفارمنگ آرٹ کی دنیا میں بڑا نام پائیں گے۔ پارٹی کے بعد تیمور اور مینا آرٹس کونسل کی کینٹین میں آ بیٹھے۔

''اب آگے کے کیا ارادے ہیں؟'' تیمور نے خوش دلی سے پوچھا۔

''ایک ٹی وی ڈرامے کی پیشکش ہے۔ کل ٹی وی اسٹیشن جانا ہے..... اگر یہ معاملہ طے ہو گیا تو اچھا چانس ہے میرے لیے..... سنا ہے ٹی وی والے معاوضہ بھی اچھا دیتے ہیں۔'' مینا نے بتایا..... تیمور نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔

''اور تم.....؟'' مینا نے اسی کا سوال پوچھا۔

''میں.....'' اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میں اب کچھ بھی نہیں..... فی الحال آگے کوئی نیا پروجیکٹ نہیں ہے..... تب تک انتظار.....''

''صدیقی صاحب تمہاری جتنی تعریف کر رہے تھے یہ بہت بڑی بات ہے۔ وہ کبھی کسی کی اتنی زیادہ تعریف نہیں کرتے۔ تم میں واقعی ٹیلنٹ ہے۔ ''اجوکا'' والوں کا ڈراما فیسٹیول بھی آنے والا ہے۔ تمہیں ان کے ساتھ جڑے رہنا چاہیے..... بہت چانس ملے گا ادھر۔'' مینا نے کہا۔

''ہاں دیکھیں گے..... فی الحال تو اس میں تین چار ماہ باقی ہیں.....''

''تمہیں کیا ہوا..... اتنے سنجیدہ کیوں ہو رہے ہو؟ ارے بھئی تمہیں تو خوش ہونا چاہیے..... جس کامیابی کے لیے تم نے اتنی محنت کی ہے وہ اب تمہارے پاس آ رہی ہے۔'' مینا نے کہا۔

وہ بولا۔ ''عجیب بات ہے۔ میں خود حیران ہوں..... مجھے تو خوش ہونا چاہیے..... میرے خواب کی تکمیل ہو رہی ہے..... لیکن..... لیکن پتا نہیں کیوں..... مجھے کچھ خاص خوشی محسوس نہیں ہو رہی مینا..... جانے کیا بات ہے..... مجھے یہ احساس ہو رہا ہے جیسے..... یا تو یہ وہ کامیابی نہیں جس کے لیے میں نے محنت کی تھی یا پھر..... یا پھر یہ وہ نہیں جو مجھے چاہیے تھا۔''

''اچھا..... تو تمہیں اس کے سوا اور کیا چاہیے؟ اداکاری ہی تو تمہارا سب سے بڑا خواب تھا۔''

''ہاں..... لیکن تھا..... کیونکہ تب تک میں اس سے آگے کچھ نہیں دیکھ پا رہا تھا..... مگر اب..... میں اس سے آگے دیکھ رہا ہوں۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''جسے میں اپنا سب سے بڑا خواب سمجھتا تھا..... اس سے آگے کی دنیا اتنی حسین ہو گی میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔''

''تم واقعی کمال کے ایکٹر ہو..... لیکن یاد رکھو تیمور! ایکٹنگ صرف اسٹیج پر اچھی لگتی ہے اور ڈائیلاگ بھی..... بیک آف دی اسٹیج اور حقیقت کی دنیا میں ایسی شاعرانہ باتیں اور خیال دونوں فلاپ ہو جاتے ہیں۔'' مینا نے ہنس کر کہا۔

تیمور نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''لیکن تم چاہے کچھ بھی کہو..... ڈراما ہو یا حقیقت..... محبت کے معانی وہی رہتے ہیں۔ ہمارا پروجیکٹ ختم ہو گیا ہے..... اب وقتی طور پر ہی سہی لیکن ہمارے راستے جدا ہو گئے ہیں لیکن اب میں تمہارے ساتھ ان چھوٹے چھوٹے رستوں پر چلنے کے بجائے زندگی کے بڑے سفر پر دور تک جانا چاہتا ہوں..... جہاں سے ہمارا کوئی راستہ الگ نہ ہو۔''

''تیمور! میں ایک بار پھر تم سے کہتی ہوں..... تمہیں اس وقت صرف اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا چاہیے..... ابھی ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔'' مینا نے کہا۔

''وہی تو کر رہا ہوں..... مستقبل کے بارے میں ہی تو سوچ رہا ہوں۔'' اس نے آہستہ سے احتجاج کیا۔

مینا چائے ختم کرتے ہوئے بولی۔ ''میرے خیال میں اب چلنا چاہیے۔''

تیمور بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ آرٹس کونسل کی پارکنگ میں مینا کا ڈرائیور اس کی گاڑی لیے اس کا منتظر تھا..... وہ بنا کچھ کہے چلی گئی۔

تیمور نے اپنی الف ایکس نکالی اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایک بے نام سی اداسی اس کے اندر گھر کر رہی تھی۔

گلبرگ کے ایک پانچ مرلہ مکان میں اس کی رہائش تھی۔ یہ گھر بھی اس کا ذاتی نہیں تھا، کرائے کا تھا اور یہاں وہ اکیلا ہی رہتا تھا۔ لیکن اب اس نے ایک فیصلہ کر لیا تھا، اسے اب ایک گھر خرید لینا چاہیے۔

☆☆☆

چند برس قبل تیمور جب شاہدرہ سے لاہور آیا تو

یہ بات اس کے گمان میں بھی نہ تھی کہ لاہور میں اس کا مستقبل ''آرٹ'' سے وابستہ ہو جائے گا۔ نہ تو وہ زیادہ پڑھا لکھا تھا اور نہ ہی اسے آرٹ جیسی چیزوں میں دلچسپی تھی۔ اس کا مقصد تو محض روزگار کی تلاش تھی اور چند پیسے کما کر اپنی اکیلی زندگی کا بوجھ اٹھانا تھا..... لیکن ایک پروگرام انسان اپنے لیے بناتا ہے تو دوسرا پروگرام تقدیر اس کے لیے طے کر کے بیٹھی ہوتی ہے۔ لاہور میں اس کا ایک دوست عامر تھا جو گارمنٹس کا کاروبار کرتا تھا اور اپنی بیوی کے ساتھ علامہ اقبال ٹاؤن میں رہتا تھا۔ پسند کی شادی کرنے کی وجہ سے اس نے اپنا گھر چھوڑ دیا تھا۔ اسی نے تیمور کی مدد کی۔ عامر کا ایک جاننے والا آرٹس کونسل میں جاب کرتا تھا، اس نے تیمور کو وہاں آفس بوائے کے طور پر رکھ لیا..... جہاں سے اس کی دوستی تھیٹر سے وابستہ ایک میک اپ آرٹسٹ سے ہو گئی اور کچھ عرصے بعد وہ اس کا اسسٹنٹ بن کے میک اپ کا فن سیکھنے لگا۔ یہ آفس بوائے کی نوکری سے بہتر تھا..... لیکن میک اپ کا فن پوری طرح سیکھنے سے پہلے ہی ایک ڈرامائی موڑ نے اسے اداکار بنا دیا۔ جب ایک ڈرامے کا کردار ڈراما شروع ہونے سے محض پندرہ منٹ پہلے ڈائریکٹر سے جھگڑ کر چلا گیا۔ تیمور اس کردار کے میک اپ روم میں نہ پہنچنے کی وجہ تلاش کرنے باہر نکلا تھا..... جہاں ریہرسل روم میں ایک تناؤ کی سی کیفیت بپا تھی۔ پروڈیوسر بری طرح بھڑک رہا تھا جبکہ ڈائریکٹر پُرسکون انداز سے بیٹھا جیسے کسی سوچ میں گم تھا۔ تیمور اندر داخل ہوا تو پروڈیوسر چلا رہا تھا۔

''اب دس منٹ میں کہاں سے نیا بندہ پیدا ہو گا؟''

ڈائریکٹر نے سامنے دیکھا اور مسکرا کے بولا۔ ''پیدا تو ہو گیا.....'' اس کی نگاہیں نوجوان اور خوبرو تیمور پر جمی ہوئی تھیں۔

ڈرامے کا پہلا سین تیمور کی اداکاری کا پہلا سین ہی تھا اور وہ بھی بڑی مختصر سی ریہرسل کے ساتھ..... آٹھ منٹ کے اس سین میں البتہ تیمور کو یہ سہولت تھی کہ اسے کوئی ڈائیلاگ نہیں بولنا تھا..... دو فنکاروں کی بات چیت کے دوران اسے ان آٹھ منٹوں میں مسلسل پریشانی کے عالم میں اسٹیج پر ٹہلنا تھا۔

تیمور کا پہلا ہی سین بڑی کامیابی سے پایۂ تکمیل کو پہنچا اور کیوں نہ پہنچتا..... وہ اسٹیج پر اداکاری تھوڑی کر رہا تھا بلکہ وہ تو سچ میں بدلتی ہوئی صورت حال کو لے کر پریشان تھا لیکن پچھلے چند ماہ سے وہ بیک ڈی اسٹیج ان ڈراموں کا حصہ ضرور رہا تھا..... اور اکثر پردے کے پیچھے سے اسٹیج پر ہونے والی پرفارمنس کو دیکھنے میں دلچسپی پیدا کر چکا تھا۔ جب کوئی اداکار کسی ڈائیلاگ یا اپنے کسی تاثر سے فن اداکاری میں کوئی خوبصورتی پیش کرتا تو سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھتا۔ یہ چیز تیمور کو بہت پسند تھی..... لیکن ایسا پہلی بار ہوا تھا جب ہال میں اس کے لیے تالیاں بجائی گئی تھیں۔

تیمور کے دوسرے سین میں البتہ پندرہ منٹ کا وقفہ تھا جس میں اسے جو سمجھا دیا گیا تھا، اس کی اس نے کم وقت میں ریہرسل بھی کی اور اسے خوبصورتی سے پرفارم بھی کر لیا۔ اس کا کردار ہیرو کا نہیں تھا لیکن ڈرامے کا مضبوط کردار تھا جو اس نے خوش اسلوبی سے ادا کیا۔ یہ تجربہ اس کے لیے بہت انوکھا اور خوش کن تھا..... اور اس تجربے کے دوران اس نے طے کر لیا کہ یہی وہ راستہ ہے جو اس کے مستقبل سے وابستہ ہے۔ یہی وہ فن ہے جسے لے کر اس نے آگے بڑھنا ہے لیکن یہ راستہ آسان نہیں تھا..... اس پہلے ڈرامے کے بعد اسے طویل عرصے تک دوبارہ اداکاری کا موقع نہ ملا..... لیکن وہ اس دوران تھیٹر میں ہونے والے ڈراموں کو بڑے غور سے دیکھتا رہا..... اور اپنے طور پر اداکاری کو سیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے کچھ ڈائریکٹرز کو آڈیشن بھی دیے لیکن ناکام رہا۔ اس دوران اس کا دوست میک اپ آرٹسٹ اس کی بھرپور مدد کرتا رہا۔ کچھ عرصے بعد اسے ایک ڈرامے میں ایک بار پھر ایک مختصر رول دیا گیا۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ اس کا یہ رول تماشائیوں میں بیٹھے ایک اور ڈائریکٹر کو پسند آ گیا اور اس نے اپنے ڈرامے کے ایک لیڈ رول میں اسے کاسٹ کر لیا۔ اس ڈرامے میں اداکاری کے لیے تیمور نے جان توڑ محنت کی..... اور ایسی شاندار پرفارمنس پیش کی کہ دیکھنے والے اش اش کر اٹھے..... اداکاروں اور ڈائریکٹرز سے حاصل کردہ فنِ اداکاری کی وہ باریکیاں جان گیا تھا جو پرفارمنگ آرٹ کا ایک طالب علم بہت دیر بعد عملی تجربہ حاصل کر کے جانتا تھا..... لہٰذا بہت کم وقت میں وہ تھیٹر کا ایک اچھا اداکار بن گیا۔

مینا آفندی کی کہانی تیمور سے مختلف تھی۔ اس نے باقاعدہ پرفارمنگ آرٹ کی تعلیم حاصل کی تھی اور مزید ایکٹنگ کورسز کے لیے باہر جانا چاہتی تھی مگر فی الوقت آرٹ تھیٹر میں کام بھی کر رہی تھی۔ مینا آفندی کی عمر زیادہ نہیں تھی لیکن اس کی شادی ہو چکی تھی جو ناکام ثابت ہوئی تھی۔ اب وہ ماڈل ٹاؤن کے ایک گھر میں اپنے ملازموں کے ساتھ تنہا رہتی تھی۔ اس کے سوا اس کے بارے میں اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ مینا کا سارا حسن اس کی فسوں خیز آنکھوں میں چھلکتا تھا..... جس میں جھانکنے کے بعد تیمور کے اندر کا موسم بدل جایا کرتا تھا۔

تیمور کی زندگی کا اب تک ایک ہی مقصد تھا..... بڑا اداکار بننا..... اور اب یہ مقصد تکمیل کی طرف گامزن

ہو چکا تھا۔ اس کی محنت رنگ لا رہی تھی۔ آرٹس کونسل میں پیش کیے جانے والے ڈرامے ''اوتھیلو'' میں اس کی کارکردگی کو سراہا گیا تھا..... جس بنا پر اسے ایسے بڑے ڈائریکٹرز کی بھی آفرز آنے لگیں جن کے ساتھ کام کرنے کا مطلب یہی تھا کہ اب وہ ''اسٹار'' بن جائے گا..... لیکن جہاں سے اس کی زندگی کے مقصد کا سفر عروج کی طرف بڑھنا شروع ہوا، وہیں سے اس نے وہ کام کر دیا جو اس کی فنی زندگی پر حاوی ہو سکتا تھا۔ اس نے مینا آفندی سے عشق کر لیا۔ مینا سے اس کی دوستی ایک تھیٹر پرفارمنس کے دوران ہی ہوئی تھی۔ تھیٹر سے شوبز میں قدم رکھتی ابھرتی ہوئی اداکارہ مینا آفندی کو تیمور پہلی ملاقات میں ہی جاذب نظر لگا۔ وہ کم گو اور سلجھا ہوا انسان نظر آیا جو اپنے پروفیشن سے مخلص تھا۔ زیادہ پڑھا لکھا نہ ہونے کے باوجود اچھے طریقے سے گفتگو کرتا اور بالکل بھی شو آف نہیں کرتا تھا۔

دونوں نے ایک دوسرے کی دوستانہ کمپنی کو پسند کیا اور پھر دھیرے دھیرے ہونے والی ملاقاتوں میں تیمور کو احساس ہو گیا کہ وہ اس فسوں خیز آنکھوں کی ملکہ کے عشق میں گرفتار ہو چکا ہے..... اس نے اپنے اس حسین جذبے کو قطعاً چھپانے کی کوشش نہ کی بلکہ سلیقے سے مینا کے سامنے اظہار کر دیا۔ مینا نے اس کی بات کا جواب اگر نفی میں نہیں دیا تھا تو مثبت بھی نہیں تھا۔ اس نے یہ کہا تھا کہ اس نے یہ سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے کہ اب کوئی اس کی زندگی میں آئے گا۔

اس کے جواب میں تیمور کے لیے صاف انکار نہیں تھا ..... اس لیے اس نے امید کا چراغ جلتا رہنے دیا اور یہ کوشش کرتا رہا کہ مینا کو اس کے چراغ کی لو نظر آتی رہے۔ اوتھیلو ختم ہو گیا تھا۔ مینا ایک ٹی وی سیریل میں کام کرنے لگی تھی۔ تیمور کو بھی ڈراما فیسٹیول میں ایک بڑے ڈائریکٹر خاور نے اپنے تھیٹر پلے کے لیے کاسٹ کر لیا تھا اور اس میں لیڈنگ رول جو تیمور کو ملا وہ اس کے لیے بہت چیلنجنگ بھی تھا اور اہم بھی..... ڈرامے کا نام ''آدھا مرد آدھی عورت'' تھا..... جس میں ایک ایسے انسان کا کردار تیمور کو نبھانا تھا جو نفسیاتی طور پر دو زندگیاں ایک ساتھ جی رہا تھا۔ وہ دن کے وقت ایک مرد کی طرح کام کاج کرتا نظر آتا۔ لیکن رات ہوتے ہی وہ خود کو ایک عورت تصور کرتا..... زنانہ لباس پہنتا..... بناؤ سنگھار کرتا اور گھنگرو پہن کر رقص کرتا۔ تیمور کو ایک عورت کی طرح چلنا اٹھنا بیٹھنا ہی نہیں بلکہ اسے شاندار رقص بھی کرتے نظر آنا تھا..... اس کے لیے تیمور کی خاص ریہرسل جاری تھی..... باقی تو سب کچھ اس نے کر کے دکھا دیا لیکن رقص میں وہ اناڑی تھا..... اور اتنا اناڑی کہ اس کے لیے ایک ماہر کوریو گرافر کا بھی بندوبست کیا گیا لیکن تیمور کی پرفارمنس ڈائریکٹر کو متاثر نہیں کر پا رہی تھی۔ حتیٰ کہ ایک موقع پر خاور کی باتوں سے تیمور کو ایسے لگا جیسے وہ اسے اس کردار سے ہٹانے والے ہیں..... مگر یہیں مینا آفندی نے تیمور کی مدد کی۔ تیمور نے اسے اپنی پریشانی کا بتایا تو اس نے تیمور کو ایک خوشگوار پیشکش کی کہ وہ چاہے تو مینا اسے رقص سکھانے کی کوشش کر سکتی ہے۔ سوگلبرگ کے پانچ مرلہ مکان میں پہلی بار مینا آفندی نے قدم رکھے اور وہ دن تیمور کے لیے کسی خواب سے کم نہیں تھے۔ اس کی زندگی کے سب سے اہم موڑ پر اس کی محبت اس کی مدد کر رہی تھی۔ تیمور جب اسے رقص کرتا دیکھتا تو دیکھتا رہ جاتا۔ مینا کسی دیوی کی طرح ناچتی رہتی اور وہ کسی پجاری کی طرح بیٹھا اسے عقیدت سے دیکھتا رہتا..... زندگی کا سب سے اہم موقع..... ڈراما..... رقص..... سب کچھ اسے بھول سا گیا حتیٰ کہ مینا کے تھرکتے پاؤں رک گئے اور جیسے ایک طلسم سا ٹوٹ گیا اور وہ ہوش کی دنیا میں واپس آیا۔ دو ہفتوں میں اس نے مینا سے رقص کم سیکھا اور اسے رقص کرتے ہوئے زیادہ دیکھا پھر بھی جب خاور کے سامنے اس نے پرفارمنس دی تو وہ مطمئن نظر آئے۔ بالآخر وہ وقت آ گیا جب خاور کا ڈراما اسٹیج پر پیش کیا جانا تھا۔

ڈراما فیسٹیول میں ملک کے ہی نہیں بلکہ ملک سے باہر کے بھی بڑے بڑے فنکار اور آرٹسٹ آئے ہوئے تھے..... اور سب کو خاور کے ڈرامے کا انتظار تھا کیونکہ خاور نے ہمیشہ منفرد کام پیش کیا تھا۔ تیمور جانتا تھا کہ یہ اس کی آنے والی زندگی کے لیے کتنا بڑا موقع ہے۔ اس کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ اس نے بھرپور محنت کی تھی۔ پلے ایکٹ میں اداکاری پوری ذمے داری کے ساتھ نبھائی..... دوسرے ایکٹ میں اس کے رقص کی پرفارمنس تھی۔ اسے کردار کے عین مطابق تیار کیا گیا۔ دلہن جیسے سرخ لباس کے ساتھ چہرے کا بناؤ سنگھار بہت عمدگی سے کیا گیا تھا۔ کہیں شو آف نہیں تھا..... جب اسٹیج پر داخل ہوا تو اس کا بدلا ہوا روپ دیکھ کر کئی منٹ تک ہال میں تالیاں گونجتی رہیں۔

وہ اسکرپٹ کے عین مطابق اسٹیج پر رکھی ایک الماری کی طرف گیا وہاں سے گھنگرو نکال کر اس نے پیروں میں پہنے اور تبھی ''پائل میں گیت ہیں چھم چھم کے'' کی موسیقی شروع ہو گئی۔ اس نے دھیمے انداز میں کلاسیکل رقص شروع کیا۔ شروع میں وہ تھوڑا کنفیوز نظر آیا لیکن پھر اس کے ذہن کے پردے پر مینا کا خیال آیا..... اس نے مینا کو رقص کرتے ہوئے دیکھا..... اور پھر یوں محسوس کیا جیسے وہ نہیں بلکہ اس

کی جگہ مینا رقص کر رہی ہے..... اور وہ سامنے بیٹھا اسے دیکھ رہا ہے۔ یہ خیال اتنا طاقتور تھا کہ وہ اپنے اردگرد کی ہر شے فراموش کرتا چلا گیا۔ اسٹیج..... روشنیاں..... ہال میں چمکتی ہوئی نگاہیں..... سب ایک دھند کے پردے میں چھپتے چلے گئے۔ اسٹیج پر مینا رقص کر رہی تھی اور وہ خود کو ایک خالی ہال میں بیٹھا محسوس کر رہا تھا۔ اس حالت میں اسے خبر بھی نہ ہوئی کہ گانا تھم گیا ہے۔ ایک خاموشی چھا گئی ہے۔ کوئی موسیقی نہیں ابھر رہی..... صرف اس کے گھنگروؤں کی چھن چھن گونج رہی ہے اور رقص جاری ہے۔ اسٹیج کے دروازے پر موجود اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے اسے دوبار آواز دی۔ تیسری بار جب وہ پکارنے لگا تو خاور نے اسے روک دیا۔ وہ تیمور کو غور سے دیکھ رہے تھے جو بنا کسی موسیقی کے رقص کر رہا تھا..... اور اس کے انداز میں ایک ایسی وارفتگی تھی جیسے وہ ہوش میں نہیں..... اور واقعی وہ ہوش میں کہاں تھا لیکن وہ یہ بھول گیا کہ برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔ اس کی وہ حد ختم ہوئی اور وہ نڈھال ہو کر اپنے پیروں پر گر گیا..... گھنگرو خاموش ہو گئے اور ایک سکوت سا طاری ہو گیا۔

اوپر سے سرخ پردہ نیچے گرنے لگا..... اور پھر ایک دم ہال تالیوں کے بے پناہ شور سے گونج اٹھا۔

☆☆☆

''آدھا مرد آدھی عورت'' کے پہلے شو نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے۔ ڈرامے کے منفرد موضوع اور حساس کہانی نے جہاں سب کو متاثر کیا، وہیں تیمور کی پرفارمنس کا ڈنکا بج رہا تھا..... اور تیمور اس ماحول اور اس کامیابی کی خوشی سے دور مینا کے ساتھ تھا اور اس کا ساتھ ہمیشہ کے لیے پانے کی اجازت مانگ رہا تھا۔

''دیکھو تیمور! تم اپنے سب سے بڑے خواب کی تکمیل کے دہانے پر کھڑے ہو..... تمہارے سامنے وہ راستہ کھل گیا ہے جہاں تمہیں تمہاری منزل مل گئی۔ ہر طرف تمہارے نام کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ پتا نہیں تمہیں علم ہے یا نہیں لیکن میں نے سنا ہے کہ شاہ جی جیسے فلم ڈائریکٹر تمہارے ساتھ فلم بنانے کا سوچ رہے ہیں۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو، مجھے ابھی ان سب کے بارے میں سوچنا چاہیے لیکن مینا! ایسا ہو نہیں رہا۔ میرا خود پر اختیار نہیں..... میں صرف اور صرف تمہارے بارے میں سوچتا رہتا ہوں اور جب تک تمہاری سوچ مجھ پر حاوی رہے گی میں کچھ اور نہیں سوچ سکتا۔ مجھے اپنے ہر فیصلے سے پہلے تمہارے بارے میں ایک فیصلہ کرنا ہے، اس کے بعد ہی میں کچھ اور کر پاؤں گا۔'' وہ عجیب سے انداز میں بولتا چلا گیا۔ مینا خاموش رہی.....

''مینا..... کیا تم مجھ سے شادی کرنا چاہو گی؟'' تیمور نے ساری باتیں بالائے طاق رکھتے ہوئے ایک دم ہی پوچھ لیا۔

مینا نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

''میرے سوال کا جواب دو مینا..... پلیز!''

''تم اسلام آباد کب جا رہے ہو.....؟'' مینا نے بات بدلتے ہوئے نیا سوال کر دیا تو تیمور سانس بھر کے رہ گیا۔

''پرسوں جاؤں گا..... خاور..... آدھا مرد اور آدھی عورت کو مختلف جگہوں پر پیش کرنے والے ہیں۔ پہلے اسلام آباد..... پھر کراچی اور شاید لندن بھی..... میں آنے والے دنوں میں بہت مصروف ہونے والا ہوں مینا..... لیکن میں نہیں چاہتا کہ میں اتنے بڑے پروجیکٹ میں کام کرتے ہوئے کسی خلش کا شکار رہوں۔ ذہنی دباؤ ہو گا تو میں پرفارم کیسے کر پاؤں گا۔ اس لیے مجھے تمہارے جواب کا انتظار ہے۔ میں جانے سے پہلے جاننا چاہتا ہوں کہ تم کیا چاہتی ہو؟'' تیمور نے کہا۔

''تم جب اسلام آباد سے لوٹو گے تو تمہیں تمہارا جواب مل جائے گا.....'' مینا نے کہا اور ہلکے سے مسکرا دی۔

☆☆☆

زرد بلب کی ناکافی روشنی کمرے کے اندھیرے کو روشن کرنے کے بجائے مزید پُراسرار بنا رہی تھی۔ ایک سفید چادر بچھی چارپائی پر دونوں گھٹنے جوڑ کر بیٹھے چھیناں نام کے بوڑھے خواجہ سرا کی طرف اس نے یوں دیکھا جیسے کچھ دیکھا ہی نہ ہو۔ اس کا چہرہ ہی نہیں آنکھیں بھی سپاٹ تھیں۔ جسم پر ابھی تک لڑکیوں والا لباس تھا۔ چہرے کا میک اپ البتہ اس وقت دھل دھلا گیا جب اسے ہوش دلانے کے لیے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے گئے تھے۔ دو خواجہ سرا دروازے پر کھڑے اندر کا منظر دیکھنے میں مصروف تھے۔

''چل بتانا..... کون ہے رے تو؟'' بوڑھے خواجہ سرا نے تیسری بار پوچھا۔ وہ پھر سے خاموش ہی رہا۔

''چل اپنا نام ہی بتا دے؟''

اس نے پھر کوئی جواب نہیں دیا اور ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

چھیناں چونک کر بولی۔ ''کیا رے! بھوک لگی ہے؟''

اب کی بار اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اری او چنبیلی..... ادھر چھنو کے پاس ہو گی وہ کھانے

والی پوٹلی جو فنکشن سے لائے تھے..... اس میں سے کچھ کھانے کے لیے لا۔''

اس کی بات سنتے ہی دروازے کی چوکھٹ پر کھڑی چنبیلی ایک زقند بھرتے ہوئے باہر نکل گئی۔

کچھ دیر بعد اس نے چھوٹی سی ٹرے میں موجود روٹیاں، مرغ کا دیگی سالن اور میٹھے چاول یوں نگلے جیسے کئی دنوں کا بھوکا ہو۔ چنبیلی برتن اٹھا کر لے گئی۔ چھیناں کسی خیال میں گم صم بیٹھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی..... اور وہ اس کی نظروں سے بے نیاز اپنی جگہ پر ٹانگیں سمیٹ کر لیٹ گیا اور چند لمحوں بعد نیند کی وادی میں اتر گیا۔ چنبیلی کمرے میں واپس آئی تو اسے سوتا دیکھ کر چونک گئی۔

''باجی! کون ہے یہ؟ میرا مطلب ہے کچھ بتایا نہیں اس نے اپنے بارے میں؟''

''اللہ جانے کون ہے ری..... پر اس ننھی عمریا میں کوئی بہت بڑا روگ لگا ہے اسے۔'' چھیناں نے کہا۔

''لیکن باجی اسے یہاں کیوں لے آئے ہم؟''

''تو کیا وہیں سڑک پر چھوڑ دیتے..... کوئی ہا کو جیسا ٹکوڑ مارا موٹر کار ٹھوک کر نکل جاتا تو کیا ہوتا؟'' چھیناں نے پیک دان میں پیک تھوکتے ہوئے کہا۔

''ہائے باجی..... دیکھ تو کتنا سوہنا مکھڑا ہے اس کا..... پر حالت دیکھ کر دل کو ہول اٹھتا ہے۔ جانے کس کا ہے، کہاں کا ہے..... کچھ بولا بھی نہیں۔'' چنبیلی نے کہا۔

''بولے گا ری..... بولے گا..... کب تک چپ رہے گا۔ ابھی بھوک لگی تھی تو پیٹ بھر لیا..... تھک گیا تھا شاید اس لیے سو گیا۔ صبح بولے گا..... اور چل تو بھی نکل..... اور مجھے بھی سونے دے۔ ذلیل ہا کو نے جو تھڑ کھلی مچائی تھی پورا انجر پنجر ہل کے رہ گیا ہے۔'' چھیناں نے لیٹتے ہوئے کہا۔ چنبیلی اس سوئے ہوئے مہمان کو نظر بھر کر دیکھتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

صبح سویرے چنبیلی جب کمرے میں آئی تو اس نے دیکھا چھیناں اور وہ گم صم سا لڑکا نہ صرف اٹھ گئے ہیں بلکہ ان کی بات چیت بھی شروع ہو گئی ہے۔

''چل میرے پیارے میرے سوہنے اپنا نام تو بتا دے۔'' چھیناں پوچھ رہی تھی۔

لڑکا آہستہ سے لیکن سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''میرا کوئی نام نہیں ہے۔''

''نہ میری جان..... ایسے نہیں بولتے..... سب کے نام ہوتے ہیں..... تیرا بھی ہو گا رے۔''

''پہلے تھا..... پر اب نہیں ہے۔'' وہ اسی انداز سے بولا۔

''رہتا کہاں ہے رے تُو..... کوئی ٹھکانا تو ہو گا نا؟'' چھیناں نے نام کا پیچھا چھوڑ کر اگلا سوال کر دیا۔

''آج سے یہیں رہوں گا۔'' اس کا جواب سن کر چھیناں اور چنبیلی چونک گئیں۔

''یہاں..... ہمارے پاس..... یہاں کیا کرے گا رے..... یہاں تیرا کیا کام؟''

''کام جو بولو کروں گا..... لیکن رہوں گا یہیں۔'' وہ اسی سپاٹ انداز میں بولے جا رہا تھا۔

''میرے شہزادے! جانے کس پر غصہ کھائے بیٹھا ہے..... پر یہ جگہ تیرے لیے نہیں ہے۔ کل کو تیرے آگے پیچھے والے تجھے ڈھونڈتے ہوئے یہاں آ گئے تو ہم مصیبت میں پھنس جائیں گے۔'' چنبیلی نے چھیناں کے خاموش رہنے پر خود سمجھانے کی کوشش کی۔

''مجھے ڈھونڈنے یا مجھے لینے کوئی نہیں آئے گا۔''

''کیوں..... کیوں نہیں آئے گا..... اماں باوا کوئی تو آئے گا۔'' چنبیلی ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔

''نہیں کوئی نہیں آئے گا۔''

''لیکن کیوں.....؟''

''کیونکہ..... سب مر گئے۔'' وہ زہر خند لہجے میں بولا تو چنبیلی نے بے اختیار اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔

''ہائے میں مر گئی..... سب..... سب مر گئے؟''

چھیناں بھی چونک گئی لیکن بولی کچھ نہیں۔

''میرا اب کوئی نہیں ہے..... نہ کوئی رشتہ، نہ کوئی گھر..... مجھے یہاں رہنے دو..... میں سب کام کروں گا..... یہاں سے نکالو گے تو کچھ پتا نہیں دوبارہ کسی سڑک پر بے ہوش ہو کر گر جاؤں اور شاید مر جاؤں۔''

چنبیلی تیر کی طرح اس کی طرف آئی اور اس کے سر کو بانہوں میں بھر لیا۔

''ظالم بس کر..... اتنی سی عمر میں کیسی باتیں کر رہا ہے۔ نامراد..... مریں تیرے دشمن!'' چنبیلی نے سسک کر کہا اور امید بھری نظروں سے چھیناں کی طرف دیکھا جو خود ہمدردی سے اس لڑکے کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ چنبیلی کی نظروں کا مفہوم سمجھتے ہوئے اس نے گہری سانس لی اور کہا۔

''اچھا فی الحال تو، تُو یہیں رہ..... باقی بعد کا بعد میں سوچتے ہیں۔ اری او چنبیلی! چل چھوڑ دے اس نامراد کو..... اور ناشتا کرا اسے.....''

چنبیلی نے اسے فوراً چھوڑ دیا اور آنکھوں کی نمی صاف

کرتے ہوئے بولی۔ ''چل اٹھ آ میرے ساتھ باہر..... منہ ہاتھ دھولے میرے شہزادے..... باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔''

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور چنبیلی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا..... چھیناں ایک گہری سوچ میں گم تھی۔

☆☆☆

تیمور اسلام آباد میں تھا۔ یہاں خاور کے مقبول ڈرامے آدھا مرد آدھی عورت کا آج خصوصی شو تھا اُس وقت شام کے چھ بج رہے تھے۔ ڈراما رات دس بجے شروع ہونا تھا لیکن تیمور جانے کے لیے تیار ہو چکا تھا کیونکہ ڈراما شروع ہونے سے پہلے کچھ مہمانوں سے ملاقات متوقع تھی۔ وہ ٹائی کی ناٹ باندھ رہا تھا جب ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے ریسیور اٹھایا تو ریسپشنسٹ نے اسے بتایا کہ کوئی مینا آفندی لائن پر ہیں۔

''جی بات کروایئے۔'' اس نے پُرجوش انداز میں کہا۔

دوسری طرف سے ایک مختصر سی ٹون کے بعد مینا کی آواز سنائی دی۔

''فرصت مل گئی جناب؟''

''ارے آپ کے لیے تو فرصت ہی فرصت ہے۔'' وہ خوش دلی سے بولا۔

''کیا کر رہے تھے؟''

''میں ابھی نکلنے کی تیاری کر رہا تھا۔ شو سے پہلے ایک تقریب ہے اور خاور صاحب کی تقریر بھی ہے۔ اس کے بعد رات دس بجے ڈراما شروع ہو جائے گا۔''

''اوہو۔ پھر تو ڈسٹرب کر دیا میں نے..... اچھا واپسی کب ہو گی؟'' مینا نے پوچھا۔

''ہوٹل واپسی کا پوچھ رہی ہو تو رات ایک یا دو بج جائیں گے..... اور اگر لاہور واپسی کا تو پھر..... کل صبح نو بجے کی فلائٹ سے ٹکٹ بک ہے میری۔''

''پھر تو ایسا ہے میں آپ کا مزید وقت ضائع نہیں کروں گی کیونکہ یہ شو آپ کے لیے بہت اہم ہے..... البتہ فرصت ملی تو رات کو کال کرنے کی کوشش کروں گی..... ورنہ ایسا کیجیے گا کہ صبح ائرپورٹ سے سیدھا میری طرف آیئے گا۔''

''ارے واہ! جیسے آپ بلا رہی ہیں..... میرا تو جی چاہتا ہے کہ ابھی کے ابھی اڑ کے پہنچ جاؤں آپ کے پاس۔'' وہ ہنس کے بولا۔

''اس طرح کے ایڈونچر کی کوئی ضرورت نہیں..... آپ اپنے وقت پر ہی پہنچیں تو مہربانی ہو گی۔''

''یہ تم اچانک آپ آپ کر کے کیوں بات کرنے لگیں؟''

''ویسے ہی..... کبھی کبھی آپ کو عزت سے مخاطب کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔'' اس نے کہا تو تیمور ہنس پڑا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن..... کیا کوئی خاص پروگرام ہے؟'' تیمور نے پوچھا۔

''خاص پروگرام تو نہیں ہے..... لیکن خاص بات ضرور ہے۔''

''کون سی بات ہے؟'' اس نے بے اختیار پوچھا۔

''اس کے لیے لاہور آنا پڑے گا..... ہمارے پاس۔''

''تم جانتی ہو مجھے سسپنس بالکل نہیں برداشت ہوتا۔''

''مگر اب تو کرنا ہو گا۔'' اس نے صاف جواب دے دیا۔

''اچھا کوئی ہنٹ ہی دے دو..... اب نیند تو آنے سے رہی..... اسی بات کے متعلق سوچتا رہوں گا۔''

''ہنٹ..... ٹھیک ہے..... تو ہنٹ یہ ہے کہ یہ خاص بات..... ایک خاص سوال کے متعلق ہے..... اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتی..... اچھا خدا حافظ.....'' مینا نے تیزی سے کہہ کر کال کاٹ دی۔ تیمور بوکھلا کر ''ہیلو ہیلو'' ہی کرتا رہ گیا پھر اس نے ریسیور کو کریڈل پر جمایا اور سوچنے لگا..... وہ کون سی خاص بات ہے جو ایک خاص سوال کے متعلق ہے۔ بات تو بعد کی بات ہے پہلے یہ سوچنا چاہیے کہ وہ خاص سوال کیا ہے۔ یہی سوچتے سوچتے اچانک اس کے ذہن میں ایک بات آئی..... مینا نے ابھی جس لہجے میں اس سے بات کی تھی..... وہ لہجہ بھی بہت خاص تھا..... مینا کے لہجے میں ایسی اپنایت اس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ اس انداز پر سوچتے سوچتے وہ خاص سوال اس کے ذہن میں ابھر آیا اور وہ اتنا چونکا دینے والا تھا کہ تیمور بے اختیار اچھل پڑا۔ خاص سوال تو ایک ہی تھا..... جو اس نے مینا سے پوچھا تھا۔

''کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟''..... اور مینا نے کہا تھا کہ اس سوال کا جواب وہ سوچنے کے بعد دے گی اور یقیناً وہ اسی جواب کے متعلق کہہ رہی تھی اور جیسا اس کا انداز تھا..... جیسی اس کے لہجے میں خوشی تھی..... وہ جواب یقیناً ہاں میں تھا۔ اس گتھی کو سلجھاتے اور اپنے دلفریب اندازوں پر تیمور جھوم سا گیا لیکن اسی وقت اسے انٹرکام پر بتایا گیا کہ آرٹس کونسل جانے والے مہمان اس کے منتظر ہیں۔ وہ فوراً کمرے سے باہر آ گیا۔ اس کی واپسی رات دو بجے ہوئی۔ کامیاب شو..... داد کے تحائف کی خوشیاں لیکن سب سے بڑھ کر مینا کا شام کو آنے والا فون..... وہ بہت خوش تھا..... اس نے آتے ہی مینا کو کال کی لیکن یہ کال ریسیو نہیں کی گئی۔ وقفے وقفے سے اس نے تین چار بار کال کی لیکن فون ریسیو نہ ہوا۔ اس کے بعد

کا وقت تیمور نے جیسے کاٹا وہ وہی جانتا تھا۔ کئی بار اس نے ریسپشنسٹ کو فون کر کے اپنی فلائٹ کی کنفرمیشن کا پوچھا اور استدعا کی کہ کیا اس سے پہلے کی کوئی بکنگ ہو سکتی ہے لیکن اس کا جواب نفی میں ہی تھا صبح چھ بجے ہی اس نے چیک آؤٹ کیا اور ائرپورٹ پہنچ گیا۔ ایک ایک پل اس کے لیے صدیوں کے برابر تھا۔ اوپر سے فلائٹ بھی لیٹ ہو کر دس بجے روانہ ہوئی۔ لاہور ائرپورٹ سے وہ بھاگتے ہوئے باہر نکلا اور ٹیکسی پکڑ کر ماڈل ٹاؤن روانہ ہو گیا۔ راستے میں اس نے گلاب کے پھولوں کا گلدستہ بھی لیا۔ محبت کو پانے کے خیال نے ہی اس کے پورے وجود کو سرشار کر دیا تھا..... لیکن جب وہ مینا کے گھر پہنچا تو وہاں ایک ایسا منظر اس کا منتظر تھا جس کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

گھر سے باہر لوگوں کا رش لگا ہوا تھا اور گھر کے اندر پولیس کی نفری موجود تھی..... اور گھر کے اندر..... بیڈ روم میں مینا تھی..... خون سے لت پت..... ایک بے جان لاشے کی صورت میں..... بتانے والے نے بتایا کہ علی الصباح دودھ والے نے بیل دینے کے بعد خاموشی محسوس کرتے ہوئے گیٹ کو تھپتھپایا تو وہ کھلا ہوا ملا..... اور جب اس نے اندر جھانکا تو گیٹ کے اندر کی طرف زخمی چوکیدار بے ہوشی کی حالت میں رسیوں سے بندھا ہوا ملا۔ اس نے فوراً پڑوسیوں کے چوکیدار کو اطلاع کی جس نے پولیس کو بلوا لیا۔ پولیس نے ہی گھر کے اندر مینا کی لاش کو پہلی بار دیکھا۔ بادی النظر میں یہ ڈکیتی کی واردات لگتی تھی کیونکہ گھر کے کمروں خاص طور پر مینا کے بیڈ روم کی حالت ابتر تھی اور سامان بکھرا ہوا تھا..... لیکن حتمی رائے قائم نہیں کی جا سکتی تھی۔ مینا کا چوکیدار اب بھی اسپتال میں بے ہوش پڑا تھا۔ اس کے سر پر ضرب لگائی گئی تھی..... اور اس کی حالت بھی تشویشناک تھی۔ تیمور کے بارے میں جان کر پولیس نے اس کا بیان ریکارڈ کیا جو اس نے قدرے غائب دماغی کے ساتھ دیا۔

مینا کی لاش کو ضروری کارروائی کے بعد پوسٹ مارٹم کے لیے لے جایا گیا..... تو تیمور بھی وہاں سے نکل آیا۔ لڑکھڑاتے قدموں اور سردی خوفناک لہروں کو جسم میں محسوس کرتے ہوئے وہ ماڈل ٹاؤن پارک کی ایک بنچ پر آ بیٹھا۔ مینا کا خون میں لت پت وجود اس کی نظروں میں گھوم رہا تھا جسے اس نے سرخ جوڑے میں دیکھنے کا خواب دیکھا تھا، اسے حقیقت میں سرخ لہو کے ساتھ لت پت دیکھنا کسی عذاب..... سے کم نہ تھا۔ مینا آفندی کی اپنائیت بھری زندگی سے سرشار کل رات کی گفتگو اس کی سماعت میں گونج رہی تھی۔ سب جیسے ایک خواب کے مانند..... ایک خوفناک خواب کے مانند..... اسے لگ رہا تھا جیسے وہ ابھی اسلام آباد کے ہوٹل میں ہے۔ صبح ہونے کا انتظار کرتے ہوئے وہ غنودگی میں ڈوبا ایک خواب دیکھ رہا ہے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور یہ رونا بھی ایک بہت بڑی اذیت تھی کہ نہ مینا تھی جس کے ساتھ وہ اپنے آنسو بانٹ سکتا اور نہ ہی اس کا کوئی اپنا تھا جس کے کاندھے پر وہ سر رکھ لیتا..... ایسی تنہائی اس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔

وہ شام تک وہیں پارک میں اسی بنچ پر بیٹھا رہا۔ بالآخر رونے کی سکت ختم ہو گئی۔ غم بے شک اب بھی بھرپور تھا لیکن سوچ کے گھوڑے اب مینا کی موت سے آگے بڑھ کر کچھ اور باتوں کے رستوں پر دوڑنے لگے تھے۔ یہ کیسے ہوا..... وہ کون سنگدل لوگ تھے جنہوں نے ایسا کیا؟ اگر وہ محض ڈاکو تھے تو ان کے لیے مینا کے گھر میں نقدی، زیورات لوٹنے کے لیے کافی تھے..... مینا کو مارنے کی کیا ضرورت تھی..... لیکن ان سوالوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے سوچا کہ اسپتال جایا جائے جہاں زخمی چوکیدار شاید ہوش میں آ گیا ہو۔ یہی سوچ کر وہ اٹھا لیکن جیسے ہی وہ پارک سے باہر نکل کر فٹ پاتھ پر پیدل آگے بڑھنے لگا، فضا میں بریکوں کی چرچراہٹ گونجی۔ ایک سفید ویگن اس کے بالکل پاس آ کر رک گئی۔ اس نے حیرت سے گاڑی کی طرف دیکھا جس کا دروازہ کھلا اور دو آدمیوں نے باہر نکلتے ہی بجلی کی سی تیزی سے اسے تھام کر گاڑی کے اندر فرش پر پھینک دیا اور خود بھی اندر گھس آئے۔ گاڑی تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ تیمور نے چیخ مارتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی لیکن تبھی اس کی گردن پر کسی ٹھوس چیز کی زبردست ضرب پڑی اور وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہوتا چلا گیا۔

☆☆☆

شدید تکلیف کی لہر تھی جو پورے جسم میں عجیب سے انداز میں چکرا رہی تھی، خاص طور پر بازوؤں، ٹانگوں اور سر میں..... اس نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھولیں تو کئی لمحے تک ایک سیاہ دھند کے سوا کچھ نظر نہیں آیا..... اور جب نظر آنا شروع ہوا تو وہ ایک نامانوس منظر تھا..... جس میں کئی چیزیں اور چند انسان الٹے کھڑے نظر آئے۔ سیاہ دھندلا پردہ آنکھوں پر یلغار کیے جا رہا تھا اور درد کی لہر سے سر بھاری ہو رہا تھا۔ اس نے سر کو چند زور دار جھٹکوں سے ہلایا..... ذہن کا مطلع صاف ہوا تو بات سمجھ میں آ گئی۔ سامنے کا منظر الٹا نہیں وہ خود الٹا لٹکا ہوا تھا۔ اس نے سر

اٹھا کر اپنے پیروں کی طرف دیکھنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ جسم کا سارا خون سر اور منہ میں اتر آیا تھا اور وہ کسی پتھر کی طرح بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ درد کی شدت سے وہ کراہنے لگا۔ اسے ہوش میں آتا دیکھ کر کمرے میں کھڑے آدمیوں میں سے ایک کالا بھجنگ آدمی جس کا جسم کسی باڈی بلڈر کی طرح کسا ہوا تھا، چہرہ کلین شیو اور دونوں کانوں میں بالیاں تھیں..... آگے بڑھ کر اس کے پاس آیا اور اس کے سر کو بالوں سے پکڑ کر پوچھنے لگا۔

''بتاؤ..... کہاں ہے وہ؟''

''کون ہو تم..... کس کی بات کر رہے ہو؟'' اس نے تکلیف کی شدت کو ضبط کرتے ہوئے بہ مشکل پوچھا۔ جواب میں اس آدمی نے ایک زوردار گھونسا اس کے پیٹ میں جڑ دیا۔ یہ بالکل ایسے ہی تھا جیسے درد کے الاؤ میں کوئی پٹرول پھینک دے۔ پیٹ میں ایسی اینٹھن اٹھی کہ وہ چیخ بھی نہ سکا..... گویا حلق میں جیسے کوئی گولا سا پھنس کے رہ گیا ہو۔ اسے اپنی سانسیں بند ہوتی محسوس ہوئیں۔ زمین کی طرف لٹکے ہوئے اپنے بازوؤں کو ہلا کر اس نے جسم کو حرکت دینے کی کوشش کی۔ سانس بند ہوجانے کی وجہ سے اس کا جسم ماہی بے آب کی طرح تڑپ اٹھا۔ یہ ایسی اذیت تھی کہ چند لمحوں میں جیسے اس نے موت کی طویل کالی سرنگ دیکھ لی ہو..... مگر تبھی ایک جھٹکے کے ساتھ اس کے حلق سے منہ کے رستے قے کا فوارہ چھوٹا..... اور رکی ہوئی سانس بحال ہوتی چلی گئی۔ وہ لمبی لمبی سانسیں بھرتے ہوئے جیسے کمرے کی ساری آکسیجن اپنے اندر کھینچنے لگا۔ گھونسا مارنے والے نے اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ جڑا۔ اس تھپڑ کا اثر یہ ہوا کہ وہ اپنے حواس میں دوبارہ واپس آگیا..... اسی پہلے والی شدید تکلیف دہ صورت میں.....

''جو پوچھا ہے صرف وہی بتاؤ..... کہاں ہے وہ؟''..... آدمی نے غراتے ہوئے پوچھا۔

''کک..... کون..... کک..... کس کی بات کر رہے ہو؟'' تیمور نے کراہتے ہوئے پوچھا۔

''میں تیری یار کے پتے کے بارے میں پوچھ رہا ہوں..... کہاں ہے وہ الو کا پٹھا.....؟'' اس نے ایک تھپڑ جڑتے ہوئے پوچھا..... تیمور کے ہونٹ پھٹ گئے اور خون رسنے لگا۔

''میں..... میں نہیں جانتا..... میں کچھ نہیں جانتا.....'' وہ وحشت کے عالم میں بولا۔

کالے آدمی نے اس کی طرف دیکھا اور پھر مڑ کر پیچھے کھڑے ایک دوسرے آدمی کے ہاتھ سے بید کا موٹا ڈنڈا پکڑ لیا..... اور تیمور پر بے دریغ یوں برسانا شروع کیا جیسے وہ انسان نہ ہو..... الگنی پر پھیلایا گیا قالین کا ٹکڑا ہو جس میں سے دھول نکالنے کے لیے اس پر ڈنڈے برسائے جا رہے ہوں۔ کمرا تیمور کی کرب ناک چیخوں سے گونج اٹھا۔ ہوا میں الٹا لٹکا اس کا جسم تڑپ تڑپ کر جیسے ہر ضرب سے بچنے کی کوشش میں تھا لیکن وہاں کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ ٹانگوں، کمر اور بازوؤں پر وہ منحوس ڈنڈا جہاں پڑتا، ایک گہرا نیلا نشان اور درد کی خوفناک لہر پیدا کرتا جا رہا تھا۔ پھر اس کالے کا ہاتھ چوکا یا اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا کہ ڈنڈے کی ایک ضرب تیمور کی کھوپڑی سے ٹکرائی اور تیمور نے..... خود کو..... تاریکی کی گہری کھائی میں گرنے سے پہلے یہی محسوس کیا کہ اس کا سر پاش پاش ہوگیا ہے۔ اس کے بعد جیسے اس کا جسم ایک پرندے کے پر کے مانند بے انت خلا میں بے سمت تیرتا چلا گیا..... مگر یہ کیفیت بہت زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی۔ درد کی شدید لہریں اسے ایک بار پھر بے ہوشی سے باہر کھینچ لائیں۔ اب کی بار اس نے خود کو زمین پر گرا ہوا پایا۔ اس کا جسم اس کے اپنے ہی خون میں لت پت تھا اور کسی خزاں رسیدہ پتے کے مانند لرز رہا تھا۔ منہ میں بھی خون کا ذائقہ بھرا ہوا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے چکراتے ہوئے سر کو پکڑ کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن بری طرح کراہ کر رہ گیا۔ کالا بھجنگ آدمی اس کے سامنے پیروں کے بل بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر تیمور کے سر کے بال مٹھی میں پکڑ کر اسے بٹھایا اور اس کی اذیت سے دوچار آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

''تم چاہے جتنے بھی نرم و نازک کیوں نہ ہو..... مجھے تم پر ترس نہیں آتا..... لیکن پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ تم یہ بات جان لو کہ ابھی تک تم نے جتنی بھی تکلیف محسوس کی ہے، وہ صرف آغاز ہے..... اور جب میں باقاعدہ تشدد کروں گا تو تمہیں ابھی جو درد محسوس ہو رہا ہے، وہ سب سے بڑی راحت محسوس ہوگا۔'' اس کے سرد لہجے اور الفاظ کو سن کر تیمور کی آنکھوں میں خوف ابھر آیا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم کون ہو..... اور یہ بھی کہ تم اتنے نازک ہو کہ زیادہ تشدد برداشت کرنے سے پہلے مر جاؤ گے..... اس لیے میں ایک بار پھر پوچھ رہا ہوں..... وہ بچہ کہاں ہے؟''

''خدا..... کی..... قسم..... مجھے..... نہیں معلوم تم..... کس بچے..... کا پوچھ رہے ہو.....'' تیمور نے خوفزدہ انداز میں کہا۔

تیمور کی بات سن کر وہ اس کی طرف چند لمحے خاموشی سے دیکھتا رہا پھر نرمی سے بولا۔ ''میں مینا کے بچے کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ مینا آفندی کا بیٹا..... کہاں ہے وہ؟''

اس کے الفاظ میں ایسا دھما کا تھا کہ تیمور کو اپنی تکلیف جیسے بھول سی گئی۔ وہ بے اختیار لیکن لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''مم..... مینا..... مینا کا بچہ..... نن..... نہیں.....''

کالے بھجنگ آدمی نے الجھن بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ تیمور منہ کھولے حیرانی کی تصویر بنے سر کو نفی میں ہلاتا جا رہا تھا۔ ''مینا..... کا بیٹا..... یہ..... کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کا تو کوئی بیٹا نہیں ہے۔''

''تو تم اس کے بارے میں نہیں جانتے؟''..... اس کی بات پر تیمور نے بنا کچھ کہے نفی میں سر ہلا دیا۔ کالا بھجنگ آدمی کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اچانک اسے چھوڑ کر کھڑا ہو گیا..... اور تیزی سے کمرے کی دیوار پر لٹکے ٹیلیفون کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے ایک نمبر ڈائل کیا اور رابطہ ہو جانے پر بولا۔ ''جی سر! بندہ کلین ہے۔ اس کے پاس ٹارگٹ کے بارے میں کوئی معلومات نہیں۔ لگتا ہے اس سے بھی چھپایا گیا ہے۔ جی ہاں..... اس کے گھر کی تلاشی بھی لی جا چکی ہے۔ جی میرے خیال میں تو ہمیں اس عورت کو ہی تلاش کرنا چاہیے۔ ٹھیک ہے سر! اور اب اس کا کیا کرنا ہے؟'' وقفے وقفے سے بولتے ہوئے اور دوسری طرف سے آخری سوال کا جواب مل جانے کے بعد اس نے ریسیور رکھ دیا۔ اس دوران تیمور اپنے چکراتے ذہن میں گھومتے ہوئے اسی سوال کی الجھن میں ڈوبا ہوا تھا..... ''مینا کا بیٹا.....''

کالے بھجنگ آدمی نے اس کی طرف دیکھا اور اپنے آدمیوں سے بولا۔ ''اسے اس کے گھر کے آس پاس ہی کہیں پھینک آؤ۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

☆☆☆

چنبیلی اب اسے ''شہزادے'' کے نام سے ہی بلا رہی تھی۔ اس نے گھر میں موجود باقی نفوس کا تعارف بھی شہزادے سے کروایا۔ چھیناں باجی ان کی گرو تھی..... اس کے بعد خود چنبیلی تھی۔ چنبیلی طبیعت کی بڑی خوش مزاج اور تیز تھی۔ اس کے چلنے سے لے کر باتیں کرنے کے ہر انداز میں ایک پھرتی سی تھی۔ اس نے باقیوں کا تعارف بھی شہزادے سے شگفتہ انداز میں کرایا۔

''یہ جو اپنی وگ پکڑ کر ٹھیک کر رہی ہے، یہ نیلی ہے..... بڑی ہی نخریلی ہے قسمے..... پر اس جیسا ناچتا یہاں اور کوئی نہیں..... اس لیے خود بھی ناچتی ہے اور دوسروں کو بھی اپنی انگلیوں پر نچاتی ہے۔ وہ ادھر جو لوٹا لے کر اپنی ایڑیاں نوچ رہی ہے، وہ تمنا بیگم ہے۔ دن میں چھ بار پیر نہ دھوئے تو اسے چین نہیں آتا..... لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ صفائی پسند ہے۔ باہر سے جو گولا گنڈے اور شکر قندی کی ریڑھی والا گزرتا ہے وہاں سے ہر الم غلم ہڑپ کر جاتی ہے۔ وہ اوپر جو گیلے کپڑے منڈیر پر پھیلا رہی ہے وہ ستارہ ہے۔ گھر میں ہانڈی پکانے سے لے کر جھاڑو لگانے تک سب سے زیادہ کام وہی کرتی ہے..... اور ادھر دیکھو، وہ جو باہر والے دروازے کی چوکھٹ پر چپکے سے باہر گلی میں جھانک رہی ہے وہ بندیا ہے۔ اس کا دل گھر میں کم اور گلی میں جھانکی مارنے پر زیادہ لگتا ہے۔ اڑوس پڑوس بلکہ ارد گرد کی گلیوں کی سبھی خبریں یہ یونہی دروازے کی چوکھٹ پر لگی جمع کرتی ہے اور رات کو اس کا خبرنامہ ہم سب مل کر شوق سے سنتے ہیں۔ ہمارے علاوہ دو اور بندے تھے اس گھر میں، ایک ہمارے استاد جی جو ہارمونیم بجاتے تھے، دوسرا ان کا لڑکا جو ڈھولکی بجاتا تھا..... لیکن جب سے یہ موا سی ڈی پلیئر آیا..... دونوں یہاں سے چلے گئے۔ اب بس ہم چھ جانیں اس گھر میں رہتی ہیں..... چھ جانیں.....'' اس نے ایک آہ بھری اور مزید کہا۔

''چھ جانیں..... جن کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں..... بس جیسے ٹرین کے ڈبے کے مسافر ہوتے ہیں..... کوئی کہیں سے آیا، کوئی کہیں سے آیا..... پر سب کو جانا ایک طرف ہی ہے۔ اس لیے ساتھ ساتھ بیٹھے ہیں۔'' یہاں تک بات کر کے وہ خاموش ہوئی اور چند لمحے جیسے کسی سوچ میں کھوئی رہی..... پھر سر جھٹک کر بولی۔

''دیکھ میرے شہزادے! کتنا بولتی ہوں میں بھی..... تھوڑا سا تو بھی تو بول..... کچھ تو بتا اپنے بارے میں۔'' اس نے پچکارا۔

وہ سپاٹ انداز میں بولا۔ ''میں بھی اس طرف جانا چاہتا ہوں جدھر یہ ٹرین جا رہی ہے۔''

''نہ میرے شہزادے! جب تو ایسے بولتا ہے نا تو دل میں ہوک سی اٹھتی ہے۔ اتنی سی عمر میں اتنی اداسی ٹھیک نہیں ہوتی۔ تیرے تو ابھی ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں۔ پوری زندگی پڑی ہے۔ ہم جیسے بے مرادوں کے ساتھ رہنے کا خیال بھی نہ کر..... تیری دنیا الگ ہے، تجھے وہاں جانا ہی ہوگا۔ دیکھ ہمیں، ہم ترستے ہیں اس دنیا میں جانے کے لیے..... وہ دیکھ ادھر بندیا کو..... وہ چوکھٹ پر کھڑی گلی کا نظارہ نہیں کر رہی ہے۔ وہ تیری دنیا کے دروازے پر کھڑی اندر جانے کی اجازت مانگ رہی ہے..... اور ہم سب یہاں اس لیے نہیں

بیٹھے کہ ہم بندیا کی طرح تیری دنیا میں جانا نہیں چاہتے بلکہ اس لیے بیٹھے ہیں کہ جو بات بندیا سمجھ نہیں رہی، وہ ہماری سمجھ میں آگئی ہے۔ یہی کہ ہمیں اجازت نہیں ملے گی، پر تجھے تو اجازت کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ تو تیری اپنی دنیا ہے..... تیرے اپنے لوگ ہیں..... تیری زندگی وہاں ہے، یہاں کچھ بھی نہیں۔''

شہزادے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بس خاموشی سے سامنے دیکھتا رہا۔ تمنا بیگم اپنے پاؤں صاف کر کے اندر کمرے میں چلی گئی تھی۔ بندیا ابھی تک دروازے کی چوکھٹ سے لگی ہوئی تھی۔ نیلی نے وگ رکھ کے اب گھنگرو اٹھا لیے تھے اور انہیں صاف کر رہی تھی۔ ستارہ چھت سے اتر کر اب ان کے قریب بیٹھی ترکاری بناتے ہوئے ان کی باتیں سن رہی تھی۔

چنبیلی نے شہزادے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

'چل تجھے دوسرے کپڑے دیتی ہوں۔ اتار یہ عورتوں والے کپڑے۔ استاد جی کے لڑکے کے کچھ کپڑے پڑے ہیں ادھر..... وہ پہن لے۔''

''نہیں.....'' وہ سختی سے بولا۔ ''ابھی مجھے اسی میں رہنے دو۔''

''اتار دے سوہنے! یہ ویسے بھی تجھ پر پورے نہیں آرہے..... تیرے ماپ سے بڑے اور کھلے ہیں۔'' ستارہ نے بھی پچکارا۔

''دیکھ تو ستارہ! کوئی بات بھی نہیں مان رہا۔ پتا نہیں کس کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔'' چنبیلی نے کہا۔

''یہ کسی کے نہیں ہیں..... یہ میری ماں کے ہیں۔'' وہ پرانی اور بھسی ہوئی اینٹوں سے بنے ہوئے اس بوسیدہ سے مکان کے ٹیڑھے میڑھے در و دیوار کو تکتے ہوئے بولا تو ستارہ اور چنبیلی چونک گئیں۔

☆☆☆

تیمور کو گھر پہنچے تقریباً بہتر گھنٹے گزر چکے تھے..... سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ہونٹوں پر ٹانکے لگے ہوئے تھے..... اور جسم پر ابھرے نیل کے نشان پھوڑے کے مانند دکھ رہے تھے۔ سارا بدن بخار کی حدت سے دہک رہا تھا لیکن سب سے زیادہ تکلیف دہ وہ سوچیں تھیں جو گرداب کے مانند اس کے دماغ میں گھوم رہی تھیں۔ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے اس کے ساتھ یہ سلوک کیا..... اور وہ کس بچے کی بات کر رہے تھے؟ انہوں نے کہا تھا کہ مینا کا بچہ ہے..... لیکن مینا نے تو اسے کبھی نہیں بتایا تھا بلکہ وہ کئی بار مینا کے گھر جا چکا تھا۔ وہ اکیلی رہتی تھی۔ اس کے گھر میں کوئی بچہ نہ تھا پھر ایک خیال نے اسے بری طرح چونکا دیا۔ کہیں یہی لوگ تو مینا کے قاتل نہ تھے؟ وہ مضطرب ہو کر شدید تکلیف میں بھی بیڈ سے اتر کر کھڑا ہو گیا اور بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ اسے فوراً پولیس سے رابطہ کرنا چاہیے اور سب کچھ بتا دینا چاہیے..... مگر اسی وقت ٹیلیفون کی بیل بج اٹھی۔ حالیہ واقعات سے گزر جانے کے بعد وہ فطری طور پر گھنٹی کی اس آواز سے خوفزدہ ہو گیا۔ بیل وقفے وقفے سے مسلسل بج رہی تھی۔ اس نے ریسیور اٹھا لیا لیکن کچھ کہا نہیں۔ دوسری طرف سے چند لمحے خاموشی کے بعد ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

''ہیلو.....'' بولنے والی کا انداز بھی محتاط سا تھا۔

''ہیلو..... کون؟'' تیمور نے پوچھا۔

''آپ تیمور بات کر رہے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''جی۔''

''تیمور صاحب..... میں بڑی مشکل سے آپ کو کال کر رہی ہوں..... اور زیادہ بات نہیں کر سکتی..... اس لیے جو میں کہوں اسے پورے دھیان سے سنیے گا۔'' اس بار بولنے والی کا انداز تیز تھا۔

''میں سن رہا ہوں۔'' اس نے صرف اتنا ہی کہا۔

''پہلی بات یہ کہ آپ میرے حوالے سے مطمئن ہو جائیں اس لیے میں حوالے کے لیے مینا میڈم کا نام لے رہی ہوں..... دوسری بات آپ کے گھر کی نگرانی ہو رہی ہے۔ آپ ان لوگوں سے بچ کر کسی طرح میرے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ جائیں۔''

''لیکن.....'' تیمور نے کچھ کہنا چاہا مگر دوسری طرف سے اس کی بات کاٹ دی گئی۔

''یہ سوال جواب آپ ملنے پر پوچھ لیجیے گا۔ اس وقت سب سے ضروری بات یہی ہے کہ آپ کو آج اور ابھی، اسی وقت ہر حالت میں میرے پاس پہنچنا ہے۔ میرے پاس مینا کی امانت ہے جو آپ کے سپرد کرنی ہے۔ آپ پتا نوٹ کر لیں..... اور یہ بات دھیان میں رکھیں کہ آپ نے بالکل اکیلے آنا ہے۔'' یہ کہہ کر دوسری طرف سے ایک جگہ کا پتا بتا دیا گیا جس کے بعد کال کٹ گئی۔

تیمور نے ریسیور رکھنے کے بعد چند لمحے سوچا پھر اس نے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ مینا کا نام آنے کے بعد وہ ان ساری باتوں کو یکسر فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ گاڑی نکال کر جب وہ باہر نکلا تو باہر کی فضا معمول کے مطابق تھی لیکن گلبرگ سے لبرٹی پہنچنے تک وہ اپنے پیچھے ایک سفید ٹویوٹا

گاڑی کو تعاقب کرتے دیکھ چکا تھا۔ یہ یقیناً وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے اسے اغوا کر کے تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ لبرٹی مارکیٹ پہنچ کر اس نے گاڑی ایک ریستوران کی پارکنگ میں کھڑی کی اور خود اتر کر ریستوران کے اندر چلا گیا۔ تعاقب کرنے والوں کو اس نے اس بات کا اشارہ دیا تھا جیسے وہ کھانے کے لیے یہاں آیا ہو..... لیکن اس ریستوران کی ایک خوبی سے وہ فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ ریستوران کی یہ عمارت دو سڑکوں کے درمیان تھی اور دونوں طرف اس کے داخلی اور خارجی دروازے تھے۔ وہ عام سے انداز میں چلتا ہوا ایک طرف سے داخل ہوا اور دوسری طرف سے باہر دوسری سڑک پر نکل آیا۔ قسمت اس کے ساتھ تھی کہ باہر دروازے سے کچھ ہی فاصلے پر چند آٹو رکشا سواریوں کے منتظر کھڑے تھے۔ کلمہ چوک کی طرف بھاگتے ہوئے رکشے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر اس نے بڑے چوکنے انداز سے بیک ویو مرر سے اپنے پیچھے نظر جمائے رکھی..... لیکن اس بار کوئی اس کے تعاقب میں نہیں تھا۔ اس کے باوجود سمن آباد تک پہنچنے کے لیے اس نے مزید احتیاط سے کام لیا۔ فیروز پور روڈ پر ایک جگہ اس نے اس رکشے والے کو چھوڑ کر ایک دوسرے رکشے کو ہائر کیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سمن آباد کے ایک خستہ حال گھر کے سامنے تھا جس کا لکڑی کا دروازہ بوسیدہ ہو کر اتنا ڈھیلا ہو چکا تھا کہ اندر لگی کنڈی باہر سے ہاتھ اندر کر کے کھولی جا سکتی تھی۔ اس کی پہلی ہی دستک پر دروازے کے پیچھے حرکت ہوئی۔ کسی نے جھانک کر باہر دیکھا اور پھر دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھولنے والی خاتون نے چہرے کو ناک تک دوپٹے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں کافی مضطرب تھیں۔ تیمور کی طرف اس نے یوں دیکھا جیسے وہ اسے پہچانتی ہو۔ اس نے تیمور کو اندر بلایا اور پھر خود گلی میں جھانک کر یہ تسلی کی کہ کسی نے دیکھا تو نہیں اور دروازے کو اندر سے دوبارہ کنڈی لگا دی۔

تیمور بھربھری اینٹوں سے بنے مختصر سے صحن اور گھر کی خستہ عمارت کو ایک نظر دیکھنے کے بعد خاموش کھڑا تھا۔ خاتون نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور اسے ایک نیم تاریک کمرے میں لے گئی۔ یہاں بلب کی زرد نا کافی روشنی کمرے کے اندھیرے کے ساتھ جنگ لڑنے میں مصروف تھی۔ کمرا پہلے ہی مختصر سا تھا، اوپر سے یہاں ایک جستی پیٹی اور اس پر کافی سارا بے ترتیب سا سامان پڑا تھا۔ ایک طرف چارپائی بچھی تھی۔ اس نے تیمور کو چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود کمرے سے باہر نکل گئی۔ چند لمحوں بعد وہ واپس آئی۔ اب کی بار اس کا نقاب اترا ہوا تھا۔ وہ پینتیس چھتیس سال کی جوان عورت تھی لیکن مفلوک الحالی کی وجہ سے اپنی عمر سے تھوڑی بڑی نظر آ رہی تھی۔

''میں جانتی ہوں کہ آپ کے دل میں اس وقت کتنے سوال مچل رہے ہوں گے، لیکن ان سب سے پہلے میں چاہتی ہوں کہ آپ ایک بار یہ پڑھ لیں۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک خاکی کاغذ کا لفافہ تیمور کو تھما دیا۔ ''یہ مینا میڈم نے مجھے آپ کو دینے کے لیے دیا تھا۔ آپ یہ پڑھیے میں ابھی آتی ہوں۔'' وہ یہ کہہ کر دوبارہ باہر نکل گئی۔ تیمور نے بے تابی سے لفافہ چاک کیا۔ اندر سے ایک خط نکلا جو مینا نے اسے مخاطب کر کے لکھا تھا۔

''تیمور! اگر آپ یہ خط پڑھ رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں مر چکی ہوں گی..... کیونکہ موت کے سائے میں اپنے اتنے نزدیک محسوس کر رہی ہوں کہ مجھے یہ یقین بھی نہیں کہ اس خط کو ہاجرہ تک پہنچا بھی پاؤں گی یا نہیں۔ میں جانتی ہوں..... آپ اس وقت میرے بارے میں بہت سی حیرانیوں کا شکار ہوں گے۔ کاش کہ زندگی مجھے اتنی مہلت دیتی کہ میں خود آپ سے یہ باتیں کہہ سکتی اور میں نے ارادہ بھی کر لیا تھا..... مگر تب تک آپ اسلام آباد جا چکے تھے۔ ابھی میں نے تھوڑی دیر پہلے آپ کو فون کیا تھا اور اس بات کی تاکید کی تھی کہ آپ صبح لاہور پہنچتے ہی میرے گھر پہنچیے گا۔ مجھے یہ یقین تو ہے کہ آپ صبح ضرور پہنچیں گے لیکن یہ یقین نہیں کہ میں آپ کو زندہ ملوں گی بھی یا نہیں..... اور وہ جواب جو آپ کے سوال پر مجھ پر ادھار ہے، وہ دے بھی پاؤں گی یا نہیں..... اور وہ اپنا سب سے قیمتی راز جو میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں وہ بتا بھی پاؤں گی یا نہیں۔ چونکہ آپ اس وقت یہ خط پڑھ رہے ہیں تو یقیناً ان تمام سوالوں کا جواب نفی میں ہی ہوگا۔ تیمور! جب آپ نے مجھ سے محبت کا اظہار کیا تو وہ لمحہ میرے لیے بہت قیمتی تھا مگر میں چاہ کر بھی آپ کو اس کا کوئی بدل نہیں دے سکتی..... اور جب آپ نے مجھ سے شادی کی بات کی تو میں چاہ کر بھی اسی وقت ہاں نہیں کہہ سکتی تھی۔ کیسے کہتی..... کیونکہ میرے بارے میں ایسا بہت کچھ ہے جو آپ نہیں جانتے تھے اور جو میں کسی کو بتا نہیں سکتی تھی۔ آپ ہی نہیں ساری دنیا میرے بارے میں صرف اتنا ہی جانتی ہے کہ میں ایک طلاق یافتہ عورت ہوں مگر یہ کوئی نہیں جانتا کہ میری شادی کس سے ہوئی، کن حالات میں ہوئی اور طلاق کیسے ہوئی۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے جو میں لکھ کر نہیں بتا سکتی مگر ایک بات مجھے لکھ کر ہی بتانی ہے اور وہ

یہ کہ میرا ایک بیٹا بھی ہے۔ ہاں تیمور! میرا ایک بیٹا ہے، میں ایک ماں بھی ہوں لیکن میری بدنصیبی یہ ہے کہ وہ میرا بیٹا ہو کر بھی میرے پاس نہیں اور میں ایک ماں ہو کر بھی اسے پاس نہیں رکھ سکتی۔ اس کی وجہ آپ کو ہاجرہ بتائے گی۔ ہاجرہ وہی عورت ہے جو آپ کو یہ خط دے گی۔ اس خط میں آپ کے سوال کا جواب لکھنے کی کوشش کر رہی ہوں اور وہ جواب ہاں میں ہے۔ میں آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں لیکن یہ ادھورا سچ ہے..... اور ایک مرنے والے کو پورا سچ ضرور بولنا چاہیے۔ پورا سچ یہ ہے کہ شاید میں بہت خودغرض ہوں کیونکہ میں آپ سے شادی اس لیے نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ مجھے آپ سے ویسی محبت ہے جیسی آپ توقع کر رہے تھے۔ میں صرف اپنے بیٹے کو ایک مرد کا اور ایک باپ کا تحفظ دینا چاہتی تھی اور اب چونکہ ایسا ممکن نہیں..... تو میں اب صرف ایک گزارش کروں گی۔ اس محبت کے نام پر جو آپ کو مجھ سے تھی۔ ایک محبت جو ہمارے درمیان تکمیل کے مراحل میں تھی..... اس محبت کے نام پر۔ ایک گزارش کہ میرے بیٹے کو اپنا لیجیے گا..... اسے ایک باپ کا تحفظ دیجیے..... اس کی حفاظت کیجیے کیونکہ چند خونخوار بھیڑیے میری اور اس کی جان کے درپے ہیں۔ میں تو ان کا شکار ہو گئی، مجھے کوئی بچا نہیں سکا لیکن اسے آپ بچا سکتے ہیں اور اگر آپ کو لگے کہ آپ اس خطرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے تو مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں مگر پھر ایک دوسری گزارش یہ ہوگی کہ کسی طرح ہاجرہ اور میرے بیٹے کو اس شہر سے دور کسی محفوظ مقام تک پہنچا دیجیے گا۔ کاش کہ یہ خط آپ کو کبھی نہ ملے..... اور میں یہ باتیں آپ کے روبرو خود کہہ سکوں۔ کاش کہ میں زندہ رہوں اور آپ کی محبت کا جواب دے سکوں۔"

تیمور کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر کاغذ پر لکھے الفاظ کی سیاہی کو پھیلاتے جا رہے تھے۔ خط ختم ہو چکا تھا۔ اس نے آنکھیں صاف کر کے سامنے دیکھا۔ کمرے کے دروازے پر ہاجرہ اپنے کندھے سے لگائے ایک تین سالہ بچے کی پشت سہلا رہی تھی۔ بچہ سو رہا تھا۔ تیمور نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے بچے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور ہاجرہ سے لے کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ رکے ہوئے آنسو پھر سے بہہ نکلے۔

☆☆☆

جیسے بہت سارے دکھ ایک جیسے ہوتے ہیں ویسے ہی بہت ساری دکھ بھری کہانیاں بھی ایک جیسی ہوتی ہیں۔ مینا کی کہانی بھی ایسی ہی کہانی تھی جیسی کسی ڈرامے، کسی رسالے یا روزمرہ کے قصوں میں سننے کو مل جاتی ہے۔ بس جگہیں، نام اور مقام بدل جاتے ہیں۔ ایسی تمام کہانیوں کے غم ایک جیسے ہوتے ہیں۔ مینا پانچ سال کی تھی جب اس کے والدین کا انتقال ہو گیا۔ اسے اس کے چچا اور چچی نے پالا جن کی اپنی چار بیٹیاں تھیں اور بیٹا کوئی نہیں تھا۔ مینا ان کے لیے ایک بوجھ کے مانند تھی جس سے کسی کو کوئی پیار تو کجا ہمدردی بھی نہ تھی۔ چچا کی اسٹیشنری کی دکان تھی اور آمدنی کم خرچہ زیادہ والا معاملہ تھا۔ اوپر سے بیٹیوں کے متعلق یہ سوچیں کہ ان کو زیادہ پڑھانا لکھانا نہیں کیونکہ انہوں نے کون سا سدا اسی گھر میں رہنا ہے۔ تعلیم کے بجائے ان کی شادی پر پیسا خرچ کرنا زیادہ ضروری تھا..... مگر پھر بھی چچی نے اپنی بیٹیوں کو کم از کم میٹرک تک پڑھانے کی ٹھانی جس میں کچھ بھلا مینا کا بھی ہو گیا۔

چچا کو مینا سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ چچی کے لیے یہ لڑکی گھر کے کام کاج میں ملازمہ کا نعم البدل تھی اور ان کی بیٹیوں کے لیے مینا کا وجود ناقابلِ برداشت تھا کیونکہ اپنی ماں سے ملنے والے حسن کی بدولت اسے اس گھر کی تمام لڑکیوں میں وہی حیثیت حاصل تھی جو چاند کی ستاروں میں ہے۔ جب بھی یہ چاند نکلتا، ستاروں کی چمک ماند پڑ جاتی تھی اور جیسے جیسے اس کی عمر بڑھتی جا رہی تھی، اس چاند کی چمک بڑھتی جا رہی تھی۔ سولہواں سال تو ویسے بھی چودھویں کے چاند جیسا ہوتا ہے جو ایک پرسکون سمندر کو بھی زیروزبر کر دیتا ہے اور اگر یہ ایک حسین عورت کے روپ میں ہو تو اس کا جادو سر چڑھ کے بولتا ہے۔ مینا کو یہ تو پتا تھا کہ اس گھر میں وہ زیادہ سے زیادہ میٹرک تک تعلیم حاصل کر سکتی ہے اور پھر اس کی شادی کر دی جائے گی مگر شادی سے پہلے اسے چار بہنوں کی شادیاں بھگتانی ہوں گی لیکن وہ اس وقت حیران رہ گئی جب گھر کی چار لاڈلی بیٹیوں میں سے شہر کے رئیس کا رشتہ مینا کے لیے نہ صرف قبول کر لیا گیا بلکہ مینا کی حیثیت ایک دم سے اس گھر میں ایسا شاہانہ روپ اختیار کر گئی کہ چچا چچی سمیت چاروں بہنیں اس پر فدا ہوئی جا رہی تھیں..... اور وہ حیرت اور معصومیت کے اس مقام پر تھی جہاں اسے پہلے تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کایا پلٹ کیسے ہو گئی اور پھر اگر سمجھ میں آیا تو صرف اتنا کہ وہ کتنی ناسمجھ تھی جو ان پیار کرنے والے رشتوں سے متنفر ہوئے بیٹھی تھی۔

چچا چچی کو اپنی بیٹیوں سے زیادہ اس سے پیار تھا تبھی تو سلطان عالم جیسے شخص سے اس کی شادی کی بات طے کی گئی تھی۔ سلطان عالم ایک نوجوان سیاستدان تھا۔ اس کی پرسنالٹی شاندار تھی۔ باوجود اس کے کہ کوئی اس کی پرسنل

لائف سے واقف تھا اور نہ ہی اس نے ابھی تک سیاست میں کوئی کمال دکھایا تھا۔ صرف ایک چارمنگ پرسنالٹی ہونے کی وجہ سے میڈیا نے اسے کافی کوریج میں لے رکھا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ مینا کے لیے اس کا رشتہ کیسے آیا تھا۔ بس ایک دن چچا کو کچھ لوگ اپنے ساتھ لے کر گئے اور واپسی پر چچا نے کسی طلسماتی کہانی جیسا انکشاف کیا جس میں ایک غریب لڑکی کے لیے ایک شہزادے کا رشتہ آجاتا ہے۔ بقول چچا، سلطان عالم نے خود ان سے ملاقات کی اور چچا نے فوراً ہاں کردی۔ البتہ سلطان عالم نے تاکید کی تھی کہ اس شادی کے بارے میں زیادہ لوگوں کو علم نہ ہو..... بلکہ صرف ہمارے گھر کے علاوہ کسی اور کو علم نہ ہو کیونکہ سیاستدانوں کی ایسی خبروں کو میڈیا بہت غلط کوریج دیتا ہے۔ سلطان عالم نے یہ بھی کہا تھا کہ شادی کے بعد مناسب وقت پر وہ سب کے سامنے اس کا اعلان کردیں گے اور پھر ان ساری باتوں میں سے کچھ باتیں تو بالکل ایسی ہی ہوئیں جیسی چچا نے بتائی تھیں۔ ایک فارم ہاؤس میں رات کی تاریکیوں میں نہایت مخصوص لوگوں کے بیچ بڑی خاموشی سے مینا کا نکاح سلطان عالم سے کردیا گیا اور تقریب کے بعد مینا کو وہیں چھوڑ کر اس کے گھر والے واپس آگئے۔

وہ چاندنی رات تھی لیکن چاند سے بڑھ کر ایک نور جلۂ عروسی میں پھیلا ہوا تھا۔ کہکشاں سے تاریکی میں گھرا ہوا کمرا چمک رہا تھا۔ محبت کی نرم گرم ریشمی فضائیں پھیل رہی تھیں۔ مینا کو لگ رہا تھا جیسے وہ طلسماتی کہانیوں کا ایک کردار ہے۔ ایک شہزادی جسے اس کا شہزادہ حاصل کرلیتا ہے لیکن اس رات کا حسن جتنا شدید تھا اتنا ہی مختصر ثابت ہوا۔ صبح فجر کی نماز سے پہلے ہی سلطان عالم اسے خود سے جدا کر کے چلا گیا پھر اس کی واپسی تین دن بعد رات کی تاریکی میں ہی ہوئی..... اور ایک بار پھر صبح پو پھٹنے سے پہلے وہ چلا گیا۔ ایک ماہ میں وہ چار بار آیا اور تاریکیوں میں محبت کی شمع جلا کر واپس چلا گیا۔ یہ فارم ہاؤس مینا کے لیے کسی محل سے کم نہ تھا لیکن جلد ہی مینا کو یہ احساس ہونے لگا جیسے یہ محل ایک لگژری جیل کی طرح ہے جہاں دن کے اجالے میں نہ کوئی اس سے ملنے آتا ہے، نہ ہی اسے باہر جانے کی اجازت ہے۔ گھر میں چار ملازم ہمہ وقت اس کی خدمت کے لیے حاضر تھے لیکن زبان رکھتے ہوئے بھی سب گونگے تھے اور بولتا تو وہ رات کا راجا بھی بہت کم تھا۔ مگر پانچویں رات مینا نے اس کی زبان کھلوانے کا تہیہ کرلیا۔ قربت کی معراج پر محبتوں کی منزلیں طے کرنے کے بعد جب وہ آسمان سے زمین پر قدم رکھ چکے تھے تب مینا نے اس سے پوچھا۔

''آپ مجھے اپنے گھر کب لے کر جائیں گے.....؟''

اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے سلطان عالم کے ہاتھ رک گئے۔ اس نے مینا کی مخمور نظروں کی طرف دیکھا اور پھر وہ اس سے یوں دور ہٹ گیا جیسے مینا نے اسے ڈنک مار دیا ہو۔

''کیا ہوا.....؟'' مینا نے پوچھا۔

وہ گہرے سانس لیتا ہوا سرد نگاہوں سے مینا کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس کی نظریں مینا کے دماغ کو پڑھ رہی ہوں۔

''یہ مت کہنا کہ تمہارے گھر والوں نے تمہیں کانٹریکٹ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟'' وہ بولا۔

''کانٹریکٹ..... کون سا کانٹریکٹ؟'' مینا نے بے اختیار پوچھا تو سلطان عالم نے اپنا سر تھام لیا۔ مینا نے قریب آکر اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھنا چاہا تو اس نے بری طرح اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور پھر وہ پھرتی سے بیڈ پر سے کھڑا ہوگیا۔ اس نے اپنا شب خوابی کا گاؤن اتار کر وہی لباس پہنا جو وہ جاتے وقت پہنتا تھا۔

''کہاں جارہے ہیں آپ..... اور یہ کانٹریکٹ کیا ہے؟'' مینا نے سہمے ہوئے انداز میں پوچھا۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ کوئی بہت بڑی بات ہے جسے وہ نہیں جانتی۔ سلطان عالم نے اس کے کسی سوال کا جواب نہ دیا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا کمرے سے باہر نکلا..... باہر نکلتے ہی اس نے چلا کر اپنے خاص آدمی شاہ نواز کو آواز دی۔ مینا ننگے پاؤں ہی اس کے پیچھے نکل آئی۔ سلطان عالم سیڑھیاں اتر کر لاؤنج میں کھڑے شاہ نواز کے پاس کھڑا چیخ رہا تھا۔

''بکواس کرتے ہو تم اور وہ بڈھا..... اس نے کچھ نہیں بتایا اس لڑکی کو.....'' جواب میں شاہ نواز کچھ منمنایا۔

''شٹ اپ..... جسٹ شٹ اپ..... وہ تو بے وقوف تھا ہی تم نے کیوں اپنے کان بند کرلیے۔ تم جانتے نہیں یہ کس قدر حساس معاملہ ہے۔ میری ساری ریپوٹیشن تمہاری غلطی کی وجہ سے داؤ پر لگ سکتی ہے۔ بلواؤ اس بڈھے کو..... حرامزادہ پیسے ڈکار گیا مگر ایک کام ڈھنگ سے نہ کرسکا۔'' مینا اوپر کھڑی کانپ رہی تھی۔ سلطان عالم کا ایسا غصیلا روپ اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ شاہ نواز تیزی سے وہاں سے چلا گیا اور کچھ دیر بعد وہ اس بڈھے کو لے کر آگیا جس کے بارے میں سلطان عالم اس سے کہہ رہا تھا۔ وہ بڈھا مینا کا چچا تھا۔ اس کے بعد جو انکشاف ہوا، وہ بھول گئی تھی۔ پریوں اور شہزادیوں کی طلسماتی کہانیاں کاغذوں پر لکھی ہوتی ہیں، مفروضوں پر کھڑی ہوتی ہیں..... حقیقت کی دنیا میں سب

سے بڑا سچ وہ سفاکیت ہے جو کوئی مفروضہ نہیں تھا۔

سلطان عالم ایک شادی شدہ آدمی تھا۔ اس کی بیوی ایک معروف منسٹر کی بیٹی تھی اور وہ ایسا زینہ تھی جس پر چڑھ کر وہ سیاست کے مینار پر چڑھا بیٹھا تھا اور اب اسے حکومت کی منزل تک پہنچنا تھا۔ وہ بہت دبنگ خاتون تھی۔ اس کا باپ بڑا آدمی تھا اور شوہر ابھی بڑا آدمی بننے کے مراحل میں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سلطان عالم جیسا شخص بھی اس سے قدرے ڈر کر رہتا تھا۔ باوجود اس کے کہ ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی لیکن سلطان عالم کو دوسری شادی کی اجازت نہ تھی۔ اپنی بیوی اور طاقتور سسر کے خوف کی وجہ سے اس نے اپنی عیاش طبیعت کو سنبھالنے کے لیے ایک خفیہ راستہ نکالا تھا۔ وہ کم عمر لڑکیوں سے شادی کرتا..... اس شادی کو کانٹریکٹ کا نام دیا جاتا تھا۔ اس کانٹریکٹ کے مطابق اس کی منکوحہ صرف تب تک اس کے نکاح میں رہے گی جب تک اس کا دل اس سے نہیں بھر جاتا۔ اس دوران وہ سلطان عالم کے لیے کوئی بچہ پیدا نہیں کرے گی..... اور الگ ہو جانے کے بعد وہ یہ کلیم نہیں کرے گی کہ وہ سلطان عالم کی بیوی رہ چکی ہے۔ کیونکہ اس شادی کے تمام تر کاغذی ثبوت سلطان عالم کے سوا کسی کے پاس نہ ہوں گے..... اور اس کانٹریکٹ کے بدلے میں لڑکی کے گھر والوں کو طے شدہ پیسا ملتا تھا جو لاکھوں میں ہوتا..... اور لڑکی سے علیحدگی کے بعد اس لڑکی کو بھی سلطان عالم کی طرف سے کافی سارا پیسا اور تحفظ دیا جاتا تھا۔ جہاں یہ ساری باتیں کانٹریکٹ میں درج تھیں وہیں ایک اہم بات یہ بھی تھی کہ کسی بھی صورت میں کسی بھی قسم کی وعدہ خلافی کی سزا خلاف ورزی کرنے والے کو موت کی صورت میں ملے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام تر کانٹریکٹ کسی کاغذ پر لکھا نہیں جاتا تھا مگر ایک طاقتور اور کمزور کے بیچ کاغذی ثبوت کی اہمیت ہی کیا ہوتی ہے۔ ان ساری باتوں کے علاوہ یہ بات بھی لڑکی کے گھر والوں کو بتائی جاتی کہ اس سارے معاملے میں لڑکی کا رضامند ہونا ضروری ہے تاکہ کانٹریکٹ ختم ہونے کے بعد وہ شور شرابا کر کے کوئی مصیبت نہ کھڑی کر دے..... اور اب بات مینا کو سمجھ آ گئی تھی کہ گھر کی چار بیٹیوں کو چھوڑ کر اس رشتے کے لیے مینا کو کیوں منتخب کیا گیا تھا۔ وہ سکتے کے عالم میں یوں بیٹھی تھی جیسے اس کے جسم سے جان نکل گئی ہو۔ سامنے اس کا چچا، سلطان عالم کے پیروں میں گرا اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا..... اور سلطان عالم اسے گالیوں سے نوازتے ہوئے ٹھوکریں مار رہا تھا۔

یہ معاملہ چچا کی موت کی طرف جا رہا تھا اور پھر اس سے آگے..... اس سے آگے گھپ اندھیرا تھا۔ مینا نے اچانک ایک گہری سانس بھری بالکل ایسے جیسے کوئی پانی کے اندر کئی منٹوں تک سانس روکے رکھنے کے بعد سطح آب پر آ کر سانس لیتا ہے۔ اس نے زمین پر گرے زخمی چہرے کے ساتھ روتے ہوئے چچا کو زندگی کی بھیک مانگتے دیکھا اور پھر بولی۔

''میرے چچا کو جانے دیں..... میں آپ کی ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔''

سلطان عالم نے اس کی طرف غصے سے دیکھا اور پھر اس کا غصہ ایک حیرانی میں بدلتا چلا گیا۔ کچھ دیر مجسمے کی طرح بیٹھی مینا کو دیکھنے کے بعد اس نے چچا کو ایک اور ٹھوکر لگائی اور شاہ نواز سے بولا۔

''لے جاؤ اسے.....'' شاہ نواز چچا کو گریبان سے پکڑ کر دھکیلتا ہوا کمرے سے باہر لے گیا۔ سلطان عالم نے سگار سلگایا اور سامنے دیوار میں بنے بار ریک سے اپنے لیے شراب کا ایک پیگ بنا کر اپنا حلق تر کرنے کے بعد بولا۔

''لیکن میں اس معاملے میں مزید رسک نہیں لے سکتا.....''

''تو پھر مجھے طلاق دے دیں.....'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ اپنے لہجے کو سپاٹ رکھنے کے لیے اس نے اپنے اندر جس طوفان کو دبایا تھا اسے صرف وہی جانتی تھی۔

''میں کیسے مان لوں کہ تم میرے لیے کوئی خطرہ نہیں بنو گی؟'' وہ بولا۔

''تب مجھے قتل کر دیں۔'' مینا کی بات پر وہ بری طرح چونک گیا۔ کتنی ہی دیر تک وہ مینا کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا پھر بولا۔

''ٹھیک ہے.....'' اور یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے بعد مینا نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ صرف فون پر اس سے بات کی۔ ایک بار تب..... جب سلطان نے اسے اس کے مستقبل کا فیصلہ خود طے کرنے کا آپشن دیتے ہوئے کہا کہ اگر میں تمہیں چھوڑ دوں تو کیا کرو گی؟

مینا نے صاف صاف اس سے کہہ دیا۔ ''میں اپنے چچا کے پاس نہیں جاؤں گی۔ مجھے ایک الگ گھر چاہیے..... اور ڈھیر سارا پیسا..... میں اکیلی رہوں گی اور اپنی تعلیم مکمل کروں گی۔''

حیران کن طور پر سلطان عالم نے اس کی باتیں مان لیں۔ ماڈل ٹاؤن میں ایک گھر اسے دے دیا گیا اور ڈھیر سارا پیسا بھی..... وہ جانتی تھی کہ اب خود کو سمجھانا اور سنبھالنا دونوں ناممکن ہیں۔ جو حادثہ ہونا تھا وہ ہو گیا، اب اسے ایک نئی زندگی شروع کرنی ہے جس میں ماضی کی کسی تلخ یاد کا شائبہ نہ ہو اور اس کے لیے اس نے شراب سے بڑھ کر کسی کو اپنا رفیق نہ پایا جو یادوں کی تلخیوں کو تیز ہوا میں بادلوں کی

طرح یوں بکھیر دیتی کہ وہ بارش نہیں برسا سکتے تھے۔

گھر میں چوکیدار کے علاوہ شکیلہ خالہ باورچی خانہ سنبھالتی تھیں اور اس کی بیٹی ہاجرہ گھر کے باقی کام کرتی تھی۔ مینا نے ایف اے میں داخلہ لے کر اپنی تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا۔ چند دن تک اسے اپنے گرد تعاقب کرتے کچھ سائے سے محسوس ہوتے رہے لیکن بس کچھ دن ہی..... اس کے بعد سلطان عالم کی طرف سے وہ جیسے مکمل آزاد ہو گئی تھی اور سلطان عالم اس کے ماضی کا وہ قصہ بن چکا تھا جسے وہ یاد بھی نہیں کرنا چاہتی تھی..... مگر یہ اس کی خام خیالی تھی۔ کبھی کبھی ماضی، حال میں ایسے بیج بو دیتا ہے جو مستقبل میں تناور درخت بن کے اگتے ہیں۔ سلطان عالم نے بھی ایک بیج بو دیا تھا جو مینا کے وجود میں ایک نیا وجود بن کے پھوٹ رہا تھا..... اور جب اس کی خبر مینا کو ہوئی تو اسے سمجھ نہیں آئی کہ اسے دھاڑیں مار کر رونا چاہیے یا خوش ہونا چاہیے..... مگر ان دونوں کیفیات پر غلبہ ایک خوف نے پالیا۔

یہ سلطان عالم کا بچہ تھا..... جس نے ریپوٹیشن کی وجہ سے ایک ماہ کا نکاح اور اس کے سارے ثبوت ختم کر دیے تھے ..... وہ سلطان عالم اس جیتے جاگتے ثبوت کے ساتھ کیا کرے گا؟ اس نے فوراً سوچا، اسے اس بچے کو جنم نہیں دینا..... مگر اس خیال کی عمر چند لمحے ہی تھی۔ اب اس کے اندر ایک عورت کا وجود ایک ماں کے وجود میں ڈھل رہا تھا..... اور کوئی ماں اپنے بچے کے بارے میں ایسا نہیں سوچ سکتی تھی۔ اس نے خود کو بتایا یہ سلطان عالم کا نہیں..... مینا کا بچہ ہے۔ اسے دنیا میں آنا ہوگا، زندہ رہنا ہوگا۔ اپنی ماں کا سہارا بننا ہوگا..... اور ایک طاقتور مستقبل کے تصور کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے اس نے پہلا قدم اٹھالیا۔ بچے کا جنم سمن آباد میں شکیلہ خالہ کے گھر میں ہوا اور چند دن اسی گھر میں رہنے کے بعد وہ بچہ ہاجرہ کا بچہ بن کر ماڈل ٹاؤن میں آ گیا جہاں کسی کو کیا پتا کہ ہاجرہ کی شادی ہوئی بھی ہے یا نہیں۔ بچے کا نام حماد سلطان رکھا گیا..... جس کے والد سلطان عالم کا بھی کوئی ڈیٹا موجود نہیں تھا۔ بس یہ کہ وہ مر چکا تھا۔ مینا نے دوبارہ سے اپنی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ ایف اے کے بعد اس نے فائن آرٹ میں داخلہ لے لیا اور اس کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی سوائے اس کے کہ اس کی ایک کلاس فیلو نے اپنے ساتھ اس کا ایڈمیشن بھی کروا دیا تھا۔ پرفارمنگ آرٹ کے شعبے میں خاطر خواہ کامیابی کے بعد اس نے اسی راستے کو اپنا پروفیشن بنانے کی ٹھان لی۔ اسی پروفیشن میں اس کی ملاقات کئی لوگوں سے ہوئی جن سے مل کر اس نے سوچا کہ اسے شادی کر لینی چاہیے تاکہ وہ اپنا اور حماد کا مستقبل مزید محفوظ بنا سکے مگر اب اس کے لیے کسی پر بھروسا کرنا آسان نہیں تھا۔

کم عمری کے سنگین تجربے کے بعد وہ اور کچھ نہیں تو کم از کم آدمیوں کو پرکھنے کا ہنر جان چکی تھی۔ مسکراتے لبوں کی زہر خیزیاں ..... محبت بھری آنکھوں کے پیچھے چھپی ہوئی ہوس..... شخصیت کے فسوں کی آڑ میں لڑکھڑاتا ہوا کردار..... وہ سمجھ لیتی تھی کہ باہر سے دکھنے والا اندر سے کیسا ہے۔ حتیٰ کہ وہ تیمور سے ملی اور اس نے اپنے روبرو ایک ایسے شخص کو دیکھا جو سرتاپا، ظاہر و باطن، مخلص اور وفادار ثابت ہو سکتا تھا لیکن اس کے باوجود جب تیمور نے اسے پروپوز کیا تو وہ اسے فوراً جواب نہ دے سکی۔ اس نے سوچا کہ وہ تیمور کو اپنی زندگی میں شامل کرنے سے پہلے اسے تمام تر حقیقت سے آگاہ کر دے گی لیکن اسی دوران ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس نے اس کی تمام تر امیدوں پر پانی پھیرتے ہوئے وہ خوف اس کی زندگی میں واپس لا کھڑا کیا جسے وہ فراموش کر بیٹھی تھی۔ سلطان عالم کا خاص آدمی..شاہ نواز..... اچانک ہی اس کے سامنے آ گیا جب وہ شاپنگ سینٹر میں ہاجرہ اور حماد کے ساتھ شاپنگ کر رہی تھی۔ شاہ نواز شاید کچھ دیر سے ان کے پیچھے تھا پھر وہ اچانک ہی ان کے سامنے آ گیا۔ وہ بڑے غور سے حماد کو دیکھ رہا تھا جو ہاجرہ کی بانہوں سے خود کو چھڑا کر مینا کے پاس جانے کی ناکام کوششوں میں مصروف رہا تھا۔ مینا شاہ نواز کو اپنے سامنے دیکھ کر بت سی بنی رہ گئی۔

''یہ بچہ کون ہے.....؟'' شاہ نواز نے وہی سوال پوچھا جس کے نہ پوچھنے کے بارے میں مینا کا روم روم دعا مانگ رہا تھا۔

''یہ..... یہ ہاجرہ کا بیٹا ہے۔'' مینا نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

جواب سن کر بھی شاہ نواز نے اپنی نظریں حماد پر سے نہیں ہٹائیں..... جو مینا کی طرف لپک رہا تھا۔

''کیوں..... تم کیوں پوچھ رہے ہو؟'' مینا نے کہا۔

''ویسے ہی..... ایک خیال آ گیا تھا۔''

''کک..... کیسا خیال.....؟''

''یہی کہ ایک ملازمہ کا بچہ ہو کر اتنے قیمتی کپڑے پہنے ہوئے ہے۔''

''یہ..... ہاجرہ کا بیٹا ہے..... میرے بیٹے کی طرح ہے۔ اس کا سارا خرچ میں اٹھاتی ہوں اور میں ایسا کر سکتی

ہوں۔'' مینا نے مضبوط لہجے میں کہا۔ شاہ نواز نے اس کی طرف دیکھا اور پھر وہاں سے چلا گیا۔ اس کے دور جاتے ہی مینا کو اپنے پیروں پر کھڑے رہنا مشکل ہو گیا۔ اگر اس نے سلطان عالم کو اس بارے میں بتا دیا تو کیا ہو گا؟ یہ بات ہی اس کا دل دہلائے جا رہی تھی۔ گھر پہنچتے ہی اس نے خود کو کمرے میں بند کر لیا اور خوب سوچ بچار کے بعد اور تمام تر امکانات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نے کچھ فیصلے کیے..... سب سے پہلے اس نے تیمور کو کال کی مگر اس کی طرف سے جواب نہیں ملا تو اسے یاد آیا کہ تیمور نے تو اسلام آباد جانا تھا پھر اس نے تیمور کو اسلام آباد کال کی۔ اس کا ارادہ فون پر ہی تیمور کو سب کچھ بتا دینے کا تھا مگر وہ ایسا کر نہیں پائی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے شو پر جانے کی تیاری کر رہا ہے تو اس نے اسے اپنی پریشانیوں سے کچھ دیر اور دور رکھنے کا فیصلہ کیا۔ خود کو سنبھال کر اپنے لہجے کو خوشگوار بناتے ہوئے اس نے تیمور سے باتیں کیں اور اسے صبح گھر آنے کی دعوت دی۔ اس فون کے بعد بھی اسے قرار نہیں آیا۔ ایک بے چینی نے اسے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا جو کسی طرح کم نہیں ہو رہی تھی پھر اس نے تیمور کے نام ایک خط لکھا اور اس خط کو حماد سمیت ہاجرہ کے سپرد کر دیا اور ہاجرہ کو تمام تر ضروری باتیں بتانے کے بعد کہا کہ وہ حماد کو لے کر سمن آباد چلی جائے اور مینا کے بارے میں کوئی خبر سنے تو تیمور سے رابطہ کرے۔ اس نے تیمور کا فون نمبر بھی اسے دے دیا تھا۔ ہاجرہ کی ماں شکیلہ کافی دنوں سے گاؤں گئی ہوئی تھی۔ ہاجرہ ان حالات میں مینا کو اکیلا چھوڑنے پر تیار نہ تھی مگر اسے اپنی مالکن کی بات ماننا پڑی۔ وہ حماد کو لے کر سمن آباد آ گئی..... جہاں اگلی صبح اسے یہ روح فرسا خبر سننے کو ملی کہ مینا کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اس نے رات ہونے کا انتظار کیا پھر اس نے گھر سے دور ایک پی سی او سے تیمور کا نمبر ملایا لیکن کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ اس نے وقفے وقفے سے کئی بار فون کیے، بالآخر ایک فون پر تیمور سے بات ہو گئی اور وہ اس کے کہنے پر یہاں اس کے گھر چلا آیا۔

☆☆☆

اس سے اس کے متعلق کوئی بھی بات اگلوانے میں وہ ناکام رہے تھے۔ اس کے علاوہ بھی اب تک اس نے ان کی صرف ایک ہی بات مانی تھی کہ اپنے جسم پر پہنا ہوا وہ ڈھیلا سا زنانہ لباس اتار دیا تھا لیکن بدلے میں اس نے چنبیلی کا دیا ہوا ایک اور لان کے ہلکے رنگوں کا پرانا لیکن صاف زنانہ لباس ہی پہنا تھا جو پہلے والے کی نسبت اس کے ماپ کے برابر تھا۔ وہ اب بھی سپاٹ چہرے کے ساتھ گم صم کی سی کیفیت میں تھا۔ رات کو چھیناں باجی کے کمرے میں ہی سوتا اور صبح سارا دن باہر برآمدے میں بیٹھا رہتا۔ البتہ اب اس نے کئی کام بنا کسی کے کہے اپنے ذمے لے لیے تھے۔ ستارہ کے ساتھ بیٹھ کر سبزی کاٹنے میں مدد کرنے لگتا..... باتھ روم میں پانی کی بالٹی بھر کے رکھتا..... چھیناں باجی کے کمرے کی ساری صفائی روز خود ہی کرتا اور رات کو دیر تک ان کے پاؤں بھی دباتا۔ چھیناں عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے زیادہ تر اپنے کمرے میں چارپائی پر ہی لیٹی رہتی۔ اس کے قریب میز پر اس کی ڈھیر ساری دواؤں کی شیشیاں پڑی رہتیں۔ اسے دمے کی شکایت تھی مگر اس کے باوجود تمباکو والے پان وہ تواتر سے کھاتی۔ شہزادے نے پان بنانا بھی سیکھ لیا۔ چار دن ہو چکے تھے۔ وہ سبھی اس کم روشنیوں والے گھر میں سایوں کی طرح رہتے تھے۔ صرف ایک رات چنبیلی نے کمرے میں رکھا سی ڈی پلیئر آن کیا جس پر سبھی نے رقص کے خوب جوہر دکھائے۔ چھیناں بھی وہاں آ گئی اور شہزادہ ان کے پاس خاموش بیٹھا ان خواجہ سراؤں کو دیکھتا رہا جو موسیقی کی تال پر بے ڈھنگے انداز میں رقص کرتے ہوئے بہت خوش نظر آ رہے تھے اور تبھی اچانک جیسے کوئی بند ٹوٹ گیا ہو..... سیلاب کی طرح اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور دھیرے دھیرے اس کے رونے کی آواز بڑھتے بڑھتے چیخوں کی صورت اختیار کر گئی۔ بندیا نے میوزک بند کر دیا۔ چنبیلی نے اسے پکڑنا چاہا تو وہ خود کو چھڑا کر اپنے گھٹنوں میں سر دیے اور سمٹ گیا۔ وہ روتا رہا..... چیختا رہا..... اور اس کی چیخوں میں ایک ہی جملہ سنائی دے رہا تھا۔ ''مجھے نفرت ہے آپ سے..... مجھے نفرت ہے آپ سے۔''

زرد بلب کی سنہری روشنی میں وہ چھ خواجہ سرا اس چھوٹے سے لڑکے کو یوں دھاڑیں مارتے بے بسی سے دیکھے جا رہے تھے اور انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کریں تو کیا کریں۔

بیس پچیس منٹ بعد اس کا رونا دھیما ہوتا گیا۔ وہ شاید تھک چکا تھا اور پھر ہچکیاں لیتا ہوا جہاں بیٹھا تھا وہیں لیٹ گیا۔ چھیناں اور چنبیلی نے باری باری اسے پچکارا لیکن وہ جب بھی اسے ہاتھ لگاتیں وہ انہیں جھٹک دیتا..... حتیٰ کہ ایسا کرتے کرتے وہ سو گیا۔

''آئے ہائے باجی! یہ کیا چیز ہے؟'' تمنا نے اسے بے سدھ ہوتا دیکھ کر کہا۔

''باجی! مجھے تو اس سے ڈر لگنے لگا ہے۔ پتا نہیں کب کیا کر دے۔ اس کا کوئی اتا پتا کرواؤ باجی..... اللہ معاف

کرے کہیں اسے کچھ ہو گیا تو مدعا ہم پر نہ پڑ جائے۔'' نیلی نے کہا۔

''تو ذرا اپنی کالی زبان منہ میں بند نہیں رکھ سکتی۔'' چنبیلی نے جھنجلا کر کہا اور پھر چھیناں سے بولی۔ ''باجی! میں نے تو پوری کوشش کر لی، پر اس نے کچھ نہیں بتایا۔ میرے خیال میں ہمیں اب حاجی صاحب سے بات کرنی چاہیے۔ اڑوس پڑوس کو پتا چل گیا تو ہماری کس نے سننی ہے۔ پہلے ہی مکان بدل بدل کر تھک گئے ہیں۔ اب جا کے یہ ایک جگہ سکون کی ملی ہے..... کہیں یہاں سے بھی نکال نہ دیے جائیں..... اور پھر..... پھر بات صرف ہماری تھوڑی ہے۔ اس کا بھی اسی میں فائدہ ہے کہ یہ یہاں نہ رہے۔'' چنبیلی نے افسردہ سے لہجے میں کہا۔

''پہلے تو ایک کام کر دے ری..... اسے اٹھا اور اندر چارپائی پر لٹا آ..... اس کے بارے میں اب کچھ سوچنا ہی پڑے گا۔'' چھیناں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

چنبیلی اسے چھیناں کے کمرے میں لٹا کر واپس آئی تو چھیناں نے کہا۔ ''حاجی صاحب سے بات کرنے کا ابھی کوئی فائدہ نہیں۔ مجھے تو یہ کوئی اور ہی معاملہ لگتا ہے۔ اس کے درد میں ایک غصہ چھپا ہوا ہے پر..... جب اس کا کوئی ہے ہی نہیں تو یہ غصہ کیسا..... مجھے لگتا ہے کچھ دن بعد جب اس کا غصہ کم ہو گا تو پھر بتائے گا اپنے بارے میں۔ پھر دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے اس کا۔'' چنبیلی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

بندیا نے سنجیدگی کا ماحول ختم کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں رے باجی! میں تو بتانا بھول ہی گئی..... ملک صاحب کے ہاں رب نے خوشی دکھائی ہے۔ نو سالوں بعد اب جا کے بیٹا ہوا ہے۔ صبح ان کی طرف جانا ہے اور ایک بات میں بتا دوں صاف صاف، یہ چنبیلی باجی نے پچھلی دفعہ جو کیا وہ اس بار نہ ہو گا۔''

''چل بی نامرادے! میں نے پچھلی بار کیا کر دیا ایسا؟'' چنبیلی نے فوراً کہا۔

''کیوں..... بھول گئی ہو یا جان بوجھ کر پوچھ رہی ہو۔ چھیناں باجی! آپ کو تو یاد ہو گا نا..... پچھلی دفعہ وہ ہری کوٹھی والوں کے ہاں جب ہم مبارکباد دینے گئے تھے تو وہاں کیا ہوا تھا۔ چنبیلی باجی نے تین سو روپے پکڑے اور سب واپس آ گئے۔ قسم سے تھوڑی دیر رکتے تو سہی پانچ سو روپے پورے دے دینے تھے انہوں نے۔'' تمنا نے یاد کروایا۔

''اری جا..... پانچ سو روپے نہیں پانچ سو جوتے مارنے تھے انہوں نے۔ وہ تین سو روپے بھی بہت تھے۔ تم نے دیکھا نہیں کیسے غصے سے لال بھبوکا ہو رہے تھے۔ بس اتنے ہی ملنے تھے جو مل گئے۔ میں تو چھیناں باجی سچی میں کہتی ہوں..... پیسے وہی لو جو بندہ اپنی خوشی سے دے۔ خوامخواہ ایویں کسی کے سر پر سوار ہو کر سود و سوز یاد وہ نکلوانے والوں کو دفع دور کرو۔'' چنبیلی ہاتھ نچاتے ہوئے نخوت سے بولی۔

''بس اب کوئی نہ بولے..... کل کو مبارکباد دوں گی بھی میں اور لوں گی بھی میں..... دیکھتی ہوں ملک صاحب کیسے ہزار سے کم دیتے ہیں..... اور ملکانی سے تو میں نے نیا سوٹ بھی لینا ہے۔ تھوڑے دن پہلے ہی تو گلی میں ملی تھی۔ میں نے بیٹے کی دعا تھی تو انہوں نے خود کہا تھا کہ بندیا تیری دعا قبول ہو گئی تو نیا سوٹ دوں گی۔'' بندیا نے کہا۔

''ٹھیک ہے سوٹ تیرا لیکن پھر پیسوں میں سے تجھے کچھ نہیں ملے گا۔ یہ میں پہلے ہی بتا رہی ہوں تجھے۔'' چنبیلی نے کہا۔

اس سے پہلے کہ بندیا احتجاج کرتی چھیناں اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے اٹھتا دیکھ کر سب خاموش ہو گئے۔

☆☆☆

ننھی سی جان، معصوم چہرہ لیے زندگی کی سفاکیت اور جان کے خطروں سے بے نیاز حماد..... تیمور کی بانہوں میں سو رہا تھا۔ اس کے چہرے میں مینا کی اس قدر مشابہت تھی کہ تیمور کو لگ ہا تھا جیسے مینا ایک ننھے سے وجود میں تبدیل ہو کر اس کی بانہوں میں آ گئی ہو۔ ہاجرہ نے مینا کی ساری کہانی اس کے گوش گزار کر دی تھی۔ سارے معاملات صاف ہو چکے تھے لیکن اتنا ہی اس خطرے کا احساس بڑھ گیا تھا جو پہلے شاید تیمور کے لاشعور میں کسی کم سطح پر موجود تھا۔ اسے ماڈل ٹاؤن سے اغوا کرنے والے اس سے اسی بچے کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ وہ ایک بار پھر مینا کی زندگی میں داخل ہو گئے تھے، انہیں تیمور کا بھی پتا چل گیا ہو گا مگر شاید وہ ہاجرہ کے اس گھر سے آگاہ نہ تھے لیکن آگاہ ہونے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ اب تک بے خبر ہی ہوں۔ اس خیال کے آتے ہی اسے درد سے بھرے ہوئے بدن کے ساتھ نیم بے ہوشی کی حالت میں اس کالے بھجنگ آدمی کا فون پر کہا وہ فقرہ بھی یاد آ گیا جو اس نے کہا تھا۔ ''میرے خیال میں ہمیں اس عورت کو تلاش کرنا چاہیے۔'' کہیں وہ ہاجرہ کی ہی بات نہ کر رہے ہوں؟

تیمور اٹھ کھڑا ہوا۔ ''ہاجرہ! فوراً چلو یہاں سے..... یہ جگہ محفوظ نہیں ہے۔''

اور اس سے پہلے کہ ہاجرہ کچھ کہتی، باہر دروازے پر

ہونے والی دستک ان کے اعصاب پر کسی بم کی طرح پھوٹی۔

''کک..... کون ہوسکتا ہے؟'' تیمور نے پوچھا۔

''میں نہیں جانتی..... اس وقت یہاں کوئی نہیں آسکتا۔ اماں تو گاؤں گئی ہیں اوکاڑے کے پاس۔'' ہاجرہ نے خوفزدہ انداز میں کہا..... دستک دوبارہ ہوئی۔ اس بار انداز زوردار تھا۔

''یہاں سے نکلنے کا کوئی اور راستہ ہے؟'' تیمور نے تیزی سے پوچھا۔

''چھت..... چھت پر سے ساتھ والے گھر میں نکل سکتے ہیں۔''

''تو چلو.....'' تیمور یہ کہتا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔ صحن میں چھت کی طرف جاتی سیڑھیاں وہ گھر میں داخل ہوتے وقت دیکھ چکا تھا۔ جب وہ سیڑھیوں کی طرف بھاگ رہے تھے، صحن کے ڈھیلے دروازے کی درزوں سے شاید انہیں دیکھ لیا گیا تھا۔ کسی نے باہر سے چلا کر کہا۔

''وہ اندر ہیں.....'' اس کے ساتھ ہی دروازے پر زوردار ضربیں پڑنے لگیں۔ ابھی وہ آدھی سیڑھیوں پر تھے جب دروازہ ٹوٹ گیا۔

''رک جاؤ.....'' کوئی چلایا۔ تیمور نے دو دو سیڑھیاں پھلانگیں اور اوپر پہنچ گیا۔ عین اسی وقت فضا میں گولی چلنے کا زوردار دھماکا ہوا اور ہاجرہ کی دل دوز چیخ بلند ہوئی۔ تیمور نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ہاجرہ کا جسم سیڑھیوں کے دائیں طرف خلا میں صحن کے فرش کی جانب گر رہا تھا اور تین آدمی سیڑھیوں کی طرف بھاگتے ہوئے آرہے تھے۔ تیمور کے ہاتھوں میں نیند سے جاگا حماد بری طرح کسمساتے ہوئے رونے لگا۔ تیمور نے اسے یوں تھاما جیسے متاعِ جان کو تھام رکھا ہو۔ وہ پوری جان سے بھاگا۔ مختصر سی چھت ساتھ والے گھر کی چھت سے ملی ہوئی تھی اور یہی نہیں، یہاں دور تک گھروں کی چھتیں چھوٹی چھوٹی منڈیروں کی باؤنڈریوں کے ساتھ ملی ہوئی تھیں لیکن ان خستہ حال پرانے گھروں کی چھت پر دوڑنا آسان نہیں تھا۔ وہ تاروں اور رسیوں سے نیچے سے جھکتا ہوا اور رکاوٹوں کو پھلانگتا ہوا بھاگے جارہا تھا..... اور پیچھے تین موت کے ہرکارے ہاتھوں میں اسلحہ تھامے بھاگتے چلے آرہے تھے۔ انہوں نے وقفے وقفے سے دو تین فائر بھی کیے لیکن رات کی تاریکی میں یوں بھاگتے ہوئے نشانہ لینا آسان نہ تھا۔ فائرنگ کے دھماکوں اور دوڑنے کی دھمک سے ان چھتوں کے نیچے اور اردگرد بسنے والے لوگ گالیاں دیتے اور چیختے ہوئے اپنی چھتوں کی طرف دوڑ رہے تھے۔ ایک ہنگامہ سا اس بھاگ دوڑ کے اردگرد پھیل رہا تھا۔

چھتوں کا یہ سلسلہ دور تک تو گیا لیکن بالآخر ایک جگہ رک گیا..... مٹی کے گھڑوں سے بھری ہوئی چھت پر دوڑتے اور کئی گھڑے توڑتے ہوئے وہ اس سرحد تک پہنچا جس کے آگے ایک چھ فٹ چوڑی اور دس گیارہ فٹ گہری گلی تھی..... کسی سوچ میں وقت ضائع کیے بغیر وہ چند قدم واپس پلٹا اور چھت سے منسلک سیڑھیاں اترتا ہوا اس گھر کے صحن میں اتر گیا۔ ایک طرف موجود برآمدے سے ایک نوجوان ہاتھ میں ہاکی تھامے اس پر حملہ آور ہوا۔ تیمور نے جھک کر خود کو بچایا اور باہر کے دروازے کی طرف دوڑتا چلا گیا۔ نوجوان اپنی جھونک میں آگے کو نکلا پھر تیمور کے پیچھے بھاگا۔ تیمور نے دروازے کی کنڈی کھولی اور گلی میں دوڑ لگا دی۔ پیچھے بھاگتے جوان نے ہاتھ میں موجود ہاکی گھما کر ہوا میں دے ماری جو گھومتی ہوئی تیمور کی پشت پر لگی۔ وہ ایک پل کو لڑکھڑایا لیکن رکا نہیں۔ بانہوں میں روتے مچلتے حماد کو تھامے بھاگتا چلا گیا۔ ان کے درمیان کافی فاصلہ اب بھی برقرار تھا..... لیکن یہ فاصلہ مسلسل قائم رہے ایسا ہونا ضروری بھی نہیں تھا۔ جان بچانے والا ہرن ہر بار چیتے سے جیت نہیں پاتا۔ بھاگتے ہوئے تیمور کو عقب سے لوگوں کی چیخم دھاڑ کے علاوہ ایک غراتے ہوئے مشینی انجن کی آواز بھی سنائی دینے لگی تھی۔ جو لحہ بہ لحہ موت کی طرح قریب تر ہوتی جارہی تھی۔ یہ کوئی گاڑی تھی۔ اسے لگا کہ اب اس کی یہ دوڑ زیادہ دور تک نہیں جانے والی..... تبھی ایک گلی کا موڑ مڑتے ہی اس کے سامنے اس دوڑ سے نجات کا راستہ نکل آیا۔ دائیں جانب ایک پلاٹ تھا۔ جس کی خستہ دیوار میں، بڑا سا شگاف تھا۔ وہ پھرتی سے سیدھا بھاگنے کے بجائے اس دیوار کے شگاف سے اندر داخل ہوگیا۔ اندر کوڑا کرکٹ کا ڈھیر پڑا تھا۔ جیسا کہ عموماً ایسے خالی پلاٹوں کے اردگرد کے مکین کچرا خانہ بنا لیتے ہیں۔ اندر گھستے ہی وہ دیوار کے ساتھ لگ کے بیٹھ گیا مگر مسئلہ یہ تھا کہ ننھا حماد اس صورت حال کی نزاکت کو سمجھ نہیں سکتا تھا وہ چلائے جارہا تھا۔ اس نے دل پر جبر کرتے ہوئے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کی آواز کو دبا دیا۔ وہ بری طرح مچلنے لگا مگر یہ اس کی جان بچانے کے لیے ضروری تھا۔ پیچھا کرنے والا ہجوم بھاگتے ہوئے گلی میں داخل ہوا اور اپنی جھونک میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ ہجوم کے آخر میں ایک سوزوکی مہران اور ایک موٹر سائیکل بھی شامل تھی۔ حماد اس کی بانہوں میں تڑپ رہا تھا۔ تیمور کو اندازہ تھا کہ اس کا

سانس رک رہا ہے..... لیکن اس نے اس وقت تک ہاتھ نہ ہٹایا جب تک تعاقب کرنے والے گلی کو پار نہ کر گئے۔ اس نے حماد کے منہ سے فوری ہاتھ ہٹا دیا۔ وہ بیچارہ رونا بھول کے گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے بری طرح کھانسنے لگا۔ تیمور اسی دیوار کے شگاف سے باہر نکلا اور تعاقب کرنے والوں کے مخالف رخ پر بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کا جسم..... خاص طور پر ٹانگیں اور بازو درد سے بوجھل ہو رہے تھے..... لیکن اس تمام تر تکلیف کے باوجود وہ رکنے یا ستانے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ البتہ اب تعاقب محسوس نہ ہونے پر اس کے کشیدہ اعصاب کا دباؤ کم ضرور ہوا تھا۔ وہ چلڈرن پارک کی طرف سے غزالی روڈ پر آیا۔ یہیں چوک پر اسے ایک آٹو رکشا کسی نعمت کی طرح مل گیا۔ حماد بے چارہ کھانسی اور رونے سے بے حال ہو کر اب ہچکیاں لے رہا تھا اور سہمی سہمی نظروں سے تیمور کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تیمور نے جس طرح اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کا سانس روک دیا تھا، وہ شاید اس سے تھوڑا خوفزدہ ہو گیا تھا۔ رکشے والے نے اسے خیر و عافیت سے پہنچا دیا اور کچھ دیر بعد وہ اپنی زندگی کی سب سے خوفناک ریس جیت کر اپنے سب سے عزیز دوست عامر کے گھر پہنچ چکا تھا۔

☆☆☆

حماد، تیمور کے دوست عامر کی بیوی شگفتہ کی بانہوں میں پُرسکون انداز میں سو رہا تھا۔ سونے سے پہلے شگفتہ نے اسے گرم دودھ پلایا تھا اور خوب پیار کیا تھا۔ ڈرائنگ روم میں تیمور گرم پانی کی بوتل سے اپنے جسم کو ٹکور کرتے ہوئے عامر کو ساری باتیں بتا چکا تھا۔

''میرے خیال میں ہمیں فوراً پولیس کو اطلاع دینی چاہیے۔''

تیمور نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''مجھے نہیں لگتا کہ یہ ٹھیک ہوگا۔ سلطان عالم کا نام بیچ میں آنے سے پولیس کچھ بھی کر سکتی ہے۔ وہ اس بچے کو خود ہی سلطان عالم کے حوالے کر سکتی ہے کیونکہ سیاسی صورتِ حال کا جائزہ لیں تو سلطان اگلے الیکشن میں سی ایم بننے جا رہا ہے۔ اس صورتِ حال میں وہ اس طرح کے اسکینڈل کو اٹھانے کے بجائے دبانے کی کوشش کریں گے۔''

''تو پھر ایک پریس کانفرنس کرتے ہیں۔ صحافیوں کے روبرو اس سلطان عالم کا سارا کچا چٹھا کھول دیتے ہیں۔''

''ہاں اور ہماری اس کہانی کو صحافی سچ مان لیں گے جس کا ہمارے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے۔'' تیمور نے کہا۔

''ٹھوس ثبوت ہے نا..... یہ بچہ۔''

''اس ثبوت کو ثابت کرنے سے پہلے ہی بہت کچھ بدل دیا جائے گا..... تم ہمارے سسٹم کی کمزوریوں کو جانتے تو ہو۔''

''ہاں میں جانتا ہوں لیکن ہمارے پاس اس کے سوا اور آپشن ہی کیا ہے۔ کیا کرو گے تم..... یونہی اسے اٹھا کر گلیوں میں موت کے آگے بھاگتے رہو گے۔''

''اگر یہی ایک راستہ بچا ہے تو یہی سہی.....'' تیمور نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''پاگل ہو گئے تم۔ کب تک بھاگو گے؟ معاملے کا حل نکالتے ہیں، اس سے فرار حاصل نہیں کرتے۔'' عامر نے سر جھٹک کر کہا، تیمور خاموش رہا۔

عامر اپنی پیشانی پر انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔ ''وہ کیا نام بتایا تھا تم نے..... ہاں شاہ نواز..... یہ وہی تو نہیں بھائی گیٹ والا شاہ نواز عرف شاہنا..... سلطان عالم کے اس کے ساتھ تعلقات پوشیدہ تو نہیں۔ اوہ..... اگر یہ وہی ہے تو..... تو واقعی تم بڑے خطرے میں ہو تیمور۔''

تیمور بھی چونک گیا۔ اس سے پہلے اس نے شاہ نواز کے نام پر اتنی توجہ نہیں دی تھی لیکن عامر کی بات سچ تھی۔ یہ یقیناً وہی تھا..... لاہور شہر کا سب سے طاقتور اور خونخوار غنڈا۔ سیاستدانوں کا چہیتا..... درجنوں قتل میں مطلوب ہونے کے باوجود دندناتے ہوئے پھرتا تھا۔ شاہنا گینگ کے نام سے ایک پورے علاقے پر اس کا قبضہ تھا اور حکومت پورے لاہور پر تھی۔ پچھلے وقت سے یہ سلطان عالم کا چہیتا مانا جا رہا تھا۔

''میرا نہیں خیال کہ تمہیں اس طرح سوچنا بھی چاہیے جیسے تم سوچ رہے ہو۔ شاہ نواز کا نام سامنے آنے کے بعد تو بالکل بھی نہیں۔ وہ لاہور کے چپے چپے سے تمہیں ڈھونڈ نکالے گا۔ کہاں تک بھاگو گے؟'' عامر نے کہا تو تیمور خاموش رہا۔ چند لمحے بعد عامر اچانک اٹھ کر ایک طرف موجود فون کی طرف بڑھ گیا۔ دھیمے لہجے میں اس نے فون پر کسی سے بات کی اور پھر واپس آ کر بیٹھ گیا۔

''کس سے بات کر رہے تھے؟'' تیمور نے سرسری انداز سے پوچھا۔

''تمہاری مصیبت کا ہی حل نکال رہا تھا۔''

''کیا مطلب.....؟''

''صبح ہم ایک آدمی سے ملنے جائیں گے۔ میرا دوست ہے حاجی لطیف..... تم ایک بار ملے بھی ہو اس سے۔ وہ ایک آدمی کو جانتا ہے، اس شہر میں بس ایک وہی ہے جو شاہ نواز کے خطرے سے تمہیں محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اس کے بعد تمہارے لیے یہی بہتر ہوگا کہ اس شہر سے کہیں باہر نکل جاؤ

لیکن اب دور کی سوچنے کے بجائے فی الحال تم آرام کرو۔ صبح بات کریں گے۔'' عامر کی بات سن کر تیمور نے سر ہلا دیا۔ خود اس کا جسم بھی تھکن سے چُور اور درد سے نڈھال ہو رہا تھا۔ اس نے پین کلر گولیاں کھائیں اور بستر پر گر کر سو گیا..... مگر آج کی رات اس کی زندگی میں آرام نہ تھا۔ اسے جھنجوڑ کر جگایا گیا۔ تیمور نے دیکھا، عامر نے ایک ہاتھ میں حماد کو تھاما ہوا ہے اور دوسرے ہاتھ سے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کر رہا ہے۔ تیمور تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گیا..... عامر نے سرگوشی کی.....

''اٹھو..... چلو میرے ساتھ..... اور کوئی آواز نہ پیدا کرنا۔'' عامر سوئے ہوئے حماد کو تھامے تیمور کو لے کر اس کمرے سے ملحق ایک اور دروازہ پار کر کے گھر کی بیٹھک میں لے آیا اور اس نے یہاں سے گلی میں کھلنے والا دروازہ اس احتیاط سے کھولا کہ ذرا سی بھی آواز پیدا نہ ہو۔ اس نے حماد کو خاموشی سے تیمور کے حوالے کیا۔

''جاؤ یہاں سے۔'' اس نے سرگوشی کی۔

''ہوا کیا ہے؟'' تیمور نے بے چینی سے پوچھا۔

وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''میری بات دھیان سے سنو..... یہاں سے نکل کر سیدھا حاجی لطیف کے پاس جاؤ جن کے گھر ایک دفعہ میں تمہیں لے کر گیا تھا۔ وہاں جاؤ اور ان سے کہنا کہ تمہیں سرخاب دادا کے پاس پہنچا دیں..... سرخاب دادا..... یاد رکھنا..... اب نکلو یہاں سے، جلدی کرو۔''

''عامر میرے یار..... مجھے بتاؤ تو سہی ہوا کیا ہے؟'' تیمور نے باہر جانے کے بجائے وہیں کھڑے رہ کر پوچھا۔ عامر نے خوفزدہ نظروں سے گھر کی اندرونی سمت دیکھا اور بولا۔

''گھر میں کچھ لوگ گھس آئے ہیں..... مجھے لگتا ہے وہ تمہارا پیچھا کرنے والے ہی ہیں۔''

تیمور اچھل پڑا۔ ''تو..... تو تم یہاں کیا کر رہے ہو..... چلو میرے ساتھ۔''

''میں کیسے جا سکتا ہوں یار!'' عامر عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''میری بیوی..... میرے بچے اندر ہیں۔ میں انہیں چھوڑ کر کیسے نکل جاؤں؟''

''تو انہیں ساتھ لو نا.....''

عامر نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''وہ میرے بچوں کے کمروں تک پہنچ گئے ہیں۔ اب میں کہیں نہیں جا سکتا۔ تم جاؤ..... خدا کے واسطے..... دیر مت کرو۔'' وہ اسے باہر کی سمت دھکیلنے لگا۔

''نہیں، میں نہیں جاؤں گا۔'' تیمور نے اونچی آواز میں کہا لیکن عامر نے اسے دھکا مار کر کھلے دروازے سے باہر نکالا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ تیمور نے دروازے پر ہاتھ مارنا چاہا لیکن ایک بے بسی کے ساتھ خود کو روک لیا۔ اسی لمحے بائیں جانب سے گھر کے مین گیٹ کی طرف سے کسی نے ٹارچ کی روشنی اس کی طرف ماری۔

''کون ہے یہاں؟'' ایک آواز ابھری۔ اس آواز نے تیمور کو بھاگ کھڑے ہونے پر مجبور کر دیا۔

''اوئے رک.....'' کوئی پکارا۔ ''رشید..... سلیم..... ادھر آؤ یہاں سے کوئی نکل کے بھاگا ہے۔'' چلاتی ہوئی آواز کے ساتھ بھاگتے ہوئے قدموں نے گلی کا سناٹا توڑ ڈالا۔ بھاگنے پکڑنے اور بچنے کی وہی ریس دوبارہ شروع ہو گئی جس کا پہلا راؤنڈ سمن آباد میں ختم ہوا تھا۔ حماد ایک بار پھر اس خوفناک صورتِ حال میں بلک بلک کر رونے لگا تھا..... اور اس روتے بلکتے بچے کو اپنی بانہوں میں دبائے تیمور پوری جان کے زور سے بھاگ رہا تھا۔ فضا میں پہلے فائر کی دھماکے دار آواز گونجی۔ عین اسی لمحے تیمور ایک گلی کا موڑ مڑ گیا..... مگر بالکل اس کے سر کے قریب سے گزرتی گولی کی سائیں اس نے صاف محسوس کی۔ یہ لوگ اس پر بے دریغ گولیاں چلا رہے تھے۔ سمن آباد میں بھی انہوں نے اس پر کم و بیش چار سے پانچ بار فائر کیے تھے۔ صاف دکھائی دیتا تھا اس بچے کو پانے کے لیے وہ سرِعام اسے قتل کر سکتے تھے۔ دو قتل تو پہلے ہی کر چکے تھے..... مینا اور ہاجرہ کا..... ہاجرہ کا سیڑھیوں سے گرتا ہوا جسم دیکھ کر وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ زندہ نہیں بچی ہو گی۔ تیمور ایک بار تو ان کے نرغے سے بچ گیا تھا لیکن ہر بار ایسا ہونا ضروری بھی نہیں تھا۔ اس کے تعاقب میں بھاگتے چلے آ رہے قدموں اور للکاروں میں موت کی آمد کا اعلان تھا اور وہ اس موت کے آگے آگے بھاگے جا رہا تھا۔ اسٹریٹ لائٹس میں روشن کشادہ گلیوں میں دوڑتا ہوا وہ کسی ایسی جگہ کا متلاشی تھا جو وقتی طور پر اسے تعاقب کرنے والوں سے پناہ دے۔ جیسا کہ سمن آباد میں ایک پلاٹ کی ٹوٹی ہوئی دیوار کی صورت میں اسے پناہ ملی تھی لیکن یہاں ایسی کوئی پناہ گاہ نہیں نظر آ رہی تھی۔ ایک گلی میں مسجد کو دیکھ کر وہ اس کی سمت تیر کی طرح بڑھا لیکن مسجد کے دروازے پر لگا تالا دیکھ کر اسے حسرت سے دیکھتا ہوا آگے نکل گیا۔ یہ گلی کافی دور تک سیدھی تھی..... لہٰذا وہ جلد ہی تعاقب کرنے والوں کے نشانے پر آ گیا۔ وہ بھی کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھے۔ گلی کا موڑ صرف چند قدم کے فاصلے پر تھا جب عقب سے فائر کا مہلک دھماکا

ہوا۔ تیمور چیختا ہوا منہ کے بل جا گرا مگر گرنے سے پہلے اس نے حماد کو اس طرح تھام لیا تھا کہ وہ زمین سے نہ ٹکرائے۔ خود وہ زمین پر گرتے ہی دائیں طرف رول کرتا ہوا کچھ دور تک آگے لڑھک گیا۔ گولی اس کے دائیں شانے میں پیوست ہوئی تھی۔ تکلیف کی شدت سے وہ بے حال ہوا مگر موت جتنا قریب ہو انسان اتنا ہی اس سے بچنے کی زیادہ جدوجہد کرتا ہے۔ وہ اپنی تمام تر تکلیف کے باوجود گرنے کے فوراً بعد ہی اٹھا اور دوسرے فائر سے پہلے ہی گلی کا موڑ مڑ گیا۔ اپنے شانے سے گرم خون اپنی پشت پر بہتا ہوا اسے صاف محسوس ہو رہا تھا۔ گولی لگ جانے کا روح فرسا خیال ہی آدھی موت ہوتا ہے..... مگر یہاں معاملہ یہ تھا کہ تیمور کو اپنی جان سے زیادہ اس بات کی فکر تھی کہ اگر وہ مر گیا تو یہ بچہ..... مینا کا بچہ بھی اپنی جان سے جائے گا۔ یہ خیال اپنی جگہ ہونے کے باوجود اور پوری طاقت سے دوڑنے کی کوشش کے باوجود اب اس کے بھاگنے کی رفتار میں کمی آ رہی تھی۔ ٹانگیں شل ہو رہی تھیں، قدم لڑکھڑا رہے تھے اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ یہ دوسری گلی مختصر سی لمبائی کے بعد گھوم کر لنک روڈ کے ساتھ متصل ہو گئی تھی۔ تیمور کے جسم کی طاقت شاید اسے یہیں لانے کے لیے دوڑا رہی تھی۔ دائیں طرف سے آنے والی کار کے ڈرائیور نے شاید یہ سوچ کر اپنی رفتار کم کر لی کہ تیمور سڑک پار کرنا چاہتا ہے لیکن تیمور بجلی کی سی تیزی سے اس کی طرف آیا اور دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔

''ڈ..... ڈاکو..... میرے پیچھے ڈاکو ہیں..... جلدی چلو..... ان کے پاس اسلحہ ہے۔'' وہ بیٹھتے ہی چلایا۔ ڈرائیور جو اس کے یوں اچانک اندر داخل ہونے پر بوکھلا سا گیا تھا، اس کے الفاظ سن کر ہڑبڑا گیا۔ اس نے فوراً گاڑی آگے بڑھا دی۔ عین اسی لمحے بائیں جانب گلی سے دو فائر ایک ساتھ ہوئے جن میں سے ایک گاڑی کی باڈی میں گھس گیا۔ کار ڈرائیور کو تیمور کی بات کا اب پوری طرح یقین ہو گیا تھا۔ تیمور سیٹ سے پشت لگائے آنکھیں بند کیے ہوئے ہانپ رہا تھا۔ حماد اب بھی روئے جا رہا تھا۔ ڈرائیور نے تیزی سے پوچھنا شروع کر دیا کہ وہ کون ہے اور ڈاکوؤں..... کے ہتھے کیسے چڑھ گیا لیکن تیمور اس کی کوئی بات ٹھیک سے سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ گولی کے زخم کی تکلیف اور نقاہت بڑھتی جا رہی تھی۔

''آپ کو کہاں چھوڑ دوں؟'' ڈرائیور نے پوچھا۔

''مجھے ایسی جگہ اتار دو جہاں سے کوئی رکشا مل جائے۔'' دانت بھینچتے ہوئے تیمور نے بہ مشکل کہا تو ڈرائیور نے تھوڑی دور جا کر ہی ایک رکشے والے کے عین سامنے گاڑی روک دی۔ تیمور گاڑی سے نکل کر رکشے میں گھس گیا۔

''کریم پارک چلو..... جلدی..... ڈبل پیسے دوں گا۔'' جس وقت رکشا آگے بڑھا، کار کا ڈرائیور چلا رہا تھا..... ''ارے تمہارا تو خون بہہ رہا ہے۔''

رکشے والے نے ڈبل کے لالچ میں رکشا جہاز کی طرح بھگایا۔ تقریباً بارہ کلومیٹر کا فاصلہ تیمور نے اپنی بچی کھچی طاقت کے سہارے ذہن پر اترتے سیاہ پردوں سے لڑتے ہوئے گزارا۔ اس کا جسم اپنے ہی خون سے لت پت ہو چکا تھا۔ رکشے کی سیٹ بھی لہو سے بھر گئی تھی لیکن وہ اپنے زخم کے متعلق سوچ کر خود کو مزید کمزور نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بالآخر مطلوبہ جگہ پہنچتے ہی ایک گھر کے عین سامنے پہنچ کر اس نے رکشا رکوایا اور ڈرائیور سے درخواست کی کہ وہ اس گھر سے حاجی لطیف صاحب کا پوچھ کر اسے بتائے۔ رکشے والے نے گھر کا دروازہ بجایا جو تیسری دستک پر کھلا۔ کچھ دیر بعد ایک باریش لیکن نوجوان شخص نے رکشے میں جھانکا۔

''اوہ تیمور صاحب..... آپ؟..... اس وقت.....؟ عامر نے تو بتایا تھا کہ وہ صبح.....'' اس کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ اس کی نظریں رکشے کے فرش پر پڑ گئی تھیں جہاں خون کا تالاب سا بن گیا تھا۔

''حاجی صاحب..... مم..... مجھے سرخاب دادا سے ملنا ہے..... ہماری جان کو خطرہ ہے..... ہم..... ہمیں بچا لیجیے.....'' تیمور یہ کہتے کہتے اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ ہوتا چلا گیا..... حاجی لطیف نے لپک کر اس کے ڈھیلے ہوتے بازوؤں سے روتے ہوئے حماد کو تھام لیا۔

☆☆☆

وہ چھت پر کھڑا تھا۔ ایک طرف ستارہ، چھت پر دھو کے پھیلائے ہوئے سوکھے کپڑے سمیٹ رہی تھی۔ جبکہ وہ منڈیر کے ساتھ لگا سامنے دیکھ رہا تھا جہاں ایک اور دو منزلہ عمارتوں کی ایک گنجان آبادی دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ کئی جگہوں پر درجنوں مکانوں کی چھتیں ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی تھیں پھر اچانک وہ نیچے صحن میں بندیا کی آواز سن کر چونکا۔

''ارے دیکھو تو ذرا چڑیا آئی ہے اور ساتھ میں لائی ہے حلوا۔''

شہزادے نے نیچے صحن میں دیکھا۔ بندیا کے ساتھ ایک نوعمر لڑکی کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس نے سفید اسکول

یونیفارم پہن رکھی تھی اور پیلے رنگ کا ایک دوپٹا بے پروائی سے گلے میں لٹکا رکھا تھا۔ بندیا کے ہاتھ میں ایک پلیٹ تھی جس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی۔

''اور دیکھو تو بھلا..... جتنا حلوا یہ لائی ہے اتنا تو چنبیلی باجی اکیلی کھا جاتی ہے..... ہم کرموں جلی کو کیا ملے گا بھلا۔''

''ارے شکر کریں اتنا سا بھی بچا لائی..... ورنہ جتنا مما نے حلوا پکایا تھا وہ سارا تو میں اکیلی بھی نگل سکتی تھی۔'' چڑیا نامی وہ لڑکی خوش مزاجی سے بولی..... پھر ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے اس نے اچانک اوپر دیکھا تو شہزادے کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حیرانی ابھر آئی۔

''ارے یہ منڈیر پر کوا بیٹھا ہے یا کوئی نیا پرندہ آیا ہے؟'' اس کی بات سن کر بندیا نے اوپر دیکھا پھر چڑیا کے سر پر چپت رسید کرتے ہوئے بولی۔

''چل پگلی..... کبھی اتنا سوہنا کوا بھی دیکھا ہے۔ یہ تو ہمارا شہزادہ ہے شہزادہ۔'' اور ایسا کہتے ہوئے اس نے اوپر شہزادے کو آنکھ بھی ماردی۔ شہزادہ ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔

''ارے شرما گیا ہے یا ڈر گیا ہے۔'' چڑیا کی آواز سنائی دی۔

''اری چڑیا تم..... فرصت مل گئی تجھے ہم نمانیوں سے ملنے کی۔'' اچانک چنبیلی کی آواز گونجی۔ ''کتنے دن ہو گئے ہیں بھلا..... نہ کوئی اتا پتا نہ سلام دعا..... پتا ہے چھیناں باجی کتنا پوچھ رہی تھیں تیرا۔''

''چلیے پہلے چھیناں باجی سے ہی ملتے ہیں۔ ویسے یہ نیا پرندہ کون ہے؟'' چڑیا کی آواز دور جاتی معلوم ہوئی۔ شاید وہ سب کمروں میں چلے گئے تھے۔ شہزادہ خاموشی سے چھت کے ایک کونے پر پڑے پرانے سے ناکارہ تخت پر بیٹھ گیا۔ اس کی طبیعت میں ایک اضطراب سا پھیل رہا تھا۔ کچھ دیر بے چینی سے بیٹھنے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ٹہلنے لگا۔ اس کے جسم پر ابھی تک لڑکیوں والا لباس ہی تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے جب تھک گیا تو منڈیر سے ٹیک لگا کے نیچے بیٹھ گیا۔ کافی دیر گزر گئی جب اچانک اس نے ایک آہٹ پر اپنی بند آنکھیں کھولیں اور یہ دیکھ کر چونک گیا کہ چڑیا نام کی وہ لڑکی اس کے قریب کھڑی دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے جھک کر اسے غور سے دیکھ رہی ہے۔ وہ مضطرب سا اٹھ کھڑا ہوا تو چڑیا بھی سیدھی ہو گئی۔

''تم رو رہے تھے؟''

اس نے تیزی سے اپنی نم آنکھوں کو صاف کیا اور نفی میں سر ہلا دیا۔

''جھوٹ بولتے ہو.....'' اس نے یکدم ڈانٹتے ہوئے کہا پھر اس کی گھبراہٹ دیکھ کر اچانک زور سے ہنس پڑی۔ وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''میرا نام صائمہ ہے لیکن اس گھر میں مجھے چڑیا کہتے ہیں۔ یہ نام مجھے چھیناں نے دیا تھا اور مجھے بہت پسند ہے کیونکہ میرا بہت دل کرتا ہے کہ کاش میں ایک چڑیا بن جاؤں اور مجھے لگتا ہے کہ ایک دن ایسا ہو جائے گا..... اور جس دن میں چڑیا بن گئی نا میں دور اوپر آسمانوں پر اڑ جاؤں گی اور دوبارہ کبھی زمین پر نہیں اتروں گی، سوائے دو جگہوں کے..... ایک یہاں اس گھر کی منڈیر پر اور دوسرا وہ ادھر نیلی ٹنکی والی چھت دیکھ رہے ہو، وہاں..... وہ میرا گھر ہے۔'' وہ مسلسل بولے جا رہی تھی۔ ''مجھے چنبیلی نے بتایا تمہارے بارے میں..... اس لیے تم گھبراؤ مت..... میں تم سے کچھ نہیں پوچھوں گی، نہ تمہارا نام، نہ پتا، نہ کچھ اور..... ہاں لیکن اگر کبھی بتانے کا دل چاہے تو پھر ضرور بتانا، میں سننا چاہوں گی..... مگر ایسا کم ہی ہوتا ہے کیونکہ جب میں بول رہی ہوتی ہوں تو کسی اور کو بولنے کا موقع کم ہی ملتا ہے۔ خیر تو میں تمہیں بتا رہی تھی کہ میرا بڑا دل چاہتا ہے کہ کاش میں ایک چڑیا ہوتی اور ہواؤں میں اڑتی رہتی..... ہے نا مزیدار بات۔''

اس کی مسلسل باتوں کے درمیان بھی وہ خاموشی سے سامنے دیکھتا رہا جہاں سورج غروب ہو رہا تھا اور مغربی افق پر سرخ رنگ چھایا ہوا تھا۔

''ویسے کم بولنا اچھی بات ہے لیکن بالکل ہی نہیں بولنا تو بری بات ہے..... ہے نا..... تو پھر تم کچھ تو بولو۔''

وہ خاموش رہا۔

''اچھا ٹھیک ہے، ابھی ویسے بھی مجھے جلدی ہے۔ ابا کے آنے کا وقت ہو گیا ہے میں چلتی ہوں پھر ملیں گے۔'' اس نے کہا اور بڑی... تیزی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے چلی گئی۔

رات کو چنبیلی نے بتایا کہ چڑیا (صائمہ) ساتھ والی گلی میں رہتی ہے۔ اس کے والد حاجی صاحب اس علاقے کے بہت نیک اور اچھے انسان شمار ہوتے ہیں۔

☆☆☆

تیمور ایک پرانے جہازی سائز نواڑی پلنگ پر تکیوں سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ اس کا اوپری برہنہ جسم ایک چادر سے ڈھانپا گیا تھا۔ نیچے شانے کے زخم پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ گولی اس کے جسم سے نکال دی گئی تھی..... بہت زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے اس کی حالت کافی سیریس تھی مگر زندگی باقی تھی سو جان بچ گئی۔ یہ کھلا سا کمرا تھا جس

کی دیواروں پر مٹی کا پلاستر تھا اور اوپر پیلے رنگ کا چونا پھیرا گیا تھا۔ کمرے میں اس پلنگ کے علاوہ چند کرسیاں اور میز تھی۔ دروازے اور کھڑکیوں پر بھاری پردے تھے۔ باہر سے کوئی آواز اندر سنائی نہیں دے رہی تھی۔ دروازے کے پردے کو ہٹا کر لطیف صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔

''کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟''

''وہ..... بچہ..... حماد کہاں ہے؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''وہ بالکل ٹھیک اور محفوظ ہاتھوں میں ہے..... بلکہ آپ بھی اس وقت یہاں خود کو بالکل محفوظ سمجھیے۔''

''عامر کی کوئی خبر ملی؟'' تیمور نے اگلا سوال کیا تو لطیف اس سے نظریں چرا کر رہ گیا۔

''پلیز لطیف صاحب.....'' وہ التجائیہ انداز میں بولا۔

''عامر اس دنیا میں نہیں رہا تیمور صاحب۔'' لطیف نے گلوگیر لہجے میں کہا تو تیمور نے اپنی آنکھیں زور سے میچ لیں۔

''کل رات اس کے گھر میں گھسنے والے ڈاکوؤں نے مزاحمت پر اس کے سر پر کوئی چیز ماری تھی..... زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے جانبر نہ ہو سکا۔ اس کی بیوی بھی شدید زخمی ہے۔ اسے کافی تشدد کا نشانہ بنایا گیا..... وہ اسپتال میں ہے۔''

''اوہ میرے خدا! یہ کیسا کڑا وقت ہے۔ یہ کیسی آزمائش ہے۔'' تیمور بلک بلک کر رونے لگا۔ پہلے مینا، پھر ہاجرہ اور اب عامر..... کیسے سفاک لوگ تھے وہ انسانی جان کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔ کیسے درندے تھے جو آزادانہ گلیوں میں فائرنگ کرتے اور لوگوں کو قتل کرتے جا رہے تھے لیکن کوئی انہیں روکنے والا نہ تھا..... اور کس لیے؟ ایک چھوٹے سے معصوم بچے کی جان لینے کے لیے..... لطیف نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام کر اسے تسلی دی۔

''تیمور صاحب! یہ سب اچانک کیا ہو گیا..... کون تھے وہ لوگ؟ مجھے عامر نے رات فون کر کے بس یہی بتایا تھا کہ وہ آپ کے متعلق پریشان ہیں اور صبح آپ کے ساتھ ہی میری طرف آئیں گے۔''

''ہاں، وہ بدنصیب میں ہی ہوں جس کے حصے کی موت عامر نے خود پر لے لی۔ وہ قاتل میرے لیے ہی اس گھر میں گھسے تھے۔'' وہ بھیگے لہجے میں بولا۔

''وہ کون لوگ ہیں اور آپ کی کیا دشمنی ہے ان سے؟''

''وہ مجھے نہیں بلکہ میرے بچے کو مارنا چاہتے ہیں۔ دیکھیں لطیف صاحب! میں نہیں چاہتا کہ میں آپ کو اپنی مصیبتوں میں شامل کروں۔ مجھے عامر نے کہا تھا کہ آپ مجھے سرخاب دادا کے پاس پہنچا سکتے ہیں۔ مجھے ان کے پاس لے چلیے..... فوراً.....''

''آپ اس وقت سرخاب دادا کی حویلی میں ہی ہیں۔ وہ ابھی تھوڑی دیر میں آنے والے ہیں..... دیکھیے..... آپ جو بھی بتانا چاہیں کھل کر ہر بات انہیں بتا دیں۔ اگر دادا آپ کی مدد پر آمادہ ہو گئے تو واقعی پھر آپ کے دشمن چاہے کوئی بھی ہوں، یہ ان سے آپ کو تحفظ دلوا کر رہیں گے۔''

تیمور نے سر ہلا دیا۔ لطیف اس کا ہاتھ تھپتھپا کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ تیمور نے دوبارہ اپنی آنکھیں موند لیں۔ عامر کے متعلق جان لیوا خبر نے جیسے اس کے جسم سے ساری توانائی نچوڑ لی تھی۔ اسے رہ رہ کر وہ منظر یاد آ رہا تھا جب عامر نے ان قاتلوں کو اپنے گھر میں گھستا محسوس کرتے ہی اسے وہاں سے باہر نکال دیا تھا۔

اس نے کہا بھی تھا۔ ''چلو میرے ساتھ۔''

''میں کیسے جا سکتا ہوں یار.....'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا تھا۔ ''میری بیوی..... میرے بچے اندر ہیں۔ میں انہیں چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں؟''

تیمور کو اپنی ذات خود غرض لگی۔ وہ کیوں اسے موت کے درندوں کے درمیان چھوڑ کر بھاگ نکلا تھا؟ چند دن پہلے اپنی زندگی میں آنے والے ایک بچے کی خاطر اس نے اپنے سالوں پرانے یار کو موت کے حوالے کر دیا تھا۔ ایسی ہی سوچوں میں گھرا وہ روئے جا رہا تھا۔

پھر دروازے پر لگا پردہ ہلا اور ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ تیمور نے تیزی سے سلامت ہاتھ سے اپنی آنکھیں پونچھ لیں۔ اندر داخل ہونے والا ایک جوان آدمی تھا جس نے نسواری رنگ کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ اندر داخل ہوتے ہی دونوں ہاتھ کمر پر ٹکا کر کچھ ایسے انداز میں کھڑا ہو گیا کہ تیمور کو بڑا عجیب سا محسوس ہوا..... اور یہ صرف اس کے کھڑا ہونے کا انداز نہیں تھا بلکہ کچھ اور بھی تھا جو اس کی شخصیت کو ایک الگ ہی رنگ دے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پاؤڈر کی تہ جمی ہوئی تھی اور ہونٹوں پر شاید لپ اسٹک بھی تھی۔ تیمور کی طرف دیکھتے ہوئے وہ اپنی پلکیں بڑی نزاکت سے دبا دبا کے جھپکا رہا تھا۔ بظاہر مرد دکھنے والے اس آدمی کے طور اطوار میں نسوانیت سی جھلک رہی تھی۔ تیمور ابھی اس کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے کا پردہ دوبارہ ہلا۔ ایک اور آدمی اندر داخل ہوا۔ اس نے بھی بالکل پہلے والے نوجوان جیسا نسواری رنگ کا لباس پہن

رکھا تھا۔ وہ اندر داخل ہوتے ہی کمر لچکاتا بائیں جانب آیا اور دیوار کے ساتھ کرسیوں میں سے ایک کرسی اٹھا کر تیمور کے قریب رکھ کر خود بڑے انداز سے مڑ کر دیوار کے ساتھ جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس شخص کے چہرے پر بھی پاؤڈر کی تہ صاف نظر آ رہی تھی اور اس نے وی شیپ میں گلے میں ایک دوپٹا بھی لٹکا رکھا تھا اور وہ دیوار سے ٹیک لگائے بے نیاز... سے انداز میں اپنے نیل پالش لگے ناخنوں کو دیکھنے لگا۔ دروازے کا پردہ تیسری بار ہلا اور اب جو شخصیت اندر داخل ہوئی اسے دیکھ کر کمرے میں موجود دونوں ''آدمی'' اٹینشن سے ہو گئے۔ آنے والا ایک پچاس سے اوپر کی عمر کا آدمی تھا جس نے خوبصورت دھوتی کے اوپر سفید کرتہ پہن رکھا تھا۔ اس کے سفید بالوں کو پیچھے کی طرف کھینچ کر چٹیا بنائی گئی تھی جو اس کی عقبی گردن سے نیچے تک اتر رہی تھی۔ چلتے ہوئے اس نے اپنے دائیں ہاتھ کو فضا میں ڈھیلے سے انداز میں اٹھا رکھا تھا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا تیمور کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گیا اور فرش پر اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد اس نے منہ میں دبائے ہوئے پان کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''اری او ملکہ..... پیک دان کدھر ہے مرجانیے''۔ اس کی پان گزیدہ بھاری آواز میں ایک نسوانی لوچ تھا۔ اس کی بات سنتے ہی دروازے کے پاس کھڑا ''آدمی'' بولا۔

''ابھی لائی۔'' اور دروازے کے پار غائب ہو گیا۔ چند لمحوں بعد وہ ایک پیک دان لے آیا اور کرسی کے قریب فرش پر رکھ دیا۔ سفید چٹیا والے نے پیک دان میں تھوکا..... اور پھر تیمور کی طرف دیکھ کر مسکرایا جس کی آنکھیں حیرت کی وجہ سے پھیل رہی تھیں۔

''کیسی طبیعت ہے میرے پیاریا!'' مرجانیا اور پیاریا اس کا تکیہ کلام تھا۔

''مم..... میں..... ٹھیک ہوں..... آپ..... آپ کون؟'' وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

''اے لو..... ہم ہی سے ملنے کو جان ہلکان کیے پھرتے ہو اور ہم ہی سے پوچھ رہے ہو کہ ہم کون..... مرجانیا دل ہی توڑ دیا تو نے تو.....'' یہ کہہ کر اس نے پیک پھینکی اور بولا۔

''ارے ہم ہی تو ہیں..... سرخاب دادا!'' وہ بوڑھا نسوانی ادا سے سر کو پیچھے جھٹکتے ہوئے بول رہا تھا اور تیمور گنگ بیٹھا تھا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا جس کے بارے میں عامر نے کہا تھا کہ لاہور میں شاہ نواز سے تمہیں صرف ایک شخص ہی بچا سکتا ہے..... سرخاب دادا..... وہ ایک ہیجڑا ہو گا۔

☆☆☆

تیمور ''سرخاب دادا'' کو لے کر شدید تذبذب کا شکار تھا لیکن پھر اس نے ایک ایسی بات کہی جسے سن کر تیمور نے سرخاب دادا کی شخصیت کو تسلیم کر لیا۔ سرخاب دادا نے کہا تھا۔

''ہمارے اطوار پر نہ جا مر جانیا..... سینے میں دل اگرچہ عورت سا نازک ہے مگر جگر مرد جیسا ہے..... فولادی.....''

تیمور نے ایک گہری سانس لے کر الف سے یے تک تمام صورتِ حال اس کے سامنے بیان کر دی۔ مینا کی محبت سے شروع ہونے والی کہانی اس کی پراسرار موت کے بعد اچانک ہونے والے پے در پے انکشافات سے ہوتی ہوئی..... ایک چھوٹے بچے کے قتل کی خواہش میں ہاجرہ اور عامر کی موت کو شامل کرتی، زخمی حالت میں تیمور کو یہاں پہنچا رہی تھی۔ اس کہانی میں سلطان عالم اور اس کے بچے کے متعلق انکشافات اور تین قتل کی وجوہات نے کمرے میں گہری سنجیدگی طاری کر دی تھی۔ سرخاب دادا بڑی توجہ اور خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا اور وقفے وقفے سے پیک دان میں تھوکتا جا رہا تھا۔ تیمور کی کہانی ختم ہونے کے بعد اس نے اس سے چند سوال پوچھے اور پھر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ اس نے تیمور کے کندھے پر شفقت بھرا ہاتھ رکھا اور بولا۔

''تو نے بہت اچھا کیا پیارے جو ہمارے پاس چلا آیا..... بہت اچھا کیا۔ اب زیادہ فکر کی ضرورت نہیں..... اب تو سرخاب دادا کے پاس ہے، کوئی تیرا اور تیرے ''کاکے'' کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ ادھر تو آرام کر..... ہم آتے ہیں تھوڑی دیر تک..... اری او ملکہ..... اس کا ''کاکا'' کدھر ہے مرجانے..... دیکھ کہیں اس کے بغیر ہلکان نہ ہوا پڑا ہو۔ چل ری شبنم تو میرے ساتھ چل!'' آخری دو فقرے اس نے دیواروں کے ساتھ لگے دونوں خواجہ سراؤں سے کہے اور پھر وہ تینوں کمرے سے چلے گئے۔

تیمور جیسے حالات کے دھارے پر خود کو چھوڑ کر اب قدرے سکون محسوس کرنے لگا تھا۔ کچھ دیر بعد ملکہ حماد کو اٹھائے اس کے پاس لے آئی۔ وہ معصوم بچہ اپنے گرد تیزی سے بدلتی اجنبی صورتوں اور انجانے ماحول کی وجہ سے قدرے سہما ہوا تھا۔ اپنی بڑی بڑی اور گول آنکھیں تیزی سے گھماتے ہوئے کسی مانوس شکل کو ڈھونڈ رہا تھا۔ تیمور نے اسے چوم کر سہلانا شروع کر دیا۔ ملکہ اسے چھوڑ کر واپس چلی گئی تھی۔ وہ کچھ دیر حماد کے ساتھ باتیں کر کے اسے بہلانے کی کوشش کرتا رہا۔ حماد کو دیکھتے ہی مینا کی یاد ایک ٹیس کی طرح اس کے دل میں ابھرتی تھی اور وہ غم کے اتھاہ

سمندر میں ڈوب جاتا تھا..... حالانکہ اس بچے کے ساتھ ابھی اس نے کچھ گھنٹے ہی گزارے تھے لیکن اب وہ اس کے لیے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہو چکا تھا۔ اس کی آنے والی زندگی اس کی محبتوں کا مرکز..... اس کے جینے کی وجہ اب یہی بچہ تو رہ گیا تھا۔

رات کو سرخاب دادا اس سے دوبارہ ملنے آیا۔ حال احوال پوچھنے کے بعد اس نے جو بتایا، اس سے لگ رہا تھا کہ وہ واقعی میں کوئی اونچی شے ہے جو اتنی معلومات مختصر سے وقت میں لے آیا ہے۔ اس نے بتایا کہ ''سمن آباد میں کل رات ہاجرہ کی موت اور علامہ اقبال ٹاؤن میں عامر کے قتل ..... دونوں کو ان کے متعلقہ تھانوں کے پولیس اسٹیشنوں نے ڈکیتی کی واردات میں نامعلوم ڈاکوؤں کے کھاتے میں ڈال دیا ہے۔ عامر کی بیوی کو ہوش آ گیا ہے، وہ اب بہتر حالت میں ہے لیکن اس نے اپنے بیان میں تیمور یا بچے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس کے بچے اپنے ننھیال والوں کے پاس ہیں۔ تیمور کے متعلق فی الحال کوئی تشویش میں مبتلا نہیں کہ وہ کیوں غائب ہے..... اور یہ بات بھی کسی کو پتا نہیں کہ کل رات تیمور کے گھر میں بھی کچھ لوگ گھسے تھے اور انہوں نے کچھ چیزیں تلاش کرنے کی کوشش میں گھر کا کافی سامان بکھیرا..... اور سرخاب دادا نے اس بات کی تصدیق بھی کر لی تھی کہ حماد اور تیمور کے پیچھے جو قاتل ہیں وہ لاہور کے نامی گرامی غنڈے شاہنے یعنی شاہ نواز کے ہی ہیں..... اور ان کا مقصد واقعی میں اس بچے کو قتل کرنا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی بہت اہم تھی کہ ماڈل ٹاؤن، سمن آباد، علامہ اقبال ٹاؤن سمیت لاہور کے کئی علاقوں کی پولیس کو خفیہ طور پر اوپر سے آرڈر ملے تھے کہ تیمور اور اس کے ساتھ بچے کو گرفتار کر کے شاہنے تک پہنچایا جائے۔''

سرخاب دادا باتیں ختم کر کے چلے گئے تو ملکہ اس کے لیے کھانا لے آئی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ سو گیا۔

اگلے دن سرخاب دادا پھر سے ایک اطلاع لے کر آ گئے۔

''سنا ہے کچھ دیر پہلے شاہ نواز کو علم ہو چکا ہے کہ تیمور اور حماد..... سرخاب دادا کی پناہ میں ہیں۔''

یہ آخری اطلاع سن کر تیمور بری طرح چونک گیا۔

''تو..... پھر..... اب کیا ہوگا..... وہ یہاں بھی آ جائیں گے؟''

''آنے دو ان مرجانوں کو..... ملنے آئیں گے تو مل لیں گے..... مارنے آئیں گے تو مار دیے جائیں گے۔ ہم نے کہا تو ہے یہاں کوئی تیرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا پیاریا..... ہم گھنگرو وں کی چھنچھناہٹ والے نہیں گولیوں کی تڑتڑاہٹ والے ہیں اور یہ بات وہ مرجانا شاہنا اچھی طرح جانتا ہے۔ اس کے سر پر سلطان عالم کا ہاتھ ہے تو ہمارے سروں پر بھی خدا کا ہاتھ ہے۔''

وہ ہاتھ نچا نچا کر بول رہا تھا۔ اس کی دھمکیوں اور ہاتھ نچانے کے انداز میں اتنا ہی فرق تھا جتنا فرق ایک جان لیوا گولی اور ایک پیار سے مارے جانے والے تھپڑ میں ہو سکتا ہے۔

تیمور کو سوچ میں ڈوبا دیکھ کر وہ بولا۔ ''ہائے اتنی رونی صورت بنانے کی ضرورت نہیں..... غم نہ کر میرے پیاریا..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تو، تو بڑے حوصلے والا ہے رے..... دوسرے کے بچے کے لیے اپنا اتنا سارا لہو بہا دیا۔ جان کو داؤ پر لگا دیا۔ تو فکر نہ کر..... سرخاب دادا ہے نا..... اللہ بخشے ہمارے گرو جی کہا کرتے تھے، زندگی کی رسی میں گانٹھیں ہی گانٹھیں ہیں۔ ایک کھولو تو دوسری ملتی ہے، دوسری کے بعد تیسری..... جتنی گانٹھیں کھولتے جاؤ گے، رسی سلجھتی جائے گی، سیدھی ہوتی جائے گی۔ پریشان نہیں ہوتے پیاریا..... گانٹھ آ جائے تو اسے کھولنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

تیمور اس جہاندیدہ خواجہ سرا کے پل پل بدلتے روپ پر حیران رہ گیا۔ ایک وقت میں اس نے مردوں کی طرح دھمکیاں دیں اور اپنے عزائم بتائے۔ ساتھ ہی عورتوں کی طرح اپنا ہاتھ نچاتا رہا پھر ایک شفیق بزرگ کی طرح اسے تسلیاں دیں اور اب ایک دانشور کی طرح زندگی کی پیچیدگیوں کو سلیقے سے سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

سرخاب دادا تیمور کی سوچ سے بے پروا بولے جا رہا تھا۔ ''اور گرو جی کہا کرتے تھے کہ مسئلہ کبھی اکیلا پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ اس کا حل بھی جنم لیتا ہے۔ تیرا مسئلہ بھی اکیلا نہیں جنما ہوگا پیاریا..... اس کا بھی ایک مرجانا حل ہوگا۔ ہمیں وہی حل تلاش کرنا ہے۔'' عین اسی وقت ملکہ بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

''دادا..... وہ..... وہ..... وہ آیا ہے۔''

''دھیرج کر مرجانے..... دھیرج کر..... کون سا تیرے سسرالیوں سے طلاق نامہ آ گیا ہے۔'' سرخاب دادا نے کہا۔

ملکہ ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ ''طلاق نامہ نہیں آیا..... ہلاکت نامہ آیا ہے اور صرف سسرالی نہیں پوری برات آئی ہے دولہے سمیت..... آپ کی جان اور دل کے دشمن شاہ نواز بقدم خود ملاقات کا شرف حاصل کرنے آئے ہیں۔ میں کہتی ہوں جلدی چلیے کہیں برات واپس نہ لوٹ جائے۔''

شعاع ڈائجسٹ

جنوری 2020

Download

www.pklibrary.com

اس کی بات سن سرخاب دادا مسکرا اٹھے جبکہ تیمور ملکہ کی بات کا مفہوم سمجھ کر بری طرح چونک گیا۔ سرخاب دادا نے اس کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں اندازہ تھا کہ شاہنا خود آئے گا۔ پر تو فکر نہ کر پیاریا..... یہ لاہور کی گلیاں نہیں ہیں جہاں اس کے مشٹنڈے سرعام گولیاں چلاتے ہیں اور مرجانا جانتا ہے ہمیں..... بہت اچھی طرح جانتا ہے..... تو آرام کر..... ہم اس سے مل کر آتے ہیں۔''

سرخاب دادا اور ملکہ کمرے سے نکل گئے۔ تیمور بے چین ہو رہا تھا۔ اس کے لیے بستر پر یونہی پڑے رہنا ممکن نہ تھا۔ حماد بھی اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ بستر سے اتر کھڑا ہوا۔ کندھے کی پٹی سے بازو مڑا ہونے کی وجہ سے وہ قمیص پہننے کے بجائے ابھی تک چادر اوڑھے ہوئے تھا۔ زخم میں تکلیف ضرور تھی لیکن بدن میں نقاہت اب پہلے جتنی نہیں تھی۔ وہ پہلی بار اس کمرے سے باہر نکلا۔ کمرے سے باہر راہداری کی طرز پر راستہ بنا ہوا تھا مگر سامنے دیوار کے بجائے قدیم طرز تعمیر کے جھروکے بنے ہوئے تھے جن کے پار لاہور کا آسمان تھا۔ جہاں پتنگیں اڑ رہی تھیں۔ وہ جھروکے میں آیا تو اس پر انکشاف ہوا جسے وہ خستہ حال مکان سمجھ رہا تھا، وہ ایک قدیم حویلی تھی۔ ساری حویلی پر پیلے رنگ کا چونا کیا گیا تھا اور اس کا صحن تین اطراف سے دوسری اور تیسری منزل کے جھروکوں کے درمیان گھرا ہوا تھا۔ وہ اس وقت دوسری منزل پر تھا۔ اس کے عین نیچے صحن میں کئی لوگ کھڑے تھے۔ صحن کے دوسری طرف بڑا گیٹ اور اوپر برجیاں بنی ہوئی تھیں۔ تیمور صحن میں دیکھنے لگا۔ یہاں سرخاب دادا موجود تھے۔ ان کے پیچھے خواجہ سراؤں کی ایک ٹولی اسلحہ تھامے کھڑی تھی۔ ان میں ملکہ بھی تھی جو چلتے وقت تو کمر لچکاتی تھی مگر اس وقت کسی مرد کی طرح ساکت اور ثابت قدمی سے کھڑی تھی۔ سرخاب دادا کے عین سامنے جو آدمی بیٹھا تھا، وہ شاہ نواز شاہنا ہی تھا۔ اس کی تصویر تیمور نے مختلف اخباروں میں دیکھ رکھی تھی۔ اس کے پیچھے بھی اسلحہ بردار آدمی کھڑے تھے اور ان میں وہ کالا بھجنگ شخص بھی شامل تھا جس نے تیمور کو ماڈل ٹاؤن سے اغوا کر کے تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔

''دادا! یہ تیری سوچ سے بڑا معاملہ ہے..... اس میں نہ پڑ۔'' شاہنا کہہ رہا تھا۔

''مرجانیا! تیری سوچ ہی اتنی چھوٹی ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور.....'' سرخاب دادا نے اطمینان سے جواب دیا۔

''تو کچھ بھی کہہ لے مگر اسے ہلکا مت لے دادا..... تو نہیں جانتا کہ اصل بات کیا ہے؟''

''اور تجھے پتا بھی نہیں کہ ہمیں کیا کچھ معلوم ہو چکا ہے مرجانیا۔''

''تو بات کو سمجھ نہیں رہا یا سمجھنا نہیں چاہتا؟'' شاہ نواز غصے سے بولا تو خواجہ سراؤں کی اسلحہ بردار فورس نے اپنی بندوقیں سیدھی کر لیں..... جس پر شاہنے کے آدمیوں نے بھی بندوقیں تان لیں..... تیمور کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ اسے لگا کہ ابھی فضا فائرنگ کے دھماکوں سے گونج اٹھے گی اور بارود کی مہک پھیل جائے گی..... مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ تناؤ کی فضا میں سرخاب دادا نے اپنا ہاتھ اٹھایا تو اس کے آدمیوں نے اپنی بندوقوں کا رخ نیچے کر لیا جس پر شاہ نواز کے آدمی بھی نارمل پوزیشن پر آ گئے۔

''دیکھ دادا! میرا تیرا جو بھی تھڑا ہے..... اسے الگ سمجھ۔ یہ معاملہ الگ ہے۔ میں تجھ سے لڑنے واسطے نہیں آیا۔ یہی بتانے آیا ہوں کہ یہ میرا ذاتی معاملہ نہیں ہے..... اس میں بڑے لوگ شامل ہیں۔''

''کون بڑا رے..... کس کی بات کرتا ہے؟ اس مرجانے سلطان عالم کی.....؟'' سرخاب دادا نے طنزیہ انداز میں کہا تو شاہ نواز اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

''تجھے جو بھی معلوم ہے، وہ بہت کم ہے۔ اصل بات کچھ اور ہے۔ وہ بچہ میرے حوالے کر دے دادا..... ورنہ میں تو چلا جاؤں گا لیکن پھر اوپر سے جو آرڈر آئیں گے..... ان کو تو سنبھال نہیں پائے گا۔'' شاہ نواز نے کہا۔

''تو میری بات چھوڑ دے مرجانیا..... میری فکر کیوں کرتا ہے۔ میں دیکھ لے گا جو بھی ہوگا..... تو بس اتنا سبق یاد کر لے کہ وہ بندہ اور وہ بچہ، ہماری پناہ میں ہیں' ان کی طرف کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا نا..... تو میں ان کی آنکھیں پھوڑ دوں گا۔''

''تو ایک نئی جنگ کا محاذ کھول رہا ہے دادا!'' شاہ نواز نے سرد لہجے میں کہا۔

''نہیں رے! میں تو نئی جنگ شروع ہونے سے پہلے روک رہا ہوں۔''

شاہ نواز کچھ دیر خاموش بیٹھا سرخاب دادا کو گھورتا رہا پھر وہ اپنے آدمیوں سمیت چلا گیا۔ اوپر تیمور گہری گہری سانسیں لیتا ہوا اپنے کمرے میں واپس آ کر بستر پر لیٹ گیا۔ ابھی اور کتنی خون ریزی باقی تھی..... وہ سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

سرخاب دادا کی حویلی میں شاہ نواز کی آمد اور دھمکیاں دے کر چلے جانے کو ایک ہفتہ گزر چکا تھا اور اس

دوران کوئی ایسا ہنگامہ نہیں ہوا تھا جس کی تیمور توقع کر رہا تھا۔ اس کی اپنی جسمانی حالت بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ کندھے کی پٹی سے بازو آزاد کر دیا گیا تھا۔ زخم بھرنے لگا تھا۔ اب وہ آرام سے چل پھر سکتا تھا۔ شاہ نواز کے جانے کے بعد سے حماد مستقل اس کے پاس کمرے میں ہی رہنے لگا تھا۔ وہ اب تیمور اور خاص طور پر ملکہ سے مانوس ہو رہا تھا۔ ملکہ اس کے کھانے پینے اور صفائی ستھرائی اور کپڑوں کا خاص خیال رکھتی تھی۔ وہ مرد تھی نہ عورت..... لیکن اس کے اندر ان دونوں کے جذبات تھے۔ حماد کے ننھے وجود کے ساتھ کھیلتے ہوئے وہ ایک ماں کی طرح پیش آتی تھی۔ سرخاب دادا دن میں ایک بار ضرور تیمور سے ملنے آتے، اسے تسلیاں دیتے اور حوصلہ افزائی کرتے۔ تیمور کو پہلے بھی کوئی روک ٹوک نہیں تھی لیکن وہ اپنے زخموں کی وجہ سے کمرے سے باہر نہیں نکلتا تھا مگر اب وہ حویلی کے دوسرے حصوں میں گھوم پھر آیا تھا۔ تقریباً دو کنال پر پھیلی اس قدیم حویلی کے اندر کبھی خواجہ سرا ہی تھے لیکن بقول سرخاب دادا..... یہ سب گھنگروؤں والے نہیں گولیاں چلانے والے تھے..... جن کے سینے میں دل عورت کی طرح نازک مگر جگر امرد کی طرح فولادی تھا۔ البتہ خاص موقع اور وقت کی مناسبت سے یہ ویسے ہی ہلا گلا کرتے جیسے خواجہ سرا کرتے ہیں۔ سرخاب دادا کی اس حویلی میں سبھی بہت قدر کرتے تھے۔ وہ نہ صرف ان کے گینگ لیڈر اور گرو تھے بلکہ وہ ان کے لیے ایک مسیحا کی طرح تھے..... اور اس بارے میں جو کہانی تیمور کو سنائی گئی، وہ کچھ یوں تھی۔

لاہور کے ایک بہت بڑے بزنس مین کا شف شیرازی اپنے والد کی کروڑوں کی جائداد کے اکلوتے وارث تھے..... اور اب انہیں اپنی اربوں کی جائداد کے لیے ایک وارث کا انتظار تھا۔ مسز کاشف امید سے ہوئیں تو ان کا یہ انتظار خوشیوں میں بدل گیا۔ پہلے بچے کی آمد کو ایک بہت بڑی تقریب کے ساتھ خوش آمدید کہنے کا فیصلہ کیا گیا۔ شاندار آتش بازی سے لاہور کے آسمان کو جگمگانا تھا..... لاکھوں روپے جشن میں اڑانے تھے..... ملک کی بڑی ہستیوں کو دعوت پر بلانا تھا..... لیکن جس رات بچے کی آمد ہوئی، اس رات شہر کے سب سے بڑے بزنس مین کے گھر میں روشنیاں تک نہیں جلائی گئیں۔ آتش بازی کا سامان دھرا رہ گیا۔ دعوت کی تقریب سنسان رہی اور جشن کا سماں شروع ہونے سے پہلے موت کے سوگ میں ڈوب گیا۔ کہا یہی گیا تھا کہ بچہ جانبر نہ ہو سکا لیکن درحقیقت..... افسوس اسی بات کا تھا کہ وہ بچہ زندہ کیوں رہا۔ جن ڈاکٹروں نے آپریشن کیا تھا ان کے منہ نوٹوں سے اتنے بھر دیے کہ وہ کچھ بھی بول نہ سکیں، اور بچے کو رات کی تاریکیوں میں اس گھر سے اتنی دور بھیج دیا گیا کہ وہ کبھی واپسی کا راستہ نہ پا سکے۔ لے جانے والے نے اس بچے کو کسی اور کے سپرد کیا اور اس نے کسی اور کو..... یہ بچہ یونہی در در ہوتا ہوا بالآخر اس جگہ پر پہنچ گیا جہاں پہنچنا اس کی قسمت میں لکھا تھا۔ وہاں اس گورے گلابی بچے کا نام سرخاب رکھا گیا۔

سرخاب جس ماحول میں پلا بڑھا وہاں اس کے ہر طرف اسی جیسے لوگ تھے لہٰذا اسے یہ علم بڑی دیر بعد ہوا کہ ایک دنیا ان کی دنیا سے باہر بھی ہے..... اور ان کی دنیا سے زیادہ بڑی، زیادہ حقیقی اور زیادہ طاقتور دنیا ہے۔ اس دنیا کے لوگ ان کو صرف دو نظروں سے دیکھتے ہیں، ایک نظر حقارت بھری، دوسری ہوس بھری..... خواجہ سراؤں کی فیملیوں میں کوئی خونی رشتہ نہیں ہوتا، صرف اصولی رشتے ہوتے ہیں یا اخلاقی۔ سب سے بڑا رشتہ گرو کا اپنے چیلوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ گرو ان کے لیے ان کے ماں اور باپ ہوتے ہیں اور چیلے اپنے گرو کے بچے۔ گرو ان کا خیال رکھتا ہے، اپنی برادری میں اپنے تمام چیلوں کی نمائندگی، حاضری، ذمے داری اسے ہی نبھانا ہوتی ہے۔ وہ کوئی اور کام نہیں کرتا..... لہٰذا اس کی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لیے چیلے اسے ہر ماہ ایک مخصوص رقم دیتے ہیں۔ اول تو انہیں کوئی ایسا کام ہی نہیں ملتا جسے محنت سے سرانجام دے کر وہ اپنی روزی کما سکیں۔ نہ ہی انہیں کوئی ایسا ہنر سکھائے جانے کی سہولت ملتی ہے جس سے وہ اپنا کام شروع کر سکیں۔

سرخاب جن کے ساتھ رہتا تھا وہ تقریبوں میں ناچنے گانے والے تھے۔ عموماً ایسی تقاریب مرد حضرات اپنی مہندی، سالگرہ یا دوسری خوشی کے موقع پر خفیہ طور پر رکھتے ہیں۔ سرخاب جب ان محفلوں میں اترا تو وہ اپنے ساتھ ایک ہنگامہ لے کر آیا کیونکہ قدرتی طور پر وہ بہت خوبصورت تھا۔ ایسی تقاریب میں نشے میں ڈوبے تماش بین ناچنے والے خواجہ سراؤں کو چھیڑنا، چٹکیاں کاٹنا، ہاتھ لگانا جائز ہی نہیں بلکہ اپنا حق بھی سمجھتے ہیں۔ سرخاب کو ایسی حرکتوں سے نہ صرف الجھن ہوتی بلکہ ایک نفرت کی سی لہر اس کے اندر دوڑ جاتی۔ وہ باقاعدہ ناراضی کا اظہار کرتا تو گرو اسے سمجھاتا اور ایک وظیفہ پڑھتا، برداشت کر۔

ایسے ہی ایک فنکشن میں نشے میں دھت ایک بندے نے سرخاب کو پکڑ لیا اور کھینچ کر اندر لے جانے لگا۔ سرخاب

نے پہلے تو خود کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن اس آدمی کی بڑھتی ہوئی دست اندازی پر اسے تاؤ آ گیا۔ اس نے رکھ کے ایک تھپڑ جڑ دیا۔ یہ چھٹے ہوئے بدمعاشوں کی محفل تھی اور تھپڑ کھانے والا بھی خود کو تیس مار خان سمجھتا تھا۔ ایک ہیجڑے کے ہاتھوں تھپڑ کھانا ایسا واقعہ تھا جس کو لے کر اس کی زندگی ایک مذاق بن سکتی تھی۔ اس نے سرخاب کو بالوں سے پکڑا اور اس کے پیٹ میں گھٹنا دے مارا۔ سرخاب کی مدد کے لیے اس کے ساتھی ناچنا چھوڑ کر پہنچ گئے تو ادھر بدمعاشوں کی ٹولی بھی شراب کے گلاس رکھ کے میدان میں آ گئی..... اور اس لڑائی میں تعداد میں زیادہ ہونے کے باجود بدمعاشوں کی اچھی خاصی دھلائی ہوگئی کیونکہ نشے نے ان کے اعصاب مختل کر رکھے تھے..... لڑائی تھمی تو خواجہ سراؤں کو احساس ہوا کہ وہ کیا کر بیٹھے ہیں! انہوں نے اپنا سامان سمیٹا اور اپنے ٹھکانے کی طرف دوڑ لگا دی اور پھر بھی سہمے ہوئے چوزوں کی طرح اپنی مرغی یعنی گرو کے پروں تلے آ بیٹھے۔ سوچ رہے تھے اب کیا ہوگا..... کیونکہ بدمعاشوں کا نشہ اتر ہی جانا تھا اور پھر..... اس سے آگے وہ سوچ نہیں سکتے تھے اور جو وہ سوچ نہیں سکتے تھے وہ اگلی صبح ہو گیا۔ پولیس کی گاڑی ہوٹر بجاتی ہوئی آئی اور سرخاب اور اس کے گرو سمیت آٹھ خواجہ سراؤں کو ہتھکڑیاں پہنا کر لے گئی۔

سارا دن وہ حوالات میں بیٹھے رہے کہ اب بڑا افسر آئے گا تو کوئی بات ہوگی..... لیکن کوئی نہیں آیا۔ شام کو اچانک ہی ان سب کو دوبارہ گاڑی میں بٹھایا گیا اور ان کے گھر کے پاس انہیں اتار کر چھوڑ دیا گیا۔ وہ ناقابلِ یقین حیرت کے ساتھ ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے کہ یہ ان کے ساتھ ہوا کیا ہے؟ پہلے تو کچھ سمجھ نہیں آئی مگر گھر میں داخل ہو کر جب گرو نے پوچھا..... سرخاب کہاں ہے؟ تو انہیں پتا چلا کہ سرخاب کو تو ان کے ساتھ واپس بھیجا ہی نہیں گیا تھا۔ وہ سمجھ گئے کہ انہیں کیوں چھوڑ دیا گیا ہے۔ سرخاب آدھی رات کے بعد نیم مردہ حالت میں گھر پہنچا تھا اور پہنچتے ہی وہ گرو کی جھولی میں آ کر گر گیا۔ گرو نے اس کے پھٹے ہوئے لباس سے جسم کی حالت کا اندازہ لگاتے ہوئے اپنی چادر اتار کر اس پر ڈال دی۔ باقی کی رات اس گھر میں سوگ کی رات تھی۔ یہ سوگ اگلے دو دن تک جاری رہا۔ یہ بالکل خاموش سوگ تھا جس میں کسی نے کسی سے کچھ کہا اور نہ ہی کسی کی آنکھ سے کوئی آنسو ٹپکا۔ حتیٰ کہ سرخاب کی آنکھ سے بھی نہیں۔ تیسرے دن شام کو انہیں ایک فنکشن پر جانا تھا لیکن دوپہر تک کسی نے کوئی تیاری نہیں کی..... حتیٰ کہ گرو نے چلا کر کہا۔

''چلو..... سب تیاری کرو۔ تم سب تو ایسے افسوس میں ہو جیسے کسی کی عزت لٹ گئی ہو۔'' پھر اس نے گود میں سر رکھے خاموش بیٹھے سرخاب کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''عزت تھی کہاں جو لٹ گئی؟''..... اور ہولے سے سرخاب کے کان میں کہا۔ ''برداشت کر.....''

سرخاب نے پہلی دفعہ اس کی بات سن کر برداشت نہیں کیا اور بولا۔ ''کب تک؟''

گرو نے کہا۔ ''جب تک سانس چلتی ہے تب تک..... ہماری زندگی برداشت کرنے کا دوسرا نام ہے۔''

سرخاب نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''نہیں..... اب نہیں گرو جی!''

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور پھر اکیلا ہی گھر سے باہر چلا گیا۔

چند دن بعد شہر میں ایک اے ایس آئی اور تین بدمعاشوں کے قتل کی خبر پھیل چکی تھی۔ اسی رات سرخاب واپس آیا تو اس کے رنگ ڈھنگ ہی بدلے ہوئے تھے..... اس نے کہا..... ''میں نے طے کر لیا ہے کہ آگے کیسے جینا ہے..... تم میں سے کوئی میرے ساتھ آنا چاہتا ہے تو وہ آ سکتا ہے۔''

سوائے گرو کے سبھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ گرو نے کہا کہ اگر میں نے خود سے ایک وعدہ نہ کیا ہوتا تو میں بھی تمہارے ساتھ ہوتا۔

سرخاب نے خواجہ سراؤں کا ایسا گروپ بنایا جو مجبور بدحال اور زمانے کے ستائے ہوئے خواجہ سراؤں کے لیے ایک پناہ گاہ بنتا چلا گیا۔ اس نے مظلوموں کو ظالموں سے تحفظ دیا لیکن دوسری طرف اس نے شریف لوگوں کے ساتھ شرافت کا ایسا برتاؤ کیا کہ وہ اپنے قبیلے سے باہر کی دنیا میں بھی اپنی اچھی خاصی پہچان بنا گیا۔ کریم پارک کے اس علاقے میں دور دور تک پھیلے گھروں کے لوگ اس کے کسی نہ کسی طرح سے احسان مند تھے اور اس کے لیے جان بھی دے سکتے تھے۔

☆☆☆

وہ دوپہر کا وقت تھا۔ تیمور، حماد کو اپنے پاس لٹائے سلا رہا تھا جب باہر نیچے صحن سے شور وغل کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ تیمور نے حماد کی طرف دیکھا جس کی سانسیں گہری ہوتی جا رہی تھیں اور آنکھیں بند تھیں۔ وہ احتیاط سے اس کے پہلو سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس نے پہلے اوپر سے دیکھا اور پھر بھاگتا ہوا نیچے اتر آیا۔ صحن میں ایک چارپائی پر شبنم کا مردہ وجود پڑا تھا۔ لہولہان جسم پر گولیوں کے نشان تھے۔ چارپائی کے گرد بین کرتے روتے ہوئے

خواجہ سراؤں میں ایک جو شبنم کی لاش کو یہاں لے کر آیا تھا' خود اس کے بازو میں بھی گولی لگی تھی اور سر کی کسی چوٹ سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ وہ روتے ہوئے جو بتا رہا تھا اس سے تیمور کو یہی سمجھ آئی کہ وسیم نامی کسی بدمعاش اور اس کے ساتھیوں نے ان پر گولیاں چلائی تھیں جس میں شبنم مارا گیا۔ وسیم ..... شاہنا گروپ کا ہی بندہ تھا۔ وسیم کا نام سنتے ہی روتے اور بین کرتے خواجہ سراؤں میں غصے کی لہر دوڑ گئی۔ وہ سب چلانے لگے اور سرخاب دادا سے کہنے لگے کہ ہمیں ابھی کے ابھی جا کر شبنم کا بدلہ لینا ہوگا۔ اس دوران چند خواجہ سرا اندر کمروں سے بندوقیں بھی نکال لائے لیکن سرخاب دادا خاموش کھڑا رہا۔

''دادا! بولو..... کچھ تو بولو دادا..... ہماری شبنم کو مار دیا انہوں نے..... خون کا بدلہ خون دادا!'' ملکہ چلا رہا تھا اور ایک اور خواجہ سرا سرخاب کا ہاتھ پکڑے جھنجوڑ کر اسے جیسے سکتے سے باہر لانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن سرخاب دادا سکتے میں نہیں تھا صرف خاموش تھا۔ اس نے شبنم سے نظریں ہٹائیں اور دھیمے لہجے میں بولا۔

''سب ہوگا رے..... سب ہوگا لیکن پہلے اس مرجانے کے کریا کرم کی تیاری تو کرو۔'' یہ کہہ کر وہ اندرونی کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ صحن میں شبنم کی لاش کے گرد کھڑے غصے سے چلانے والے ایک بار پھر بین کرنے لگے اور رونے لگے۔ کچھ دیر بعد وہاں پولیس آ گئی۔ ایس ایچ او نے سرخاب دادا سے اکیلے میں بات کی اور پھر پولیس واپس چلی گئی۔ اس قتل کا نہ کوئی پرچہ کٹا نہ پوسٹ مارٹم وغیرہ کیا گیا۔ اردگرد کے رہنے والے لوگ حویلی کے گرد اکٹھے ہونے لگے لیکن کسی کو اندر آنے کی اجازت نہ تھی۔ شام کو عصر کی نماز کے بعد شبنم کا جنازہ اٹھایا گیا۔

حویلی میں سوگ کی فضا قائم تھی۔ اس واقعے کے بعد چار دن گزر گئے تھے جب ایک رات بارہ بجے حویلی سے تین گاڑیاں خاموشی سے باہر نکلیں اور ان کی واپسی صبح چار بجے کے آس پاس ہوئی۔ وہ نعرے لگا رہے تھے، اسلحہ لہرا رہے تھے اور خون کا بدلہ خون چلا رہے تھے۔ سرخاب صحن کے درمیان میں کھڑا تھا اور اس کے ساتھی خواجہ سرا ہاتھوں میں بندوقیں تھامے اس کے گرد جھوم رہے تھے۔ اوپر جھروکے میں تیمور پھٹی پھٹی نگاہوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ باقی کا سارا دن انہوں نے کسی جشن کی طرح منایا۔ تیمور سرخاب سے ملنا چاہتا تھا لیکن پورا دن اس کی اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ وہ اپنے کچھ خاص مہمانوں میں گھرا ہوا تھا جو کہیں دور سے آئے تھے۔

رات آئی اور بیت گئی۔ اگلا دن بھی بنا کسی ہنگامے کے گزرنے والا تھا لیکن شام کو ایک اور خبر آ گئی..... ملکہ سمیت پانچ خواجہ سراؤں کو شاہ نواز کے آدمیوں نے اغوا کر لیا تھا۔ حویلی میں ایک ہلچل سی مچ گئی تھی۔ طیش اور غصے کی فضائیں پھر سے پھیل گئیں۔ بندوقیں باہر نکل آئیں۔ باہر سے کچھ لوگ آ جا رہے تھے۔ پولیس بھی دو مرتبہ چکر لگا چکی تھی۔ اندر اپنے کمرے میں سرخاب بہت مصروف تھا۔

تیمور نے بہت کوشش کی کہ سرخاب سے ملاقات ہو جائے لیکن یہ ملاقات ہونے میں ہی نہیں آتی تھی۔ شام کو حویلی سے دو گاڑیاں باہر گئیں جن میں سرخاب دادا خود بھی بیٹھے تھے۔ ان کی واپسی رات دو بجے کے بعد ہوئی۔ تیمور کو دو باتیں پتا چلیں ..... ایک یہ کہ مذاکرات ناکام ہو گئے ہیں اور دوسری یہ کہ اب کسی بھی وقت شاہ نواز کے اس ڈیرے پر حملہ کیا جائے گا جہاں ملکہ سمیت باقی خواجہ سرا قید تھے۔ تیمور اس کے بعد بیٹھا نہ رہ سکا۔ وہ سرخاب دادا سے ہر صورت ملنے کا تہیہ کر کے آیا۔ مخصوص کمرے کے دروازے پر اسے روکا گیا تو اس نے روکنے والے خواجہ سرا کو غصے سے دھکا دے کر دروازہ کھول دیا..... اندر سرخاب سمیت پندرہ خواجہ سرا بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ دروازہ کھلتے ہی سب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''مجھے آپ سے بات کرنی ہے، ابھی اور اسی وقت۔'' تیمور نے کہا تو سرخاب نے سب لوگوں کو باہر بھیج دیا۔ تیمور اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔

''میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتا..... یہ سب میری وجہ سے ہو رہا ہے اور..... میرے بچے کی وجہ سے.....''

سرخاب دادا نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روکا اور کہا۔ ''تو غلط لائن پر سوچ رہا ہے پیارے..... تیرے آنے سے پہلے بھی یہاں یہی کچھ ہوتا تھا۔ تو فکر نہ کر..... تو جا اپنے کاکے کے پاس..... کچھ نہیں ہوگا تم لوگوں کو۔''

''نہیں..... پہلے جو ہوتا رہا ہے مجھے اس سے کوئی غرض نہیں لیکن اب جو بھی ہو رہا ہے، وہ ہماری وجہ سے ہو رہا ہے۔ میں بھی جانتا ہوں اور آپ بھی..... اور اب میں اسے مزید نہیں ہونے دوں گا۔ پہلے مینا پھر ہاجرہ پھر عامر اور شبنم ..... میں ایک زندگی بچانے کی خاطر کتنی اور زندگیاں داؤ پر لگاؤں گا دادا؟''

سرخاب نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''تو خود کو الزام مت دے پیارا..... تو نے کچھ نہیں کیا۔ تو

نے تو اس کاکے کو بچانے کے لیے گولی تک کھائی ہے.....
کیوں سوچتا ہے رے تو ایسا؟''

''میں نے ایک فیصلہ کرلیا ہے اور مجھے آپ کی مدد چاہیے..... لیکن اگر آپ مدد نہ بھی کریں تو بھی..... جو فیصلہ میں نے کرلیا ہے اب میں اس پر ہی عمل کروں گا۔'' تیمور نے کہا اور پھر بولا۔ ''میں سلطان عالم سے خود ملوں گا۔ حماد کے ساتھ۔ میں اس کا بچہ اس کے حوالے کردوں گا پھر وہ جو چاہے اس کے ساتھ کرے۔''

سرخاب نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور بولا۔ ''تو سمجھتا ہے کہ اپنے بیٹے کو دیکھ کر اس مرجانے کے اندر کی باپتا جاگ اٹھے گی؟ وہ اسے اپنا بیٹا مان لے گا؟ ایسی بات ہوتی تو سلطان عالم اپنے بیٹے کے لیے خود ہم سے رابطہ کرلیتا۔ شاہ نواز کو معلوم ہے کہ بچہ یہاں ہے تو سلطان عالم کو بھی تو پتا چل گیا ہوگا۔ اس مرجانے کے سینے میں باپ کا دل ہوتا تو خود چل کر یہاں آجاتا۔ بچے کو لینے کے لیے ایک بدمعاش کو کیوں چھوڑ رکھا ہے اس نے.....''

''میں نہیں جانتا۔'' تیمور سر پکڑتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میں اب کسی اور کا خون ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ میں اتنا خودغرض کیسے ہوسکتا ہوں کہ ایک بچے کی خاطر اتنی جانیں گنوادوں۔ یہ ٹھیک نہیں ہے دادا۔''

''پیاریا! میں نے تجھے ایک بات کہی تھی کہ زندگی کی رسی کو سلجھانے کے لیے گانٹھیں کھولنا پڑتی ہیں۔ کبھی ہاتھ سے تو کبھی دانتوں سے..... پر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ رسی کاٹنی بھی پڑتی ہے۔'' سرخاب نے کہا۔

''رسی کاٹنے کاٹنے زندگی ختم ہوجائے گی دادا۔''

''اچھا تو بتا..... پھر تیرے پاس کوئی اور حل ہے اس کا؟''

''میں یہ حویلی چھوڑ کر جارہا ہوں دادا..... میں اس حویلی میں اور لاشیں نہیں دیکھ سکتا۔''

''ایسا مت کر..... یہ ٹھیک نہیں ہے رے۔''

''تو پھر آپ وعدہ کریں اور لاشیں نہیں گریں گی اور خون نہیں بہے گا۔ جو بھی بات ہوگی بیٹھ کر ہوگی۔'' تیمور نے کہا۔

سرخاب دادا چند لمحے اس کی طرف دیکھتے رہے پھر ایک طویل سانس لے کر بولے۔

''اچھا چل رے..... اور خون نہیں بہے گا۔ اب بیٹھ کر بات ہوگی..... پر تو جانے کی بات مت کر ابھی..... مجھے کوئی اور مرجانا رستہ نکالنے دے۔''

تیمور اٹھ کر وہاں سے چل آیا۔ بعد میں اسے پتا چلا کہ شاہ نواز کے ڈیرے پر حملے کا پلان کینسل ہوگیا ہے۔

☆☆☆

حویلی کے در و بام سے پھوٹنے والا نیا ہنگامہ جو ملکہ اور پانچ خواجہ سراؤں کے اغوا سے شروع ہوا تھا، اچانک ہی تھم گیا اور اب ایک خاموشی طاری ہوگئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی بہت خفیہ پلاننگ ہورہی ہے۔ ایک عجیب سی پُراسراریت نے حویلی کے در و بام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا..... تیمور کو کسی بات کی کوئی سن گن نہیں مل رہی تھی لیکن پھر ایک رات جب ہر طرف سناٹے کا راج تھا، حویلی کے اندر ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ تیمور نے دیکھا صحن میں سرخاب دادا بے چینی سے ٹہل رہے ہیں اور ان کے کچھ ساتھی بھی وہیں کھڑے ہیں۔ لگتا تھا کسی کا انتظار کیا جارہا ہے۔ تیمور بھی خاموشی سے اوپر جھروکے میں کھڑا ان کی حرکات کو دیکھتا رہا۔ کافی دیر بعد حویلی کا گیٹ کھولا گیا اور کوئی اندر آیا۔ آنے والا سیاہ برقع میں تھا لیکن جب اس نے اندر داخل ہوتے ہی برقع اتارا تو وہ عورت نہیں خواجہ سرا ہی تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک چھوٹا سا ڈبا تھا..... اور چہرے پر دبا دبا جوش سا تھا۔ اس کے آتے ہی سرخاب دادا اسے لے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ آیا..... اور پھر بہت دیر تک وہ باہر نہیں آیا۔ حتیٰ کہ صبح کا اجالا پھیل گیا۔ جس خاموشی اور پُراسراریت نے حویلی کو گھیر رکھا تھا وہ غائب ہوچکی تھی۔ اب یہاں کے نفوس میں ایک نیا جوش اور پھرتی نظر آرہی تھی۔ خلافِ توقع اچانک ہی سرخاب دادا نے اسے اپنے کمرائے خاص میں بلوالیا۔ تیمور اندر داخل ہوا تو سرخاب گہری سوچ میں گم تھا۔ اس کے سامنے ٹیبل پر وہی ڈبا پڑا تھا جو رات باہر سے حویلی میں آیا تھا۔

''میں جانتا ہوں پیاریا..... بہت سارے سوال اٹھ رہے ہیں تیرے اندر.....'' سرخاب دادا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''دادا! آپ جانتے ہیں تو پوچھنا کیا..... خود ہی بتادیں جو بتانا ہے۔''

''تیری بات مان لی ہے رے میں نے..... اب مرنے مارنے کے بجائے باتوں سے مسئلہ حل کرنے نکلے ہیں ہم.....'' اس نے سامنے پڑے ڈبے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''اس میں کیا ہے دادا؟''

''اس میں وہ طوطا ہے جس میں اس مرجانے شاہ نواز کی جان ہے۔''

(جاری ہے)

برسوں پہلے ان دنوں جب عبداللہ نے فیکٹری کی ملازمت کو خیر باد کہہ کر ٹیکسی چلانے کا کام شروع کیا تھا، ایک مقامی بوڑھا نیوٹاؤن جانے کے لیے اس کی ٹیکسی میں بیٹھا۔ عقبی نشست پر بیٹھنے کے بجائے اس نے اکثر سواریوں کی طرح عبداللہ کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھنا پسند کیا۔

راستے میں باتیں شروع ہوگئیں۔ عبداللہ اپنی سواریوں کے لیے اچھا سامع تھا۔ توجہ سے سنتا اور جہاں ضرورت محسوس کرتا خود بھی بولتا مگر بلاضرورت بولنے سے

اے وطن

ناہید سلطانہ اختر

اپنا گھر محل ہو یا جھونپڑی، ہر حال میں اچھا لگتا ہے جس کے متعلق کسی کی بھی غلط بات ناقابلِ برداشت ہوتی ہے... وہ بھی دیارِ غیر میں روزگار کے لیے زندگی گزارنے پر مجبور تھا لیکن اپنے وطن کو اپنے دل میں بسایا ہوا تھا۔

غیروں کے درمیان اپنوں کی کمزوریوں کو چھپانے والوں کا جذبہ

احتراز کرتا۔

''موسم اچھا ہے۔'' بوڑھے نے گفتگو کا آغاز روایتی انداز میں کیا۔

''جی ہاں۔''

''ٹیکسی کے دھندے میں کب سے ہو؟''

''کافی عرصہ ہو گیا۔''

''کام ٹھیک ہے؟''

''خدا کا شکر ہے..... گزارہ ہو جاتا ہے۔''

''بیوی بچے ہیں؟''

''جی..... چار بچے ہیں..... دو بیٹے، دو بیٹیاں۔''

''بیوی؟''

''ایک ہی۔'' عبداللہ کو مذاق سوجھا۔

''میرا مطلب..... بیوی ٹکی ہوئی ہے؟''

''اب تک تو ٹکی ہوئی ہے۔''

''ہماری نسل میں بھی اکثر ٹکی ہی رہتی تھیں۔ یہ اب کچھ زیادہ چلن ہو گیا ہے، اس کو چھوڑو اس کو پکڑو..... عورت میں برداشت ہی نہیں رہی..... میں اور میری بیوی باون سال سے اکٹھے رہ رہے ہیں۔''

''زبردست!''

''یہ بات نہیں کہ ہم فرشتے ہیں..... لڑتے جھگڑتے بھی ہیں۔ کبھی وہ سزا دیتی ہے، کبھی میں زیادہ بول جاتا ہوں..... کبھی وہ منا لیتی ہے، کبھی میں معذرت کر لیتا ہوں..... زندگی کی گاڑی یونہی چلتی ہے۔''

''بے شک!'' عبداللہ نے تائید کی۔

''تم اپنی سناؤ..... بیوی اچھی ہے؟''

''شکر ہے!''

''کبھی تو لڑتی ہو گی..... وہ بیوی ہی کیا جو نہ جھگڑے۔''

''ٹھیک کہتے ہو۔'' عبداللہ نے تائید کی۔

''اور وہ بیوی بھی کیا جو شوہر پر شک کیے بنا رہ جائے۔''

''یہ بھی درست۔''

''بہت پرانا قصہ سناتا ہوں۔'' بوڑھا ترچھا ہو کر اپنا رخ عبداللہ کی طرف کرتے ہوئے بولا۔ ''وکٹوریہ اور میں اسکول کے زمانے میں اکٹھے پڑھتے تھے..... وکٹوریہ میری بیوی ہے..... اسکول کے زمانے میں ہم دونوں کی ایک مشترکہ دوست ہوتی تھی ٹریزا..... ٹریزا مجھے پسند کرتی تھی اور میں وکٹوریہ کا عاشق تھا..... ٹریزا کو ایک مخصوص برانڈ کی چاکلیٹ بہت پسند تھی۔ وہ کہا کرتی تھی اس چاکلیٹ کی ایک بار کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتی ہے..... خیر میری شادی وکٹوریہ سے ہو گئی اور ٹریزا زندگی کی بھیڑ میں ہم سے الگ ہو گئی۔ شادی کے کئی سال بعد جب ہمارے تین بچے بھی ہو چکے تھے، میری اور وکٹوریہ کی شادی کی سالگرہ کا دن تھا۔ وکٹوریہ بڑی گھر داری والی عورت ہے۔ گھر میں کوئی تقریب ہو یا کوئی تہوار، ہمارے گھر میں کھانے کی میز پر تمام اشیائے خورونوش وکٹوریہ کے ہاتھ کی بنی ہوتی ہیں..... ہاں تو میں کہہ رہا تھا، ہماری شادی کی سالگرہ تھی۔ میں وکٹوریہ کے لیے تحفہ خریدنے گیا تو وہاں میری ٹریزا کی پسندیدہ چاکلیٹ پر بھی نظر پڑی۔ میں نے چاکلیٹ کا ڈبا بھی خرید لیا اور سوچا کہ جب میں وکٹوریہ کو شادی کی سالگرہ کے تحفے کے ساتھ چاکلیٹ کا وہ ڈبا بھی دوں گا تو وہ بہت خوش ہو گی لیکن کیک کاٹنے کے بعد جب اس نے میرا دیا ہوا تحفہ کھولا تو بجائے خوش ہونے کے صدمے میں دکھائی دی اور اچانک رونے لگی۔ میں حیران اور بچے پریشان ہو گئے۔ اس سے رونے کی وجہ پوچھی تو مجھ پر کسی شیرنی کی طرح جھپٹتے ہوئے بولی..... تم اب تک اس چڑیل ٹریزا کو بھولے نہیں۔ میں نے کہا کیا ہوا؟ چاکلیٹ کا ڈبا میز پر سے اٹھا کر فرش پر پھینکتے ہوئے غرائی۔ یہ والی چاکلیٹ اسی کو پسند تھی نا۔ وکٹوریہ کو سمجھانے بجھانے اور منانے میں مجھے دو دن لگے۔''

عبداللہ زور سے ہنسا۔

''تمہاری بیوی بھی تم پر شک تو کرتی ہو گی؟''

''میری زندگی میں اس کے سوا کسی دوسری عورت کی پرچھائیں تک نہیں۔ ویسے بھی ہماری عورتیں بے چاری بہت صابر و شاکر اور مفاہمت پسند ہوتی ہیں۔ مرد کی زندگی میں کوئی دوسری عورت ہو بھی تو چپ چاپ سہہ لیتی ہیں۔''

''حیرت ہے!'' بڑے میاں نے تعجب کا اظہار کیا۔

''کہاں سے آئے ہو؟''

''تمہارا مطلب..... میرا وطن؟''

''ہاں۔''

''پاکستان۔''

''اوہ! پے کستان! میں نے اس ملک کا نام سنا ہے۔''

عبداللہ کو آج بھی یاد تھا..... ان دنوں جب مذکورہ بوڑھے سے اس کا مکالمہ ہوا، وطن عزیز کو آزاد مملکت کا درجہ حاصل کیے تقریباً تیس سال کا عرصہ گزرا تھا۔

''تمہارے ملک میں ایسی ٹیکسیاں ہوتی ہیں جس میں ہم اس وقت سفر کر رہے ہیں؟'' بوڑھے نے عبداللہ

سے پوچھا۔
''ایسی تو نہیں..... کچھ مختلف..... مگر ہوتی ہیں۔''
عبداللہ بولا۔
''چار پہیوں والی۔''
''جی..... جی۔''
''تم لوگ انہیں کھینچ کر یا دھکیل کر چلاتے ہو یا خود چلتی ہیں؟''
''نہ کھینچ کر نہ دھکیل کر..... خود چلتی ہیں۔ انہیں بھی اسی طرح پیٹرول ڈال کر چلانا پڑتا ہے جیسے میں اس ٹیکسی کو چلا رہا ہوں۔''
''اچھا!'' بوڑھے کو قدرے تعجب ہوا۔ کچھ دیر سوچ میں رہا پھر اس نے پوچھا۔ ''تمہارے ملک میں سڑکیں ہوتی ہیں؟''
''جی..... بالکل ہوتی ہیں۔'' عبداللہ نے دل ہی دل میں سوچا بوڑھا خبطی تو نہیں جو اس قسم کے احمقانہ سوالات کر رہا تھا۔
''تمہارے ملک میں لوگ رہتے کہاں ہیں؟''
''کیا مطلب؟''
''میرا مطلب ہے گھر ہوتے ہیں؟''
''تمہارا مطلب ہے مکان؟''
''ہاں۔''
''ہوتے ہیں۔''
''کیسے؟''
''جیسے یہاں ہوتے ہیں..... یہاں مکانوں کی چھتیں ڈھلوان ہوتی ہیں، ہمارے ہاں زیادہ تر سیدھی چھتیں ہوتی ہیں..... فرش کے متوازی۔''
''اچھا!'' بوڑھے نے تعجب سے کہا پھر قدرے توقف سے بولا۔ ''میں تو سمجھتا تھا تم لوگ جنگلوں میں درختوں پر رہتے ہوگے۔''
عبداللہ بے ساختہ ہنسا، پھر بولا۔ ''ہم کوئی بندر ہیں جو تم ایسا سمجھتے تھے؟''
''غریب ملکوں میں لوگ جنگلوں ہی میں تو رہتے ہیں۔''
''اتنے بھی غریب نہیں ہم..... کبھی موقع ملے تو جا کر دیکھو ہمارے ہاں پیسے والے لوگ کیسے کیسے شاندار گھروں میں رہتے ہیں۔''
''میں تو آج تک لندن نہیں گیا..... نیوٹاؤن میں میرا گھر ہے اور وہیں میرے کام کی جگہ..... کبھی کبھار آس پاس کسی کام سے جانا ہو تو چلا جاتا ہوں ورنہ گھر سے دکان اور

دکان سے گھر۔"

"معاف کرنا..... پھر تو تم پیدا ہی نہیں ہوئے۔"

"کیا مطلب!" بوڑھا چونک کر بولا۔

"ہمارے ملک کا ایک بڑا شہر ہے لاہور..... اس کے بارے میں کہا جاتا ہے جس نے لاہور نہیں دیکھا، وہ پیدا ہی نہیں ہوا..... میرا خیال ہے جس نے انگلستان میں رہتے ہوئے لندن نہیں دیکھا، وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔"

"مجھے لندن دیکھنے سے کوئی دلچسپی بھی نہیں۔ میرے لیے تو میری دنیا نیوٹاؤن ہی ہے۔ یہیں پیدا ہوا ہوں۔ یہیں میرا گھر ہے۔ یہیں شادی ہوئی، بچے ہوئے۔ مروں گا تو یہیں دفن کر دیا جاؤں گا۔"

"بہت سے لوگوں کی زندگی ایسی ہی ہوتی ہے۔ ایک چھوٹے سے دائرے میں مقید..... میں نے بھی جب تک ٹیکسی چلانا شروع نہیں کی تھی، میری زندگی بھی اپنے گھر سے فیکٹری اور فیکٹری سے گھر تک محدود تھی۔ ٹیکسی کے کام نے مجھے وہ جگہیں دیکھنے کے مواقع فراہم کیے جنہیں دیکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا میں۔ انسان کو دنیا دیکھنے کا موقع ملے یا نہ ملے، اردگرد تو ضرور دیکھنا چاہیے..... کبھی موقع ملے تو میرے دیس ضرور جانا تاکہ تمہیں پتا چلے کہ ہم درختوں پر رہنے والے لوگ نہیں ہیں۔"

"جب مجھے لندن دیکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تو تمہارا دیس دیکھنے سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔"

"میری دنیا میرا ٹاؤن ہے اور میں اپنی دنیا میں بہت خوش ہوں۔"

"خدا تمہیں خوش ہی رکھے۔" عبداللہ نے کہا۔

بوڑھا دھیرے سے ہنسا۔

عبداللہ نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔

☆☆☆

بوڑھے مسافر سے عبداللہ کی ملاقات ہوئے چالیس سال سے زائد عرصہ بیت چکا تھا۔ بوڑھا غالباً مر چکا ہوگا۔ عبداللہ کی ٹیکسی میں اپنے پہلے اور آخری سفر کے وقت بھی وہ ساٹھ پینسٹھ کے درمیان تو یقیناً رہا ہوگا مگر ہنوز اس کے زندہ ہونے کی موہوم سی امید اس لیے کی جا سکتی تھی کہ مغربی ممالک میں دستیاب سہولتوں کے باعث بعض معمر افراد ایشیائی بوڑھوں کی نسبت طویل عمریں پاتے ہیں۔ خود عبداللہ ہی اب ستر کے لگ بھگ تھا۔ بوڑھے کی بات اسے اکثر یاد آتی، اس نے کہا تھا۔ "میں تو سمجھتا تھا تم لوگ جنگلوں میں درختوں پر رہتے ہوگے۔"

"ہم کوئی بندر ہیں جو تم ایسا سمجھتے تھے۔" عبداللہ نے جواباً کہا تھا۔

"غریب ملکوں میں لوگ جنگلوں ہی میں تو رہتے ہیں۔" بوڑھا بولا تھا۔

"اتنے بھی غریب نہیں ہم..... کبھی موقع ملے تو جا کر دیکھو ہمارے ہاں پیسے والے لوگ کیسے کیسے شاندار گھروں میں رہتے ہیں۔" عبداللہ نے فخر سے کہا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ عبداللہ کو خاصی فراغت نصیب آ گئی تھی۔ بچے اپنے گھر بار کے ہو گئے تھے۔ بیوی کے ساتھ وہ ہر سال حرم پاک کی زیارت کو جاتا۔ ہر سال نہ سہی، دوسرے سال وطن بھی ضرور جاتا۔ گزرے برسوں میں وطن عزیز کے خدوخال بہت بدل گئے تھے۔ حکمرانوں کا طرزِ حکمرانی، عوام کی بود و باش سبھی کچھ تو بدل گیا تھا۔ نہ وہ روایات رہی تھیں، نہ وہ اقدار۔ معاشرہ ہر اعتبار سے تنزلی کا شکار تھا۔ مکان پہلے سے زیادہ بڑے ہو گئے تھے مگر دل پہلے سے کہیں چھوٹے۔ محبت، یگانگت، اخلاص کا رنگ اڑ چکا تھا۔ انسانیت متاعِ گمشدہ بن گئی تھی۔ ملک تو دو پارہ ہوا ہی تھا، خاندانوں کا شیرازہ بھی بکھر چکا تھا۔ بھائی، بھائی کا دشمن۔ گھروں میں آپا دھاپی سڑکوں پر وحشت۔ ہر شخص دوسرے کو روندتے ہوئے گزرنا چاہتا۔ زبردست، زبردست کو پامال کر دینا فرضِ عین سمجھتا۔ جنگل کا قانون بھی کچھ تو بھلا ہوتا ہوگا۔ عبداللہ جب وطن آتا، دل گرفتہ ہی ہو کر واپس لوٹتا۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ رہی تھی۔ یہاں لوگ اپنی ذات کے دائرے ہی سے نہ نکل پا رہے تھے۔ عوام کو روٹی کا چکر، خواص اپنے عشرت کدوں میں محصور۔

عبداللہ شکر کرتا کہ اپنے ٹاؤن ہی کو اپنی دنیا سمجھنے والا وہ بوڑھا اسے ان دنوں ملا تھا جب اس کا پیارا وطن اس حال میں نہ تھا۔ ورنہ اسے بوڑھے کے اس خیال سے مفر کی کوئی صورت نہ ملتی کہ وہ تو سمجھتا تھا کہ اس کے وطن میں لوگ جنگلوں میں درختوں پر رہتے ہوں گے۔ تب تو ایسا نہ تھا مگر اب عبداللہ وطن آتا تو اسے واقعی یہی لگتا کہ اس کے وطن میں لوگ جنگل ہی میں تو رہ رہے تھے۔

پر عبداللہ پھر بھی ہر سال یومِ آزادی پر ہونے والے تارکینِ وطن کے اجتماع میں پوری قوت سے نعرہ زن ہوتا..... پاکستان زندہ باد!

☆☆☆

وہ شخص جسے علمائے اسلام نے بلعم بن باعور اور بلعم بن باعوراء کے نام سے یاد رکھا ہے اور توریت نے بلعام بن بعور درج کیا ہے، اپنے دور کا بہت بڑا عالم اور عابد و زاہد تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسے اسم اعظم کا علم بھی تھا۔ نہایت مستجاب الدعوات تھا یعنی جو دعا مانگتا فوراً قبول ہوتی تھی۔ اس کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ مشہور یہ ہے کہ اس کی درس گاہ میں طالب علموں کی تعداد بارہ ہزار تھی۔

بلعم بن باعور

رضوانہ ساجد

گھمنڈ اور تکبر اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہمیشہ ناپسندیدہ عمل رہا ہے... وہ بھی ایک نیک شخص تھا۔ اللہ کا ایسا عبادت گزار بندہ کہ جس کی دعائیں فوراً سے پہلے قبول ہو جاتی تھیں مگر... اللہ کے اس انعام کی قدر جب بے قدری میں بدلی تو اس کا بھی حال مستقبل سب بدل گیا کیونکہ... کوئی بھی ایسی خوبی یقیناً اللہ کی بہترین نوازش ہے جس کا غلط استعمال ہمیشہ انجام تباہ کر دیتا ہے۔

اللہ رب العزت کی وحدانیت اور اس کی قدرت

کا بے مثال واقعہ

توریت کے مطابق اردن پار کے شہروں میں سے ایک شہر ''فتور'' میں اس کا قیام تھا۔ یہاں کے بادشاہ کا نام بلق بن صفور تھا۔ یہ بادشاہ نہایت قوی ہیکل اور بہادر تھا۔ یہی حال اس ملک کے باشندوں کا تھا۔ ان لوگوں کی دلاوری کو دیکھ کر کوئی بادشاہ ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا۔ اس بادشاہ کو یہ غرور بھی تھا کہ اس کی رعایا میں بلعم بن باعور بھی ہے جس کی دعاؤں سے وہ ہمیشہ فتح مند رہے گا۔

قرآن مجید کی سورۃ الاعراف میں ایک شخص کا ذکر کیا گیا ہے۔ مفسرین کا خیال ہے کہ یہ اسی بلعم بن باعور کی طرف اشارہ ہے۔

''اور انہیں اس شخص کا حال پڑھ کر سنا دو جس کو ہم نے اپنی آیتیں عطا فرمائیں تو اس نے ان کو اتار دیا پھر شیطان اس کے پیچھے لگا تو وہ گمراہ ہو گیا اور اگر ہم چاہتے تو ان آیتوں سے اس کو بلند کر دیتے مگر وہ تو پستی کی طرف مائل ہو گیا اور اپنی خواہش کے پیچھے چل پڑا تو اس کی مثال کتے کی سی ہو گئی کہ اگر سختی کرو تو زبان نکال کر رہے اور اگر یوں ہی چھوڑ دو تو بھی نکالے ہی رہے۔ یہی مثال ان لوگوں کی ہے جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تو یہ قصہ بیان کر دو تا کہ وہ فکر کریں۔ جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ان کی مثال بُری ہے اور انہوں نے نقصان اپنا ہی کیا۔''

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے قول کے مطابق بلعم بن باعور نے پوری زندگی عبادت و ریاضت میں گزار دی اور اسے کشف بھی ہوتا تھا۔ مشرکوں کی بستی میں یہ تنہا زاہد شب بیدار تھا۔ اس کی دعائیں مقبول ہوتی تھیں۔ شہر والوں کو اس شخص پر بڑا اعتماد تھا اور بادشاہ کو بھی اس کی دعاؤں پر بڑا بھروسا تھا۔

☆☆☆

حضرت موسیٰؑ کی زندگی مبارک کے واقعات میں حضرت یوشع بن نون کا ذکر بہ کثرت آتا ہے۔ یہ حضرت موسیٰؑ کی حیات میں ان کے خادمِ خاص اور حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد ان کے خلیفہ اور جانشین نبوت بنے۔

توریت میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی زندگی ہی میں حق تعالیٰ نے ان پر ظاہر کر دیا تھا کہ یوشع میرا خاص بندہ ہے اور بنی اسرائیل کے نوجوان اسی کی سرکردگی میں کنعان اور بیت المقدس کو جابر مشرکین سے پاک کریں گے۔

مؤرخین نے ان کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے..... یوشع بن نون فراہیم بن یوسف بن یعقوب بن ابراہیم علیہ السلام۔ حضرت ہارونؑ اور حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد یہی یوشع بن نون بنی اسرائیل کے سپہ سالار اور نبی تھے۔

جس یوسف علیہ السلام کی بدولت کنعان کے ستر انسانوں پر مشتمل خاندان کنعان سے ہجرت کر کے مصر میں آباد ہوا تھا، آج اس کے پوتے یوشع کی قیادت میں لاکھوں کی مردم شماری کا یہ خاندان پھر اپنے آباؤ اجداد کے وطن کنعان میں داخل ہونے کو تیار کھڑا تھا۔

یہ وہ نسل تھی جن کے آباؤ اجداد حضرت موسیٰؑ کے ہمراہ مصر سے نکلے تھے اور فرعون کی غرقابی کا واقعہ پیش آیا تھا اور جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا کہ ہم انہیں ان کے باپ دادا کی زمین کا مالک بنائیں گے، یعنی یہ کنعان سے آئے تھے، اسی ملک میں آباد ہوں گے۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ کی معرفت خدا کا حکم ہوا کہ اپنی قوم سے کہو ارضِ مقدس میں داخل ہوں اور وہاں کے جابر و ظالم حکمرانوں کو نکال کر عدل و انصاف کی زندگی بسر کرو۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ فتح تمہاری ہو گی۔

حضرت موسیٰؑ نے ان لوگوں سے کہا کہ اس سرزمین میں داخل ہو جس کو اللہ تعالیٰ نے تم پر فرض کر دیا ہے لیکن بنی اسرائیل نے لڑنے سے انکار کر دیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ تم اور تمہارا خدا جانے اور ان سے لڑے۔ ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس نافرمانی پر حضرت موسیٰؑ پر یہ وحی اتاری۔

''اب ہم نے ان کے لیے یہ سزا مقرر کر دی ہے کہ یہ چالیس سال تک اسی میدان میں بھٹکتے پھریں گے۔ ہم نے ان پر ارضِ مقدس حرام کر دیا ہے۔''

ان چالیس برسوں میں یہ قوم بھٹکتی رہی۔ وہ تمام لوگ مر کھپ گئے جنہوں نے لڑنے سے انکار کیا تھا اور ان کی اولادیں جوان ہو گئیں۔ حضرت موسیٰؑ کی وفات کا وقت بھی قریب آ گیا تب وحی نازل ہوئی۔

''نون کے بیٹے یوشع کو لے کر اس پر اپنا ہاتھ رکھ کیونکہ اس شخص میں روح ہے اور اسے الیعزر کاہن اور ساری جماعت کے آگے کھڑا کر کے ان کی آنکھوں کے سامنے اسے وصیت کر اور اپنے رعب داب سے اسے بہرہ ور کرتا کہ بنی اسرائیل کی ساری جماعت اس کی فرماں برداری کرے۔'' (توریت، باب گنتی)

حضرت موسیٰؑ کے بعد حضرت یوشع بن نون نے بنی اسرائیل کی راہنمائی کی۔ ان کے سامنے جو قوم تھی ان میں کوئی بھی

فرد وہ نہیں تھا جس پر اللہ تعالیٰ کی سزا نازل ہوئی تھی اور چالیس سال کی مدت بھی پوری ہو چکی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوشع کو حکم دیا کہ تم اس قافلے کو لے کر موعودہ سرزمین کی طرف بڑھو اور وہاں عمالقہ اور دوسری جابر قوموں سے جنگ کرو۔ میری مدد تمہارے ساتھ ہے۔

توریت میں ہے:

''میرا بندہ موسیٰ مر گیا ہے، سو اب اٹھ اور ان سب لوگوں کو ساتھ لے کر یردن کے پار اس ملک میں جا، جسے میں ان کو یعنی بنی اسرائیل کو دیتا ہوں۔ جس جس جگہ تمہارے پاؤں کا تلوا ٹکے، اس کو جیسا میں نے موسیٰ کو کہا میں نے تم کو دیا ہے۔ بیابان اور اس بیابان سے لے کر بڑے دریائے فرات تک حیثیوں کا سارا ملک اور مغرب کی طرف بڑے سمندر تک تمہاری حد ہوگی۔ زندگی بھر کوئی شخص تیرے سامنے کھڑا نہ رہ سکے گا۔ جیسا میں موسیٰ کے ساتھ تھا ویسے ہی تیرے ساتھ رہوں گا۔ میں نہ تجھ سے دست بردار ہوں گا، نہ تجھے چھوڑوں گا۔''

حضرت یوشع نے بنی اسرائیل کو خدا کا پیغام سنایا اور وہ سب دشت سینا سے نکل کر ارضِ کنعان کے سب سے پہلے شہر ''اریحا'' کے سامنے جا کر خیمہ زن ہو گئے۔

اریحا کے لوگ دیکھ رہے تھے کہ ایک نئی طاقت ابھر رہی ہے۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ بنی اسرائیل مختلف قوموں سے لڑتے ہوئے اور ''اموریوں'' کا صفایا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں۔ ان کے حوصلے بڑھے ہوئے ہیں۔ ان سے لڑنا آسان نہیں ہوگا۔ بادشاہ بلق نے ایک پہاڑ پر چڑھ کر موآب کے میدانوں کی طرف دیکھا۔ بنی اسرائیل دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی، ان کے خیمے نظر آتے تھے۔ وہ ان کی کثرتِ تعداد دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا۔

اریحا کا یہ شہر یروشلم سے ساٹھ میل دور جنوب مشرق میں واقع تھا اور موآب کا علاقہ کہلاتا تھا اور بحیرہ شور اور مدین کے درمیان واقع تھا۔ بلق بن صفور تنہا نہیں تھا۔ عموری، حطی، کنعانی اور یبوسی اس کی مدد کر رہے تھے۔ ان کے درمیان طے ہو چکا تھا کہ اریحا پر حملے کی صورت میں وہ اس کی مدد کریں گے۔ اس کے باوجود بلق خوفزدہ تھا۔

بلق جب اچھی طرح مشاہدہ کر چکا تو اپنے ہمراہ جانے والے لوگوں کے ساتھ پہاڑ سے نیچے اترا۔ اس کے چہرے سے فکر و پریشانی کے آثار ظاہر تھے۔ وہ اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ اپنے خوف کا اظہار اپنے وزیروں کے سامنے بھی کر بیٹھا۔

''تم نے بنی اسرائیل کے پھیلے ہوئے لشکر کو دیکھا؟ ان کے قدموں سے میدان کی زمین چھپ گئی تھی۔ ان کے خیموں نے دھوپ کو ڈھانپ لیا تھا۔ جو کچھ ہمارے آس پاس ہے، اسے یہ انبوہ ایسا چٹ کر جائے گا جیسے بیل میدان کی گھاس کو چٹ کر جاتا ہے۔''

''اے بادشاہ! تجھے ہماری بہادری پر شک کیوں ہے اور پھر کئی قومیں ہمارے ساتھ ہیں۔ ہمارے دروازے اور قلعہ اتنا مضبوط ہے کہ وہ مہینوں بھی محاصرہ کیے رہیں تو ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔''

''تم نے دیکھا نہیں، اس قوم نے اموریوں کے ساتھ کیا کیا؟''

''ہم اموری نہیں موآبی ہیں۔''

''مجھے خوش کرنے کے لیے اپنی بہادری کے ترانے مت گاؤ۔ مجھے معلوم ہے جب مقابلہ ہوگا تو تم سب مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔''

''ہمیں باہر نکلنے اور لڑنے کی ضرورت نہیں۔ ہم آرام سے بیٹھے ہیں۔ وہ دیواروں سے سر ٹکرا کر خود ہی واپس چلے جائیں گے۔''

''تم چاہتے ہو دوسری قومیں مجھے بزدلی کا طعنہ دیں؟''

''آپ کیا چاہتے ہیں، ہم ان سے باہر نکل کر جنگ کریں؟''

''میں کوئی ایسی تدبیر چاہتا ہوں کہ وہ یہاں سے چلے جائیں۔''

''اگر ہم اپنے خزانے ان کے سرداروں کے حوالے کر دیں تو شاید وہ واپسی کا راستہ لیں۔''

''میرے باپ دادا نے جو خزانے جمع کیے ہیں، وہ ان کے حوالے کر دوں؟ کوئی اور ترکیب نکالو۔''

''ہمیں کوئی اور ترکیب تو نہیں سوجھتی۔''

''پھر تم سب میرے سامنے سے چلے جاؤ۔ میں خود کچھ سوچتا ہوں۔''

بادشاہ نے مجلس برخاست کردی اور محل سے چلا گیا۔ وہ سخت کبیدہ خاطر تھا۔ بیوی نے جب اس کا مزاج مکدر دیکھا تو قریب آ کر بیٹھ گئی اور لگاوٹ کی باتیں کرنے لگی۔

''میں نے ایسا فکرمند آپ کو کبھی نہیں دیکھا۔''

''کبھی ایسے حالات بھی تو نہیں ہوئے۔''

''آپ بنی اسرائیل سے اتنے خوفزدہ کیوں ہیں؟ وہ لوگ تو ہمارے لوگوں کی پنڈلیوں تک بھی نہیں آتے۔ وہ بھلا کیا مقابلہ کریں گے۔''

''تم عورت ہو، ان باتوں کو نہیں سمجھو گی۔ میں دیکھ چکا ہوں ان لوگوں نے ''اموریوں'' کے ساتھ بہت بُرا کیا ہے۔ میں کسی جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتا۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ وہ لڑے بغیر کسی طرح یہاں سے چلے جائیں۔ کوئی ایسی ترکیب بتا سکتی ہو تو بتاؤ ورنہ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔''

''آپ کی رعیت میں ایک شخص بلعم بن باعور بھی تو ہے؟''

''ہاں ہے تو سہی۔ اسے کون نہیں جانتا لیکن اس کا اس جنگ سے کیا واسطہ؟''

''کیا آپ نے یہ نہیں سنا کہ وہ جو بھی دعا..... کرتا ہے قبول ہو جاتی ہے؟''

''سنا کیا ہے، اس کا مظاہرہ میں کئی دفعہ دیکھ چکا ہوں۔''

''پھر اس سے کام کیوں نہیں لیتے؟ اس سے کہیں کہ آپ کے حق میں دعا کرے۔ اس کی دعا سے شاید ہم بنی اسرائیل پر غالب آ جائیں۔''

''تیرا مشورہ ہے تو یہ بھی کر کے دیکھ لیتا ہوں۔''

بادشاہ نے اس وقت تو ملکہ کی تعریف نہیں کی لیکن دل ہی دل میں اس کی دانش مندی کا قائل ہو چکا تھا۔ اس نے فوراً اپنے دربار کے حاضر دماغ قاصدوں کا ایک وفد ترتیب دیا اور بلعم کو کہلا بھیجا۔

''دیکھ ایک قوم مصر سے نکل کر آئی ہے۔ ان سے زمین کی سطح چھپ گئی ہے۔ اب وہ میرے مقابل ہی آ کر جم گئے ہیں۔ سو اب تو آ کر میری خاطر ان لوگوں پر لعنت کر کیونکہ یہ مجھ سے بہت قوی ہیں۔ پھر ممکن ہے میں ان پر غالب آؤں اور ہم سب ان کو مار کر اس ملک سے نکال دیں کیونکہ یہ میں جانتا ہوں کہ جسے تو برکت دیتا ہے اسے برکت ملتی ہے اور جس پر تو لعنت بھیجتا ہے وہ ملعون ہوتا ہے۔''

یہ قاصد بادشاہ کا پیغام لے کر بلعم بن باعور کے پاس پہنچ گئے اور اپنے ساتھ فال کھولنے کا انعام بھی لیتے گئے۔ بادشاہ کا پیغام پہنچایا اور اپنی طرف سے بھی بہت کچھ کہا تا کہ اسے قائل کر سکیں۔

بلعم بن باعور نے ان کی باتیں اطمینان سے سنیں اور پھر ان سے مخاطب ہوا۔

''میں نے تمہاری باتیں سن لیں لیکن میں تمہیں اس وقت جواب نہیں دے سکتا۔ اس کے لیے تمہیں صبح تک انتظار کرنا ہوگا۔ میں رات کو مراقبہ کروں گا۔ جو کچھ خدا مجھ سے کہے گا، اس کے مطابق عمل کروں گا۔ اگر مجھے بددعا کرنے کا حکم ہوگا تو بددعا کروں گا ورنہ تمہیں لوٹا دوں گا۔''

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تو ہمارے ساتھ ابھی چل تا کہ ہم بادشاہ کے سامنے سرخرو ہوں؟'' قاصدوں نے یہ سوچ کر اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہا کہ کل کہیں انکار ہی نہ کر دے۔

''بس ایک دن ہی کی تو بات ہے۔ کل تمہیں جواب مل جائے گا۔''

وہ لوگ اس کی خانقاہ میں ٹھہر گئے اور وہ ایک کمرے میں بند ہو کر خدائی احکامات کے لیے انتظار کرنے لگا۔ وہ حالتِ مراقبہ میں تھا اور کسی خبر کا منتظر تھا۔

رات گزر گئی۔ صبح ہوئی تو بلعم بن باعور کمرے سے باہر نکلا اور قاصدوں کے درمیان آ کر بیٹھ گیا۔

''تم بادشاہ کے پاس لوٹ جاؤ۔ خدا مجھے تمہارے ساتھ جانے کی اجازت نہیں دیتا۔''

یہ وفد واپس ہو گیا۔ اس نے وہ سب باتیں بیان کر دیں جو ان کے اور بلعم کے درمیان ہوئی تھیں۔ بادشاہ ان قاصدوں پر برس پڑا۔ اس کا خیال تھا کہ ان قاصدوں نے بلعم کو قائل کرنے میں سستی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس نے ایک وفد اپنے امراء کا ترتیب دیا اور انہیں حکم دیا کہ جس طرح بھی ہو، بلعم کو میرے پاس لے کر آؤ تا کہ میں اسے ڈرا دھمکا کر راضی کر سکوں۔

یہ وفد بلعم کی خدمت میں حاضر ہوا۔

''کیا تُو یہ سمجھتا ہے کہ بادشاہ تجھے اپنے پاس بلائے بغیر چھوڑ دے گا؟ بادشاہ نے کہلوایا ہے کہ میرے پاس آنے میں تیرے لیے کوئی رکاوٹ نہ ہو کیونکہ میں تجھے عالی منصب پر بٹھاؤں گا اور جو کچھ تُو چاہے گا، تجھے ملے گا۔''

بلعم کو ان کی یہ پیشکش سن کر غصہ آ گیا۔

''کیا تیرا بادشاہ مجھے لالچ دے کر خریدنا چاہتا ہے؟ اگر وہ میرا گھر بھی سونے چاندی سے بھر دے تو بھی وہ مجھے نہیں خرید سکتا۔''

''اے بلعم! تُو کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ اگر تُو نے بادشاہ کے حکم کے خلاف کیا تو اپنے قتل کے لیے تیار ہو جا۔''

بلعم نے انہیں بھی ایک رات کے لیے روک لیا۔

''تم لوگ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ میں خدا کے حکم کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا۔ اب تم لوگ آ ہی گئے ہو تو میں ایک مرتبہ پھر مراقبہ کرتا ہوں۔ دیکھتا ہوں اب خدا کا کیا حکم ہوتا ہے۔''

ان امراء کو وہیں ٹھہرنا پڑا۔

بلعم بن باعور کے کانوں میں بادشاہ کے امراء کی باتیں گونج رہی تھیں۔ اسے دولت کا لالچ تو نہیں تھا لیکن جان کا خوف اس پر طاری ہو گیا۔ اگر وہ بادشاہ کے حکم کے مطابق اس کے پاس نہیں گیا تو وہ اسے قتل کرا دے گا۔ اسے اپنی بیوی سے بہت محبت تھی۔ وہ رات بھر یہ سوچتا رہا کہ اگر وہ قتل ہو گیا تو اس کی بیوی پر کیا گزرے گی۔ اس نے اس خوف سے مراقبہ بھی نہیں کیا کہ فیصلہ کہیں پہلے کی طرح نہ آ جائے۔

صبح ہوئی تو وہ ان کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔ اس نے اپنی گدھی پر زین ڈالی، بیوی کو پوری بات بتائی اور سوار ہو کر چل پڑا۔ امراء اس سے آگے آگے چل دیے تا کہ اس سے پہلے پہنچ کر بادشاہ کو باخبر کر دیں۔

وہ اپنی گدھی پر سوار چلا جا رہا تھا لیکن وہ دیکھ رہا تھا کہ آج گدھی کی رفتار بہت دھیمی ہے۔ پھر بھی وہ اسے برداشت کرتا رہا لیکن ایک جگہ پہنچ کر تو حد ہی ہو گئی۔ گدھی نے شاہراہ کو چھوڑا اور کھیتوں میں چلی گئی۔ بلعم کو غصہ ہی تو آ گیا۔ اس نے گدھی پر ڈنڈے برسائے اور گدھی کو شاہراہ پر لے آیا۔ گدھی چلنے لگی لیکن ایک جگہ پہنچ کر شاہراہ کو چھوڑ کر ایک دیوار سے اس طرح چپک گئی کہ بلعم کا پاؤں دیوار سے ٹکرا کر زخمی ہو گیا۔ اس نے پھر گدھی کو مارا۔ گدھی پھر دیوار چھوڑ کر الگ ہو گئی اور سیدھے راستے پر چل دی لیکن تھوڑی دور چل کر بلعم کو لے کر زمین پر بیٹھ گئی۔ بلعم نے اسے بُری طرح پیٹنا شروع کر دیا۔ اسی وقت خدا نے گدھی کی زبان کھول دی۔

''میں نے تیرے ساتھ کیا کیا ہے جو تُو نے مجھے تین بار مارا، کیا میں وہی نہیں ہوں جس پر تو آج تک سوار ہوتا آیا ہے۔ کیا کبھی میں نے تیرے ساتھ ایسا کیا؟''

گدھی کو بولتے ہوئے سنا تو بلعم کے ہوش اڑ گئے۔ وہ سمجھ گیا کہ معاملہ کچھ اور ہے ورنہ بھلا گدھی کبھی بولتی ہے۔ اسی وقت خدا کے فرشتے نے اسے پکارا۔

''دیکھ، میں تجھ سے مزاحمت کرنے آیا ہوں کیونکہ تیری چال ٹیڑھی ہے۔ گدھی نے مجھے دیکھا اور وہ تین بار میرے سامنے سے مڑ گئی۔''

''مجھ سے خطا ہوئی۔ اگر اب تجھے بُرا لگتا ہے تو میں لوٹ جاتا ہوں۔'' بلعم نے کہا۔

''اب تو ان آدمیوں کے ساتھ چلا ہی جا لیکن فقط وہی بات کہنا جو میں تجھ سے کہوں۔'' فرشتے نے کہا۔

گدھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ اس پر بیٹھا اور چل دیا۔

بادشاہ کے امراء نے آگے جا کر بادشاہ کو خبر پہنچا دی تھی کہ بلعم آ رہا ہے۔ بادشاہ نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا لیکن ساتھ ہی اپنا دل بھی اس پر کھول دیا۔

''تو نے میرے پاس آنے میں دیر کیوں کی۔ کیا تجھے یہ زیب نہیں دیتا تھا کہ میرے پاس پہلے بلاوے پر ہی چلا آتا؟''

بلعم نے اس کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور بادشاہ کے ساتھ محل میں آ گیا۔ بادشاہ نے اس کی خوب خاطر مدارات کی جیسی کہ مہمانوں کی، کی جاتی ہے اور دوسرے دن اسے ایک بلند مقام پر لے گیا۔ بلعم نے دور دور تک پھیلے ہوئے اسرائیلیوں کو دیکھا۔

''یہ ہے وہ قوم جو ٹڈیوں کی طرح میرے ملک پر حملہ آور ہو گئی ہے اور میرا محاصرہ کیے پڑی ہے۔ تو ان کے لیے لعنت

کرتا کہ یہ مجھے چھوڑ کر چلے جائیں یا اگر جنگ ہو تو انہیں شکست سے دوچار ہونا پڑے۔"

"میں اس پر لعنت کیسے کروں جس پر خدا نے لعنت نہیں کی۔" بلعم نے عجیب بات کہہ دی کہ بادشاہ کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

"میں نے تجھے اس لیے بلایا تھا کہ تو میرے دشمنوں پر لعنت کرے لیکن تو ان کو برکت دے رہا ہے۔"

"میں کیا کروں، کہنا کچھ اور چاہتا ہوں اور میرے منہ سے نکلتا کچھ اور ہے۔"

"پھر تو یہی ہو سکتا ہے کہ میں تجھے قتل کر دوں۔ نافرمانوں کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے۔"

"اے بادشاہ! ایسا ہرگز نہ کرنا۔ تو مجھے کسی اور پہاڑی پر لے چل۔ شاید وہاں لعنت کے الفاظ میری زبان پر آ جائیں۔" بادشاہ اسے دوسرے مقام پر لے گیا۔ وہاں جا کر بھی بلعم کی زبان سے برکت ہی کے الفاظ ادا ہوئے۔

"دیکھ، مجھے تو برکت دینے کا حکم ملا ہے۔ میں اسے پلٹ نہیں سکتا۔"

اب تو بادشاہ کے طیش کا کوئی اندازہ ہی نہیں لگا سکتا تھا۔ اس نے بلعم سے صاف کہہ دیا کہ اب تُو اپنی موت کے لیے تیار ہو جا۔ بلعم نے پھر اس سے درخواست کی۔

"اے بادشاہ! مجھے قتل میں جلدی نہ کرو۔ میں ایک مرتبہ پھر کوشش کرتا ہوں۔ تُو مجھے ایسی جگہ لے چل جہاں سے میں بنی اسرائیلیوں کو دیکھ نہ سکوں۔ شاید اس طرح لعنت کے الفاظ میرے منہ سے ادا ہو جائیں۔" بادشاہ اسے بیابان کی طرف لے گیا۔ بلعم نے سوچ لیا تھا کہ اس مرتبہ وہ لعنت کے الفاظ ضرور ادا کرے گا لیکن اس مرتبہ بھی اس کے برعکس الفاظ ادا ہوئے۔

"جو تجھے برکت دے، وہ مبارک اور جو تجھ پر لعنت کرے وہ ملعون ہوا۔"

بادشاہ کے غضب کو اب کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ اس نے اپنے ساتھ آئے ہوئے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ بلعم کو گرفتار کر لیں اور قید خانے میں ڈال دیں۔ اگر یہ پھر بھی نہ مانا تو میں اسے قتل کیے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔

بلعم کو قید خانے میں ڈال دیا گیا۔

وہ جلادوں کو اس کے قتل کا حکم دے ہی چکا تھا کہ اس کے ایک بااعتبار امیر نے اسے مشورہ دیا کہ اسے قتل نہ کیا جائے بلکہ اسے مجبور کیا جائے کہ وہ بددعا دینے پر تیار ہو جائے۔ امیر نے اسے اطلاع دی کہ بلعم خود بوڑھا ہے لیکن اس کی بیوی جوان ہے اور بہت خوبصورت بھی۔ یہ بوڑھا اس سے بہت محبت کرتا ہے اور اس کی ہر بات مانتا ہے۔ اگر کسی طرح اس کی بیوی کو شیشے میں اتار لیا جائے اور وہ بلعم کو مجبور کرے تو وہ ضرور بنی اسرائیل کو بددعا دے گا۔

بادشاہ کو یہ مشورہ پسند آیا۔ بلعم ابھی قید خانے ہی میں تھا کہ بادشاہ نے اس کی بیوی کو بلوا لیا۔ وہ بے چاری ڈرتی ڈرتی گئی۔ اس کا شوہر بھی گھر نہیں پہنچا تھا اور اب بادشاہ نے اسے بھی بلوا لیا تھا۔ ڈرنا تو لازمی تھا۔ اسے محل میں لا کر بادشاہ کے روبرو پیش کر دیا گیا۔ بادشاہ نے اسے تمام قصہ تفصیل سے سنایا۔

"ہم تو اس مصیبت میں گرفتار ہیں اور تیرا شوہر یوشع بن نون کو بددعا دینے کو تیار نہیں۔ میں نے تجھے اس لیے بلوایا ہے کہ تو مجبور کر ورنہ میں اسے قتل کرنے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔ تو اگر اس کی جان بچانا چاہتی ہے تو اسے مجبور کر۔"

"میں اس کے کاموں میں دخل نہیں دیتی اور نہ وہ میری سنتا ہے۔ وہ جو بہتر سمجھے گا وہی کرے گا۔ میں کچھ نہیں کر سکتی۔"

"کیا تجھے یہ خوف بھی نہیں کہ اسے قتل کر دیا جائے گا؟"

"مجھے دکھ ضرور ہو گا لیکن اے بادشاہ میں کیا کر سکتی ہوں۔ وہ میری بات ہرگز نہیں مانے گا۔"

تب بادشاہ کو خیال آیا کہ وہ ایک عورت ہے اور اسے کس طرح جال میں پھنسایا جا سکتا ہے۔ اس نے سونے کے زیورات اس کے سامنے رکھ دیے۔

"اپنے شوہر کو اگر بددعا دینے پر راضی کر لو تو یہ سب تمہارے ہیں۔"

بلعم بن باعور زاہدانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کی بیوی نے ایک ساتھ اتنے زیور کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اس نے بادشاہ کی موجودگی کا خیال بھی نہیں کیا اور زیورات اٹھانے کے لیے لپکی۔

"یہ سب تیرے ہی ہیں لیکن ابھی نہیں۔" بادشاہ نے کہا۔ "تو اپنے شوہر کو یوشع کے خلاف بددعا دینے پر راضی کر لے۔ جب میں دیکھوں گا کہ بددعا کے اثرات ظاہر ہونے لگے اور بنی اسرائیل محاصرہ اٹھا کر جا رہے ہیں تو یہ سب زیور میں تجھے دوں گا۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تجھے ملے گا۔"

عورت اب پوری طرح بادشاہ کے قابو میں آ چکی تھی۔

''میں اس سے بددعا کیسے کراؤں؟ تُو نے تو اسے قید میں ڈالا ہوا ہے۔ اسے قید سے رہا کر دے۔ وہ گھر آئے گا تو میں اسے مجبور کر سکوں گی۔''

عورت بادشاہ سے وعدہ کر کے واپس چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد بلعم بن باعور کو بھی رہا کر دیا گیا۔ وہ گھر پہنچا تو بیوی پریشان بیٹھی تھی۔

''تم کہاں چلے گئے تھے؟ یہ بھی نہ سوچا کہ میں کتنی پریشان ہو رہی ہوں گی۔''

بلعم نے جو کچھ اس پر گزری تھی، وہ سب بپتا سنا دی۔ بیوی کو یہ ساری باتیں پہلے ہی معلوم تھیں لیکن وہ انجان بنی رہی اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔

''بھلے آدمی! تم نے اگر بادشاہ کی بات مان لی ہوتی تو یہ تکلیفیں اٹھانی نہ پڑتیں۔''

''میں اس کی بے جا بات کیسے مان لوں؟ میں تو بددعا کرنے گیا بھی تھا لیکن خدا نے میری زبان پر کوئی اور کلمات جاری کر دیے۔''

''بس بس، زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ تم دل سے چاہتے ہی نہیں کہ یوشع کے خلاف بددعا کرو۔ تم تو یہ چاہتے ہو کہ تمہیں قتل کر دیا جائے اور میں بیوہ ہو جاؤں۔''

''مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ یوشع اللہ کے نبی ہیں۔ میں پیغمبر کے خلاف بددعا نہیں کر سکتا۔''

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم جھوٹ بھی بولنے لگے ہو۔'' بیوی رونے لگی۔

''میں جھوٹ کیوں بولوں گا۔ یوشع اللہ کے نبی ہیں اور تمہیں اس معاملے میں بولنے کی ضرورت نہیں۔''

''کیوں نہ بولوں؟ اگر یوشع کو فتح مل گئی تو وہ ہماری قوم کے کسی بھی آدمی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

''میں نے بادشاہ سے کہا تھا کہ وہ یوشع سے صلح کر لے۔ اس پر ایمان لے آئے لیکن وہ نہیں مانا۔''

''جب وہ نہیں مانا تو تم مان جاؤ۔ ذرا دیر کی تو بات ہے، اپنی زبان ہلا دو اور بددعا کر دو۔ سوچو اگر بادشاہ ہم سے خوش ہو گیا تو ہمیں مالا مال کر دے گا۔''

''یہ خدا کے راز ہیں تُو انہیں نہیں سمجھے گی۔ بہتر تو یہ ہے کہ تُو اس معاملے سے الگ ہو جا۔''

''میں کیسے الگ ہو جاؤں؟ مجھے تو اپنی بربادی صاف نظر آ رہی ہے۔''

''پھر ایسا کر کہ تُو میری طرف سے بادشاہ کے پاس جا اور اس سے کہہ کہ بنی اسرائیل کے لشکر میں بڑی تعداد میں لڑکیاں بھیج۔ جب وہ فحاشی میں مبتلا ہو جائیں گے تو خدا ان کی طاقت سلب کر لے گا اور ان کے دلوں میں تیرا خوف بیٹھ جائے گا۔''

''وہ بھلا میری بات کیوں مانے گا؟''

''اس سے کہنا یہ سب باتیں بلعم کو کشف کے ذریعے معلوم ہوئی ہیں۔ خدا یہی چاہتا ہے۔''

''اگر وہ نہ مانا تو؟''

''تو پھر میں کچھ اور سوچوں گا۔''

''تم خود کیوں نہیں جاتے..... مجھے کیوں بھیجتے ہو؟''

''اگر میں گیا تو وہ مجھے دوبارہ گرفتار کر لے گا۔ بہتر ہے تم جاؤ۔''

اس کی بیوی تیار ہو گئی اور بادشاہ کے پاس جانے کے لیے روانہ ہوئی۔ وہ ابھی کچھ ہی دور گئی تھی اور انگوروں کے ایک باغ کے قریب سے گزر رہی تھی کہ ایک باریش بزرگ اچانک اس کے سامنے آ گئے۔ وہ انہیں دیکھ کر ڈر گئی لیکن پھر ان کی بزرگی کو دیکھ کر مطمئن بھی ہو گئی۔ وہ اس کا نام لے کر پکار رہے تھے اور اسے حیرت ہو رہی تھی کہ یہ بزرگ اس کا نام کیسے جانتے ہیں۔

''ڈرو نہیں۔ میں کوئی اور نہیں اللہ کا بھیجا ہوا فرشتہ ہوں۔''

یہ کوئی فرشتہ نہیں بلکہ ابلیس ملعون تھا جو خود کو فرشتہ ظاہر کر کے بلعم کی بیوی کو بہکانے آیا تھا۔

''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''یہ بتانے آیا ہوں کہ تُو جس کام سے بادشاہ کے پاس جا رہی ہے، وہ ہرگز پورا نہیں ہو گا۔ بادشاہ تیرے بتائے ہوئے مشورے پر عمل نہیں کرے گا اور تجھے قید کر لے گا۔''

''مگر اس نے تو مجھے زیورات دینے کا وعدہ کیا تھا۔''
''صرف اس صورت میں کہ بلعم بددعا کرے۔''
''میں تو اسے سمجھا بجھا کر تھک گئی۔ وہ بددعا دینے پر تیار ہی نہیں ہوتا۔''
''تو بڑی نادان ہے۔ تیرے پاس ایک ایسا ہتھیار ہے کہ بلعم فوراً مان جائے گا۔ اگر وہ بددعا کرنے سے انکار کرے تو، تُو اس سے طلاق کا مطالبہ کر دے۔ وہ تجھے طلاق ہرگز نہیں دے گا اور یوشع کے حق میں بددعا کر دے گا۔ بادشاہ خوش ہو کر تیرا گھر سونے چاندی سے بھر دے گا۔ کیا تو نہیں چاہتی کہ تیرے پاس بیش قیمت زیورات ہوں؟''
''چاہتی تو ہوں لیکن بلعم نے مجھے طلاق دے دی اور بددعا پھر بھی نہیں دی تو کیا ہوگا؟''
''وہ تجھے ہرگز طلاق نہیں دے گا۔''
''اب کیا کروں؟''
''بادشاہ کے پاس مت جا، گھر لوٹ جا اور جو میں نے بتایا ہے اس پر عمل کر۔'' اس بوڑھے آدمی نے کہا اور اچانک غائب ہو گیا۔ اس کے اس طرح غائب ہو جانے سے اس عورت کو یقین آ گیا کہ وہ واقعی فرشتہ تھا حالانکہ وہ ابلیس تھا۔
بلعم کی بیوی نے ابلیس کی بات مان لی اور بادشاہ کے پاس جانے کے بجائے گھر لوٹ آئی۔ اسے معلوم تھا کہ بلعم اس وقت اپنے شاگردوں کے پاس ہوگا اور شام سے پہلے گھر لوٹ کر نہیں آئے گا۔ اسے معلوم ہی نہ ہو سکے گا کہ وہ کتنی جلدی گھر لوٹ کر آ گئی ہے۔
بلعم شام کو گھر آیا تو اس کی بیوی منہ پھلائے بیٹھی تھی۔ بلعم کو دیکھتے ہی اس پر برس پڑی۔
''تیرے ساتھ میں بھی ماری جاؤں گی۔ بادشاہ نے تیری پیشکش ٹھکرا دی ہے۔ وہ کہتا ہے اگر تُو نے بددعا نہیں کی تو وہ تیرے ساتھ مجھے بھی قتل کرا دے گا۔ اس لیے میں کہتی ہوں کہ تو مجھے طلاق دے دے۔ میں بادشاہ سے کہہ تو سکوں گی کہ میرا اب بلعم سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ مجھے قتل نہ کرے۔''
''تو بادشاہ سے ڈرتی ہے، میں خدا سے ڈرتا ہوں۔ میں پیغمبر پر لعنت کیسے بھیجوں؟''
''تو پھر مجھے طلاق دے۔''
''چل ہم یہاں سے کہیں بھاگ جائیں۔''
''مجھے طلاق دے دے پھر تیرا جہاں جی چاہے چلے جانا۔''
''یہ تجھے طلاق کی کیوں لگ گئی ہے؟ تجھے معلوم ہے میں تجھ سے کتنی محبت کرتا ہوں۔''
''اگر محبت کرتا ہے تو میری بات مان کیوں نہیں لیتا۔ تیرا کیا جاتا ہے؟ تو یوشع کے حق میں بددعا کیوں نہیں کرتا؟''
''میں خدا کے حکم کے برخلاف کیسے کروں؟ میری تمام عبادت میرے خلاف گواہی دے گی۔''
''میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے طلاق دے اور اپنا راستہ الگ کر لے۔''
بلعم اسے پیار سے، نرمی سے سمجھاتا رہا لیکن اس کے کانوں میں تو ابلیس کی آواز گونج رہی تھی کہ بلعم کو طلاق کی دھمکی دے، وہ تیرا کہا مان لے گا پھر بادشاہ نے جو زیور دکھائے ہیں، وہ سب تیرے ہوں گے۔ وہ اپنی ضد پر اڑی رہی۔ اس نے یہ دھمکی بھی دے دی کہ وہ اس وقت تک نہ کچھ کھائے گی، نہ پیے گی جب تک اسے طلاق نہیں مل جاتی یا بلعم بادشاہ کا کہنا مان نہیں لیتا۔
بلعم سخت پریشان تھا۔ بیوی کو طلاق بھی دینا نہیں چاہتا تھا اور بددعا کے حق میں بھی نہیں تھا۔ پھر اس نے بیوی کی محبت میں وہ کیا جو اسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ بددعا کرنے پر تیار ہو گیا۔
اس نے بڑے اہتمام سے غسل کیا اور کہیں جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اس کی اس تیاری کو اس کی بیوی بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ آخر پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔
''بادشاہ کے پاس جا رہے ہو یا مجھے طلاق دے کر کہیں جانے کا ارادہ ہے؟''
''دونوں میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے۔ میں تیری خاطر جنگل میں جا رہا ہوں تاکہ وہاں سکون سے بیٹھ کر یوشع کو بددعا دے سکوں۔''
''جنگل میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ بددعا تو یہاں بیٹھ کر بھی دی جا سکتی ہے۔ ضرور تم مجھے دھوکا دے کر

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

قرآن وسنت۔ فزکس، کیمسٹری وغیرہ آپ کو ڈاکٹر اور سائنس دان تو بنا سکتے ہیں لیکن انسان بننے کے لیے آپ کو قرآن اور سنت کی طرف ہی آنا پڑے گا۔

تکبر و مایوسی۔ کامیابی کو دماغ میں اور ناکامی کو دل میں جگہ مت دو کیونکہ کامیابی دماغ میں تکبر اور ناکامی دل میں مایوسی پیدا کرتی ہے۔

کاروبار۔ جب تعلیمی ادارے، کاروباری ادارے بن جائیں تو تربیت یافتہ افراد بکنا شروع ہو جاتے ہیں۔

تربیت۔ بدتمیزی تو ہر انسان کر سکتا ہے مگر کسی کو اس کی تربیت روک لیتی ہے۔

منع ہے۔ ہنسنا منع ہے (1) قبرستان میں (2) جنازے کے ساتھ (3) علمائے دین کی محفل میں (4) مسجد میں (5) تلاوتِ کلام پاک کرتے وقت (6) اذان کے دوران (7) نماز پڑھتے ہوئے۔

قبول کرلو۔ (1) ماں باپ کا حکم چاہے وہ ناگوار ہی کیوں نہ ہو۔ (2) دوست کا تحفہ چاہے وہ حقیر ہی کیوں نہ ہو۔ (3) نصیحت کی بات چاہے وہ کڑوی ہی کیوں نہ ہو۔ (4) غریب کی دعوت چاہے اس میں تکلیف ہی کیوں نہ ہو۔ (5) نیک بیوی کی محبت چاہے وہ بدصورت ہی کیوں نہ ہو۔

ساتھ۔ ماں باپ کو ساتھ رکھا نہیں جاتا بلکہ ان کے ساتھ رہا جاتا ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ماں باپ کو اپنے ساتھ رکھ کر وہ کوئی احسان کر رہے ہیں تو وہ جان لیں کہ ماں باپ کا قرض کبھی ادا نہیں ہو سکتا اور یہ جو آپ کے پاس اتنا کچھ ہے، یہ سب ان کی (ماں باپ) کی محنت اور دعاؤں کا ثمر ہے۔ مسلمانوں کے زوال کے نہ رکنے کا سبب یہ ہے کہ ہم نے آسانیاں تقسیم کرنے کے بجائے رکاوٹیں کھڑی کرنے کا فن سیکھ لیا ہے۔ (اشفاق احمد)

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، حیدرآباد

جا رہے ہو۔''

''وہاں بیٹھ کر چلہ کھینچوں گا۔ اس کے بعد دعا کروں گا۔''

''تم جیسا عقل مند آدمی ایسی بے وقوفی دکھائے گا، یہ مجھے امید نہیں تھی۔ بنی اسرائیل کی فوجیں کیا تمہارا چلہ ختم ہونے کا انتظار کریں گی؟ وہ اس سے پہلے ہی حملہ آور ہو گئے تو کیا ہوگا؟ بادشاہ نے مجھ سے کہہ دیا ہے کہ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں۔ تمہیں جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو ورنہ مجھے طلاق دو۔''

''نیک بخت! تیری ضد نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ میں پہلے تو خدا سے گڑگڑا کر دعا کروں گا کہ وہ مجھے معاف کر دے، اس کے بعد یوشع کے لیے بددعا کروں گا۔ یاد رکھ، میں وہ کام کر رہا ہوں جس کے میں حق میں نہیں۔ تو مجھے جانے دے۔ میں تیری خوشی کے لیے بددعا کروں گا۔''

وہ اپنی گدھی پر سوار ہوا اور جنگل کی طرف چل دیا۔ شہر سے نکلتے ہی اس کی گدھی نے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ وہ ڈنڈے مارتا رہا اور اسے چلاتا رہا لیکن جب اس کی گدھی نے چلنے سے بالکل ہی انکار کر دیا تو بلعم کے دل پر خوف طاری ہو گیا۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ بادشاہ سے ملنے گیا تھا تو اس کی گدھی نے یہی حرکت کی تھی اور خدا کے فرشتے نے اسے تاکید کی تھی کہ وہ یوشع پر لعنت نہ بھیجے۔ اس کا مطلب ہے اب پھر مجھ سے یہی کہا جا رہا ہے کہ میں اس ارادۂ بد سے باز آجاؤں۔ اس نے طے کر لیا کہ اب وہ جنگل کی طرف نہیں جائے گا، واپس گھر چلا جائے گا۔ اگر بیوی کہے گی تو وہ اسے طلاق بھی دے دے گا۔ اس نے اپنے دل میں جیسے ہی اس خیال کو جگہ دی ایک سفید ریش بزرگ اسے اپنی طرف آتا ہوا نظر آیا۔ بلعم اسے دیکھ کر رک گیا کہ شاید وہ میری مدد کرے۔ وہ واقعی اس کی مدد کے لیے آیا تھا۔ آتے ہی اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کرنے لگا۔

''بلعم بن باعور! اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو اور کس پریشانی میں ہو؟''

بلعم بن باعور حیران تھا کہ وہ تو اس شخص کے بارے میں نہیں جانتا اور وہ ہے کہ اس کا نام تک جانتا ہے۔

یہ دراصل شیطان تھا جو انسانی روپ میں اس کے سامنے آیا تھا۔ اس نے پہلے تو بلعم کی بیوی کو ورغلایا تھا اور اب اس

کے سامنے تھا۔ شیطان اس بات سے اچھی طرح واقف تھا کہ جب تک کسی کے دل میں غرور پیدا نہ ہو، وہ راندۂ درگاہ نہیں ہوسکتا۔ وہ خود اس منزل سے گزر چکا تھا۔ اس نے غرور کیا تھا اس لیے راندۂ درگاہ ہوا تھا اور یہ عہد کر کے آسمان سے اترا تھا کہ میں تیرے نیک بندوں کو بہکاتا رہوں گا۔ اسے معلوم تھا کہ بلعم بن باعور نہایت عبادت گزار ہے۔ اس کی یہ عبادتیں اسی وقت رائگاں ہوسکتی ہیں جب اسے اپنی عبادتوں پر ناز ہونے لگے۔ اس کی عاجزی اس سے چھین لی جائے، اسی وقت کامیابی مل سکتی ہے۔

اسے خاموش دیکھ کر بلعم نے اس سے پوچھا۔

''ظاہر تو یہی ہوتا ہے کہ آپ کوئی پہنچے ہوئے بزرگ ہیں لیکن اس سے پہلے میں نے آپ کو دیکھا نہیں۔''

''اے خدا کے نیک بندے! تو ایسا عبادت گزار ہے کہ خدا کے سوا کسی کو دیکھتا ہی نہیں۔ مجھے تو تیری عبادتوں پر رشک آتا ہے۔ تُو نے خدا کے سوا کسی کو دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی ورنہ تو یہاں مجھے سب لوگ جانتے ہیں۔ میں تجھ سے ملنے اور تیرا مرید ہونے کے لیے بے تاب تھا، شکر ہے آج موقع مل گیا۔ میری عبادتیں تیرے سامنے ہیچ ہیں لیکن میں تیری مدد تو کرسکتا ہوں۔''

''بھائی بات یہ ہے۔'' بلعم نے کہنا شروع کیا۔ ''یوشع بن نون پیغمبروں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور خود بھی پیغمبر ہیں۔ بادشاہ کہتا ہے میں ان کے خلاف بددعا کروں اور اب تو میری بیوی بھی بادشاہ کے ساتھ مل گئی ہے۔''

''تمہیں کس نے کہا کہ یوشع کے خلاف بددعا نہ کرو۔''

''ایک فرشتہ مجھ پر ظاہر ہوا تھا۔ اس نے مجھے روک دیا۔''

''تم اپنی سادگی سے مات کھا گئے اور شیطان کو فرشتہ سمجھ بیٹھے۔ شیطان کب چاہے گا کہ تم اپنے ملک وقوم کو بچانے کے لیے یوشع کے حق میں بددعا کرو اور لوگ تمہاری بزرگی کے قائل ہوجائیں اور یوشع سے بڑا مرتبہ تمہیں مل جائے۔ خدا بھی خوش ہوجائے کہ تم نے نیک کام کیا۔''

''اگر ایسا تھا تو یہ کیوں ہوا کہ جو میں کہنا چاہتا تھا، وہ الفاظ میری زبان سے جاری ہی نہیں ہوئے؟''

''یہ کارستانی بھی شیطان ہی کی تھی۔ اس نے تمہاری زبان بند کردی تھی ورنہ بادشاہ تمہیں خوش کردیتا اور تمہاری بیوی بھی تم سے باغی نہ ہوتی۔''

سامنے کھڑے شیطان کی باتیں بلعم کے دل میں اترتی جارہی تھیں۔ اسے اپنے بارے میں احساس محرومی ہورہا تھا کہ وہ شیطان کی باتوں میں آگیا ورنہ لوگ آج میری بزرگی کے قائل ہوچکے ہوتے۔ اب یہ حال ہے کہ ہر طرف سے مجھے پھٹکار پڑ رہی ہے۔ میری بیوی الگ مجھ سے نالاں ہے۔ میں اگر یوشع کے حق میں بددعا کردوں تو وہ خوش ہوجائے گی۔ اگر وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی تو ایسی خوبصورت بیوی اس بڑھاپے میں مجھے کہاں ملے گی۔

''بلعم! کیا سوچنے لگے؟'' ابلیس نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔

''سوچ رہا ہوں اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

''یہ بھی کوئی سوچنے کی بات ہے۔ تم نے اگر بددعا دے دی تو خدا کی زمین پر خون بہنے سے بچ جائے گا۔ ہزاروں شہریوں کی زندگی بچ جائے گی۔ وہ تمہیں دعائیں دیں گے۔ خلق خدا کی دعائیں لینا کتنی بڑی عبادت ہے۔ بادشاہ بھی تم سے خوش ہوجائے گا اور کیا خبر خدا تمہیں وہی مرتبہ دے دے جو یوشع بن نون کو حاصل ہے۔ پیغمبری کا تاج ان کے سر سے اتار کر تمہارے سر پر سجادے۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' بلعم نے خوش ہوکر پوچھا۔

''کیوں نہیں ہوسکتا۔ تم کیا زہد وتقویٰ میں یوشع سے کم ہو؟''

''میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ میری بیوی مجھ سے طلاق کی ضد نہ کرے۔ مجھ سے خوش رہے۔''

''پھر تو اور بھی ضروری ہے کہ تم اس کا کہنا مان لو اور خدا تک اپنی درخواست پہنچاؤ۔''

''اس گدھی کا کیا کروں؟ یہ تو مجھے پہاڑی تک نہیں پہنچائے گی جہاں پہنچ کر مجھے چلہ کھینچنا ہے۔''

''اب چلے کا وقت نہیں۔ تمہاری دعا رد ہو ہی نہیں سکتی۔ پہاڑ پر جانے کے بجائے جنگل میں داخل ہوجاؤ اور وہاں رو رو کر دعائیں مانگو۔''

''پھر تو اس گدھی کی ضرورت بھی نہیں ہوگی۔''

''اسے یہیں چھوڑ دو اور پیدل جنگل میں داخل ہو جاؤ۔''

بلعم اب کسی بچے کی طرح شیطان کی باتوں پر عمل کر رہا تھا۔ اس نے ہدایت مانی اور پیدل جنگل کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں کی تنہائی میں وہ حضرت یوشع کے خلاف بددعائیں کرتا رہا۔

اس کی بیوی نے گھر سے نکل کر چیخ چیخ کر کہنا شروع کر دیا تھا کہ بلعم نے جنگل میں جا کر بددعا دینا شروع کر دی ہے۔ اب بنی اسرائیل الٹے پاؤں بھاگ جائیں گے اور اگر جنگ کریں گے تو زبردست شکست کا سامنا ہوگا۔ یہ باتیں بادشاہ تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ اسے یقین ہو گیا کہ بلعم کی بددعا ضرور اثر دکھائے گی۔ اس سے پہلے کہ بنی اسرائیل محاصرہ چھوڑ کر جائیں، باہر نکل کر ان کا مقابلہ کیا جائے تاکہ انہیں شکست ہو اور ان کے اتنے لوگوں کو قتل کر دیا جائے کہ ان کی تعداد ہی کم ہو جائے۔ اگر اس وقت وہ محاصرہ اٹھا کر چلے گئے تو پھر کسی وقت آ جائیں گے اور اب سے زیادہ تعداد میں آئیں گے لہٰذا اس وقت ان کو ایسا سبق سکھایا جائے کہ آئندہ اس طرف کا رخ نہ کریں۔

اس نے اپنے امراء کا اجلاس طلب کیا جس میں اس کے اتحادی بھی شامل تھے۔ بادشاہ نے جب اپنا ارادہ ان پر ظاہر کیا تو سب نے اس کی حمایت کی۔ بلعم کی بددعا پر سب کو بھروسا تھا اس لیے سب کی ہمتیں بڑھ گئی تھیں۔ سب کو یقین تھا کہ اگر ہم نے جنگ میں پہل کی تو فتح ہماری ہوگی۔ ابھی یہ بحث چل ہی رہی تھی کہ ایک شخص نے آ کر یہ اطلاع دی کہ بنی اسرائیل بڑے بڑے رستے ڈال کر شہر پناہ کی دیوار گرانے کی کوششوں میں مشغول ہیں۔ اگر انہوں نے دیوار گرا لی تو وہ اچانک شہر میں داخل ہو جائیں گے اور شہریوں کو قتل کریں گے لہٰذا ضروری ہو گیا ہے کہ ان سے باہر نکل کر جنگ کی جائے اور چونکہ بلعم کی بددعا اپنا اثر دکھانے والی ہے، اس لیے انہیں ضرور شکست ہو جائے گی۔ بادشاہ کے اتحادیوں کو یہ فکر تھی کہ بنی اسرائیل صرف ''اریحا'' تک محدود نہیں رہیں گے، وہ ان کے شہروں پر بھی قبضہ کر لیں گے لہٰذا سب مل کر ''اریحا'' کو بچا لیں گے۔ اتحادیوں نے تیاری کی اور شہر سے باہر نکل آئے۔ بنی اسرائیل کا لشکر یہ سوچ کر مطمئن تھا کہ بلق اور اس کے اتحادی باہر نکل کر حملہ کرنے کی ہمت نہیں کریں گے لہٰذا وہ صرف محاصرہ کیے پڑے تھے۔ بلق اور اس کے اتحادیوں نے باہر نکل کر اس زور کا حملہ کیا کہ بنی اسرائیل کو ہتھیار سنبھالنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ جب لشکری تیزی سے قتل ہونے لگے تو بنی اسرائیل نے پیچھے ہٹنے ہی میں عافیت جانی۔ بنی اسرائیل تیزی سے پیچھے ہٹنے لگے۔

بنی اسرائیل کی یہ حالت دیکھ کر شہریوں نے جشن منانا شروع کر دیا۔ وہ شہر کی فصیلوں پر چڑھ گئے اور بھاگنے والوں کو بزدلی کے طعنے دینے لگے۔

یوشع علیہ السلام سخت پریشان تھے کہ بنی اسرائیل کو ہو کیا گیا ہے۔ وہ اس بری طرح کیوں بھاگ رہے ہیں۔ انہوں نے بھاگتے ہوئے سپاہیوں کو غیرت دلائی، انہیں للکارا اور ایک مرتبہ پھر انہیں لڑائی پر آمادہ کیا۔ وہ پھر بے دلی سے لڑنے لگے۔

جب بنی اسرائیل شکست سے دوچار ہونے لگے تو شہریوں کو بلعم بن باعور کا خیال آیا۔ اس کے نام کے نعرے لگنا شروع ہو گئے۔ ان کا خیال تھا کہ بلعم بن باعور کی بددعا نے اثر دکھانا شروع کر دیا ہے۔ آج نہیں تو کل یہ قوم شکست کھا کر یہاں سے بھاگ کھڑی ہوگی۔

بادشاہ نے لوگوں کو جنگل کی طرف بھیجا کہ بلعم بن باعور کو احترام کے ساتھ جنگل سے واپس لے کر آئیں اور اسے خوش خبری سنائیں کہ یوشع کو شکست ہونے والی ہے۔ وہ واپس آ جائے۔ اپنے وعدے کے مطابق بلعم بن باعور کے جسم کو زیورات سے سجا دیا گیا۔

بلعم بن باعور نہایت شان سے واپس آیا۔

بنی اسرائیل کی قسمت اچھی تھی کہ سورج غروب ہونے کا وقت آ گیا اور اہلِ شہر کو جنگ سے ہاتھ اٹھانا پڑ گیا۔ حضرت یوشع نے خدا کا شکر ادا کیا کہ جنگ اگر طول پکڑ جاتی تو شکست یقینی تھی۔ رات بھر ستانے کے بعد جب کل جنگ کا آغاز ہوگا تو شاید ہمیں فتح نصیب ہو۔

حضرت یوشع نے یہ شکست قبول کر لی تھی لیکن ان کی سمجھ میں یہ بالکل نہیں آ رہا تھا کہ یہ شکست ہوئی کیسے اور کیا خبر کل کا سورج طلوع ہو تو کیا ہو۔

وہ اپنے خیمے میں آرام فرما رہے تھے کہ آپ کے بھیجے ہوئے دو جاسوس اجازت طلب کر کے اندر داخل ہوئے اور

انہوں نے انکشاف کیا۔

''یہاں کا ایک باشندہ جو شہر ''فتور'' میں رہتا ہے، نہایت عبادت گزار اور متقی ہے۔ یہاں کے لوگوں کا خیال ہے کہ وہ جو دعا مانگتا ہے قبول ہوتی ہے۔ اس شخص نے آپ کے خلاف بددعا کی ہے جس کے نتیجے میں ہمیں شکست کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ شہر میں ہم نے لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ جب تک وہ شخص ہماری پشت پر موجود ہے، کوئی ہمیں شکست نہیں دے سکتا۔''

''وہ کیسا عبادت گزار ہے جو ایک نبی کے خلاف بددعا پر کمربستہ ہے؟ خیر تم اب جاؤ۔ کل کا سورج طلوع ہونے دو۔ خدا نے چاہا تو پانسا پلٹ جائے گا۔''

ان کے رخصت ہوتے ہی حضرت یوشع نے سجدے میں سر رکھ دیا۔

''اے خدا! میں نے تو تیرے راستے میں جہاد کیا تھا لیکن ہزیمت اٹھانی پڑی۔ اب میں سن رہا ہوں کہ یہ شکست ایک شخص کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ اے خدا! اپنے بندوں کی لاج رکھ لے۔ اپنے وعدے کا پاس رکھ اور بنی اسرائیل کو فتح یاب کر تاکہ وہ ''اریحا'' سے گزر کر کنعان تک پہنچ سکیں۔ خدایا! تو اس شخص کی بددعاؤں کا اثر چھین لے۔''

آپ روتے جاتے تھے اور یہ دعا کرتے جاتے تھے۔ اس دعا کے نتیجے میں آپ کو بتایا گیا کہ منکرین کی فتح عارضی ہے، آپ جنگ جاری رکھیں..... کل آپ کو فتح مل جائے گی۔

آپ کے دل کو اطمینان نصیب ہو گیا۔ صبح ہوئی تو آپ نے لشکر کو آراستہ کیا۔ یہ جمعے کا دن تھا۔ آپ نے اپنے لشکر کو نوید سنائی۔

''آج پوری ہمت سے جنگ کرو۔ جس شخص کی بددعا نے ہمیں شکست سے دوچار کیا تھا، تمہارے خدا نے اس کی بزرگی چھین لی ہے۔ مجھے بتا دیا گیا ہے کہ آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے تم فتح مند ہو جاؤ گے۔''

بنی اسرائیلوں کو حضرت یوشع پر اعتماد تو تھا لیکن اس وقت حضرت یوشع کی باتیں انہیں عجیب سی لگ رہی تھیں۔ وہ سوچ رہے تھے کہ ایک دن میں کیا انقلاب آ جائے گا۔ کل بھی ہم ہمت ہی سے لڑے تھے لیکن ہمیں شکست ہو گئی، آج کیسے فتح مل جائے گی جبکہ ہمارے ہزاروں ساتھی کم ہو گئے ہیں۔ بعض لوگ دبے لفظوں میں کہہ رہے تھے کہ حضرت یوشع نے محض ہمارا حوصلہ بڑھانے کے لیے یہ باتیں کی ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہم اس قوم کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بیشتر یقین کر رہے تھے کہ حضرت یوشع اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہتے۔ انہیں ضرور خدائی پیغام ملا ہوگا۔ آج ہماری فتح یقینی ہے۔

جنگ کا آغاز ہوتے ہی بنی اسرائیل کی فتح کے آثار نظر آنا شروع ہو گئے۔ دوپہر تک تو یہ حالت ہو گئی کہ بنی اسرائیل پوری طرح غالب نظر آنے لگے۔ یہ حالت دیکھ کر بلق کو تشویش ہوئی۔ اس نے اپنے آدمی بلعم کے گھر کی طرف دوڑائے کہ وہ فوراً اپنے حجرے میں بیٹھے اور یوشع کے لیے بددعا کرے، ورنہ وہ وقت دور نہیں کہ ہم سب قتل کر دیے جائیں۔ بلعم یہ سن کر سخت حیران ہوا کہ اس کی دعا یا بددعا پوری ہوتے ہوتے اپنا اثر کیسے کھو بیٹھی۔ اس کی بیوی نے بھی اس پر دباؤ ڈالا اور وہ حجرے میں بند ہو گیا۔ رو رو کر دعائیں مانگنے لگا۔ وہ جوں جوں دعا مانگتا رہا، اس کا اثر الٹا ہی ہوتا چلا گیا۔

میدانِ جنگ گرم تھا۔ بنی اسرائیل برابر آگے بڑھ رہے تھے لیکن ہوا یہ کہ سورج غروب ہونے کا وقت آ گیا اور بنی اسرائیل ابھی شہر میں داخل نہیں ہو سکے تھے۔ دوسرے دن ہفتہ تھا۔ حضرت موسیٰ کی شریعت میں ہفتہ یوم سبت تھا، یعنی اس دن کوئی کام کاج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جنگ بھی نہیں۔ اگر جنگ دوسرے دن پر ٹل جاتی تو یک طرفہ جنگ ہوتی جس میں کفار کی فتح یقینی تھی۔ حضرت یوشع اپنے گھوڑے سے اترے اور نہایت عاجزی سے سجدہ ریز ہو گئے۔

''اے ہفتے کے دن تو بھی خدا کے حکم کا پابند ہے اور میں بھی خدا کے حکم کا پابند ہوں۔ پس اے اللہ تو اس چاند کو طلوع ہونے سے روک دے اور سورج کو غروب ہونے سے روکے رکھ تاکہ جب تک میری قوم کو فتح نہ مل جائے۔''

توریت میں بھی اس دعا کا ذکر ملتا ہے۔ توریت کے الفاظ یہ ہیں۔

''اے سورج تو جبعون پر اور اے چاند تو وادی ایالون میں ٹھہرا رہ اور سورج ٹھہر گیا اور چاند تھما رہا۔''

یہ حدیث مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا۔ ''انبیاء میں سے کسی نبی نے جہاد فرمایا اور اس نے اپنی قوم سے کہا کہ میرے پیچھے وہ شخص نہ آئے جس نے ابھی شادی کی ہو اور نہ ایسا شخص جس نے اپنی عمارت بنائی ہو لیکن اس کی چھت نہ بنائی ہو اور نہ ایسا شخص جس نے بکریاں یا حاملہ اونٹنیاں خریدی ہوں اور وہ ان کے بچے ہونے کا منتظر ہو۔ تو پھر اس نبی نے جہاد فرمایا پھر عصر کے وقت بستی کے قریب ہوا اور نبی نے سورج کو کہا تو بھی خدا کے حکم کا پابند ہے اور میں بھی۔ اے اللہ تو اس کو مجھ پر کچھ دیر

رہا۔ میری سب عبادتیں ضائع ہوگئیں۔ اب آپ ہی مجھے بچا سکتے ہیں۔"

"افسوس کہ میں سوائے معافی کے تجھے کچھ نہیں دے سکتا۔ میں نے تیرے خلاف بددعا کی تھی کہ تیری بزرگی تجھ سے چھن جائے۔ خدا نے تیری بزرگی تجھ سے چھین لی۔ اب میں تیری بزرگی واپس نہیں لا سکتا، البتہ یہ بشارت دے سکتا ہوں کہ زندگی میں تیری تین دعائیں ضرور پوری ہو جائیں گی لیکن یہ دعائیں بھی اس تاثیر کو واپس نہیں لا سکتیں جو تیری زبان میں تھی۔"

وہ بہت رویا، بہت گڑگڑایا لیکن حضرت یوشع کے پاس اب کہنے کو کچھ نہیں تھا۔

وہ اٹھا اور خاموشی سے باہر نکل آیا۔ لوگوں نے اسے گھیر لیا تھا۔ وہ پوچھنا چاہتے تھے کہ اندر کیا باتیں ہوئیں لیکن اس نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔

وہ گھر پہنچا تو بیوی اس کے انتظار میں تھی۔ اسے دیکھتے ہی پوچھنے لگی کہ وہاں کیا پیش آیا۔ وہ غصے میں تو تھا ہی، اس پر برس پڑا۔

"بدبخت عورت! تو نے مجھے کہیں کا نہ چھوڑا۔ تیرے ورغلانے پر ہی میں بددعا دینے پر تیار ہوا تھا۔ کاش! تو ایسا نہ کرتی یا تیری محبت میرے دل میں نہ ہوتی۔ میری بزرگی چھن گئی۔ میرے پاس اب تین دعاؤں کے سوا کچھ نہیں رہا جو پوری ہو سکتی ہیں۔ اس کے بعد میری دعاؤں کا اثر ختم ہو جائے گا۔"

"چلو تمہارے پاس تین دعائیں تو ہیں۔ سب کچھ تو نہیں چھن گیا۔"

"حاجتیں تو ہزار ہوتی ہیں اور دعائیں تین ہیں۔ پھر بھی خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری عبادتوں کی لاج رکھی اور تین دعائیں بحال رکھیں۔"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم ایک دعا مجھے دے دو۔"

"تمہاری کون سی حاجت ہے جو پوری نہیں ہوئی؟"

"میں چاہتی ہوں میرے حسن و جمال میں اضافہ ہو جائے۔"

"تم تو پہلے ہی بہت خوبصورت ہو اس میں مزید اضافے کی کیا ضرورت ہے؟"

"میرا چہرہ چاند کی طرح چمکے گا تو اس میں تمہیں ہی خوشی ہوگی، میرا کیا ہے۔"

بلعم کی بدنصیبی اس کا پیچھا کر رہی تھی۔ جو کچھ اس نے کیا تھا اس کا خمیازہ تو بھگتنا ہی تھا۔ بیوی کو مزید خوبصورت دیکھنے کی خواہش اس کے دل میں بھی جاگی۔ اس نے دعا کر دی۔ بیوی کا چہرہ چاند کی طرح چمکنے لگا۔

بلعم خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا لیکن اس کی یہ خوشی چند روزہ ثابت ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ بیوی کے حسن و جمال کی وجہ سے اس کے ہزاروں عاشق پیدا ہو گئے ہیں اور بیوی بھی اس سے بے وفائی کر رہی ہے۔ اس نے غصے میں آ کر بددعا دے دی کہ اے خدا! اس سے اس کا حسن و جمال چھین لے۔ اس نے یہ دعا نہیں کی کہ اسے پہلے جیسا کر دے۔ حسن و جمال چھنا تو ایسا چھنا کہ بیوی کی صورت کریہہ النظر ہو گئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے بندریا بیٹھی ہے۔

اب اس کی صورت خود اسے پسند نہیں آ رہی تھی بلکہ اسے دیکھ کر خوف آتا تھا۔ بستی کے لوگ اسے لعن طعن کرنے لگے کہ تو کیسا خودغرض ہے کہ اپنی بیوی کے لیے ایک دعا بھی نہیں کر سکتا کہ اس کی صورت پلٹ آئے۔ اسے جب بہت مجبور کیا گیا تو اس نے وہ تیسری دعا بھی بیوی پر قربان کر دی اور اس کا حسن لوٹ آیا۔

تینوں دعائیں پوری ہو گئی تھیں۔ اس کے پاس اپنے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔

قدرت شاید اسی دن کے انتظار میں تھی۔ کچھ دن نہیں گزرے تھے کہ بلعم کی زبان کتے کی طرح باہر لٹک گئی۔ یہی وہ زبان تھی جس سے اس نے حضرت یوشع کو بددعا دی تھی۔ وہ بیوی جس کے لیے اس نے اپنی عاقبت خراب کی تھی، اسے چھوڑ کر الگ ہو گئی۔ دوستوں اور شاگردوں نے بھی کنارہ کر لیا۔

وہ اسی عالم میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔

جاسوسی ڈائجسٹ

جنوری 2020

Download

www.pklibrary.com

شریمتی پوجا کی آرٹ گیلری اچھی چلنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ شہر کے سب سے بڑے بازار کے وسط میں واقع تھی۔ اس بازار میں بڑے بڑے سرمایہ دار، صنعت کار، شوبز کے فن کار، فلم ساز اور غیر ملکی سیاح آتے تھے۔ ممبئی میں کون ایسا شخص تھا جو اس کی آرٹ گیلری اور اس کے نام سے واقف نہ ہو۔

وہ نہ صرف غیر ملکی سیاحوں بلکہ آرٹ کے قدر دانوں کو بے وقوف بنانے کے فن میں طاق تھی۔ جب سے بھارتی فلمیں امریکی اور یورپی فلموں کو بے حیائی میں شرمانے لگی تھیں، تب سے لوگوں کے مزاج میں تبدیلی رونما ہونے لگی تھی۔ ان کا ذہن بھی بدلنے لگا تھا اور وہ آزاد خیال بنتے جا رہے تھے۔

پہلے لوگ اپنی خواب گاہوں اور نشست گاہوں میں مشہور و معروف فن کاروں کی تصویریں سجانے میں فخر محسوس

سواسیر

ایم الیاس

بعض اوقات بڑے بڑے طرّم خان ایک ذرا سی چیونٹی سے بھی بازی ہار جاتے ہیں... وہ بھی خود کو بہت ہوشیار اور طاقت ور سمجھتی تھی مگر جب ایک بے ضرر لڑکی نے چال چلی تو ساری ضرب تقسیم دھری رہ گئی اور اسی کو کہتے ہیں سیر کو سوا سیر مل جانا۔

آرٹ کے نام پر..... فنکاروں کا خون پینے والی بلا کا انجام

کرتے تھے لیکن اب یہ سلسلہ بند ہو گیا تھا اور اب انہیں ایسی تصویروں کی جستجو رہنے لگی تھی جس میں شوبز کی فنکارائیں بولڈ حالت میں ہوں اور یہ اداکارائیں مصوروں سے تصاویر نہ صرف خوشی خوشی بنواتی تھیں بلکہ انہیں منہ مانگی اجرت بھی دیتی تھیں کہ انہیں ایسا اجاگر اور نمایاں کیا جائے کہ وہ قیامت نظر آئیں۔ اس لیے کہ وہ شہرت اور اپنے آپ کو شائقین کی توجہ مبذول کرانے کی خواہش مند ہوتی تھیں۔

شریمتی پوجا بڑی شاطر، قیافہ شناس اور دوراندیش عورت واقع ہوئی تھی۔ وہ فوراً گاہکوں کا بدلتا مزاج سمجھ گئی اور اس نے درجنوں کے حساب سے بولڈ تصویریں جو مختلف اور سنسنی خیز زاویوں سے بنی ہوئی تھیں، لگا دیں۔ یہ تصویریں وہ قلاش اور ضرورت مند مصوروں سے سستے داموں خریدا کرتی تھی۔ یہ مصور فنکاراؤں کی بولڈ.... تصویریں اس طرح بناتے تھے جیسے ماڈل ان کے سامنے موجود ہو۔ یہ تصویریں وہ ہوٹلوں اور ریستورانوں کے مالکوں کو مہنگے داموں فراہم کرتی تھی۔ اس طرح وہ دونوں ہاتھوں سے خوب دولت بٹور رہی تھی۔

شریمتی پوجا کے کئی کاروباری راز تھے۔

اس نے سب سے پہلے اپنے مستقل خریداروں پر توجہ دی۔ خاص طور پر ایسے گاہکوں پر جن کے لیے ہر قسم، ہر حالت کی تصویریں ان کی کمزوری تھی اور ان کی جو بھی قیمت ہوتی تھی، وہ پس وپیش اور مول تول کے بغیر خرید تے تھے۔ انہیں جن زاویوں کی تصویروں کی ضرورت ہوتی وہ اس کے پاس موجود تھیں۔ خریدار قیمت کی پروا نہیں کرتے تھے۔

جب تصویروں کی نکاسی کا انتظام باقاعدہ اور اطمینان بخش ہو گیا تو اس نے مصوروں کی جانب اپنی توجہ مبذول کی۔ جن کی صلاحیتوں کے حقیقی جوہر نکل کر سامنے آئے ان سے فائدہ اٹھانے میں بخل سے کام نہیں لیا۔

جن مصوروں سے اس کا سابقہ پڑتا تھا، ان میں سے بیشتر بے پروا، غیر ذمے دار اور قلاش ہوتے تھے۔ انہیں نہ اپنے لباس کا ہوش ہوتا اور نہ ہی اپنی شخصیت کا..... شریمتی پوجا کو بہت جلد ان کی کمزوریوں کا احساس ہو گیا تھا۔ ان مصوروں کو ہمیشہ رقم کی ضرورت ہوتی تھی تاکہ وقتی طور پر ان کے پیٹ کی آگ بجھ سکے اور اپنی شراب نوشی کے لیے کسی بھی قسم کی شراب مہیا ہو جائے۔

شریمتی پوجا کے کاروباری رقیب اس کی طرح دولت مند نہیں تھے۔ اس لیے وہ مصوروں کو شہرت کے سہانے سپنے دکھایا کرتے تھے۔ کوئی مفلوک الحال مصور ان کے پاس تصویر فروخت کرنے جاتا تو وہ اس کے فن کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے تھے اور اسے اس شہر کا صفِ اول مصور گردانتے اور اس کی تصویر کی اچھی قیمت لگاتے..... مثال کے طور پر پانچ ہزار روپے..... غریب مصور کی آنکھیں پانچ ہزار روپے کا سن کر برقی قمقمے بن جاتیں۔ مگر وہ نقد رقم دینے کے بجائے اس سے کہتے کہ مہربانی فرما کر تصویر یہاں چھوڑ جائیں۔ جب یہ فروخت ہو جائے گی تو ہم اپنا کمیشن کاٹ کر باقی رقم آپ کے حوالے کر دیں گے۔ مصور کمیشن کے بارے میں پوچھتا تو جواب دیا جاتا کہ پچاس فیصد۔ اس کے برعکس شریمتی پوجا مصوروں کو شہرت کے سندر سپنے دکھانے کے بجائے ہزار پانچ سو کے نئے نئے کرارے نوٹوں کی جھلک دکھاتی تھی۔ شریمتی کے اس حقیقت پسندانہ رویے نے بہت جلد شہر کے مفلوک الحال مصوروں کو اس کا گرویدہ بنا لیا تھا۔ جیسے ہی ان کی کوئی تصویر مکمل ہوتی، پرانے اخبار میں لپیٹ کر شریمتی پوجا کی گیلری میں پہنچ جاتے۔ وہ انہیں اپنے دفتر کے کمرے میں لے جاتی اور وہاں تصویر کا باریک بینی سے جائزہ لیتی۔ اس دوران میں غریب مصور بڑی بے بسی اور بے چارگی سے اس کے فیصلے کا انتظار کرتا۔

حقیقت یہ تھی کہ جتنی ضرورت مصوروں کو شریمتی پوجا کی تھی اتنی ہی ضرورت اسے مصوروں کی تھی۔ اس طرح مصوروں کو سودے بازی کا حق مل جاتا تھا..... سودے بازی سے شریمتی پوجا کو سخت نفرت تھی۔ یہی فساد کی جڑ تھی۔ اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے آخر اس نے ایک طریقہ دریافت کر لیا تھا بلکہ طریقے کے بجائے اسے ایجاد کہنا مناسب ہوگا۔

مصور اپنی تصویر بغل میں دبائے اس کی گیلری میں داخل ہوتا۔ شریمتی کی ملازمہ اسے گیلری کے عقبی حصے کے ایک کوٹھری نما کمرے میں لے جاتی۔ یہ کمرا ایک طرح سے دفتر کا کام دیتا تھا۔ اس چھوٹے سے کمرے میں پرانے طرز کی ایک بڑی سی میز کے پیچھے شریمتی پوجا کی اونچی کرسی تھی۔ وہ کمرے میں داخل ہو کر مصور کو بیٹھنے کا اشارہ کرتی اور پھر باوقار انداز میں چلتی ہوئی اپنی کرسی پر بیٹھ جاتی۔

مصور اپنی تخلیق کھول کر اس کے سامنے پیش کرتا اور پھر تصویر ایزل پر لگائی جاتی..... شریمتی اس کا بغور معائنہ کرتی۔ اس کی عقابی نظریں تصویر کی ساری خوبیاں اور خرابیاں چند لمحوں میں پرکھ لیتیں۔ پھر وہ کاغذ کا ایک ٹکڑا اپنی طرف کھسکاتی اور مصور کی نظروں سے چھپ کر اس پر تصویر کی قیمت لکھتی جو اس کے نزدیک مناسب ہوتی۔ کاغذ کا یہ

پرزہ اس معاملے کی جان بن جاتا تھا۔ پھر مصور کو حکم دیا جاتا کہ وہ خود اپنی تصویر کی قیمت بتائے۔ اگر بدنصیب مصور کی طلب کردہ قیمت شریمتی کی تحریر کردہ رقم سے سو روپے بھی زیادہ ہوتی تو معاملہ وہیں ختم ہو جاتا۔ شریمتی خاموشی سے تصویر لپیٹ کر واپس مصور کے حوالے کر دیتی۔

مصور لاکھ قیمت کم کرتا اور اپنے اندازے کی غلطی تسلیم کرتا..... اپنی غربت کا حوالہ دیتا لیکن اسے کسی صورت میں دوسرا موقع نہیں دیا جاتا تھا۔ منت سماجت بھی لاحاصل ٹھہرتی تھی کیونکہ مصور نے قیمت لگانے میں غلطی کی تھی۔ اس لیے اسے سزا ملنی چاہیے تھی۔ بالآخر وہ تصویر بغل میں دبا کے نامراد اور ناکام واپس لوٹ جاتا تھا۔

یہ تھی وہ اختراع جس پر شریمتی سختی سے عمل کرتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کوئی مصور آیندہ اپنی تخلیق کے متعلق کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوتا تھا۔ اگر مصور کی طلب کردہ رقم شریمتی کی تحریر کردہ قیمت سے کم ہوتی یا برابر ہوتی تو رقم فوراً مصور کو ادا کر دی جاتی۔

جب بدنصیب مصور دھڑکتے دل کے ساتھ ڈرتے ڈرتے اپنی تصویر کی قیمت کم لگاتا تھا تو شریمتی مصور کے سامنے کاغذ کا وہ پرزہ رکھ دیتی جس پر اس نے اپنی رقم تحریر کی ہوتی۔ اگر اس کی طلب کردہ قیمت شریمتی کی تحریر کردہ قیمت سے کم ہوتی تو وہ بدنصیب اپنی کم بختی کو خوب کوستا، لعن طعن کرتا، اپنی ذات پر غصہ اتارتا، سرد آہ بھرتا اور بعضوں کی آنکھوں میں آنسو بھی بھر آتے تھے۔ اس کی طلب کردہ قیمت شریمتی کی تحریر کردہ قیمت سے زیادہ ہوتی تو اس کا مطلب تصویر سمیت واپس جانا ہوتا۔ اس صورت میں بھی بعض مصوروں کی آنکھوں میں بے بسی سے آنسو آجاتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ اب خواہ شریمتی کے چرنوں میں اپنا سر رکھ دیں، وہ کسی صورت بھی ان کی تصویر قبول نہیں کرے گی۔ وہ آیندہ کم سے کم قیمت لگاتا۔

واپس کی ہوئی تصویروں کا ایک ہی ٹھکانا ہوتا تھا۔ شریمتی کی گیلری کے بالکل سامنے سڑک کے دوسری طرف ایک اور آرٹ گیلری تھی۔ وہاں تصویریں پچاس فیصد کمیشن پر فروخت کی جاتی تھیں اور اس کی قیمت..... تصویر فروخت ہونے کے بعد مصور کو ادا کی جاتی تھی۔ اب یہ اس کی قسمت کہ اس کی تصویر ایک ماہ میں فروخت ہو جائے یا ایک برس کا عرصہ لگ جائے یا کبھی فروخت ہی نہ ہو۔ اگر کسی مصور کی طلب کردہ قیمت شریمتی پوجا کی تحریر کردہ قیمت سے کم ہوتی تو مصور چند لمحوں کے بعد رقم اپنی جیب میں ٹھونس کر گیلری کے برابر واقع ڈنر بار میں گھس جاتا کیونکہ وہاں شہر کی سب سے سستی اور ملاوٹ سے پاک شراب بکتی تھی جس کی اسے شدت سے طلب محسوس ہوتی تاکہ اپنی بدنصیبی کا غم کم کر سکے۔ کوئی مصور ایسا نہیں تھا جو شریمتی جیسی جلاد عورت کا دس پندرہ منٹ سامنا کرنے کے بعد شراب کی طلب محسوس نہ کرتا ہو۔

اس طرح شریمتی کے نافذ کردہ طریقے سے اسے جہاں بے پناہ فائدہ پہنچا تھا، وہاں بار کے مالک نے بھی خوب فائدہ اٹھایا تھا۔ یہ سلسلہ دراز ہوتا جا رہا تھا..... شریمتی کا اختراعی طریقہ جہاں بدقسمت مصور کو دہشت زدہ کر کے کم سے کم قیمت طلب کرنے پر مجبور کرتا، وہیں اس کا اعصابی نظام درہم برہم ہو جاتا اور اسے پُرسکون ہونے کے لیے شدت سے شراب کی طلب محسوس ہوتی۔

شریمتی اب صرف فطری مناظر والی تصویریں فروخت کرتی تھی۔ پہلے اس نے ایک دو برس ایسی تصویروں کی فروخت کی تھی جس میں کسی لڑکی یا شوبز کی ماڈل لڑکی کی تصویریں بولڈ ہوتی تھیں۔ ابتدا میں کاروبار زوروں پر چلا پھر ماند پڑتا چلا گیا۔ جب وہ فطری مناظر کی تصویریں فروخت کرنے لگی تو اس کا کاروبار چمک اٹھا کیونکہ اس قسم کی تصویریں ہر شریف آدمی اپنی نشست گاہ اور خواب گاہ کی زینت بنا سکتا تھا۔ ان تصاویر سے کمروں کی زینت اور حسن میں اضافہ ہو جاتا۔ عامیانہ قسم کی تصویروں کا خلا موبائل فون اور انٹرنیٹ نے پُر کر دیا تھا۔

انیل ایک نوجوان مصور تھا جو شہر کے تمام مفلوک الحال مصوروں میں شریمتی پوجا کے ہاتھوں سب سے زیادہ ستایا ہوا تھا مگر شریمتی کو سب سے کم برا بھلا کہنے والا شخص بھی یہی تھا۔ شاید وہ اس کے بُرے رویے کا عادی ہو چکا تھا یا پھر شاید فطری طور پر اتنا اچھا تھا کہ شریمتی کی گیلری سے باہر آتے ہی اس کا برا رویہ معاف کر دیتا تھا۔

انیل کی کلکتہ میں رہائش تھی۔ وہاں غربت و افلاس کی وجہ سے مستقبل تاریک لگا تو مستقل طور پر ممبئی آ کر آباد ہو گیا۔ شہر کے دوسرے مصوروں کی طرح وہ بھی اپنی ذات سے بے پروا تھا۔ اس کا شیو ہمیشہ بڑا رہتا تھا۔ اس کا لباس میلا اور شکن آلود ہوتا تھا۔ مناسب غذا نہ ملنے کے سبب اس کے گال پچک گئے تھے اور آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ اس کے باوجود وہ دوسرے مصوروں کے برعکس ہمیشہ مسکراتا رہتا تھا۔ اسے دنیا میں صرف دو چیزوں سے دلچسپی تھی..... مصوری اور شراب..... چونکہ اس نے کبھی یکمشت ہزار یا

پانچ سو سے زیادہ روپے کی شکل نہیں دیکھی تھی اس لیے وہ گھٹیا شراب پیتا تھا جو شریمتی کی گیلری کے پاس باہر ملتی تھی۔

جب اسے پہلی بار شریمتی پوجا کے بارے میں علم ہوا کہ وہ ہر وقت نقد رقم کے عوض فطری مناظر کی پینٹنگ خریدنے کو تیار رہتی ہے تو اس نے ایسا محسوس کیا جیسے یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی دریافت ہو۔ انیل کے بنائے ہوئے مناظر مقامی خریداروں اور غیر ملکی سیاحوں میں مقبول ہونے لگے۔ شریمتی یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ انیل کی کوئی سی بھی تصویر کیوں نہ ہو، اپنی گیلری میں آراستہ کرتی تو وہ صرف چوبیس گھنٹے میں منہ مانگے دام پر بک جاتی تھی۔

شریمتی کے طے شدہ کاروباری طریقے کی پہلی ضرب نے انیل کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ اس نے ایک تصویر کی قیمت شریمتی پوجا کی لکھی ہوئی قیمت سے صرف پچاس روپے زائد طلب کی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسے اپنی تصویر سمیت گیلری سے نکلنا پڑا۔ وہ اس کی زندگی کا سب سے پہلا دہشت ناک تجربہ تھا۔ اندازے کی ایک ذرا سی غلطی کی اتنی بڑی سزا.....؟ اتنی عبرت ناک سزا سے اس نے بہت کچھ حاصل کیا، یعنی سبق..... اس کے بعد اس نے اصول بنالیا کہ وہ چھوٹی تصویروں کے پانچ سو روپے..... اور بڑی تصویروں کے ایک ہزار روپے طلب کرے گا۔ اس کا یہ فیصلہ بے حد کارگر ثابت ہوا اور شریمتی سے اس کے تعلقات انتہائی خوشگوار ہو گئے جس سے اس کا گزارہ ہونے لگا۔

ایک مرتبہ شریمتی پوجا کے ایک کاروباری رقیب نے کسی طرح انیل کو اس امر پر آمادہ کیا کہ وہ کمیشن کی بنیاد پر اس کی گیلری میں اپنی تصویر رکھ دے..... انیل نے اس کی پیشکش مان لی مگر اس کے بعد وہ اپنی دوسری تصویر شریمتی کے پاس لے کر گیا تو قہر آلود نگاہوں نے اس کا استقبال کیا۔

''دفع ہو جاؤ.....'' شریمتی نے اسے انگلی سے باہر جانے کا راستہ دکھاتے ہوئے کہا۔ ''خبردار..... جو تم نے یہاں پر قدم رکھا..... اب میں تم سے کاروبار کرنا نہیں چاہتی۔''

انیل معصوم اور سیدھا سادہ سا شخص تھا۔ وہ سمجھ نہ سکا کہ معاملہ کیا ہے، اس نے پلکیں جھپکا کر ایزل پر لگی اپنی تازہ تصویر دیکھی۔ ایک بار نہیں کئی بار..... ''لیکن شریمتی جی.....!'' انیل نے حیرت سے کہا۔ ''ذرا تصویر توجہ سے تو دیکھیے..... کس قدر خوبصورت ہے..... اس کے پھول تو دیکھیے..... اس میں صرف رنگ بھرنے میں مجھے تین دن لگے ہیں۔''

''تم نے میرا مان توڑا ہے۔'' شریمتی نے افسوس اور برہمی سے کہا۔ ''تم غدار ہو..... یہ تصویر بھی سامنے والی گیلری میں لے جاؤ..... وہی خریدے گا، تمہارے یہ دو کوڑی کے پھول.....''

تھک ہار کے انیل کو شریمتی کے سامنے والی گیلری سے اپنی تصویر واپس لانی پڑی..... اس نے شریمتی سے ہاتھ جوڑ کے معافی مانگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ پھر شریمتی نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے معاف کر دیا۔

☆☆☆

پھر ایک دن انیل کی خزاں رسیدہ زندگی میں نیتا چپکے سے بہار کی طرح داخل ہوئی۔

وہ آسام کی رہنے والی تھی اور ایک آرٹ اسکول میں طلبا کے سامنے ماڈل بن کر کھڑی ہوتی تھی۔ جب کبھی اسے وقت ملتا تو وہ رٹنر بار میں آجاتی تھی۔ رٹنر بار کے مستقل گاہک، ویٹر، ویٹرس اور منیجر اس سے واقف تھے۔ اس کے متعلق طرح طرح کی افواہیں گشت کرتی رہتی تھیں۔ نیتا کا چہرہ جاذب نظر تھا اور نقوش میں سحر انگیز تیکھا پن تھا۔ چمکتی بھونرا جیسی سیاہ آنکھیں، لمبے لمبے گھنے اور گہرے سیاہ بادلوں جیسے ریشمی بال اور روغنی سانولی رنگت نے اسے بے مثال بنا دیا تھا۔ اسے آرٹ اسکول میں ماڈل کی حیثیت سے فوراً ملازمت مل گئی تھی۔ وہ مردوں سے بالکل بھی نہیں ڈرتی تھی بلکہ مردوں کو ڈرانے اور خائف کرنے کا حوصلہ رکھتی تھی۔ وہ بولڈ تھی۔ جب اس کی زبان قینچی کی طرح چلنا شروع ہوتی تو مردوں کے دل تیزی سے دھڑکنے شروع ہو جاتے بلکہ پسینے بھی چھوٹ جاتے کہ یہ زبان دراز لڑکی نہ جانے کیا کہہ بیٹھے.....؟ اس کا موڈ خراب دیکھ کے کوئی اس کے قریب نہیں پھٹکتا تھا.....

ایک روز رٹنر بار کے مستقل گاہکوں نے حیرت انگیز منظر دیکھا۔

موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ انیل پانی میں شرابور بار میں داخل ہوا۔ انیل کا لباس اس کے جسم سے چپکا ہوا تھا اور اس کے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ وہ سردی سے کانپ رہا تھا۔ بالکل کسی یتیم اور بے سہارا بلی کے بچے کی طرح..... نیتا اپنی میز پر تنہا بیٹھی ہوئی تھی اور کافی پیتے ہوئے بارش کا لطف اٹھا رہی تھی۔ انیل جتنی دیر تک بار کے دروازے پر کھڑا رہا، اپنے سر سے پانی جھٹکتا رہا۔ نیتا اوپر سے نیچے تک بغور اس کا جائزہ لیتی رہی پھر اس نے انگلی اٹھائی۔ ''اے مسٹر.....! ادھر آؤ.....''

ڈنر بار کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ نیتا نے کسی کو اپنی میز پر آنے کی دعوت دی تھی۔

انیل..... نیتا کی میز پر آ کر بیٹھ گیا۔ نیتا نے اس کے لیے عمدہ قسم کی شراب اور اپنے ہاتھوں سے اس کے لیے جام بنایا پھر بار میں سے تولیا لے کر آئی اور بڑی اپنایت سے اس کے بال خشک کرنے لگی۔ انیل بڑی سعادت مندی سے اسی طرح سر جھکائے بیٹھا رہا۔

''تم بالکل گدھے ہو.....؟'' نیتا نے اسے اطلاع دی۔ ''تمہیں اتنی عقل بھی نہیں ہے کہ بارش کے دوران برساتی پہن کر نکلتے ہیں تاکہ ڈبل نمونیہ کا خطرہ نہ ہو۔''

''برساتی.....؟'' اس نے احمقانہ انداز سے کہا۔

''ہاں..... ہاں..... برساتی..... کیا تم نے کبھی برساتی نہیں دیکھی جو بارش سے جسم کو محفوظ رکھتی ہے؟''

''اوہ.....'' انیل نے معذرتی انداز میں کہا۔ ''وہ میرے پاس نہیں ہے۔''

بار میں موجود ہر شخص نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے یہ منظر دیکھا جو کسی فلم کے رومانی منظر سے کم نہیں تھا۔

نیتا محبت سے انیل کا گال تھپتھپا رہی تھی۔ ''کوئی بات نہیں بچے!'' وہ کہہ رہی تھی۔ ''گزشتہ ہفتے کوئی احمق میرے کمرے میں برساتی بھول گیا تھا۔ تم میرے ساتھ میرے فلیٹ میں چلو تاکہ میں تمہیں وہ برساتی دے دوں۔''

جہاں دیدہ لوگوں نے فوراً بھانپ لیا تھا کہ نیتا اس گاؤدی اور مفلوک الحال مصور کی محبت میں بری طرح گرفتار ہوگئی ہے۔ دوسرے روز جب وہ رٹنر بار میں داخل ہوئی تو یکسر بدلی ہوئی تھی..... صاف ستھرے دھلے ہوئے کپڑے، چہرے پر ہلکا اور نفیس سا میک اپ..... اس نے بالوں کا جوڑا بڑے سلیقے سے بنا رکھا تھا۔

جہاں تک انیل کا تعلق تھا نیتا کی بزرگانہ محبت نے اسے مزید کاہل بنا دیا تھا۔ نیتا نے اس سے سول میرج کر کے اپنے فلیٹ میں قید کر لیا تھا..... اس کے لیے کپڑے خریدے..... جوتے اور جرابیں بھی..... تصویریں بنانے کے لیے بہت سے نئے رنگ..... اب انیل کا لباس صاف ستھرا اور استری شدہ ہوتا تھا۔ نیتا نے رٹنر بار کے بارمین کو سختی سے تنبیہہ کی ہوئی تھی کہ آئندہ اس نے انیل کو گھٹیا شراب پینے کے لیے دی تو وہ اس کا گلا کاٹ دے گی۔ اس نے رٹنر بار میں ڈنکے کی چوٹ پر یہ اعلان کیا کہ اگر کسی نے انیل کے سامنے اس کی محبت کا مذاق اڑانے کی کوشش کی تو وہ شخص ہمیشہ اس لمحے کو یاد کرے گا جب اس کی ماں نے اسے جنم دیا تھا۔ اس اعلان کا یہ نتیجہ نکلا کہ کسی نے بھولے سے بھی نیتا کی محبت کا مذاق اڑانے کی جسارت نہیں کی۔ البتہ شریمتی پوجا کا ردِعمل مختلف تھا۔

شریمتی ان بے حیا اور بے حجاب عورتوں سے بھی سخت نفرت کرتی تھی جو مصوروں کے لیے ماڈل کا کام کرتی تھیں۔ اس کی دانست میں ایسی عورتیں انسانیت کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا تھیں۔ شریمتی کو اس بات پر سخت کوفت ہوتی تھی کہ روزانہ اس سڑک پر قدم رکھنا پڑتا ہے جہاں سے ماڈل لڑکیاں گزرتی تھیں۔ لہٰذا جب ایک ماڈل لڑکی نے سب سے زیادہ منافع بخش مصور پر قبضہ جما لیا تو اس کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ غصے کی یہ آگ اسے جھلساتی رہی تھی۔

شریمتی کو اس بات کا علم ہوا جب ایک روز انیل اس کی گیلری میں اپنی نئی تصویر لے کر پہنچا۔ وہ اسے پہلی نظر میں پہچان نہ سکی۔ اس کا لباس صاف ستھرا تھا اور اس کے جوتے پالش کی وجہ سے چمک رہے تھے۔

شریمتی پوجا نے غالباً پہلی بار انیل کا چہرہ صاف ستھرا،

رئیل اسٹیٹ ایڈوائزر

DHA. KARACHI
DHA. City Karachi
BAHRIA TOWN KARACHI

پلاٹ، مکان، دکان، بنگلوز اور فلیٹ
کی خرید و فروخت کے لیے مستند نام

ریاض حسین

ایڈریس: راحت کمرشل لین 2
DHA PHASE 6 KARACHI
فون نمبر: 0300-3658964

شفاف اور دمکتا دیکھا تھا جبکہ پہلے انیل کا شیو بڑھا ہوتا تھا۔ وہ کسی باریش آدمی کی طرح لگتا تھا۔ اس نے غور سے انیل کے کلین شیو گال دیکھے جواب ہچکے ہوئے نہیں تھے۔ شریمتی کی نظروں کے سامنے ایک ہینڈسم نوجوان کھڑا تھا۔

انیل کا حلیہ دیکھتے ہی شریمتی کو یقین ہوگیا کہ اس کی تباہی میں کس کا ہاتھ ہے۔ اسے اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ اس سادہ لوح مصور پر نیتا اپنا تسلط جمانے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ اگر حالات یہاں تک پہنچ گئے ہیں تو اس ڈائن نے اس سیدھے سادے آدمی کو اس کے خلاف ضرور بھرا ہوگا اور اس سے مطالبہ کیا ہوگا کہ وہ آئندہ اپنی تصویروں کی زیادہ قیمت طلب کرے۔ شریمتی نے فیصلہ کیا کہ وہ اس چھوکری سے آسانی کے ساتھ شکست تسلیم نہیں کرے گی اور نہ ہی وہ کسی کو اپنا کاروبار تباہ کرنے کی اجازت .... دے سکتی تھی۔

شریمتی نے انیل کی تصویر پر ایک سرسری سی نظر ڈالی۔ انیل ستائش بھری نظروں سے اپنی تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ شریمتی نے کاغذ کے پرزے پر پنسل سے پانچ سو روپے لکھے اور انیل سے کہا۔

''جلدی بتاؤ اپنی قیمت.....؟'' پھر اس نے اپنا لہجہ درشت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں بہت مصروف ہوں، مجھے کئی کام ہیں۔''

یہ حقیقت تھی کہ نیتا نے انیل میں خوب اچھی طرح ہوا بھر دی تھی۔ جب وہ اپنی تصویر اخبار میں لپیٹ کر اس کے پاس جانے کے لیے نکل رہا تھا تو نیتا نے اسے یاددہانی کروائی تھی کہ وہ شریمتی پوجا سے ایک ہزار روپے طلب کرے۔

''احمق.....!'' نیتا نے بڑی تیزی سے کہا تھا۔ اس کے لہجے میں خلوص و محبت تھی۔ ''تم نے اس تصویر پر پورے سات دن عرق ریزی کی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اس قسم کی تصویر کم سے کم ہزار اور زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار روپے میں فروخت ہوتی ہے۔ تم اس چڑیل سے پوری قیمت کیوں نہیں وصول کرتے.....؟ اگر آج وہ تمہیں اس تصویر کی قیمت محض پانچ سو روپے دینے کی کوشش کرے تو اس کے منہ پر تھوک کے آجانا..... سمجھے نا؟''

''یقیناً.....'' انیل نے سینہ تان کر کہا۔ ''آج میں اس سے پورے ایک ہزار روپے قیمت وصول کروں گا۔''

اب وہ شریمتی کے سامنے بیٹھا تھا۔ شریمتی کی تیز و تند نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ اس نے اپنی رگوں میں لہو منجمد ہوتا محسوس کیا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا اور پھر بند کرلیا۔ وہ کس طرح بتائے اور کہے..... وہ سوچنے لگا۔

''بولو..... جواب دو۔'' شریمتی کے تحکمانہ لہجے نے اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑا دی۔

''کیا..... کیا پانچ سو روپے مناسب رہیں گے.....؟'' انیل کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

''ہوں..... مل جائیں گے.....'' شریمتی نے فاتحانہ انداز سے کہا۔

نیتا جیسی ناتجربہ کار لڑکی پر شریمتی پوجا کی یہ پہلی فتح تھی۔ اسے معلوم تھا کہ جب انیل واپس جائے گا اور نیتا کو اپنی بزدلی کی کہانی سنائے گا تو وہ اسے خوب کوسے گی۔ لعن طعن کرے گی اور جی بھر کے برا بھلا کہے گی..... شریمتی نے خوش ہوکر دل میں سوچا۔ میری بلا سے..... آج کے تجربے نے ثابت کردیا تھا کہ وہ جس وقت چاہے انیل کے سر سے محبت کا بھوت اتار سکتی ہے۔

اس فتح کے بعد شریمتی کو نیتا پر بے شمار فتوحات حاصل ہوئیں اور یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا جارہا تھا لیکن ایک فتح بڑی ناقابلِ فراموش تھی جس کا علم شریمتی کو بھی نہ ہوسکا کیونکہ وہ اس وقت اپنی سب سے بڑی فتح سے محظوظ ہونے کے لیے نیتا کے فلیٹ میں موجود نہیں تھی۔

انیل کی بزدلی ثابت ہوجانے پر ایک روز نیتا نے اعلان کیا۔

''اب میں تمہاری نئی تصویر فروخت کرنے کے لیے تمہارے ساتھ شریمتی کی گیلری میں جاؤں گی کیونکہ تم اس جیسی منافع خور کے سامنے جاکر چوہے سے کہیں زیادہ بزدل بن جاتے ہو اور کبھی ہمت کرکے زیادہ رقم طلب نہیں کرتے..... اور اب شریمتی سے تصویر کا سودا بھی میں کروں گی۔ میں اس کمینی سے بالکل بھی نہیں ڈرتی۔''

انیل کچھ دیر تک اسے متوحش نظروں سے دیکھتا رہا پھر خاموشی سے مصوری کا سامان سمیٹنے لگا۔

''یہ تم کیا کرنے لگے احمق.....؟'' اس نے بوکھلا کر پوچھا۔

''میں جارہا ہوں۔'' انیل نے باوقار لہجے میں جواب دیا۔

نیتا چونک گئی۔ اس نے فوراً خطرے کی بو سونگھ لی تھی۔

''یہ بالکل غلط ہے۔'' انیل کہہ رہا تھا۔ ''پتنی کو اپنے پتی کے کاروباری معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیے۔''

''پتنی.....؟ کس کی پتنی.....؟ یہ کیا کہہ رہے ہو احمق.....؟ ہماری لیگل میرج ہوئی ہے..... وہ شادی نہیں جو پنڈت کے سامنے ہوتی ہے..... سات پھیرے لگائے جاتے ہیں۔''

''گویا تم اسے شادی نہیں کہتیں.....؟'' انیل چکرا سا گیا۔
''نہیں.....'' نیتا ہنسنے لگی۔ اس نے سنگدلی سے کہا۔
''اسے شادی کا نام نہیں دیا جاسکتا۔''
''کوئی بات نہیں۔ میں نے جانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔'' انیل اس انکشاف پر کچھ الجھ سا گیا تھا۔ ''میں اپنی تصویروں کا مالک ہوں..... میں اپنی تصویریں خود ہی فروخت کروں گا۔ میں اس معاملے میں کسی کی بھی دخل اندازی پسند نہیں کرتا۔''

انیل کا یہ انتہا پسندانہ فیصلہ بدلوانے کے لیے نیتا کو بہت سارے آنسو بہانے پڑے اور عمدہ شراب کی دو بوتلیں بھی لانی پڑیں، پھر اس پر ایسی فیاضی سے مہربان ہوئی کہ اس کے بعد اس نے پھر کبھی بھولے سے بھی جانے کا اعادہ نہیں کیا۔ نیتا نے اسے اپنی مہربانی، فیاضی، وارفتگی اور والہانہ پن کے طلسم میں ایسا جکڑ لیا تھا کہ وہ کسی بھی لڑکی یا پھر گداز بدن کی عورت ہو، اس کی طرف متوجہ نہیں ہوسکتا تھا۔ یوں بھی نیتا کوئی عام سی لڑکی نہیں تھی۔ وہ مثالی حسن و شباب کا تراشیدہ پیکر تھی..... انیل کے غیر معمولی ردعمل نے نیتا کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ آیندہ اس قسم کی کوشش فضول، لاحاصل اور پریشان کن ہوگی کیونکہ انیل کو فطری تصویر کشی کا جنون ہے اور اس کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ شریمتی پوجا اس کی تصویریں خریدنے پر آمادہ رہتی ہے..... اور فوراً ہی رقم بھی ادا کردیتی ہے۔ اس لیے وہ اس کا ملازم بن کر رہ گیا ہے۔

نیتا کو پہلے تو شریمتی سے چڑ تھی۔ اس پر محض غصہ آتا تھا لیکن وہ اب اس سے شدید نفرت کرنے لگی تھی۔ وہ اس بڑھیا سے انتقام لینے کا منصوبہ بنانے لگی۔ ایک ایسا انتقام جو اس کا دماغ درست کردے اور وہ آیندہ کسی غریب مصور کی بے بسی اور مجبوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرے۔ اس چڑیل نے لوٹ کھسوٹ کی انتہا کردی تھی۔

نیتا رات کو بستر پر دراز ہوتی تو اس کا ذہن منصوبے بنانا شروع کردیتا پھر قسمت کی دیوی نے اس کی مدد کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ انیل کو یہ اطلاع سب سے آخر میں ملی تو اسے بڑی حیرت ہوئی۔

''اچھا تو تم ماں بننے والی ہو.....؟'' انیل نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔
''ہاں..... صرف میں ہی ماں بننے والی نہیں ہوں بلکہ تم بھی باپ بننے والے ہو۔'' نیتا نے تصحیح کرتے ہوئے اسے سمجھایا۔ ''ہم دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں..... کیا سمجھے.....؟''
''سمجھ گیا.....'' انیل نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''یعنی ہم دونوں ماں باپ بننے والے ہیں۔''
''ٹھیک سمجھے..... اس کا مطلب یہ ہے کہ اب ہماری زندگی میں بہت ساری تبدیلیاں آئیں گی..... کیا تم اس بات کو پسند کرو گے؟''
''ہاں..... کیوں نہیں.....؟'' انیل نے اثباتی انداز میں سر ہلایا۔
''اب تمہیں اپنی متلون مزاجی اور دوسری حرکتیں چھوڑنی پڑیں گی کیونکہ تمہیں ایک بہترین باپ بننا ہے..... میں بھی تمہیں ایک اچھی ماں بن کر دکھاؤں گی۔ بچے کی پرورش کے لیے ایک چھوٹا سا خوبصورت مکان چاہیے۔ اب ہم ممبئی شہر چھوڑ دیں گے۔ ہم بنگلور چلے جائیں گے۔ بنگلور نہ صرف بڑا خوبصورت شہر ہے بلکہ آب و ہوا کے لحاظ سے بھی پُرفضا ہے۔ بنگلور میں میرے چچا پچھلے برسوں سے وہاں بسے ہوئے ہیں۔ وہ ایک چھوٹے سے ہوٹل کے مالک ہیں جو خوب چلتا ہے۔ ان سے سنبھل نہیں رہا ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ میں ان کا ہوٹل سنبھال لوں۔ اگر میں اس پر تیار ہوجاؤں تو ان کے سورگ باشی ہونے کے بعد میں ہوٹل کی مالک بن جاؤں گی۔ کیونکہ وہ بے اولاد ہیں۔ اس لیے وہ ہوٹل میری ملکیت ہوگا۔ میں ہوٹل چلاؤں گی۔ تم تصویریں بنانا اور ایک آرٹ گیلری بھی قائم کرلینا۔''

انیل اس کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا، کہنے لگا۔
''میں اپنی تصویریں وہاں بیچوں گا کیسے.....؟''
''یہ تو بڑی آسان سی بات ہے..... تم آرٹ گیلری قائم نہیں کرنا چاہتے ہو تو نہ کرو لیکن اپنی تصویریں ڈاک سے شریمتی پوجا کو بھیج دیا کرنا..... کیا تمہارے خیال میں وہ ایسی عمدہ تصویریں اس لیے خریدنے سے انکار کرے گی کہ ڈاک سے آئی ہیں؟''

جب انیل کو یہ خیال پسند نہیں آیا تو اس نے قدرے تذبذب سے کہا۔ ''میں شریمتی پوجا سے بات کروں گا۔''
''نہیں..... نہیں۔ اس سے تم نہیں میں بات کروں گی، چاہے تم پسند کرو یا نہیں.....'' نیتا نے بالآخر خطرہ مول لے ہی لیا۔ ''اس کے علاوہ مجھے اس چڑیل سے ایک کام بھی ہے۔''
''کیسا کام.....؟''
''مجھے اس سے پیسے حاصل کرنے ہیں..... اس نے تمہاری تصویریں کوڑیوں کے مول خرید کر موتیوں کے بھاؤ بیچی ہیں اور بڑی دولت جمع کرلی ہے۔ مجھے اس کی ملازمہ

نے بتایا تھا کہ تمہاری کوئی تصویر غیر ملکی سیاحوں کے ہاتھوں بیس پچیس ہزار سے کم قیمت میں نہیں بیچی..... مجھے اس سے وہ دولت مع سود نکلوانی ہے کیونکہ اب ہمیں بہت سارے پیسوں کی ضرورت پڑے گی..... یہاں سے بنگلور تک ہوائی جہاز کا کرایہ درکار ہے۔ بس اور ٹرین کا سفر تو تکلیف دہ ہوتا ہے، وہ مجھے پسند نہیں اس لیے کہ میں امید سے ہوں اور دو بڑے چرمی سوٹ کیس بھی خریدنے ہیں۔ ایک چھوٹا سا فلیٹ لینا ہے جس میں ہم دونوں سکون و اطمینان سے رہیں۔''

زندگی میں پہلی بار انیل نے کسی مسئلے پر اپنی حتمی رائے کا اظہار کیا تھا۔ ''تم پاگل ہوگئی ہو۔''

''کیا کہا.....؟ میں پاگل ہوں۔'' نیتا نے ہذیانی لہجے میں چیخ کر کہا۔ ''تم جیسے بڑے عقل مند ہونا..... بس یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو..... اور میں ہر قیمت پر اس ناگن سے رقم وصول کر کے دکھاؤں گی مگر کان کھول کر سن لو..... کہ تم نے مجھے شادی کے بغیر ماں بنا دیا ہے۔ یہ بات میں پولیس سے تب کہوں گی اگر تم نے میرے کام میں ٹانگ اڑائی۔ سول میرج کے کاغذات تلف کر دوں گی..... تمہارے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہوگا کہ تم مجھے ایک برس سے بلیک میل کر رہے ہو۔ میری نامناسب تصویریں بنا کے..... جانتے ہو اس بلیک میلنگ کا کیا نتیجہ ہوگا.....؟ عدالت اس کی کیا سزا دے گی.....؟ تمہیں بیس برسوں کے لیے جیل بھیج دے گی۔ تمہیں اس بات کا علم تو ہوگا کہ جیل میں کسی کو تصویریں بنانے کی اجازت نہیں ہوتی..... بس آدمی اکڑوں بیٹھے بیٹھے لڑتا رہتا ہے اور بوڑھا ہو جاتا ہے..... کیا سمجھے.....؟''

بیس برس تک ایک بھی تصویر نہ بنانے کا خیال انیل کے لیے نہ صرف سخت دہشت ناک اور اذیت ناک تھا بلکہ اس کے لیے سوہانِ روح تھا۔

''سمجھ گیا۔'' اس نے کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح مردہ لہجے میں جواب دیا۔

''برش اٹھا کے ابھی اور اسی وقت ذرا ایک تصویر بنانی شروع کر دو لیکن خیال رکھنا کہ یہ تصویر میری مرضی سے بنے گی۔''

☆☆☆

ایک ہفتے کے بعد نیتا اخبار میں لپٹی ہوئی ایک بڑی سی تصویر لیے شریمتی پوجا کی گیلری میں داخل ہوئی۔ ملازمہ نے اسے شریمتی کے دفتر میں جانے سے روکنا چاہا لیکن نیتا نے اسے دھکا دے کر ایک طرف ہٹا دیا۔ شریمتی پوجا اس وقت اپنے دفتر کے مختصر کمرے میں بیٹھی کاغذات دیکھ رہی تھی۔ وہ اس وقت کسی سے نہیں ملتی تھی، اس لیے ملازمہ اسے اندر جانے دینا نہیں چاہتی تھی۔

جیسے ہی اس نے نیتا کو دیکھا اور اس کے ہاتھ میں لپٹی ہوئی تصویر پر اس کی نظر پڑی تو وہ سمجھ گئی کہ یہ تصویر انیل کی بنائی ہوئی ہے لیکن اسے فروخت کرنے نیتا آئی ہے۔ اس نے دروازے کی طرف اشارہ کر کے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''باہر نکل جاؤ..... میں تم جیسی عورتوں سے بات کرنا بھی اپنی توہین سمجھتی ہوں۔''

نیتا نے جواباً زور سے دروازے پر لات ماردی۔ دروازہ ایک زبردست دھماکے سے بند ہوگیا۔ اس نے تصویر ایزل پر لگائی اور اس پر لپٹا ہوا کاغذ ہٹانے لگی۔

''ذرا پہلے تصویر تو دیکھ لیجیے..... مجھے یقین ہے کہ آپ یہ شاہکار ضرور خریدنا پسند کریں گی..... شریمتی جی، یہ انیل کی زندگی کا بہترین شاہکار ہے.....'' پھر نیتا نے ایک جھٹکے سے کاغذ علیٰحدہ کر دیا۔

تصویر پر نظر پڑتے ہی شریمتی پوجا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں۔

یہ لمبائی چوڑائی کے لحاظ سے انیل کی سب سے بڑی تصویر تھی لیکن انیل کے مزاج کے برعکس تھی۔ اس میں کسی فطری منظر کی عکاسی نہیں کی گئی تھی۔ یہ ایک بے لباس عورت کی تصویر تھی۔ تصویر پر نظر پڑتے ہی شریمتی کو احساس ہوگیا کہ گردن سے نیچے کا بدن نیتا کا تھا لیکن چہرہ شریمتی کا تھا..... شریمتی پوجا کا.....

''ہے ناشاہکار.....؟'' نیتا نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

شریمتی نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ پہلے تو اس کے حلق سے آواز نہیں نکلی مگر چند لمحوں کے بعد پوری قوت سے گلا پھاڑ کے کہا۔

''کمینی..... چڑیل..... میں تجھے اور انیل کو جیل کروا دوں گی۔''

پھر اس نے اگلے لمحے نشست پر کھڑے ہو کر تصویر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''خبردار.....!'' نیتا کے ہاتھ میں اچانک ایک چاقو نہ جانے کہاں سے نمودار ہوگیا۔ ''اگر تو نے اسے خریدنے سے پہلے چھوا تو تیری ناک کاٹ ڈالوں گی۔''

شریمتی گھبرا کر پیچھے ہٹی اور دوبارہ کرسی پر گر گئی۔

''میں اسے خریدوں گی؟'' شریمتی کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔

''ہاں.....'' نیتا نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''کیونکہ

اگر تم نہیں خریدو گی تو میں یہ تصویر سامنے والی گیلری میں رکھ دوں گی جس کا مالک رنجیت سنگھ ہے۔ وہ کمیشن پر ہر قسم کی تصویر فروخت کرتا ہے۔ وہ یہ تصویر دیکھ کر اس قدر خوش ہوگا کہ اسے اندر نہیں بلکہ باہر شوکیس میں سجائے گا تاکہ سڑک پر چلنے والا ہر راہ گیر دیکھے..... کچھ دنوں میں ممبئی کے بچے بچے کی زبان پر انیل کی اس شاہکار تصویر کا ذکر ہوگا اور وہ سیاح جنہیں تم دونوں ہاتھوں سے لوٹتی ہو، وہ بھی یہ تصویر دیکھیں گے۔ میں رنجیت سنگھ سے کہہ دوں گی کہ وہ ایک برس تک تصویر فروخت نہ کرے۔ دور دور سے اس کے پاس گاہک آئیں گے تو اس کا کاروبار چمک جائے گا..... خون چوسنے والی ڈائن.....! تو کوئی آخری فیصلہ کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لے..... میں جلدی میں نہیں ہوں..... میں پانچ دس منٹ انتظار کر سکتی ہوں۔"

شریمتی بہت دیر تک خیالوں میں ڈوبی رہی۔ "یہ تو بلیک میلنگ ہے۔" شریمتی نے تلخ لہجے میں کہا۔ "تم مجھ سے انتقام لے رہی ہو؟"

"اوہ..... تم تو بڑی سمجھ دار ہو....." نیتا نے مسکراتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"اگر..... اگر میں یہ تصویر خرید لوں.....؟" شریمتی نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ "کیا مجھے اس بات کی اجازت ہوگی کہ اسے پھاڑ دوں؟"

"کیوں نہیں..... لیکن پہلے تمہیں اس کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔"

"کیا قیمت ہے اس کی.....؟"

نیتا نے پرس کھول کر اندر سے تہ کیا ہوا کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالا اور اسے شریمتی کی نظروں کے سامنے لہرایا۔

"تصویر کی قیمت اس کاغذ پر لکھی ہوئی ہے مگر میں تمہیں یہ کاغذ دیکھنے کی اجازت نہیں دوں گی۔ تمہیں خود تصویر کی بولی لگانی ہوگی۔ اگر تم نے کاغذ پر لکھی ہوئی رقم سے ایک روپیا بھی کم قیمت لگائی تو پھر یہ تصویر سڑک کے دوسری طرف شوکیس میں لگی ہوئی نظر آئے گی۔ قیمت لگانے کا اصول خود تمہارا ایجاد کردہ ہے۔ اگر تم نے کنجوسی دکھائی تو اچھی طرح سمجھ لو کہ تم خود بھگتو گی۔"

شریمتی پوجا حواس باختہ ہوگئی۔ ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس کا پسینا ایسا پھوٹ پڑا کہ نہ صرف اس کی پیشانی عرق آلود ہوگئی بلکہ اس کا جسم بھی شرابور ہوگیا۔ اس نے چشم تصور میں ایک پل میں دیکھا کہ راہ گیر اس کی بے لباسی کی تصویر دیکھ کر اس کی آرٹ گیلری کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ منچلے اس کی آرٹ گیلری میں گھس کر اسے دیکھنے آرہے ہیں..... وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔

"لیکن یہ مجھے کس طرح اندازہ ہوگا کہ تم مجھے کتنا لوٹنا چاہتی ہو؟" اس کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"میں تمہارا احتجاج تسلیم کرتی ہوں۔" نیتا نے فراخ دلی سے کہا۔ "میں بہت نرم دل کی مالک ہوں۔ میرے نزدیک کسی کا دل دکھانا پاپ ہے۔ اس لیے میں تمہیں صحیح قیمت لگانے کا ایک موقع ضرور دوں گی۔ میں اور انیل یہاں سے بنگلور بذریعہ ہوائی جہاز فرسٹ کلاس میں جائیں گے۔ لہٰذا اس مقصد کے لیے کرائے کی ضرورت ہوگی۔ تم جانتی ہوگی کہ ہوائی جہاز کے اکانومی کلاس سے چار گنا زیادہ کرایہ فرسٹ کلاس کیبن کا ہوتا ہے..... اور کچھ ملبوسات اور دو بڑے بڑے چرمی امپورٹڈ سوٹ کیس بھی خریدنے ہیں تاکہ لباس حفاظت سے رکھے جاسکیں۔ اس کے بعد بنگلور پہنچ کے ایک چھوٹا مگر قدرے کشادہ اور ہوادار فلیٹ خریدیں گے۔"

"فلیٹ.....؟" اس کا دل اچھل کر حلق میں دھڑکنے لگا۔ وہ چلانا چاہتی تھی لیکن چلا نہ سکی۔

"ہاں....." نیتا نے سر ہلا دیا۔ "دو کمروں کا چھوٹا سا فلیٹ..... سہولتوں سے آراستہ..... لکٹری..... پانی، بجلی اور گیس..... اور پھر ایک موٹر سائیکل جس پر بیٹھ کر ہم دونوں روزانہ سیر و تفریح کر سکیں۔"

"موٹر سائیکل بھی.....؟" شریمتی کے حلق میں آواز بھی اٹک گئی پھر جیسے ہی اس کی نظریں دوبارہ اپنی تصویر پر پڑیں تو وہ چونک کر ہوش میں آگئی۔

"اے بھگوان.....! آخر مجھ سے ایسا کیا پاپ سرزد ہوا جس کی اتنی کڑی سزا..... مل رہی ہے؟"

"اس کے علاوہ....." نیتا نے اپنا آخری مطالبہ پیش کیا۔ "کچھ رقم اور بھی ہمارے پاس ہونی چاہیے جو ہم آڑے وقتوں کے لیے بینک میں جمع کرا سکیں۔ میں نے سنا ہے کہ تم بہت ذہین کاروباری عورت ہو اور تمہارے سر میں شیطان کا بھیجا ہے۔ اب تم جلدی سے ان تمام اخراجات کا تخمینہ لگا لو لیکن....." نیتا نے کاغذ کا پرزہ پھر ایک مرتبہ اس کی نگاہوں کے سامنے لہرایا۔ "تمہارا حساب اس کاغذ کے مطابق ہونا چاہیے..... تمہیں تصویر کی بولی لگانے کا موقع نہیں ملے گا۔"

شریمتی کا خون رگوں میں ابلنے لگا۔ بے اختیار اس کی نظریں ایزل پر لگی ہوئی تصویر کی طرف اٹھ گئیں۔ تصویر پر نظر پڑتے ہی اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ جلدی جلدی نیتا کے

بتائے ہوئے اخراجات کا تخمینہ لگانے لگی۔ تخمینہ لگانا آسان نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ سیدھے سیدھے سات لاکھ دے دیتی ہوں۔

سات لاکھ.....؟ شریمتی کو ایسا محسوس ہوا جیسے اسے برف میں زندہ دفن کیا جارہا ہو اور چاروں طرف یخ بستہ ہوائیں چنگھاڑتی پھر رہی ہوں۔

''بہت دیر ہوگئی ہے شریمتی جی.....! جلدی کرو۔ مجھے اور بھی کام ہیں۔'' نیتا نے اپنے لہجے میں درشتی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''سات لاکھ روپے.....'' شریمتی نے کہا۔

''کیا کہا.....؟ سات لاکھ روپے.....؟'' نیتا غرائی۔ اس کی آنکھوں سے شعلے لپک رہے تھے۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ تصویر ایزل سے اتار کے اخبار میں لپیٹنے لگی۔ شریمتی نے پھر چشم تصور میں سامنے والی گیلری کے شوکیس پر ایک بہت بڑا ہجوم لگا ہوا دیکھا..... پھر یہ ہجوم اپنی گیلری کے سامنے نظر آیا۔ لوگ ایک دوسرے کو کہنیاں مار مار کے اس کی طرف اشارہ کررہے تھے۔ اگر ایک مرتبہ بھی یہ تصویر سامنے والی گیلری میں لگ گئی تو وہ آیندہ گھر سے قدم نکال نہیں سکی گے..... یہ سارے خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں کوند گئے۔

''نہیں.....نہیں.....ٹھہرو۔'' شریمتی نے چلا کر کہا۔ ''نہ جانے میری زبان کیسے پھسل گئی۔ مجھے شما کردو۔ اصل میں، میں نے دس لاکھ روپے کہے تھے۔''

''کیا تم نے واقعی دس لاکھ روپے کہے تھے؟'' نیتا غرائی۔ ''تم مجھ سے جھوٹ مت بولو۔''

''میں بھگوان کی سوگند کھاتی ہوں۔ غلطی سے میرے منہ سے سات لاکھ نکل گیا تھا۔ بھگوان کے لیے دس لاکھ روپے لے لو.....اچھی لڑکی میرا دل نہ توڑو.....میں تمہاری بنتی کرتی ہوں۔''

نیتا نے کاغذ کا ٹکڑا کھول کر اس پر ایک نظر ڈالی اور اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

''چلو.....میں تم پر رحم کھاتے ہوئے یہ رقم قبول کیے لیتی ہوں۔ لیکن مجھے دس لاکھ ابھی اور اسی وقت درکار ہیں۔''

''اتنی بڑی رقم تو میرے پاس یہاں نہیں ہے۔ البتہ اپنی ملازمہ کے ذریعے بینک سے منگوالیتی ہوں۔ اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔ اتنی دیر نہیں لگے گی۔ میری ملازمہ بھی بینک سے چیک کیش کروا کے لاتی رہتی ہے۔''

''ٹھیک ہے لیکن میں چاہتی ہوں کہ اس سلسلے میں کوئی قانونی سقم نہ رہ جائے۔ تم اس وقت تک ایک دستاویز تیار کرو کہ تم نے یہ تصویر دس لاکھ کے عوض خریدی ہے۔ ہم دونوں اس دستاویز پر دستخط کریں گے۔ اس کی ایک نقل میرے پاس رہے گی۔''

''ضرور.....ضرور.....'' شریمتی پوجا نے جلدی سے کہا۔ ''جتنی دیر میں میری ملازمہ رقم لائے گی، میں دستاویز تیار کرلوں گی۔'' اور پھر من وعن نیتا کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے تمام مراحل طے پاگئے اور توقع سے پہلے ہی ملازمہ بینک سے رقم لے آئی۔ جو ایک لفافے میں بند تھی۔ شریمتی نے وہ لفافہ نیتا کے حوالے کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور نیتا کو نئے بڑے نوٹ گنتے دیکھ کے آنسو باقاعدہ رخساروں پر بہنے لگے۔ رقم گن کے نیتا نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور لفافہ اپنے پرس میں ڈال لیا۔ پھر اس نے کاغذ کا ٹکڑا مروڑ کے فرش پر پھینک دیا اور فاتحانہ انداز سے چلتی ہوئی کمرے سے باہر آگئی۔ شریمتی حسرت بھری نظروں سے دیکھتی رہی۔ کلیجا منہ کو آرہا تھا۔ جیسے ہی نیتا نظروں سے اوجھل ہوئی اس نے لپک کر مڑا تڑا کاغذ فرش سے اٹھایا تو اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکلنے لگیں۔ چند لمحوں کے بعد شریمتی پوجا ایک زوردار چیخ مار کے بے ہوش ہوگئی۔

شریمتی پوجا کی ملازمہ اپنی مالکہ کی دہشت ناک چیخ سن کر خوف زدہ ہوئی۔ وہ دوڑتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور اس کا سر زانو پر رکھ کے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگی۔ شریمتی پوجا کے دانت سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔ اس کی مٹھی میں کاغذ کا ایک ٹکڑا دبا ہوا تھا۔ بے چاری ملازمہ اپنی مالکن کو ہوش میں نہ لاسکی۔ اس نے پڑوسی ڈاکٹر کو مدد کے لیے بلانے کا فیصلہ کیا اور احتیاط سے شریمتی پوجا کا سر فرش پر رکھ دیا۔ پھر کھڑی ہوگئی۔ اچانک اس کی نظر ایک مرتبہ پھر مٹھی میں دبے ہوئے کاغذ پر پڑی۔ ملازمہ کی چھٹی حس نے اسے خبردار کیا کہ اس کی بے ہوشی کا تعلق کسی نہ کسی طرح اس کاغذ سے ہے۔ تجسس سے مجبور ہوکر ملازمہ نے جھک کر شریمتی پوجا کی مٹھی سے کاغذ کا ٹکڑا نکالا اور اس پر ایک نظر ڈالی۔ کاغذ پر دو لفظ لکھے تھے۔

''ہزار روپے.....''

ملازمہ نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں سر کو جنبش دی اور کاغذ فرش پر پھینک کر ڈاکٹر کو بلانے چلی گئی۔

⌘⌘⌘

اس کے یہاں قیام کو ایک ماہ ہو چکا تھا اور اس ایک ماہ کے عرصے میں جو بات نہ صرف اسے غیر معمولی محسوس ہوئی تھی بلکہ اس حقیقت نے اسے رنجیدہ بھی کر دیا تھا، وہ انسانی فطرت میں پنہاں درندگی تھی۔ اس نے یہاں دولت اور حسن کی ہوس کو کسی بہروپ کے مانند لوگوں کی زندگیاں نگلتے دیکھا تھا۔ کہیں عاشق محبوب کو پانے کے جنون میں وحشی بنا بیٹھا تھا تو کہیں جائداد کی چاہ میں خونی رشتے بے رحمی کی بھینٹ چڑھ رہے تھے۔ اسے

آنکھ اوجھل

ماہ وش طالب

یہ کائنات تہہ در تہہ راز و نیاز کا ایک ایسا مجموعہ ہے جسے کھوجتے کھوجتے انسان عمر تمام کر لیتے ہیں مگر انتہا پر نہیں پہنچ پاتے۔ وہ بھی ایسے ہی رازوں کا سراغ لگانے گھر سے نکلے تھے... لیکن یہ جہان تسخیر کرنے کے لیے ابھی بہت سے مرحلے باقی تھے۔

نئی دنیا کی جستجو اور کامیابی پا لینے کی لگن کا احوال

یہ سب دیکھ کر ایک لمحے کے لیے افسوس تو ہوتا تھا، مگر اندر کہیں بے نام اور ناقابلِ بیان سی مسرت بھی ہوتی تھی۔ اس کی تعطیلات ختم ہونے میں ابھی پندرہ دن باقی تھے لہٰذا وہ ان پندرہ دنوں میں اس خطے کے باقی ماندہ مقامات بھی کھوج لینا چاہتا تھا۔

وہ بلا کا وجیہہ شخص تھا، چوڑی چھاتی اور پیشانی، ستوان ناک مگر جو نقش اس کے چہرے پر سب سے زیادہ طلسماتی تھا وہ اس کی گہری کالی آنکھیں تھیں۔ ایسی آنکھیں جو اپنے اندر بے شمار راز چھپائے ہوئے ہوں۔

☆☆☆

ایک صبح وہ پھل خرید رہا تھا جب ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے پارکنگ ایریا سے باہر نکلتی لڑکی کو دیکھ کر پہلے وہ چونکا اور پھر زیرِ لب مسکرا دیا۔ وہ لڑکی اس کی دوست جنیوا سے کافی مشابہت رکھتی تھی، قد اور جسامت بالکل اس کی طرح تھے، البتہ اس لڑکی کے بال جنیوا کے خاکی بالوں کے برعکس میرون رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتے رہنے کے بعد سر جھٹکتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

ہیمبرگ کے نواحی علاقے میں رہائش پذیر جونی فون پر اپنے گھر والوں سے محوِ گفتگو تھا۔ وہ اپنی ممی رچل کو پُرجوش انداز میں اپنی طاقت کی برتری کی تفصیلات بتا رہا تھا کہ کس طرح اس نے کل دوپہر ایک جیب کترے کو میٹرو میں رنگے ہاتھوں پکڑ کر اس کی دھنائی کی اور ایسا کرنے کے لیے اسے کچھ زیادہ نہیں صرف اپنے دائیں ہاتھ کو مکے کی شکل میں اس کے منہ پر گھمانے کی ضرورت پڑی تھی جس کے نتیجے میں نوجوان جیب کترے کے چار دانت باہر آ گئے تھے۔

پھر کال منقطع کر کے وہ اپنے لیے... کل کا شیڈول ترتیب دینے لگا۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد اس کی نظر سامنے میز پر دھرے اخبار پر پڑی، اس نے یونہی اخبار کے صفحات پلٹنا شروع کیے تو یک دم وہ چونک گیا۔ اخبار کے سرورق پر چھپی تصاویر اسے لمحوں میں پریشان کر گئی تھیں۔

اس نے اپنی پیشانی مسلنا شروع کر دی۔

اس نے سوچ لیا کہ لوگوں کا دھیان بٹانے کے لیے اسے اب کچھ خاص کرنا تھا کیونکہ اگر یہ لوگ اپنی اس کھوج میں کامیاب ہو جاتے تو بڑا نقصان ہو جاتا۔

☆☆☆

آج موسم بہت خوشگوار تھا، دریا کنارے مرغابیاں غول کی صورت پھر رہی تھیں۔ وہ دریا کے ساحل پر واقع ریستوران میں بیٹھا جھینگے اور پاستا تناول کر رہا تھا جب ایک انتہائی پرکشش لڑکی نے اس کے قریب آ کر اسے مخاطب کیا۔

''ایکسکیوزمی! کیا میں آپ کا نام جان سکتی ہوں؟ دراصل مجھے کیوں محسوس ہو رہا ہے کہ میں آپ کو کہیں دیکھ چکی ہوں۔''

''جونی ڈالٹن۔'' اس نے حیران ہوئے بغیر اپنا نام بتایا۔

یوں کسی کو سرِ راہ ایک سے دوسری یا تیسری مرتبہ دیکھنا یقیناً کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی مگر مارگریٹا کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس شخص کو بہت قریب سے جانتی ہے مگر کیسے؟ یہ معما اس کا نام جان لینے کے پانچ منٹ بعد تک بھی حل نہ ہو سکا اور اسے شرمندہ ہو کر واپس ریستوران کے باورچی خانے میں جانا پڑا۔

وہ اس ریستوران کی منیجر تھی اور شیف وہاں اس کی ہدایات کے منتظر تھے، پھر اچانک اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ جب تک اسے یاد آیا اور وہ پلٹ کر دوبارہ اس میز کی جانب گئی تو وہ شخص وہاں سے غائب ہو چکا تھا..... مارگریٹا ششدر تھی ایسا کیسے ممکن تھا؟ وہ اس کا یونی فیلو تھا اور یونی کی ہی ایک سوسائٹی کے وہ دونوں ممبر بھی رہ چکے تھے۔

مگر اسے یاد آنے میں اتنا وقت کیوں لگا اور اگر وہ نہیں یاد کر پائی تھی تو کم از کم وہ شخص جو اپنا نام جونی بتا رہا تھا اس کو تو اسے دیکھ کر یاد آ جانا چاہیے تھا کہ مارگریٹا کی شکل اتنی عام ہرگز نہ تھی کہ اسے اتنی جلدی بھلایا جا سکتا۔

دوسری طرف جونی کو بار بار کے اتفاقات سے چڑ ہونے لگی تھی۔ وہ یہاں ایڈونچر کی غرض سے آیا تھا مگر

اس کا جی بہت جلد ہی یہاں کی گہما گہمیوں سے اوب گیا۔ نتیجتاً ایک ہفتے بعد ہی اس نے اپنا ٹکٹ بک کروالیا اور جنیوا اور ممی کو اپنی واپسی کی اطلاع دی۔

گہری نیلی پولو شرٹ اور خاکی جینز پہنے بورڈنگ کے لیے قطار میں لگا وہ اپنی باری آنے کا منتظر تھا، بے ہنگم انداز میں چیونگم چبا کر اس نے بڑا سا غبارہ پھلایا۔

''پھٹاک'' کی آواز نے آگے کھڑے پسنجر کو مڑ کر ناگواری سے اس کی جانب دیکھنے پر مجبور کر دیا جس کی اس نے چنداں پروانہ کی۔

چیکنگ کے دوران اس نے اپنا پاسپورٹ ظاہر کیا، افسر اس کی قومیت والا خانہ دیکھ کر حیران ہو گیا۔ اسے اپنی معلومات اور قابلیت پر شک تو نہ تھا مگر مقابل کے پاسپورٹ نے اسے گوگل پر ''بیرٹ'' نام کی تلاش پر مجبور کر دیا..... گوگل بھی وہ معلومات فراہم کرنے سے قاصر تھا، افسر کو انتہائی استعجاب نے آگھیرا۔

قطار میں کھڑے دیگر مسافر چیکنگ کا سلسلہ ایک ہی فرد پر رُکا دیکھ کر اب کوفت کا شکار ہونے لگے تھے۔

دوسری جانب بھی یہ معاملہ گمبھیر ہو گیا تھا۔ کاؤنٹر کے سامنے بیٹھے شخص نے دوسرے افسروں کو مطلع کیا۔

اس ہلچل کے دوران جونی کا اطمینان قابلِ دید تھا، اس نے خود کو ثابت کرنے کے لیے جو کوشش کی تھی، وہ محض اتنی سی تھی کہ اس نے اپنی جیب میں موجود زمینی نقشہ نکال کر ان کے سامنے پھیلا دیا۔ اس نقشے کے مطابق جرمنی اور فرانس کے درمیان ایک چھوٹا سا ملک تھا جہاں سے وہ تعلق رکھتا تھا۔

جبکہ ہوائی اڈے کی انتظامیہ اس بات پر مصر تھی کہ دنیا میں اس نام کا کوئی ملک یا شہر نہیں جو اس کے پاسپورٹ پر درج ہے بلکہ اس نام سے ملتا جلتا ایک سمندر ہے جو ترکی کے ساحل کو جا لگتا تھا۔

یہ معاملہ حیرت کے علاوہ اب باعثِ تشویش بھی تھا... ہوائی جہاز آٹھ بجے کی اڑان بھرنے کے لیے تیار تھا اور مسافروں میں بے چینی پھیل رہی تھی، ایسے میں جونی نامی اس شخص کو مکمل تفتیش کی غرض سے ہوائی اڈے کے ایک کمرے میں روک دیا گیا اور باقی مسافروں سے معمول کی جانچ پڑتال کی جانے لگی۔

اسے اس کمرے میں قید ہوئے دس منٹ ہو چکے تھے۔ ان دس منٹوں سے وہ یہاں سے نکلنے کی ہر ممکنہ کوشش پر غور و فکر کر رہا تھا کہ اس کی نظر بائیں جانب کی دیوار پر آویزاں وال پیپر پر گئی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ہوائی اڈے کے تمام عملے کی نظر اس پر ہے اور اسے تین منٹوں کے لیے ان کی توجہ خود پر سے ہٹانی ہے۔

پانچ منٹ سوچ بچار میں ضائع کرنے کے بعد اس نے جینز کی جیب سے چیونگم نکال لی۔

اور پھر کچھ ہی لمحوں بعد اسپیکر پر آٹھ بجے روانہ

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی، ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1200 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 9000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ:

مرزا ثمر عباس: 0301-2454188

سرکولیشن مینیجر سید منیر حسین: 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی

مین کورنگی روڈ۔ کراچی

ہونے والی فلائٹ کا انجن خراب ہونے کا اعلان ہونے لگا۔

اس نے فوراً چیونگم کو کیمرے پر چپکا دیا۔

وال پیپر کو بے دردی سے پھاڑا تو حسب توقع پیچھے بڑی سی کھڑکی نے اس کے منصوبے کو تقویت بخش دی۔

کسٹم آفیسرز کا دھیان جب تک دوبارہ اس کی جانب گیا اور وہ کمرے میں آئے تو جونی نامی وہ شخص اپنے سامان سمیت غائب تھا۔

مارک کو فوراً سے پیشتر اس کا تمام ڈیٹا ریویو کر کے ہارڈ کاپیز نکالنے کا حکم دیا گیا۔

مگر عملے کا ہر بندہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس شخص سے متعلق کوئی بھی دستاویز اور آن لائن ڈیٹا کہیں بھی موجود نہ تھا۔ بلکہ ہر معلومات سرے سے غائب تھی۔

اس سے اگلے روز اخبارات ایک غیر مرئی طاقت کے زمینی حدود میں داخل ہونے کے انکشاف کی شہ سرخیوں سے بھرے ہوئے تھے۔

ریڈیو پر لوگوں کو احتیاطی تدابیر اپنانے پر زور دیا جانے لگا۔

جونی اس وقت اپنے بستر پر دراز محوِ خواب تھا، جب باہر سے گزرتے ہوائی جہاز کے اڑان بھرنے کی تیز آواز نے اسے نہ صرف یکلخت نیند سے جگا دیا بلکہ وہ اپنے چہرے پر نمودار ہونے والے پانی کے ننھے قطرے بھی محسوس کر سکتا تھا۔ قبل اس کے کہ وہ ایک بھرپور جمائی لے کر دوبارہ دراز ہوتا اور گزشتہ رات دیکھے جانے والے خواب کو ذہن میں دُہراپاتا اس کی بیوی شیلٹن اس کے لیے بیڈ کافی لیے کمرے کے اندر داخل ہوئی۔

''جونی! تم بھول گئے کیا آج ہمیں ''ہالی ڈیز ان پیرس'' کے لیے روانہ ہونا ہے، جلدی سے پیکنگ میں میری مدد کرو۔'' اس نے مگ بائیں جانب میز پر رکھ کر اس کے بکھرے بالوں کو شرارت سے مزید بکھیر دیا۔

''اوہ ہاں مجھے یاد ہے مگر اس سے پہلے مجھے دفتر پہنچنا ہے، باس نے کسی ضروری معلومات کے لیے کی میٹنگ بلائی ہے۔ تم ناراض مت ہونا میں شام سے پہلے آجاؤں گا۔''

وہ عرصہ دس سال سے ایک تحقیقی ادارے میں نوکری کر رہا تھا۔

مسٹر جانسٹن کا کہنا تھا کہ خلا میں سورج جتنے حجم اور توانائی رکھنے والے کچھ ستاروں کے موجود ہونے کا امکان ہے۔

یہ معلومات بہت دلچسپ اور اہمیت کی حامل تھی..... مسٹر جانسٹن نے جونی کو خاص طور پر اس انکشاف کو ایک یقینی دریافت میں بدلنے کے لیے ساتھ مل کر کام کرنے کی تاکید کی تھی..... اور جونی نے ایک ہفتے بعد حاضر ہونے کا وعدہ کیا۔

☆☆☆

جونی جیسے نڈر خلائی محقق کے لیے مسٹر جانسٹن کی دی گئی معلومات کی تحقیق اب ایک چیلنج بن گئی تھی۔ پیرس سے واپسی پر اس نے تعطیلات کے باوجود دفتر سنبھال لیا اور جانسٹن کی ای میل کے ذریعے مہیا کی گئی تصاویر کی جانچ پڑتال کرنے لگا۔ اس نے خلائی اجسام کی تصاویر کو زوم اِن کر کے دیکھنا شروع کیا تو کچھ لمحوں بعد یکدم اسے ہفتہ قبل دیکھے جانے والا اپنا خواب یاد آیا جو اُس صبح اس کے ذہن سے بالکل محو ہو چکا تھا..... اسے بہت کم خواب آتے تھے مگر وہ جو خواب دیکھتا تھا، اسے ہمیشہ اپنی پوری جزئیات کے ساتھ یاد رہ جاتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے خوابوں کی حقیقت پر یقین رکھتا تھا۔ اپنے خوابوں کی سچائی کا یقین اسے پہلی بار اپنے بیٹے چارلس کی پیدائش پر ہوا تھا جب شادی کے چھ سال تک بے اولاد رہنے کے بعد اس کی امیدیں دم توڑنے لگی تھیں مگر دو سال قبل ماہِ دسمبر میں واشنگٹن میں اپنی ٹریننگ کے آخری روز جب وہ اپنے ہوٹل واپس آیا تو اس رات اس نے خواب میں دیکھا کہ سیاہ آسمان ستاروں سے بھرا ہے اور بہت بلندی پر پورا چاند چمک رہا ہے۔ اس کے دل میں شدید خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ اس چاند کو اتار کر اپنے پاس رکھ لے مگر ایسا کرنے سے وہ خود کو قاصر پاتا ہے، پھر اچانک منظر بدلتا ہے اور کھڑکی کے سامنے اس

کی بیوی آجاتی ہے جس کے ہاتھ میں وہی چاند ہوتا ہے جس کو پانے کی کچھ دیر پہلے وہ تمنا کر رہا ہوتا ہے۔

اگلی صبح اسے یہ خواب من وعن یاد تھا مگر وہ اس کا مطلب نہیں سمجھ پا رہا تھا لیکن جب وہ واپس نیو جرسی گیا تو شیلٹن نے اسے اولاد کی خوشخبری سنا کر خوشگوار حیرت میں مبتلا کر دیا۔ اسے واشنگٹن کے ہوٹل میں دیکھے جانے والے خواب کا مطلب بھی سمجھ آ چکا تھا۔

اور پھر یہی ہونے لگا اس کا اس بات پر یقین تھا کہ وہ خواب جو یاد رہ جائے، کچھ نہ کچھ معنی و مقصد ضرور رکھتا ہے جبکہ ایسے خواب جن کا کوشش کے باوجود کوئی سرا ہاتھ نہ لگے ذہن کے فتور کے سوا کچھ نہیں۔

اور یہی خیال جونی کا اس نئے خواب کے بارے میں تھا جو پورا ہفتہ اس کے ذہن سے محو رہا تھا مگر اب ایک جھماکے کے ساتھ نہ صرف اس کے سیاق وسباق بلکہ خواب کا وقت اور تاریخ بھی یاد آ گئی تھی۔ یہ ایسا خواب تھا جو مستقبل کی پیش گوئی کر رہا تھا۔ جس میں اس نے خود کو دوسری دنیا کا باسی دیکھا تھا۔ وہ دنیا اس کہکشاں سے ذرا پرے ایک اور کہکشاں میں آباد تھی اور جہاں موسمیاتی تبدیلیاں، رہن سہن، چرند پرند اِس دنیا کی مخلوق سے بہت حد تک مشابہت رکھتے تھے اور جہاں سے وہ اور اس کے جیسے دوسرے انسان وقت کی رفتار کا مقابلہ کرتی ٹریول مشین کے ذریعے سفر کر سکتے تھے۔

☆☆☆

جونی نے بہت سوچ بچار کے بعد اس خواب کا ذکر اپنے سب سے قابلِ اعتماد دوست نما باس یعنی مسٹر جانسٹن سے کیا جو یہ خواب سن کر پہلے حیران اور پھر مزید پُرجوش ہو گئے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ ان کے ادارے کی تین سال سے کی جانے والی محنت اب رنگ لے آئے گی اور جونی کی خواب کے ذریعے کی گئی پیش گوئی درست ثابت ہو گی اور پھر ایسا ہی ہوا۔ ریاستِ امریکا کے دارالحکومت واشنگٹن ڈی سی کے اخبارات میں مرچ مسالے سے بھرپور خبریں شائع ہونے لگیں۔

جونی ان جھوٹی سچی خبروں کی تردید کرنے کی غرض سے پریس کانفرنس کرنا چاہتا تھا مگر جانسٹن نے منع کر دیا کہ اس کے خیال میں یہ وقت کے زیاں کے سوا کچھ نہیں تھا، وہ چاہتے تھے کہ ان کے لیے عوامل اس قدر سود مند ہو جائیں کہ میڈیا کی جھوٹی باتیں بھی سچ ثابت ہو سکیں۔

اور اس کے ٹھیک ایک ماہ بعد ناسا، ملکی وے کہکشاں کے اندر ایک سے زائد زمین سے مشابہت رکھتے سیاروں کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

"ہماری کائنات صرف ایک دنیا کی زندگی پر مشتمل نہیں..... اس کہکشاں میں سورج کے مانند کچھ دیگر ستاروں کے گرد زمین ایسے سیارے گردش کرتے پائے گئے ہیں۔"

امریکی سائنسدانوں اور محققین کے گروہ کی تصدیق کے بعد یہ بات اخبارات کی شہ سرخی بننے لگی تھی۔

صرف یہی نہیں، انہوں نے برملا یہ انکشاف بھی کیا کہ وہاں بسنے والے بیشتر انسانوں کی شکلیں، عادتیں، حتیٰ کہ حسب نسب بھی ملتے جلتے ہیں۔

لہٰذا اب اگلا کٹھن مرحلہ وہاں کی مخلوق کی جسمانی، دماغی اور دفاعی قوتوں کو جانچنا تھا۔

اس مقصد کے لیے چند ماہر خلا بازوں کو اگلے دو روز میں خلائی سفر پر روانہ ہونے کا حکم دے دیا گیا۔

⌘⌘⌘

کشش ثقل

یہ نیوٹن نے دریافت کی تھی، غالباً اس سے پہلے نہیں ہوتی تھی۔ نیوٹن اس کے ذریعے درختوں سے سیب گرایا کرتا تھا۔ آج کل سیڑھی پر چڑھ کر توڑ لیتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کوئی شخص حکومت کی کرسی پر بیٹھ جائے تو اس کے لیے اٹھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لوگ زبردستی اٹھاتے ہیں، یہ بھی کشش ثقل کے باعث ہے۔ (ابن انشا)

مرسلہ۔ غلام حسین اختر، سرگودھا

چھٹا اور آخری حصہ

مختلف مزاج اور الگ الگ خاندانوں کا ملاپ اکثر و بیشتر مشکل ہو جاتا ہے چہ جائیکہ دو مختلف معاشروں میں رہنے والے لوگوں کا سنگم... جن میں زبان و بیان، رہن سہن اور مذہب جیسا فرق... جسے قبول کرنے کے لیے انسان کو دل بہت بڑا کرنا پڑتا ہے اور جناب دل کی بھی خوب رہی جب کسی پر آجائے تو سماج کی کوئی بھی دیوار ہو ثابت قدمی سے ڈٹ جانے والوں کے آگے ریت کی بھربھری دیوار بن کر گر بھی جاتی ہے مگر... یہاں مغربی ماحول میں گلابی جاڑوں کی طرح گلابی اردو بولنے والی اس دوشیزہ نے ایک پاکستانی نوجوان کو اس طرح فرینکفرٹ کی فضائوں کا اسیر کر ڈالا کہ پھر دنیا کے کسی گوشے میں اسے سکون نہ ملا... سکون ملتا بھی تو کیسے کہ وہ تو اپنوں کے پیار بھرے انتقام میں ایسے گھرا ہوا تھا کہ اسے ذرا بھی کسی کی نیت پر شک نہ ہوا... لیکن محبت ہو یا نفرت لاکھ چھپائے نہیں چھپتی، پھر ان نفرتوں اور محبتوں کی حقیقت کیسے چھپی رہ سکتی تھی۔ لہٰذا پسِ پردہ ہونے والی سازشوں کا بالآخر ایک دن پردہ چاک ہوا اور چاہت کے مدھر جذبوں نے خود کو منوالیا۔

انجانی نفرتوں میں پناہ تلاش کرنے والے اس جوڑے کی کتھا جو..... اپنوں کے اصل روپ سے بے خبر تھا

پسِ پردہ

طاہر جاوید مغل

خشامہ چرچ سے نکل کر سامنے کھڑی گاڑی میں گھس گئی تھی اور اب وہ کھڑی سی بنی گاڑی کی نشستوں کے عقبی خلا میں لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی تیز سانسیں اس کے اپنے ہی کانوں میں گونجتی رہیں۔ گاڑی کے اندر سردی تھی۔ شیشے دھندلائے ہوئے تھے۔ چرچ کا گھڑیال رات بارہ بجے کا وقت بتانے کے بعد خاموش ہو چکا تھا۔ بس کسی وقت کسی شب بیدار پرندے کی مدھم سی آواز گاڑی کے مختصر خلا تک پہنچ جاتی تھی۔

اچانک خشامہ کو اپنی کمر کے نیچے کسی سخت شے کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے تھوڑی سی کروٹ بدلی اور ہاتھ عقب میں لے جا کر اس چیز کو ٹٹولا..... وہ حیران ہوئی۔ یہ ایک رائفل تھی۔ اس نے دیکھا، چھوٹی نال والی یہ آٹومیٹک رائفل خالی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ایک خم دار میگزین اٹیچ تھا جو یقیناً لوڈڈ تھا۔ آوارہ بدمعاش مردوں کی صحبت میں رہ کر خشامہ کو اسلحے کی تھوڑی بہت پہچان بھی ہو گئی تھی۔ کم از کم اتنا تو تھا کہ وہ موقع پڑنے پر اس رائفل کا ٹریگر دبا سکتی تھی۔ رائفل کی موجودگی سے اس کے دل میں جہاں ایک طرح کا خوف پیدا ہوا، وہیں اس نے ایک طرح کی تسلی بھی محسوس کی..... رائفل فلالین کے ایک کپڑے میں لپٹی ہوئی تھی۔

اس نے اپنی لرزاں انگلی کے ساتھ ٹریگر پر تھوڑا سا دباؤ ڈالا۔ اس نے حرکت نہیں کی۔ اس کا مطلب تھا کہ رائفل کا وہ کھٹکا دبا ہوا ہے جسے سیفٹی کیچ کہا جاتا ہے۔ اس نے اس سیفٹی کیچ کو چیک کیا۔ وہ یہ سب کچھ احتیاط کے طور پر کر رہی تھی۔ نمرسی یا اس کے ساتھی کے ساتھ الجھنے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس کی پلاننگ یہی تھی کہ وہ اس اسٹیٹ کار کے ذریعے نمرسی اور اس کے ساتھی کے ہمراہ ہی چرچ کے احاطے سے نکل جائے..... پھر آگے کہیں جا کر یہ کار جونہی آہستہ ہو، یا کسی سگنل پر رکے، وہ نکل بھاگے اور زویا وغیرہ کے لیے مدد طلب کرے۔

دھڑکنیں سرپٹ تھیں۔ خشامہ کی سماعت باہر کی آوازوں پر لگی ہوئی تھی۔ ابھی تک نمرسی اور اس کا ساتھی باہر نہیں آئے تھے۔ زویا کی من موہنی صورت ایک بار پھر اس کی نگاہوں میں گھوم گئی۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل چاہا کہ زویا اس کے سامنے ہو، وہ اس کی کلائی پکڑے اور اسے اپنے ساتھ سڑکوں اور تنگ گلیوں میں بھگاتی چلی جائے..... یہاں تک کہ اسے سب خطرات سے دور کر دے۔ پھر ہانپی ہوئی سانسوں کے ساتھ وہ اس کے قدموں میں گر جائے۔ اس سے کہے۔ ''مجھے معاف کر دو۔''

وہ پوچھے۔ ''کس بات پر؟''

وہ جواب دے۔ ''ہر بات پر۔''

یکا یک کچھ آہٹوں نے اسے چونکایا۔ یہ خشک پتوں پر متحرک قدموں کی آواز تھی شاید..... وہ کچھ اور بھی سمٹ گئی..... ساکت ہو گئی۔ کار کا دروازہ ایک دم کھلا۔ نمرسی کا دراز قد ساتھی ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ تب دوسری جانب کا دروازہ وا ہوا۔ مزید سردی کا ایک جھونکا اندر آیا، اس کے ساتھ ہی نمرسی کی بھاری بھرکم آواز ابھری۔ ''چلو اسٹارٹ کرو۔''

اسٹیٹ کار اسٹارٹ ہوئی اور پچاس ساٹھ میٹر لمبے ڈرائیووے کو طے کر کے چرچ کے چوبی پھاٹک کے سامنے پہنچ گئی۔ گیٹ کا قفل کھولے جانے کی آوازیں آئیں۔ یقیناً یہ چرچ کا مسلح چوکیدار ہی تھا۔ گاڑی چرچ سے نکلی اور ایک ہموار سڑک پر آگے بڑھنے لگی۔ دھند کی وجہ سے اس کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ نمرسی اور مائیکل کے اندر بیٹھتے ہی گاڑی میں الکحل کی تیز بو پھیل گئی تھی۔ خشامہ ڈری ہوئی ضرور تھی مگر ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھی۔ نمرسی کی آواز سنتے ہی آٹومیٹک رائفل پر اس کی گرفت بے ساختہ مضبوط ہو گئی۔ رائفل کا دستہ اور بیرل کا بیشتر حصہ اب بھی فلالین کے کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔

نمرسی نے پاٹ دار آواز میں کہا۔ ''یہاں سے دائیں مڑنا ہے۔ آگے سیدھا ہی جانا ہے۔ وہ ہوٹل میرا دیکھا ہوا ہے۔ زیادہ بڑا نہیں ہے۔ سیکیورٹی بھی نہ ہونے کے برابر ہو گی۔''

''پھر بھی اس کے کمرے کا دروازہ تو کھلوانا ہی ہو گا جناب۔''

''کوئی مسئلہ نہیں۔ کسی ویٹر یا ویٹرس کی کنپٹی پر پستول آئے گا تو دروازہ بھی کھلے گا اور راستہ بھی مل جائے گا۔'' نمرسی کے لہجے میں بے پناہ سفاکی تھی۔

ذرا وقفے کے بعد مائیکل بولا۔ ''اور وہ باسٹرڈ؟''

''ابھی تو وہ اسپتال میں ہے۔ خاصی سیکیورٹی میں ہے۔ باہر نکل آیا تو اس کو بھی دیکھ لیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں، دوبارہ یہاں آ کر اس نے اپنی موت کو خود آواز دی ہے۔''

مائیکل نے ایک لمبی سانس لے کر کہا۔ ''اور دیکھا جائے باس تو چار سال پہلے اس منحوس کی آمد نے ہی ہماری مشکلات کا آغاز کیا تھا۔''

خشامہ سمجھ رہی تھی۔ مائیکل کا اشارہ یقیناً ڈبل اے چینل کی اسی انویسٹی گیشن کی طرف تھا جس کے نتیجے میں نمرسی اور سہراب کی ایک بڑی ناجائز پراپرٹی پکڑی گئی تھی۔

ان کی گفتگو جاری تھی۔ خشامہ جیسے ہزاروں فٹ کی بلندی پر ایک تنی ہوئی رسی پر کھڑی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا

کہ اس نے بلند آواز میں سانس بھی لی تو نمرسی اور مائیکل کو اس کی موجودگی کا پتا چل جائے گا۔ وہ بس اس انتظار میں تھی کہ کسی چوراہے پر گاڑی کسی ٹریفک سگنل پر رکے اور وہ دروازہ کھول کر نکل بھاگے مگر یوں لگ رہا تھا کہ اس سرخ اسٹیٹ کار کو آج برج برگ کے سارے سگنل گرین ہی مل رہے ہیں یا پھر شاید رات کے اس پہر سگنلز کو ''یلو بلنکنگ'' پر کر دیا گیا تھا۔ گاڑی میں ہیٹر آن تھا اور خشامہ کا جسم پسینے میں نہانا شروع ہو گیا تھا۔

تب اسے ایک اور خطرہ لاحق ہو گیا..... اور یہ شدید ترین خطرہ تھا۔ نمرسی یا مائیکل میں سے کسی نے اسموکنگ شروع کر دی تھی۔ الکحل کے ساتھ ساتھ تمباکو کی بو بھی خشامہ کے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ وہ خود بھی کبھی کبھار اسموکنگ کر لیتی تھی لیکن اب اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اسے کھانسی آجائے گی۔

کھانسی کا مطلب ایک دردناک صورتِ حال کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ان لمحوں میں خشامہ نے محسوس کیا کہ شاید اس نے یوں اس کار میں گھس کر غلطی کی ہے۔ نمرسی جیسا خوفناک شخص اس سے بس چار پانچ فٹ کی دوری پر تھا اور وہ دم سادھے پڑی تھی۔

''موبائل ٹھیک سے چارج ہے؟'' نمرسی نے مائیکل سے پوچھا۔

''یس باس۔''

''کچھ یادگار قسم کے کلپس بھی ہونے چاہئیں۔ یہ بعد میں سارہ جیم اور اس کی فیملی کو دباؤ میں رکھنے کے کام آئیں گے.....'' نمرسی کے لہجے میں شیطنت لشکارے مار رہی تھی۔

ان دونوں کی گفتگو گواہ تھی کہ وہ زویا کو عزت اور زندگی دونوں سے محروم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ حولیہ کو شاید زندگی کے حوالے سے رعایت مل جاتی۔

خشامہ نے ایک بار پھر اپنے پہلو کے ساتھ لگی ہوئی رائفل کو ٹٹولا اور اس کے اندر ایک طرح کی توانائی پیدا ہوئی۔

یہ سوال بھی اس کے ذہن میں ابھرا کہ یہ کس کی رائفل ہے؟

شاید یہ نمرسی نے ہی احتیاط کے طور پر یہاں رکھی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ رائفل جیسے بڑے ہتھیار کے ساتھ تو ہوٹل میں نہیں گھس سکتے تھے۔ اس کے لیے ان کے پاس یقیناً پسٹل وغیرہ ہوں گے۔ چرچ کے تہ خانے میں وہ نمرسی کے پاس ایک ایسا پسٹل دیکھ بھی چکی تھی۔ پسٹل دیکھ کر اسے یہی لگا تھا کہ وہ شاید کسی پولیس والے سے چھینا گیا ہے۔

یہاں موجود رائفل کے حوالے سے یہ امکان بھی تھا کہ نمرسی وغیرہ کو اس کے بارے میں معلوم ہی نہ ہو۔ جس طرح اس سرخ کار کا تعلق فادر سے تھا، اس رائفل کا تعلق بھی فادر یا چرچ کے کسی دوسرے ملازم سے ہو۔

وہ انہی سوچوں میں گم تھی جب گاڑی کو ایک جھٹکا لگا۔ شاید کوئی چیز سامنے سے گزری تھی اور مائیکل کو بریک لگانا پڑے تھے۔ یہ کافی سخت جھٹکا تھا۔ خشامہ خود کو ایک نشست کے آہنی فریم کے ساتھ ٹکرانے سے نہ روک سکی۔ اس کے سر پر کچھ چوٹ آئی۔ ہلکی سی آواز بھی پیدا ہوئی۔ یقیناً کچھ تکلیف بھی ہوتی لیکن یہ تکلیف اس شدید خوف کے نیچے دب گئی جو آواز کے سبب اس کے دل میں جاگا تھا۔

کار نے پھر رفتار پکڑ لی تھی مگر وہ سکتہ زدہ اپنی جگہ پر پڑی تھی۔ دل دھڑکنا بھول گیا تھا اور ردِعمل کا انتظار کر رہا تھا۔ چند سیکنڈ جیسے گھنٹوں سے زیادہ طویل تھے..... کیا آواز نمرسی اور مائیکل کے کانوں تک پہنچی ہے..... کیا اس آواز نے انہیں چونکایا ہے؟ کیا انہوں نے اسے عام سمجھا ہے اور اہمیت نہیں دی؟ کیا ان دونوں میں سے کوئی عقب میں جھانکنے کی کوشش کرے گا؟ سوالوں کی تپش نے اس کی پیشانی کو مزید عرق آلود کر دیا۔ دس پندرہ سیکنڈ بہت طویل محسوس ہوئے اور پھر اس کا خوف قدرے ماند پڑ گیا۔

نمرسی اور مائیکل بدستور باتوں میں مصروف تھے۔

کچھ دیر بعد گاڑی نے بائیں جانب ٹرن لیا۔ اس کی رفتار اس موقع پر کچھ کم ہوئی مگر اتنی کم بھی نہیں تھی کہ وہ باہر چھلانگ لگانے کا سوچ سکتی۔ غالباً یہ سڑک ٹریفک سے خالی تھی۔ دھند کے باوجود مائیکل اسے تیزی سے چلانے لگا۔

اکا دکا خشامہ کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے نمرسی نے مائیکل سے مخاطب ہو کر کہا تھا کہ اب سیدھا ہی جانا ہے..... پھر یہ ٹرن کیوں لیا گیا تھا؟

کیا واقعی انہیں کوئی شبہ تو نہیں ہو گیا تھا؟

لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ کسی وجہ سے انہوں نے ہوٹل کے لیے متبادل راستہ اختیار کیا ہو۔ ایک بار پھر اندیشے اس کے دل کو بے طرح دھڑکانے لگے۔

گاڑی تین چار منٹ تک تیز رفتاری سے آگے بڑھی پھر یوں لگا کہ وہ قدرے ناہموار راستے پر ہے۔ پھر اچانک وہ جھٹکے سے رک گئی۔ خشامہ کے سارے اندیشے ایکدم جوان ہو گئے۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ سوچتی یا کرتی، گاڑی کا اگلا

دائیں جانب والا دروازہ تیزی سے کھلا اور خشامہ نے محسوس کیا کہ کوئی باہر نکلا ہے۔ اگلے ہی لمحے پچھلا دروازہ بھی جھٹکے سے کھلا اور خشامہ نے رونالڈو نمرسی کو اپنے سامنے پایا۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا پسٹل صاف نظر آرہا تھا۔ پسٹل کا رخ سیدھا خشامہ کے سر کی طرف تھا۔ نمرسی کی آنکھوں میں جھانک کر خشامہ کے سارے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ وہ دیکھی جا چکی تھی۔

یہی لمحے تھے جب دراز قد مائیکل بھی ڈرائیونگ سیٹ سے اتر کر اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں موبائل فون تھا جس کی ٹارچ کی تیز روشنی سیدھی خشامہ پر پڑ رہی تھی۔ مائیکل نے تحیر زدہ انداز میں سیٹی بجائی۔ ''اوہو..... یہ چرچ کی عبادت گزار حسینہ یہاں کیا کر رہی ہے؟''

''کون ہو تم؟'' نمرسی دل دہلا دینے والی آواز میں پھنکارا۔

''کوئی لمبا چکر لگ رہا ہے باس۔'' مائیکل نے کہا۔

''اٹھ کے بیٹھو۔'' نمرسی نے بے حد تحکم سے کہا اور اس کے ساتھ ہی سیاہ پسٹل کو حرکت دی۔

وہ اٹھ کر آڑھی بیٹھ گئی۔ کپڑے میں لپٹی رائفل اب بھی اس کے عقب میں تھی اور ان دونوں کی نظر سے اوجھل تھی۔ خشامہ نے دیکھا یہ ایک سنسان جگہ تھی۔ گنجان درخت دھند میں لپٹے ہوئے تھے۔ دائیں طرف نشیب میں کافی دور کچھ دھندلائی روشنیاں نظر آرہی تھیں جو یقیناً ٹاؤن کی کسی سڑک کی تھیں۔

نمرسی نے بڑے زور کے ساتھ اسے سر کے بالوں سے جکڑا اور بے رحمی سے آگے پیچھے جھلا کر بولا۔ ''کس چکر میں ہو تم یہاں؟''

''مم..... میں بس چرچ سے نکلنا چاہتی تھی۔'' وہ... بہ مشکل بول پائی۔

ایک زناٹے کا تھپڑ اس کے گال پر پڑا اور نگاہوں میں تارے سے ناچ گئے۔

''بکواس بند کرو۔ جو سچ ہے وہ بتاؤ۔'' نمرسی دہاڑا۔ ''کس نے بھیجا ہے تمہیں یہاں؟''

''میں قسم کھاتی ہوں۔''

''تم اس طرح نہیں مانو گی۔'' نمرسی نے وحشت بھرے لہجے میں کہا اور گاڑی کے اندر گھس آیا۔

مائیکل بھی جلدی سے اندر آ گیا اور دروازے لاک کر لیے۔ دونوں کے تیور خطرناک تھے۔ خشامہ نے ایک کھڑکی میں سے دیکھا۔ چند فٹ کے فاصلے پر دھند سے ایک سائن بورڈ جھانک رہا تھا جس پر ''کیمپ سائٹ'' کے الفاظ لکھے تھے۔ یہ سڑک سے ہٹ کر درختوں میں گھری ہوئی کوئی ایسی جگہ تھی جہاں کیمپنگ وغیرہ کی جاتی تھی مگر اس موسم میں یہ ایریا بالکل سنسان پڑا تھا۔ یہاں اس ویرانے میں اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

نمرسی اپنے بدبودار وزن کے ساتھ اس پر چڑھ دوڑا۔ اس نے خشامہ کے گالوں کو اتنی شدت سے اپنے ہاتھ میں دبایا کہ خشامہ کو منہ کے اندر خون کا نمکین ذائقہ محسوس ہوا۔ مائیکل نے بڑی تیزی کے ساتھ اس کے پورے جسم پر ہاتھ چلایا۔ غالباً اس کا موبائل فون یا چھوٹا موٹا ہتھیار ڈھونڈ رہا تھا۔

اسے کچھ نہیں ملا۔ ''گرجے میں پولیس کی ٹاؤٹ ہے تُو؟'' نمرسی نے پھر آتشیں لہجے میں پوچھا۔ خشامہ نے نفی میں سر ہلایا۔

نمرسی نے اسے پوری طرح اپنے نیچے دبا رکھا تھا۔ اس کا پلاستر والا بازو خشامہ کی گردن پر تھا اور اسے یوں لگ رہا تھا کہ اس بازو کی دھکیل سے اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ جائے گی۔ نمرسی نے اپنے دوسرے ہاتھ سے اپنا موبائل فون نکالا اور مائیکل سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''فادر کو فون ملاؤ۔ پوچھو ان سے کہ نن کے لباس میں یہ لومڑی کون ہے۔''

مائیکل فون کرنے میں مصروف ہو گیا۔ نمرسی نے اسے بے رحمی سے نوچا۔ ''کیا نام ہے تمہارا؟''

''خش..... شا..... مہ!'' وہ گردن پر دباؤ کے سبب بہ مشکل بول پائی۔

''پوچھو فادر سے..... یہ کون ہے؟'' نمرسی نے پھر پھنکارتی سرگوشی کی۔

چند سیکنڈ بعد مائیکل کی آواز ابھری۔ ''فادر کا فون آف ہے۔''

نمرسی نے ایک اور تھپڑ خشامہ کے گال پر جڑا۔ ''اگر نہیں جانتی ہو تو جان لو۔ میرا نام رونالڈو نمرسی ہے۔ میں پتھر کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتا ہوں۔''

''میرا..... آپ سے..... کوئی لینا دینا نہیں۔ میں صرف چرچ سے نکلنا چاہتی تھی۔ چرچ کا ایک بدنیت بشپ میرے پیچھے پڑا ہوا تھا۔''

نمرسی نے دانت پیسے۔ خشامہ نے NUNS والا بند گلے کا گاؤن پہن رکھا تھا۔ اس نے گلے میں ہاتھ ڈال کر زور سے کھینچا۔ گاؤن نیچے تک پھٹ گیا۔ نمرسی نے مائیکل کے ہونٹوں سے سلگتا ہوا سگریٹ علیحدہ کیا اور بے دریغ

خشامہ کے کندھے کو داغ دیا..... کرب کی ایک ناقابل برداشت لہر اس کے پورے جسم میں دوڑ گئی۔ وہ بے طرح چلائی مگر اس کی آواز اس ویرانے میں کون سنتا، ویسے بھی وہ بند گاڑی کے اندر تھی۔ نمرسی کی سانسوں میں بدبو کے بھبکے تھے اور آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ یہ ایک سفاک قاتل کی آنکھیں تھیں۔ عین ممکن تھا کہ ابھی چند سیکنڈ بعد وہ جھلا کر پسٹل کی گولی اس کی پیشانی میں اتار دیتا اور اس کی لاش کو اس ٹیلے کے دھندلے درختوں میں پھینک کر اپنے راستے پر چل پڑتا..... وہ بے شک جوانی کے دور سے گزر چکا تھا مگر اب بھی ایک درندہ تھا۔ جب اس نے دوسری بار خشامہ کے جسم کو سگریٹ سے داغا تو سب کچھ اس کی برداشت سے باہر ہوگیا۔ نتائج سے بے پروا ہوکر اس نے اپنے نیچے دبی ہوئی رائفل کو سیدھا کیا اور بیرل کو نمرسی کی ناف کی طرف لے جا کر ٹریگر دبا دیا۔ سماعت شکن دھماکے سے نمرسی کا جسم اچھلا اور اس کی آنکھوں میں بے پناہ حیرت کی یلغار ہوئی۔ دوسرا فائر خشامہ نے اس کے سینے پر کیا اور یہ ایک کارگر فائر تھا۔ یہی وقت تھا جب خشامہ نے دیکھا کہ مائیکل اپنا ہاتھ سیاہ جیکٹ کے اندر گھسا چکا ہے، یقیناً وہ اپنا ہتھیار نکال رہا تھا۔ یہ بس ایک یا آدھے سیکنڈ کا کھیل تھا۔ خشامہ نے ایک چنگھاڑ کے ساتھ رائفل اس کی گردن سے لگائی اور تیسری بار ٹریگر دبایا۔ دراز قد مائیکل اچھل کر ڈیش بورڈ سے ٹکرایا۔ اس کے خون کے چھینٹوں نے ونڈ اسکرین کو داغدار کر دیا تھا۔ رائفل سنگل شاٹ پر سیٹ تھی۔ خشامہ یکے بعد دیگرے ٹریگر دباتی چلی گئی۔ ایک دو فائر خالی بھی گئے ہوں گے تاہم کم و بیش چھ گولیاں مزید ان دونوں کے سر اور سینے میں اتر گئیں۔ نمرسی کی کھوپڑی ایک جانب سے اڑ چکی تھی، مائیکل بھی مکمل لاش کی صورت اختیار کر چکا تھا..... فائرنگ سے ایک جانب کی کھڑکی چکنا چور ہوگئی تھی۔ چھت میں بھی سوراخ تھے۔

خشامہ کے سینے میں جیسے دھڑکن کے گولے پھٹ رہے تھے۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ کر چکی ہے۔ وہ تو صرف اس لیے گاڑی میں گھسی تھی کہ موقع تاک کر نکل سکے اور کسی بھی طرح زویا کی مدد کر سکے۔ وہ اپنی جگہ ساکت و جامد بیٹھی رہی اور کسی ردعمل کا انتظار کرتی رہی۔ فائرنگ ''بند گاڑی'' کے اندر ہی ہوئی تھی..... اور یہ بالکل سنسان جگہ تھی۔ اس کے باوجود اس امر کا اندیشہ موجود تھا کہ کوئی اس جانب متوجہ ہوجاتا اور اگر پٹرولنگ پولیس متوجہ ہوتی تو پھر خشامہ کے مسائل میں زبردست اضافہ ہوسکتا تھا۔ جزوی طور پر کپڑے میں لپٹی ہوئی رائفل اب بھی خشامہ کے ہاتھوں میں تھی۔

وہ کچھ دیر تک ساکت بیٹھی اپنی دھڑکنیں گنتی رہی، پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا سارا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس نے اپنے پھٹے ہوئے گریبان کو اس طرح گرہیں دیں کہ سامنے سے بدن ڈھک گیا۔ اس کا دایاں پاؤں جوتی سمیت نمرسی کے خون سے لتھڑ گیا تھا۔ وہ خود کو سنبھالتی ہوئی گاڑی میں سے باہر نکل آئی۔ گہری دھند، سردی اور تاریکی کا تال میل اس ویران جگہ کے ماحول کو جداشکل دے رہا تھا۔ وہ کچھ لمحوں تک گاڑی کے قریب سکتہ زدہ حالت میں کھڑی رہی، پھر لڑکھڑاتی ہوئی سی نشیب کی طرف بڑھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کر چکی ہے اور اب اس نے کیا کرنا ہے؟ کپڑے میں لپٹی ہوئی رائفل اب بھی اس کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ اسے پھینک دینا چاہتی تھی..... مگر کہاں؟

بے شک فائرنگ کے دوران میں بھی رائفل جزوی طور پر فلالین کے اس کپڑے میں ہی لپٹی رہی تھی مگر پھر بھی اس پر فنگر پرنٹس وغیرہ کی تلاش ہوسکتی تھی۔ وہ پچاس ساٹھ قدم آگے گئی تو اسے ڈھلوان پر ایک گڑھا نظر آیا۔ اسے بارشی تالاب بھی کہا جاسکتا تھا۔ اس نے رائفل کو اچھی طرح کپڑے سے رگڑا اور پھر تالاب کی گہرائی میں پھینک دیا۔ تب اس نے اپنی جوتی اور اپنا خون آلود پاؤں اچھی طرح دھو لیا۔ سفید گاؤن کے ایک کنارے کو بھی خون کے چھینٹوں سے صاف کیا اور چند قدم ہٹ کر پائن کے ایک اونچے پیڑ کے نیچے کھڑی ہوگئی۔ وہ بلندی پر تھی۔ دائیں جانب دھند کے اندر سے برج برگ کی کچھ دھندلائی ہوئی روشنیاں نظر آتی تھیں۔ ان روشنیوں میں ہی کہیں وہ ہوٹل بھی تھا جہاں نمرسی اور مائیکل موت کے فرشتوں کا روپ دھار کر جارہے تھے۔ اس زویا کے لیے جو ہوٹل کے کسی کمرے میں اپنی بچی اور بہن کے ساتھ سو رہی تھی۔ اس نے تصور ہی تصور میں زویا کے چہرے پر ہاتھ پھیرا..... اس کے بالوں کو سہلایا..... پیاری زویا! میں نے ایک بڑی مصیبت کو تم تک پہنچنے سے روکا ہے۔ مجھ سے جو کچھ بن پڑا میں نے کیا ہے..... اب خدا تمہاری حفاظت کرے۔

تب اس کی نگاہ بائیں جانب اٹھ گئی۔ دھند کی وجہ سے زیادہ دور تک نظر نہیں آرہا تھا۔ تاہم وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ دھند کی اس دیوار کے پیچھے عظیم الشان شہر ہیمبرگ کی روشنیاں ہیں..... اور اس سے آگے نیومنسٹر ہے..... اور اس سے آگے ''فلینز برگ''..... فلینز برگ کے نواحی قصبے اور

بستیاں۔ ایسے ہی کسی قصبے یا بستی کا گرجا گھر اس کی نئی پناہ گاہ بن سکتا تھا۔ وہ جس راستے پر چل پڑی تھی اب اس سے پلٹنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ اسی راستے پر آسودہ تھی۔ اس نے اپنے لبادے کو ایک بار پھر اچھی طرح اپنے گرد لپیٹا۔ اسے اپنے بالائی جسم پر جلن محسوس ہو رہی تھی۔ یہ انہی دو داغوں کی جلن تھی جو نمرسی نے دہکے ہوئے سگریٹ سے اسے لگائے تھے۔ اس جلن سے دھیان ہٹا کر وہ تیز قدموں سے نیچے اترنے لگی۔ وہ جلد از جلد اس سرخ کار سے دور چلے جانا چاہتی تھی جہاں دو ''درندہ صفت'' اپنے خون میں لت پت پڑے تھے۔

☆☆☆

زویا صبح سات بجے کے لگ بھگ جاگی۔ اس نے اپنے پہلو میں سوئی ہوئی ننھی عینی کا رخسار چوما پھر اٹھ کر کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا سرکایا۔ ہوٹل کا لان دکھائی دے رہا تھا اور سڑک کا کچھ حصہ بھی۔ دھندرات کے مقابلے میں کچھ کم تھی مگر موجود تھی۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ ٹی وی کے ریموٹ کی طرف بڑھا لیکن پھر اس نے ارادہ بدل دیا۔ درحقیقت پچھلے تین چار روز سے اس نے ٹی وی تقریباً آف ہی رکھا تھا۔ اسے وحشت سی ہونے لگتی تھی نیوز وغیرہ سن کر۔

منہ ہاتھ دھو کر اور شال اوڑھ کر وہ بالکونی کی طرف آ گئی۔ حولیہ نیچے شاید لابی میں گئی ہوئی تھی۔ وہ بالکونی کے جنگلے پر کہنیاں ٹکا کر خالی خالی نظروں سے سیب اور چیری کے خوش رنگ پودوں کو دیکھنے لگی۔

اسے معلوم نہیں تھا، کل رات کتنا بڑا طوفان اس تک پہنچتے پہنچتے رہ گیا ہے اور یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ طوفان کس وجہ سے اس تک پہنچ نہیں پایا..... اور نہ ہی اسے کبھی معلوم ہونا تھا۔ انسان کی زندگی میں کبھی کبھی ایسے واقعات بھی رونما ہوتے ہیں۔ اس کے اردگرد کچھ ہو رہا ہوتا ہے۔ کوئی اس کی خیریت و سلامتی پر حملہ آور ہو رہا ہوتا ہے اور کوئی اس کا دفاع کر رہا ہوتا ہے۔ نہ وہ حملہ آور کے بارے میں جان پاتا ہے، نہ اپنا دفاع کرنے والے کے بارے میں۔ زویا بھی نہیں جانتی تھی کہ کل ایک عفریت کی وحشت اس کو چھو کر گزر گئی تھی۔

کمرے کی جانب سے حولیہ کی آواز آئی۔ ''زویا! کہاں ہو..... یہ دیکھو۔''

زویا بالکونی سے پلٹ کر اندر گئی۔ حولیہ کے ہاتھ میں تازہ اخبار تھا۔ وہ سنسنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''کیا ہوا؟'' زویا نے چونک کر پوچھا۔

وہ دبے دبے جوش سے بولی۔ ''ہمیں پچھلے دو تین روز کی صورتِ حال کا پتا ہی نہیں چلا۔ نمرسی کے حوالے سے کافی کچھ ہوا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''محترمہ! تین روز پہلے وہ پولیس کی حراست سے فرار ہو گیا تھا۔''

''کیا کہہ رہی ہو؟'' زویا کے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔

''بالکل ایسا ہوا ہے لیکن یہ تین روز پہلے کی بات ہے۔ کل رات وہ اپنے ایک ساتھی سمیت ''براڈہل'' پر مارا گیا ہے..... یہ دیکھو۔'' حولیہ نے لرزاں ہاتھوں سے اخبار زویا کی طرف بڑھایا۔

زویا نے حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھا۔ نمرسی کے جہنم واصل ہونے کی خبر جلی حروف میں موجود تھی۔ اس کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئی اور پڑھنے لگی۔ خبر کے ساتھ رونالڈ نمرسی کی ایک فائل فوٹو بھی موجود تھی۔ ساتھ میں ایک اور شخص بھی تھا، اس کو زویا کیسے بھول سکتی تھی۔ یہی خبیث مائیکل تھا جس نے اسے عینی سمیت لیونابرگ میں یرغمال بنائے رکھا تھا..... اور بڑی بے حیائی سے ہراساں کرتا رہا تھا۔ وہاں سے فرار ہوتے وقت زویا نے اس کے منہ پر شیشے کے ٹکڑے سے کاری وار کیا تھا اور رخسار چیر کر رکھ دیا تھا۔

خبر کی ہیڈ لائن تھی۔ ''فرار کے قریباً 72 گھنٹے بعد رونالڈ نمرسی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔''

ذیلی سرخی تھی۔ ''اپنے قریبی ساتھی مائیکل کی لاش سمیت اس کی لاش براڈہل کے ایریا میں ایک کار کے اندر پائی گئی ہے۔''

خبر کا متن کچھ یوں تھا۔ ''ویران علاقے میں کھڑی کار کے اندر رونالڈ نمرسی مردہ حالت میں پایا گیا۔ اس کے سر اور سینے میں نہایت قریب سے چار گولیاں ماری گئی ہیں۔ کچھ ایسی ہی صورتِ حال دوسری لاش کی بھی ہے۔ بتایا جا رہا ہے کہ جس سرخ اسٹیٹ کار سے یہ لاشیں ملی ہیں، وہ چرچ کی ملکیت ہے اور واردات سے چند گھنٹے پہلے چوری ہو گئی تھی۔ اس کی رپورٹ بھی درج ہے۔ موقع سے جو شواہد اکٹھے ہوئے ہیں، ان سے یہی قیاس کیا جا رہا ہے کہ یہ دونوں قتل آپسی لڑائی کا نتیجہ ہیں۔ نمرسی ہی کے کسی مخالف گروپ نے اسے اور اس کے ساتھی کو ہلاک کیا ہے۔''

زویا کا دل بھر آیا۔ یہی جانور تھا جس نے اس پر اور اس کی فیملی پر عرصۂ حیات تنگ کیے رکھا تھا۔ آج وہ اپنے حتمی

انجام کو پہنچ گیا تھا۔ حولیہ کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ اس کی ناک سرخ ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

اتنے میں دو سالہ عینی بھی جاگ گئی اور ہولے ہولے چلتی زویا کے پاس پہنچ گئی۔ زویا نے اسے بازوؤں سے تھام کر اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ عجیب کیفیت میں تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ ایک عرصے بعد آج ایک جانکاہ خوف سے آزاد ہوئی ہے۔ اس نے عینی کے بالوں کو چوما اور ایسا کرتے ہوئے اس کے رخساروں پر دو موتی ڈھلک آئے۔

اس کا جی چاہا کہ وہ ابھی شامیر کا نمبر ملائے اور اس سے یہ خبر شیئر کرے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی بھی مگر پھر بیٹھ گئی۔ اسے سینئر ڈاکٹر کی بات یاد آ گئی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ شامیر کو بار بار ڈسٹرب نہ کیا جائے تو بہتر ہے۔

اسی دوران میں ٹام کی کال آ گئی۔ ٹام واحد شخص تھا جسے فی الوقت زویا اور حولیہ کے ٹھکانے کا پتا تھا۔ وہ بھی نمرسی اور مائیکل کی ہلاکت کے بارے میں جان چکا تھا۔ اس کے لب و لہجے میں گہرے اطمینان کی جھلک تھی۔

زویا نے کہا۔ ''ٹام! شروع میں تو پتا چلا تھا کہ کار الٹنے کے بعد نمرسی سخت زخمی ہوا ہے اور شاید جانبر نہ ہو سکے، مگر لگتا ہے کہ وہ زیادہ سیریس نہیں تھا۔ اسی لیے تو ٹھیک بھی ہوا اور فرار بھی۔''

ٹام نے کہا۔ ''حادثے کے وقت وہ گہرے نشے میں تھا اور یوں لگتا تھا کہ بہت گہری بے ہوشی میں چلا گیا ہے، مگر پھر سنبھل گیا تھا۔''

ٹام نے مزید بتایا کہ اطلاعات کے مطابق یہاں پر نمرسی کے بچے کھچے ساتھیوں کا بھی تقریباً صفایا ہو گیا ہے۔ نمرسی سے کاروباری لنک رکھنے والے کچھ لوگ بھی گرفتار ہوئے ہیں۔

زویا اور اس کے منہ بولے بھائی ٹام میں کچھ دیر اسی حوالے سے بات ہوتی رہی پھر ٹام نے ذرا ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ''زویا! ایک بات کہنا چاہ رہا ہوں تم سے..... بلکہ تین چار روز سے کہنا چاہ رہا تھا۔ پتا نہیں کہ تمہیں ٹھیک لگے یا نہیں۔''

''ہاں ہاں کہو۔''

''ہفتے کے روز ٹاؤن کی ایک پولیس آفیسر ماریا سادہ لباس میں میرے پاس پہنچی تھی۔ وہ اسی جیل میں فرائض انجام دیتی ہے جہاں آج کل رابرٹ کو رکھا گیا ہے۔ وہ رابرٹ سے بہت متاثر نظر آتی ہے اور اس کی مدد کرنا چاہتی ہے۔''

رابرٹ کا نام سنتے ہی زویا کے جسم میں چنگاریاں سی پھیل گئیں۔ وہ شوہر تو کیا، انسان کہلائے جانے کے قابل بھی نہیں تھا۔ جب سے اس نے ٹام پر حملہ کیا تھا، زویا کو اس کا نام سننا بھی گوارا نہیں تھا۔

وہ خود پر ضبط کرتے ہوئے بولی۔ ''کیا کہہ رہی ہے پولیس آفیسر؟''

''وہ کہتی ہے، رابرٹ اپنے کیے پر بہت نادم ہے۔ رات دن روتا ہے۔ جس کے ساتھ بھی اس کی طرف سے زیادتی ہوئی ہے اس سے معافی مانگنا چاہتا ہے۔''

''بہت خوب..... معافی۔'' زویا نے دکھی استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ''ٹام! تم جانتے ہی ہو، اس شخص کی معافیاں تلافیاں کتنی دیرپا ہوتی ہیں..... میں بہت بھگت چکی ہوں اس کی یہ معافیاں..... وہ دو چہروں والا جانور صفت بندہ ہے۔''

''میں سب جانتا ہوں زویا! مگر درمیانی عمر کی وہ آفیسر اس سے بہت متاثر نظر آتی ہے۔ میں تو اس آفیسر کو سادہ دل ہی کہوں گا۔ اس نے رابرٹ کا لکھا ہوا ایک خط بھی مجھے دیا ہے۔ اس خط میں رابرٹ نے مجھ سے بھی معافی مانگی ہے۔ مجھ پر حملہ کرنے کے حوالے سے بے حد ندامت اور پچھتاوے کا اظہار کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ وہ طیش میں ہوش کھو بیٹھا تھا اور اپنے اس جرم کے لیے ہر سزا بھگتنے کے لیے تیار ہے۔''

''ٹام! یہ اس کا وہی دوسرا روپ ہے جو بندے کی مت مار دیتا ہے۔''

ٹام کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ''آفیسر نے درخواست کی ہے کہ وہ ایک دفعہ اپنی بچی کی اور تمہاری شکل دیکھنا چاہتا ہے۔ بہت منت کر رہا ہے کہ ایک بار تم دونوں اس سے مل لو۔''

''ہرگز نہیں ٹام! میں اس کا نام سننا بھی نہیں چاہتی۔'' وہ جیسے کانپ کر رہ گئی۔

''مگر زویا جو کچھ بھی ہے، وہ عینی کا باپ ہے۔ تمہیں پتا ہی ہے، ہمارے قانون میں قیدیوں کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ ایک مخصوص وقت کے بعد انہیں ان کی فیملیز سے ملایا جاتا ہے۔ آفیسر ماریا کہتی ہے کہ وہ اپنی بچی کے لیے تڑپ رہا ہے.....''

''مجھے اس کی تڑپ بڑی اچھی طرح معلوم ہے۔'' زویا کا لہجہ زہر خند تھا۔

''آفیسر نے درخواست کی ہے کہ کم از کم ایک بار تم، رابرٹ سے فون پر بات کر لو۔ وہ اس ٹیلی فونک گفتگو کے لیے خصوصی رعایت حاصل کر سکتی ہے۔''

''نہیں ٹام! مجھے اس امتحان میں نہ ڈالو۔ اس کی آواز سننے کے خیال سے ہی میرا دل ہولنے لگا ہے۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ تم اس آفیسر کو بھی بتاؤ کہ یہ شخص کس طرح گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے اور اس کی باتوں میں کتنا وزن ہے۔''

ٹام نے زویا کو سمجھایا بجھایا اور اس سے کہا۔ ''کم از کم آفیسر ماریا کو مطمئن کرنے کے لیے ہی ایک بار رابرٹ سے بات کرلو۔ اس بات چیت سے کوئی درمیانی راستہ بھی نکل سکتا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم خود اس سے ملنے نہ جاؤ بلکہ کسی کے ذریعے عینی اس سے مل لے۔'' پھر اس نے ذرا توقف سے کہا۔ ''ویسے بھی تمہیں اور عینی کو چھپنے کی ضرورت نہیں۔ اب تو یہ نمرسی والا وبال ختم ہوگیا ہے۔ اس حوالے سے جو بھی اندیشے تھے، وہ اب نہیں رہے.....''

ٹام کے بہت مجبور کرنے پر رات کے وقت زویا نے خود پر جبر کرکے رابرٹ سے بات کی۔ رابرٹ کا لب ولہجہ اور اس کی گفتگو حسبِ توقع ہی تھی۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں بے پناہ ندامت کا اظہار کیا۔

بولا۔ ''زویا! ایک سال بعد تمہاری آواز سن رہا ہوں۔ اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا۔ نہ ہی یہ بات سمجھ میں آرہی ہے کہ تم سے کن الفاظ میں معافی مانگوں۔ اپنی نگاہوں میں اتنا گر گیا ہوں کہ کسی وقت خودکشی کرنے کو دل چاہتا ہے۔ میرا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ میں نے تم پر شک کیا۔ تمہارے اور ٹام کے تعلق کو غلط نظر سے دیکھا۔ کاش اس غلط روی سے پہلے مجھے موت آجاتی۔'' وہ اشک بار تھا۔

زویا خاموشی سے سن رہی تھی۔ ان باتوں کا اثر اس کے دل پر نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ ایسے مکالمے پہلے بھی بہت سن چکی تھی..... اور پھر ان مکالموں کے دو چار دن بعد ہی کیا ہوتا تھا، وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ وہی تمتمایا ہوا چہرہ، وہی آگ اگلتا لہجہ، وہی ملکیت اور حاکمیت کا جنون۔ اس کے بعد زویا کے حصے میں توہین وتذلیل اور جسم وروح کی پامالی ہی آتی تھی۔

وہ پھر گویا ہوا۔ ''میں نے ٹام سے تہ دل سے معافی مانگی ہے۔ میں شامیر کے پاؤں بھی پکڑنا چاہتا ہوں۔ میرا رویہ اس کے حوالے سے بھی شاید ٹھیک نہیں تھا۔ اس کی وجہ سے تمہاری اور عینی کی جان بچی۔ میں مر کر بھی اس کا یہ احسان نہیں چکا سکتا۔ خدا اس کو زندگی اور صحت دے۔''

''اب تم کیا چاہتے ہو رابرٹ؟'' زویا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''صرف یہ کہ..... مجھے ایک موقع..... صرف ایک موقع اور دے دو..... میرے پچھلے سارے گناہ معاف کرکے صرف ایک بار مجھے بتا دو کہ مستقبل میں میرے لیے امید کی روشنی موجود ہے..... پھر میری سزا کتنی بھی لمبی ہوگی، میں تمہارے بخشے ہوئے حوصلے کی طاقت سے کاٹ لوں گا۔''

''کچھ چیزیں انسان کے اختیار میں نہیں ہوتیں رابرٹ..... اور میں اتنی بار زخمی ہوئی ہوں کہ میرے اندر کے زخم ناقابلِ علاج ہوگئے ہیں۔ یہ اب مندمل نہیں ہوسکتے۔''

''پلیز..... میں صرف ایک موقع کی بات کر رہا ہوں۔'' وہ گھگیایا۔

وہ خاموش رہی۔ اس کے پاس رابرٹ کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اگر درمیان میں عینی نہ ہوتی تو شاید وہ ابھی یہ فون کاٹ دیتی۔

اس نے کہا۔ ''زویا! تمہیں اور عینی کو دیکھنے کے لیے میری نگاہیں ترس گئی ہیں۔ بس ایک بار مجھے اپنی جھلک دکھا جاؤ۔ مجھ سے اب اور انتظار نہیں ہوتا۔''

''میں..... اپنے وکیل سے مشورہ کرکے ہی بتا سکتی ہوں۔''

وہ تڑپ اٹھا۔ ''نہیں، وکیل سے نہیں..... اپنے دل سے مشورہ کرو زویا۔ عینی کے لیے تمہارے دل میں جو ممتا ہے اس سے مشورہ کرو..... پلیز زویا۔''

''مم..... میں ابھی کوئی جواب نہیں دے سکتی۔ مجھے سوچنے کے لیے وقت چاہیے۔'' زویا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

رابرٹ سے بات ختم کرکے وہ دیر تک ہوٹل کے اس کمرے میں ٹہلتی رہی۔ انسان، انسان میں کتنا فرق ہوتا ہے، اس نے سوچا۔ ایک طرف یہ رابرٹ لوئیس تھا۔ ایک اعلیٰ جرمن خاندان کا چشم وچراغ، مگر وہ دہری زندگی جی رہا تھا۔ ایک روپ میں وہ نہایت شریف النفس اور عبادت گزار تھا، دوسرے روپ میں اس نے اپنی بیوی اور معصوم بچی کو اپنے اندر کی آگ میں جلا جلا کر نیم جان کر دیا تھا۔ دوسری طرف دور دیس سے آنے والا شامیر تھا..... اپنے اندر بے لوث محبت، قربانی اور وفا کا جذبہ رکھنے والا۔ وہ جرمن نہیں تھا اور نہ ہی اپنے حسب نسب کے حوالے سے اسے کوئی غرور تھا لیکن جب وقت آیا تھا تو وہ بے خطر ایک آگ میں کود پڑا تھا اور اپنا حسب نسب ثابت کیا تھا۔

☆☆☆

زویا کا شوہر نامدار رابرٹ جیل میں تھا۔ اس نے ایک ڈیوٹی آفیسر سارجنٹ ماریا کو اپنی باتوں سے شیشے میں

اتارا تھا۔ اس کے اندر اپنے لیے اپنایت اور ترحم کے جذبات پیدا کیے تھے اور اس کے ذریعے بالآخر ٹام اور زویا سے رابطہ کرنے میں کامیاب رہا تھا۔

ماریا نے کل پھر زویا سے اس کی بات بذریعہ موبائل فون کرائی تھی۔ اب رابرٹ کو امید تھی کہ آج کسی وقت وہ اس سے ملنے یہاں پہنچے گی۔ وہ اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ کسی قیمت پر بھی نہیں۔

وہ اس کی ضرورت بن چکی تھی۔ وہ ان وحشی پانیوں کا کنارہ تھی جو گاہے بگاہے اس کے اندر موجزن ہوتا تھا۔ اس کا استحصال اس کی خو بن چکا تھا۔ عینی کا تو بس بہانہ ہی تھا۔ اصل میں وہ عینی کے ذریعے زویا کو اپنی پہنچ میں رکھنا چاہتا تھا۔ حال میں نہ سہی، مستقبل میں سہی..... وہ اس کے جملہ حقوق کا مالک کہلا سکتا تھا۔ ویسے مقامی قوانین کے تحت دوران قید بھی ہر چند ماہ بعد بیوی اور شوہر کو تنہائی میں ملاقات کے مواقع فراہم کیے جاتے تھے۔ اس طرح کی ساری باتیں رابرٹ کے ذہن میں تھیں۔

وہ لاک اپ میں ٹہل رہا تھا اور بڑی بے چینی سے زویا اور عینی کی آمد کا منتظر تھا۔ آخر خدا خدا کر کے وہ گھڑی آن پہنچی۔ ایک اہلکار نے آہنی سلاخوں کے سامنے آ کر اسے اطلاع دی کہ اس کی فیملی آ گئی ہے۔ رابرٹ کا دل شدت سے دھڑک اٹھا۔ چہرے پر ایک دکھ آمیز افسردگی لے کر وہ اسٹیل کی چمکیلی سلاخوں کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ دو چار منٹ بعد سامنے والے کوریڈور میں اونچی ایڑی کی ٹھک ٹھک سنائی دی۔ وہ آ رہی تھی..... ہاں وہ آ رہی تھی۔

پھر دروازہ کھلا اور وہ عینی کے ساتھ اندر آ گئی..... مگر..... وہ زویا نہیں تھی۔ رابرٹ نے آنکھیں سکوڑ کر دیکھا۔ وہ زویا کی بہن ڈاکٹر حولیہ تھی۔ اس نے زویا ہی کے انداز میں اسکارف لے رکھا تھا۔ اس کی گود میں عینی تھی جس نے دو پونی ٹیلو کر رکھی تھیں اور نئے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

رابرٹ کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ پہلے مایوسی کی لہر اور پھر طیش کی چنگاریاں اس کے تن بدن میں پھیل گئیں۔ آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ وہ نہیں آئی تھی۔ اس نے وہی ڈھیٹ پن دکھایا تھا جس کا وسوسہ رابرٹ کے دماغ میں تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے ذہن میں آیا، شاید وہ بھی آئی ہو مگر سامنے آنے سے جھجک محسوس کر رہی ہو یا پھر..... سرپرائز دینا چاہتی ہو۔

''آپ..... اکیلی..... زویا کہاں ہے؟'' رابرٹ نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''وہ نہیں آ سکی..... اس کی طبیعت اچھی نہیں تھی۔'' حولیہ نے اس سے نگاہیں ملائے بغیر جواب دیا۔

''کیا ہوا اس کی طبیعت کو۔ کل تو وہ اچھی بھلی تھی۔ اس نے بات کی ہے مجھ سے؟''

حولیہ نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے عینی سے کہا۔ ''ڈیڈ کو ہیلو بولو۔ بات کروان سے؟''

دو سالہ عینی نے اجنبی نظروں سے رابرٹ کو دیکھا پھر توتلی زبان میں ''ہیلو'' کہہ کر جیسے اپنے آپ میں سمٹ گئی۔

رابرٹ نے بس رسمی انداز میں سلاخوں میں سے ہاتھ باہر نکالا اور عینی کے گالوں کو چھوا۔ اس کی ساری توجہ اپنے سوال کے جواب کی طرف تھی۔ وہ خشمگیں نظروں سے حولیہ کو دیکھ رہا تھا۔

''میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے ڈاکٹر حولیہ۔'' وہ اپنے لہجے کو حتی الامکان شائستہ رکھتے ہوئے بولا۔

''میں نے بھی جواب دے دیا ہے۔ وہ نہیں آ سکی۔''

''آ نہیں سکی، یا آنا نہیں چاہتی؟'' رابرٹ کا پارہ چڑھنا شروع ہو گیا۔

''جو بھی تم سمجھ لو۔''

''کیا مطلب..... کیا مطلب ہے اس بات کا؟'' رابرٹ کے لہجے میں دبی دبی آتش جھلک دکھانے لگی۔

حولیہ کے چہرے پر تاگواری تھی۔ اس نے رابرٹ کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اچانک جیسے لاک اپ کے اس حصے میں زلزلہ سا آ گیا۔ عالم طیش میں رابرٹ اتنی زور سے گرجا کہ در و دیوار ہل گئے۔ اس نے جنونی انداز میں اپنا دایاں ہاتھ سلاخوں میں سے نکالا اور حولیہ کا گریبان دبوچ لیا۔ وہ چنگھاڑا۔ ''اس حرامزادی کی یہ جرأت؟ کیوں نہیں آئی وہ؟ کیوں نہیں آئی..... تم ساری بہنیں ایک جیسی ہو۔ ایک جیسی کمینی، ایک جیسی لعنتی اور نیچ..... میں مار چھوڑوں گا اس کو..... میں مار چھوڑوں گا۔''

کچھ فاصلے پر موجود سارجنٹ ماریا اور ایک گارڈ بھی ہکا بکا رہ گئے۔ شاید انہیں یقین ہی نہیں آیا تھا کہ اتنا دھیما اور عاجز نظر آنے والا غمزدہ رابرٹ اچانک اس قدر آگ بگولا ہو جائے گا۔

رابرٹ نے حولیہ کا گریبان جکڑ رکھا تھا اور چلا رہا تھا۔ ''وہ باسٹرڈ اپنے دو دو یاروں سے مل رہی ہے۔ یہاں اپنے شوہر کے پاس آتے ہوئے اسے موت پڑتی ہے۔ اسے آنا پڑے گا یہاں..... آنا پڑے گا۔''

حولیہ اس سے اپنا گریبان چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی اور ساتھ ساتھ مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ ماریا اور اس کا ساتھی گارڈ بھاگتے ہوئے موقع پر پہنچے۔ تب تک رابرٹ جنونی انداز میں ننھی عینی پر بھی جھپٹا مار چکا تھا۔ اس نے بچی کی گردن دبوچنا چاہی تھی مگر حولیہ بروقت بائیں جانب جھکی اور گردن کے بجائے بچی کے بال رابرٹ کے ہاتھ میں آئے۔ اس کے اندر ایک دم بھڑکنے والے شعلے اب بلند تر ہو گئے تھے۔ وہ وحشی نظر آنے لگا۔ ہیجانی انداز میں چنگھاڑا۔ ''میں مار دوں گا اس کو بھی۔ جان لے لوں گا۔'' وہ ننھی بچی کو بالوں سے جکڑے ہوئے غضب ناک انداز میں اپنی جانب کھینچنے لگا۔

حولیہ پکاری۔ ''بچاؤ..... خدا کے لیے بچاؤ۔''

سارجنٹ ماریا نے بچی کو چھڑانے کی کوشش کی۔ ''چھوڑ دو رابی..... چھوڑ دو اسے۔'' اس نے طاقت سے رابرٹ کو پیچھے دھکیلا۔

اس کے جسم میں وحشیانہ طاقت تھی۔ بچی کے چلّانے کی آوازیں دور تک گونج رہی تھیں۔ دو اور اہل کار بھی ماریا کی مدد کو پہنچ گئے۔ وہ بچی کو رابرٹ کی گرفت سے نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ بہ عین ایسا لگ رہا تھا کہ کسی چڑیا گھر میں کسی درندے نے پنجرے میں سے ہاتھ نکال کر ایک بچے کو دبوچ لیا ہو۔ ایک تنومند پولیس اہل کار نے ڈنڈے سے رابرٹ کے ہاتھ اور کلائی پر زوردار ضربیں لگائیں۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوا..... سارجنٹ ماریا کے چہرے پر حیرت کی یلغار تھی۔ وہ یقین نہیں کر پا رہی تھی کہ رابرٹ کی عاجزی معاً یہ سفاک روپ بھی اختیار کر سکتی ہے۔

تنومند اہل کار نے اپنے ڈھائی تین فٹ لمبے الیکٹرانک ڈنڈے کو نیزے کی طرح استعمال کرتے ہوئے رابرٹ کے چہرے پر شدید ضرب لگائی۔ جواب میں رابرٹ نے اس پر بھی گالیوں کی بوچھاڑ کی تاہم اسی نوعیت کی دوسری ضرب نے عینی کے بالوں پر اس کی گرفت کمزور کر دی..... اہل کاروں نے کھینچ کر روتی بلکتی بچی کو اس سے دور کر دیا۔ حولیہ اسے اپنے ساتھ چمٹا کر دور جا کھڑی ہوئی۔

اسی اثنا میں ایک سینئر پولیس آفیسر بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔ اس کے حکم پر تین چار باوردی اہل کار لاک اپ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے بپھرے ہوئے رابرٹ کو گھما کر فرش پر پٹخ دیا..... اور پھر اس کی ٹھکائی شروع کر دی۔ گھونسے اور ٹھڈے تواتر سے اس کے جسم پر برسنے لگے۔ پہلے تو وہ گالیاں بکتا رہا، پھر اس نے چلانا شروع کر دیا۔ اس کے ناک منہ سے خون جاری ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ سامنے کی طرف سے مخصوص ہتھکڑی میں جکڑے گئے۔ پھر اس ہتھکڑی کے دوسرے حصے کو اس کے دونوں پاؤں کے ساتھ یوں منسلک کر دیا گیا کہ وہ گٹھڑی سا بن گیا۔ تب اسی حالت میں اس کی ''مزاج پرسی'' کی جانے لگی۔ وہ دہائیاں دینے لگا۔

آج کے واقعے کے بعد اس نے یقیناً اپنی سزا میں خاطر خواہ اضافہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

شامیر اسپتال میں تھا۔ تکلیف کبھی کم، کبھی زیادہ ہوتی تھی۔ زویا نے پرسوں آنے کا کہا تھا مگر اب چوتھا روز تھا، وہ آئی نہیں تھی۔ ہر آہٹ پر شامیر کی نگاہیں بے ساختہ دروازے کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ ظاہر ہے نگاہوں کو مایوس ہی لوٹنا پڑتا تھا۔ کل اس کے جی میں آئی تھی کہ اسے فون کرے مگر پھر سینئر ڈاکٹر تھامسن آ موجود ہوئے تھے۔ انہوں نے اسے منع کر دیا تھا اور سختی سے ہدایت کی تھی کہ وہ آرام کرے۔

سہ پہر کو بھی وہ اسی ادھیڑ بن میں لگا ہوا تھا۔ وہ کیوں اتنی سخت دل ہو گئی تھی؟ کیوں اس کے لیے اپنے دل میں ذرا سی گنجائش بھی پیدا نہیں کر رہی تھی؟ اچانک اسے دروازے پر میوزیشن ٹام کی صورت نظر آئی۔ شامیر کو معلوم ہو چکا تھا کہ چند روز پہلے اسپتال کی انتظار گاہ میں کیا واقعہ رونما ہوا تھا اور رابرٹ کے ساتھ ٹام کی کتنی خطرناک جھڑپ ہوئی تھی۔

ٹام کی چال سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے پیٹ پر ابھی تک بینڈیج موجود ہے اور زخم پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا۔ بہرحال وہ چہرے سے ہشاش بشاش نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے بڑے تپاک سے شامیر کی خیریت دریافت کی۔ پھر اس سے انگلش میں پوچھا۔ ''مسٹر شامیر! آپ کو نرسی کے بارے میں کوئی نیوز ملی ہے؟''

''یہی پتا چلا تھا کہ وہ پولیس کی حراست میں ہے۔''

''وہ ہلاک ہو گیا ہے مسٹر شامیر..... وہ کورٹ میں پیشی کے دوران میں پولیس کسٹڈی سے فرار ہو گیا تھا لیکن دو دن بعد اپنے قریبی ساتھی مائیکل سمیت مارا گیا۔ خیال یہی ظاہر کیا جا رہا ہے کہ وہ کسی مخالف گروپ کا نشانہ بنا ہے۔''

یہ خبر شامیر کے لیے جہاں بہت سنسنی خیز تھی، وہاں کسی حد تک اطمینان بخش بھی تھی۔ اس نے ٹام سے اس واقعے کی تفصیل دریافت کی۔

آخر میں اس نے ٹام سے مائیکل کے بارے میں

پوچھا۔ ''یہ وہی ہے نا جس نے لیونا برگ میں زویا اور اس کی بچی کو یرغمال بنائے رکھا تھا؟''

''بالکل وہی..... نمرسی کی طرح یہ شخص بھی پولیس اور انٹرپول کو ڈکیتی، قتل اور آبروریزی کے بہت سے مقدمات میں مطلوب تھا۔''

کچھ دیر اس بارے میں بات ہوئی پھر شامیر نے زویا اور حولیہ کے بارے میں پوچھا۔

ٹام نے کہا۔ ''زویا سے کل فون پر بات ہوئی تھی۔ وہ آپ کے لیے پریشان ہے۔ ڈاکٹر حولیہ بھی بہت فکرمند ہے۔ ممکن ہے ڈاکٹر حولیہ آج آپ سے ملنے بھی آئے۔ زویا بھی ایک دو روز تک آئے گی۔''

شامیر نے ایک طویل سانس لی پھر ٹام سے پوچھا۔ ''رابرٹ کی کیا صورت حال ہے؟''

''وہ جیل میں ہے۔ کافی سخت کیس بنے ہیں، اس پر..... اب تو قسمت سے ہی آزاد فضا میں سانس لے سکے گا۔''

ٹام جان بوجھ کر جیل میں پیش آنے والا واقعہ چھپا گیا۔ زویا اور حولیہ نے بھی اس سے یہی کہا تھا کہ وہ شامیر کو بتا کر خوامخواہ پریشانی میں مبتلا نہ کرے۔ ویسے بھی قانون کے شکنجے میں پوری طرح کسے جانے کے بعد رابرٹ کا ذکر بے معنی ہو گیا تھا۔

اسی دوران میں ایک دراز قد جرمن نرس آ گئی۔ اس نے شائستہ لہجے میں ٹام سے کہا کہ ڈاکٹرز راؤنڈ پر آنے والے ہیں، لہٰذا اب وہ اٹھ جائے۔

ٹام اسے خدا حافظ کہہ کر باہر چلا گیا۔ اس کی نگاہوں میں شامیر کے لیے ایک خاموش ستائش تھی اور ایسی ہی ستائش، یہاں اپنے لیے، شامیر کو اکثر نگاہوں میں نظر آتی تھی۔

ڈاکٹرز راؤنڈ لگا کر چلے گئے تو شامیر ایک بار پھر اپنے خیالوں میں گم ہو گیا۔ درد دبانے والی میڈیسن کا اثر ختم ہو رہا تھا۔ رگ و پے میں ایک جلن سی سرایت کر رہی تھی۔ اس جلن سے دھیان ہٹانے کے لیے وہ نمرسی اور اس کے انجام کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ ایک بہت مثبت خبر تھی جو ٹام کے ذریعے اسے ملی تھی..... پھر اس کا دھیان بھٹکتا ہوا زویا کی طرف چلا گیا۔ اسے اپنے اردگرد اس کی خوشبو محسوس ہونے لگی۔ یہ کیسا جذبہ تھا؟ یہ کیسی کیفیت تھی؟ کبھی کبھی تو اسے اپنے آپ سے اس کی خوشبو آنے لگتی تھی۔ اس کی باتوں کی خوشبو، اس کے سانسوں کی مہک، اس کی مسکراہٹ اور پھر کلیوں جیسے سپید دانتوں تلے اس کا اپنے نچلے ہونٹ کو ہولے سے دبانا..... اس نے اس کے بارے میں سوچنا شروع کیا تو پھر سوچتا چلا گیا۔ تب سوچ کی یہ گہرائی بھی ایک طرح کا درد پیدا کرنے لگی۔

اس نے شعوری طور پر سوچ کے گھوڑے کی باگیں موڑنے کی کوشش کی اور کامیاب ہوا۔ اس کے خیالات کا رخ امو خالہ اور فارہ کی طرف ہو گیا۔ چند دن پہلے انکل اختر نے اسے فارہ کے دیوانے پن کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، اس نے اسے گہرا صدمہ پہنچایا تھا۔ وہ اپنی سفلی خواہشات کا تعاقب کرتی ہوئی اتنی دور چلی جائے گی، یہ شامیر نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ انکل اختر کے مطابق اس نے خود اپنے جسم کو نوچ کھسوٹ کر اور اپنا لباس پھاڑ کر ایسا کرائم سین تخلیق کیا تھا جو شامیر کو بلا رکاوٹ آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچا سکتا تھا۔ یقیناً فارہ کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس میں امو خالہ بھی اتنی ہی قصوروار تھیں جتنی وہ خود تھی یا شاید خود اس سے بھی بڑھ کر۔

جس وقت شامیر اسپتال کے اس کمرے میں یہ ساری باتیں سوچ رہا تھا، عین اس وقت ہزاروں میل دور..... لاہور میں امو خالہ کندھے سے شولڈر بیگ لٹکائے گھر میں داخل ہو رہی تھیں۔ گھریلو ملازمہ نے دروازہ کھولا تھا اور امو خالہ کو بتایا تھا کہ فارہ بے چینی سے ان کا انتظار کر رہی ہے۔

''اس نے کچھ کھایا یا نہیں؟'' امو خالہ (ثمینہ بیگم) نے پوچھا۔

''نہیں جی۔'' ملازمہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بڑی مشکل سے دو تین گھونٹ دودھ پلایا ہے انہیں۔''

''ایک دم نکمی اور احمق ہو تم۔ ایک ٹکے کی عقل نہیں ہے تمہارے اندر۔ روٹیاں اور پلنگ توڑنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی ہو۔''

خالہ ثمینہ بکتی جھکتی اندر چلی گئیں۔ وہ سیدھی اس کمرے میں پہنچیں جہاں فارہ سفید بستر پر تکیے کے سہارے چت لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر زردی کھنڈی تھی۔ پیشانی کی ایک جانب زخم کا ایک نمایاں نشان تھا۔ ایک آنکھ ٹھیک لیکن دوسری ادھ کھلی تھی۔ اس وجہ سے پورا چہرہ ہی عجیب شکل اختیار کیے ہوئے تھا۔ کچھ دن پیشتر آسٹریا میں پیش آنے والے اس ٹریفک حادثے کے اثرات میں سے سب سے نمایاں اثر فارہ کے دائیں پہلو پر تھا۔ اوپر سے نیچے تک جسم کا یہ حصہ یکسر مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔

ثمینہ بیگم جلدی سے بیٹی کے سرہانے پہنچیں۔ ٹشو پیپر کے ساتھ وہ پانی صاف کیا جو فارہ کی ایک بانچھ سے بہہ نکلا تھا۔ فارہ کی نگاہیں ماں کے چہرے پر جمی تھیں۔

ثمینہ جانتی تھیں کہ وہ یوں اس کی طرف کیوں دیکھ رہی ہے؟

کل ایک پرائیویٹ اسپتال میں فارہ کے کئی ٹیسٹ ہوئے تھے۔ ان میں سی ٹی اسکین اور ایم آر آئی وغیرہ بھی شامل تھے۔ آج نیوروفزیشن نے حتمی رپورٹ دینا تھی۔

ثمینہ کے چہرے پر طمانیت تھی۔ انہوں نے فارہ کی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ ''کیا کہا ڈاکٹر نے؟'' فارہ نے لکنت زدہ لہجے میں پوچھا۔

جواب میں ثمینہ بیگم نے شولڈر بیگ میں سے ایک فولڈر نکال کر فارہ کے صحت مند ہاتھ میں دے دیا۔ ''تم خود پڑھ لو۔'' انہوں نے کہا۔

فارہ نے لیٹے لیٹے سرسری نظر سے رپورٹ کو دیکھنا شروع کیا۔ ثمینہ بیگم نے اس کا مفلوج ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''پروفیسر صاحب نے بہت امید دلائی ہے فارہ۔ وہ جو برین کے ایک چھوٹے سے حصے کے ''ڈیمیج'' ہونے کا خطرہ تھا، وہ بھی غلط ثابت ہوا ہے۔ انہوں نے کہا ہے، دواؤں اور فزیوتھراپی سے دو تین مہینے کے اندر بہت بہتری ہو جائے گی۔''

فارہ کی نگاہیں بدستور رپورٹ کے اوراق پر تھیں۔ اس نے شک کی نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔ پھر لکنت زدہ لہجے میں کہا۔ ''..... یہ..... اصلی رپورٹ ہے نا؟''

''کیا مطلب..... میں تمہیں جعلی رپورٹ پڑھواؤں گی؟'' انہوں نے مصنوعی ناراضگی سے کہا اور فارہ کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔

فارہ نے رپورٹ ایک طرف رکھ دی۔ ''پتا نہیں ماما! کیوں..... مجھے لگتا ہے..... کہ میں جلدی ٹھیک نہیں ہوں گی..... اور ہو بھی گئی تو..... شاید مجھے زندہ رہنے سے مرنا زیادہ اچھا لگے.....'' وہ رک رک کر بولی۔

''مریں تیرے دشمن..... مرے وہ بدبخت، جس نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا بدذات کہیں کا..... بڑے گندے خون کی ملاوٹ ہوئی ہے یہ ہماری فیملی میں۔ اپنے باپ سے زیادہ بے فیض اور کمینہ نکلا ہے یہ، دیکھنا بڑی بری موت مرے گا۔ اسی حرامزادی، لفنگی ٹی وی رپورٹر کے لیے، اپنے پنڈے کو کوئلہ کر کے اسپتال میں پڑا ہوا ہے۔ ہاں، کسی گندی بے فیض نسل کا سفید خون ہے اس کے اندر۔ جنہوں نے یتیمی میں آسرا دیا، پال پوس کر کسی قابل بنایا ان کو دھکے اور پرائے دیس کے غیروں کے لیے جان بھی نچھاور۔''

فارہ نے بیزاری سے منہ پھیر لیا۔ وہ ماں سے اس طرح کی باتیں پہلے بھی کئی دفعہ سن چکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ یہ لڑائی ہار چکی ہے اور اتنے برے طریقے سے ہاری ہے کہ خود کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں ہے۔

اسی دوران میں ملازمہ ایک ٹرے میں چکن سوپ، چاول اور کسٹرڈ وغیرہ لے آئی۔ ابھی ٹرے فارہ کے سامنے بھی نہیں رکھی گئی تھی کہ وہ ناک منہ چڑھانے لگی۔

''نہیں..... میں نے نہیں لینا کچھ بھی۔'' اس نے منہ پھیرا۔ فالج سے اس کی آواز بھی بری طرح متاثر ہوئی تھی۔

''نہیں فارہ..... دو چار لقمے لے لو۔ پروفیسر صاحب کہتے تھے.....''

''نہیں..... میں نے کہا ہے نا۔'' وہ ماں کی بات کاٹ کر چڑچڑے انداز میں بولی اور ٹرے کو ہاتھ سے دھکیل کر خود سے دور کر دیا۔ پیالی میں سے کچھ سوپ اچھل کر کسٹرڈ میں گرا اور اسے بیکار کر گیا۔

''اچھا..... اچھا..... غصہ مت کرو۔'' ثمینہ بیگم نے کہا اور ملازمہ کو گھورتے ہوئے ٹرے اسے واپس تھما دی۔

فارہ نے پھر منہ پھیر لیا۔

ثمینہ بیگم اس کی ٹانگوں پر کمبل درست کرتے ہوئے دوسرے کمرے میں آ گئیں۔ فارہ کے کمرے سے باہر آتے ہوئے انہوں نے کمرے کی لائٹ آف کر دی تھی اور دروازہ آہستہ سے بند کر دیا تھا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر ان کے چہرے سے مصنوعی بشاشت رخصت ہو گئی۔ انہوں نے شولڈر بیگ کھولا اور اس میں سے وہ اصل رپورٹ نکال لی جو آج سینئر نیوروفزیشن نے انہیں دی تھی۔ وہ عینک چڑھا کر رپورٹ کو دیکھنے لگیں۔ ان کی آنکھوں میں آتشیں آنسو امڈنے لگے۔

رپورٹ اچھی نہیں تھی۔ وہ اس جعلی رپورٹ کے بالکل برعکس تھی جو فارہ کی تسلی کے لیے انہوں نے اصرار کر کے نیوروفزیشن سے بنوائی تھی۔ فارہ نے ابھی جس شبہے کا اظہار عام سے انداز میں کیا تھا، وہ بالکل درست تھا۔ یہ اصل رپورٹ بتا رہی تھی کہ مریضہ کے دماغ کے کچھ ٹشوز مکمل طور پر ''ڈیمیج'' ہو گئے ہیں۔ اب ان کی بحالی کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ میڈیکل کی مختلف اصطلاحات کے ذریعے فارہ کے مستقبل کا جو نقشہ کھینچا گیا تھا، وہ کسی بھی پہلو

سے حوصلہ افزا نہیں تھا۔

ثمینہ بیگم کے آتشیں آنسو ان کی گود میں گرنے لگے۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھیں۔ طیش کے عالم میں انہوں نے شامیر کے کمرے کی ایک الماری کھولی۔ اس الماری میں اس کے اہم کاغذات، تعلیمی اسناد اور تصویریں وغیرہ تھیں۔ انہوں نے غصے کے عالم میں یہ سارے اہم سرٹیفکیٹ، اسناد اور کاغذات پھاڑ کر پرزے پرزے کردیے۔ پھر ایک البم ان کے ہتھے چڑھا۔ اس کا بھی یہی حشر ہوا۔ انہوں نے تصویروں کے بے شمار ٹکڑے گیس ہیٹر میں جھونک دیے۔

پھر الماری کے اندر ایک فریم پر ان کی نظر پڑی۔ اس یادگار فریم شدہ تصویر میں چھ سات سالہ شامیر اپنے والد کمال احمد کی گود میں نظر آرہا تھا۔ انہوں نے اس قیمتی فریم کو فرش پر پٹخ کر توڑا۔ ''جہنمی..... لعنتی..... جیسا باپ ویسا بیٹا۔'' وہ پھنکاریں اور فریم سے نکل آنے والی تصویر کو اپنے پاؤں سے روندنے لگیں۔ ملازمہ سہمی ہوئی تھی اور ایک کھڑکی کی جھری میں سے یہ مناظر دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

زویا، شامیر کی صحت کے سلسلے میں بے حد فکرمند تھی۔ وہ اشک بار ہو کر اس کے لیے دعا مانگ رہی تھی۔ اتنے میں اس کے موبائل فون کی بیل ہوئی۔ وہ جائے نماز سے اٹھی۔ یہ میونخ سے اس کی ماما کا فون تھا..... زویا نے کل ہی ماما کو فون کیا تھا اور انہیں بتایا تھا کہ وہ اور حولیہ برج برگ کے کس ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہیں۔ زویا نے ماما کو اس واقعے کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا تھا جو دو دن پہلے مقامی جیل کے لاک اپ میں پیش آیا تھا..... رابرٹ نے جس طرح ننھی عینی کو بھنبھوڑنے کی کوشش کی تھی، اس نے ایک طرح سے زویا اور رابرٹ کے تعلق کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی تھی اور تو اور ماما بھی رابرٹ کے حق میں ایک لفظ نہیں بول سکی تھیں۔

''ہیلو ماما!'' زویا نے کال ریسیو کرتے ہوئے بجھی ہوئی سی آواز میں کہا۔

''کہاں ہو تم اور حولیہ؟'' ماما نے حسبِ عادت خشک لہجے میں پوچھا۔

''وہیں ہوٹل میں ہیں۔''

''تو اب یہاں کب تک ٹکے رہنا ہے تم نے؟ لیونا برگ واپس جاؤ۔'' وہ تحکم سے بولیں۔

''بس ماما..... دو چار دن میں چلی جاؤں گی۔''

''دو چار دن میں دو ڈھائی سو یورو کرایہ مزید بھروگی۔ ابھی کیوں نہیں جاتی ہو؟'' انہوں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

زویا ان کی اس چبھن کی وجہ اچھی طرح جانتی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ شامیر یہاں برج برگ کے اسپتال میں ہے لہٰذا وہ بھی برج برگ میں رکی ہوئی ہے اور یہ بات ایسی غلط بھی نہیں تھی۔ وہ شامیر کو ایسی حالت میں چھوڑ کر یہاں سے کیسے چلی جاتی۔ حولیہ کا خیال بھی یہی تھا کہ انہیں رکنا چاہیے۔

ماما کی کرخت آواز پھر فون پر ابھری۔ وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولیں۔ ''دیکھو زویا! جو کچھ ہو چکا وہ بہت ہے۔ اب کچھ غلط نہیں ہونا چاہیے..... ورنہ میں تمہاری اپنی جان ایک کردوں گی۔'' ان کی آواز اندرونی ہیجان کے سبب لرز رہی تھی۔

زویا نے ماں کو بہ مشکل سنبھالا اور باور کرایا کہ نمرسی والے معاملے کی گرد ذرا بیٹھ جائے تو وہ دونوں بہنیں واپس لیونا برگ چلی جائیں گی۔ وہ پریشان نہ ہوں۔

ماں سے گفتگو کرنے کے بعد زویا نے عینی کے لیے دودھ اور حولیہ کے لیے ناشتا تیار کیا۔ اس کے بعد حولیہ کو جگایا اور بتایا کہ وہ ''درس گاہ'' جانے کے لیے نکل رہی ہے۔ درس گاہ جانے کا پروگرام اس نے رات کو ہی بنا لیا تھا۔ حولیہ نے بھی مخالفت نہیں کی تھی۔ درس گاہ کے منتظم، ایک ممتاز عالم دین بزرگ تھے۔ ان کا نام مولانا غلام قادر تھا اور وہ ٹاؤن کی واحد مسجد کی امامت بھی کرتے تھے۔ زویا ان سے شامیر کے لیے دعا کرانا چاہتی تھی۔

وہ بذریعہ ٹیکسی کار دس بجے کے لگ بھگ درس گاہ پہنچ گئی۔ اس نے حجاب پہن رکھا تھا اور ایک سفید کھلے لبادے میں تھی جو کندھوں سے پاؤں تک چلا گیا تھا۔ مولوی صاحب سے اس کی ملاقات درس گاہ کے ہی ایک کمرے میں ہوئی۔ نورانی صورت والی اس حلیم الطبع شخصیت سے مل کر زویا کو ایک طرح کا روحانی سکون محسوس ہوا۔ زویا کی درخواست پر انہوں نے شامیر کے لیے دعا کی..... انہوں نے زویا کو کئی ایسی باتیں بتائیں جو اس کے بے قرار دل کے لیے کسی حد تک راحت کا باعث بنیں۔ انہوں نے کہا۔ ''ہر مقام شکر کا مقام ہوتا ہے، چاہے وہ ہماری سمجھ کے مطابق کتنا بھی تکلیف دہ کیوں نہ ہو اور صدقہ و خیرات بلاؤں کو ٹالتا ہے۔ ہماری یہ نیکی، ہمارے لیے کسی نہ کسی شکل میں ضرور آسانیاں پیدا کرتی ہے۔''

زویا جب مولانا سے مل کر درس گاہ سے باہر نکلی تو مسجد کے سامنے ایک بوڑھی، سفید فام عورت خستہ حالت میں کھڑی تھی، یقیناً کسی مالی مدد کی منتظر تھی۔ زویا کے دل میں عجیب سا گداز بھرا ہوا تھا۔ اس نے کچھ دیر تک سوچا، نقدی تو اس کے پاس تھوڑی ہی تھی..... اس کا کریڈٹ کارڈ بھی لیونا برگ میں ہی تھا..... اس نے اپنی انگلی سے سونے کا ایک Ring نکالا اور عورت کے لرزتے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ''گولڈ کا ہے مدر۔'' اس نے کہا۔

عورت کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو امڈ آئے۔

زویا آگے بڑھ گئی۔ اس کی نگاہ دور ایک بلند صلیب پر پڑی۔ گھروں کی مخروطی چھتوں کے درمیان سے یہ صلیب ایک ٹاور کی طرح ابھری ہوئی تھی۔ یہ ٹاؤن کے چرچ کی صلیب تھی۔ چرچ کا خیال آتے ہی زویا کو فادر جوناتھن کا خیال بھی آ گیا۔ اسے پتا چلا تھا کہ چند روز سے وہ سخت بیمار ہیں۔ اس نے ان کی عیادت کا سوچا پھر اسے ایک اور خیال آیا۔ آج ہفتے کا دن تھا۔ چرچ سے باہر بھی تو بہت سے ضرورت مند، محتاج اپنی آنکھوں میں انتظار لیے کھڑے ہوتے تھے۔

وہ چرچ کی طرف جانے کے بجائے قریبی مارکیٹ کی طرف مڑ گئی..... تقریباً آدھ گھنٹے بعد وہ مارکیٹ سے نکلی تو اپنی کلائی کی سوئس گھڑی مناسب قیمت پر بیچ چکی تھی۔ اس کے شولڈر بیگ میں اب کم و بیش تین سو یورو موجود تھے۔

وہ قریباً دو کلومیٹر کا فاصلہ پیدل ہی طے کر کے چرچ پہنچی۔ وہاں ایک جانب تعمیر اور بحالی کا کام جاری تھا۔ چرچ کو دیکھتے ہی اس کے تصور میں وہ اندوہناک مناظر ابھر آئے جب یہاں آگ لگی تھی اور ایک تہلکہ مچا تھا۔ شعلے، دھواں، جان بچانے کی بھاگ دوڑ، کربناک آوازیں..... وہ سب کچھ زویا کے ذہن میں تازہ ہو گیا۔ وہ کسی شیر کی طرح شعلوں کی طرف جھپٹا تھا اور ایک بار نہیں، کئی بار..... دیکھنے والے دیکھتے رہ گئے تھے اور تو اور فائر مین بھی حیرت زدہ تھے۔

ایک آہ کھینچ کر زویا حال میں واپس آ گئی۔ وہ اب چرچ کے سامنے والے احاطے میں تھی۔ یہاں ایک مستطیل شیڈ کے نیچے بہت سے مفلوک الحال، سوالی موجود تھے۔ اس نے اپنے شولڈر بیگ کی زپ کھولی اور دو تین منٹ کے اندر سارے یوروان مستحق افراد میں تقسیم کر دیے۔

''ٹھیک ہو جاؤ شومیر..... ٹھیک ہو جاؤ..... اپنے قدموں پر کھڑے ہو جاؤ اور انہی قدموں پر چل کر یہاں سے..... اور یہاں کے خطرات سے دور چلے جاؤ۔ اپنے پیاروں میں پہنچ جاؤ.....'' ایک خاموش دعا اس کے ہونٹوں پر تھی۔

وہ اب چرچ کے مین دروازے پر کھڑی تھی۔ ''میں فادر سے ملنا چاہتی ہوں۔'' اس نے ایک منتظم سے کہا۔

''فادر جوناتھن؟'' منتظم نے تصدیق چاہی۔

''جی ہاں۔''

''فادر تو نہیں ہیں۔''

''کیا مطلب جناب؟''

''شاید تمہیں معلوم نہیں۔ کل شام انہیں سخت ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ وہ ٹاؤن کے کارڈیک اسپتال میں ہیں۔''

''اوہ گاڈ!'' زویا کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

☆☆☆

فادر جوناتھن اسپتال کے ''سی سی یو'' میں پڑا تھا۔ اس کے لیے پچھلے چار پانچ دن، زندگی کے کٹھن ترین دن ثابت ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ہر طرح کے مصائب نے اس کا گھر دیکھ لیا ہے۔ نمرسی اور مائیکل کے قتل کی خبر سن کر وہ سکتہ زدہ رہ گیا تھا۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہو گیا ہے۔ وہ دونوں تو ایک ''ناقابل اصلاح گناہ گار'' کو ختم کرنے کے لیے نکلے تھے۔ وہ صحیح سلامت رہی تھی اور وہ خود لاشوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ کہا یہی جا رہا تھا کہ وہ کسی مخالف گروپ کی کارروائی کا نشانہ بنے ہیں۔

فادر کو خشامہ کی طرف سے بھی پریشانی تھی۔ جس رات نمرسی اور مائیکل والا واقعہ ہوا، اسی رات وہ بھی چرچ سے اوجھل ہو گئی تھی۔ فادر کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا کہ وہ کہاں گئی ہے۔ خیال یہی تھا کہ وہ بطور نن، چرچ کے پابند ماحول کو برداشت نہیں کر سکی۔ خاص طور سے مستقل طور پر... تہ خانوں میں رہنا اس کے لیے بیزار کن ثابت ہوا ہے اور وہ کہیں نکل گئی ہے۔ دوسرا اندیشہ جو زیادہ تشویشناک تھا..... یہ تھا کہ کہیں نمرسی نے ہی اس کے ساتھ کچھ کر نہ ڈالا ہو۔ نمرسی بھی دو روز تہ خانوں میں ہی موجود رہا تھا..... وہ جوان اور خوبصورت تھی۔ عین ممکن تھا کہ نمرسی کی نگاہ اس پر پڑ گئی ہو اور وہ اپنی بدفطرت سے مجبور ہو گیا ہو۔ اس سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔

اسی طرح کا ایک واقعہ یہاں چرچ میں ڈیڑھ دو سال پہلے بھی ہوا تھا۔ ایک جوان سال جرمن پادری کی نیت ایک اٹالین نن پر خراب ہو گئی تھی۔ وہ اسے تہ خانے کے ایک الگ تھلگ کمرے میں لے گیا تھا۔ وہاں اس کے

ساتھ زیادتی کی اور اسے بے ہوشی کی حالت میں چھوڑ کر غائب ہوگیا۔ اس بیس سالہ لڑکی کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور منہ میں بھی کپڑا ٹھونسا گیا تھا۔ وہ بے ہوشی کی حالت میں ہی چل بسی تھی۔ بعدازاں لاش کی بو پھیلنے پر اس کا سراغ لگا تھا۔

اسی طرح کے اندیشے کے تحت فادر جوناتھن نے دو روز پہلے تہ خانوں کے ہر کونے کھدرے میں جھانک کر دیکھا تھا۔ فادر جانتا نہیں تھا کہ وہ جس کے بارے میں فکرمند ہے اور سوچ رہا ہے کہ کہیں وہ نمرسی کے ہتھے نہ چڑھ گئی ہو، وہ خود نمرسی کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوئی ہے..... وہ نمرسی کے قتل اور خشامہ کی گمشدگی میں کوئی لنک نہیں ڈھونڈ سکا تھا۔

اور پھر کل شام جب پولیس پارٹی اس سے ''چوری ہونے والی کار'' کے حوالے سے پوچھ گچھ کر کے واپس گئی تھی وہ سخت جھنجلاہٹ محسوس کرنے لگا تھا۔ ان لمحوں میں اس کا دھیان ایک بار پھر زویا کی طرف چلا گیا۔ اس کے اندر تپش کی لہریں ابھرنے لگیں۔ اس نے سوچا تھا، کاش اس کے جسم میں اتنی توانائی ہوتی کہ وہ خود زویا تک پہنچتا اور اپنے ہاتھوں سے اس نافرمان، منحرف لڑکی کی جان لے لیتا۔ اس نے ہر قدم پر اپنی قوم، اپنے وطن اور مذہب کے لیے ندامتوں کے اسباب پیدا کیے تھے۔

زویا اور دیگر حالات کے بارے میں سوچتے سوچتے ہی اس کے سینے میں درد شروع ہوگیا تھا۔ سانس تو پچھلے کئی دنوں سے ابتر تھی، اس درد نے اس کی رہی سہی ہمت بھی ختم کردی اور وہ بیڈروم کے دروازے کے سامنے ہی چکرا کر گر گیا..... اس نے آج قریباً 18 گھنٹے بعد یہاں اسپتال کے سی سی یو میں آنکھ کھولی تھی۔ اب وہ پچھلے تقریباً دو گھنٹے سے اسی طرح چت لیٹا سوچ رہا تھا۔ اس کے جسم سے نالیاں لگی تھیں اور منہ پر گیس ماسک تھا۔ اس کی آنکھوں کے گوشوں میں بار بار نمی جمع ہوجاتی تھی۔ ایک رقت سی طاری تھی اس پر۔

سبز لباس میں ملبوس نرس بڑے احترام سے اس کے سامنے جھکی اور اس کا بی پی چیک کرتے ہوئے بولی۔ ''فادر! آپ بالکل ٹھیک ہوجائیں گے۔ مشکل وقت گزر گیا ہے۔''

وہ بہت نحیف آواز میں بولا۔ ''مشکل وقت گزر گیا ہے مگر اس کے اثرات بھی تو کچھ کم مشکل نہیں ہیں۔ تمہاری جھوٹی تسلی کا شکریہ۔''

''جھوٹی تسلی نہیں فادر۔'' وہ کھوکھلے لہجے میں گویا ہوئی۔

''میں جانتا ہوں۔'' وہ ٹھہری آواز میں کہنے لگا۔ ''اب جتنا وقت بھی گزرنا ہے..... اس بستر پر ہی گزرنا ہے اور کتنا گزرنا ہے اس کا بھی کیا پتا؟ چند دن..... چند مہینے..... یا کیا پتا چند منٹ۔''

''پلیز فادر! ایسا مت کہیں۔ برج برگ میں بہت سے لوگوں کو آپ کی ضرورت ہے۔''

فادر کی آنکھوں میں پھر نمی آگئی۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ نتھنوں میں دواؤں اور کیمیکلز کی بو تھی۔ وہ اپنے اندر ایک عجیب کایا کلپ محسوس کر رہا تھا۔ ماضی بعید اور ماضی قریب کی ساری کوتاہیاں اور غلط رویاں اسے یاد آنے لگیں۔ نوجوانی کے کچھ کمزور لمحے، درمیانی عمر کی منافقت اور بڑھاپے کی ہوس زر..... وہ اپنے ہی اندر مسمار ہونے لگا تھا۔ آنسو آنکھوں کے گوشوں سے رسنے لگے اور کنپٹیوں کی طرف بہنے لگے۔

یہی وقت تھا جب اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ زویا اندر آرہی تھی..... ہاں، یہ سارہ کی بیٹی زویا ہی تھی۔ وہ ایک کھلے لبادے میں تھی۔ اس نے اسکارف لے رکھا تھا۔ اسکارف اور لبادہ سفید تھے۔ اس کے چہرے پر ملکوتی اجالا تھا جیسے جنت کی کوئی دوشیزہ ہو..... اور ہوا پر پاؤں رکھتی ہوئی اس کی طرف بڑھ رہی ہو۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا گلدستہ تھا۔ وہ اس کے قریب رکھی نشست پر بیٹھ گئی۔ اس کی آواز جیسے کافی فاصلے سے جوناتھن تک پہنچ رہی تھی۔ ''فادر! آپ کیسے ہیں؟''

فادر جوناتھن نے اثبات میں سر ہلایا۔

''فادر! آپ نے بہت زیادہ ٹینشن لی ہوئی تھی۔ پلیز آپ خود کو ریلیکس کریں۔ سب اچھا ہوجائے گا۔''

''خدا کرے سب اچھا ہوجائے۔'' فادر نے نحیف آواز میں کہا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''تم اور حولیہ ٹھیک ہو نا؟''

''ہاں فادر! آپ کی دعا ہے۔ بس حولیہ کو ایک بازو پر کچھ زخم آئے تھے لیکن اب وہ بھی ٹھیک ہے۔''

''اور..... وہ پاکستانی..... شامیر؟''

''وہ کافی زخمی ہے فادر..... آپ اس کے لیے دعا کرنا۔'' زویا کی آواز بھرا گئی۔ فادر نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ وہ بولی۔ ''شامیر کو اس حال تک پہنچانے والے دو تو اپنے انجام کو پہنچ گئے ہیں..... اگر کوئی اور ہے تو اللہ کرے وہ بھی سزا پائے۔'' زویا کا اشارہ نمرسی اور مائیکل کی

طرف ہی تھا۔

فادر نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔ تازہ آنسو اس کی سفید براق کنپٹیوں کی طرف ڈھلک گئے۔

''آپ کی دعاؤں میں بہت اثر ہے فادر۔ چرچ میں ہمیں آپ کی پناہ میسر نہ آئی ہوتی تو نمرسی کے کارندے دو ہفتے پہلے ہی ہماری جان لے چکے ہوتے۔ چرچ کی آگ میں سے بھی آپ ہی کی دعاؤں نے ہمیں زندہ نکالا۔ اب بھی یہ دعائیں درکار ہیں.....''

فادر جوناتھن دھندلائی نظروں سے زویا کے چہرے کو دیکھتا چلا جارہا تھا۔ اس کے اندر لعنت وملامت کے ڈونگرے برس رہے تھے۔ وہ چالیس سال سے کنفیشن باکس میں بیٹھ کر لوگوں کے اعترافاتِ گناہ وجرم سن رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں آج اس کا دل چاہا کہ وہ اس اجلی اجلی ''فرشتہ صورت'' لڑکی کو باکس کے اس حصے میں بٹھائے، جہاں وہ خود بیٹھتا رہا ہے اور خود پردے کی اس جانب کھڑا ہوجائے جہاں اعترافِ گناہ کیا جاتا ہے۔ وہ سب کچھ اس کے گوش گزار کردے جو ایک گاڑھے سیاہ دھوئیں کی طرح اس کے سینے میں جمع ہورہا ہے۔

یہ چرچ نہیں اسپتال تھا، یہاں کنفیشن باکس بھی نہیں تھا۔ پھر بھی جوناتھن کو یہی لگا جیسے وہ باکس میں ہے اور پردے کی دوسری جانب سفید لباس میں زویا بیٹھی ہے۔ اس نے اپنے کمزور اور توانی ہاتھ میں زویا کا ہاتھ تھاما۔

''زویا.....'' اس نے بہ مشکل کہا۔ الفاظ اس کے گلے میں اٹک گئے۔

اس نے آنکھیں پھر موند لیں۔ کتنی ہی دیر، اپنے اندر طاقت جمع کرتا رہا..... مگر طاقت جمع نہیں ہوئی۔ اس نے آنسوؤں کا ایک گھونٹ بھرا اور زویا کی طرف دیکھے بغیر بس اتنا ہی کہہ سکا۔ ''بیٹی! مجھے معاف کردینا۔''

وہ جیسے سرتاپا لرز گئی۔ ''فادر! آپ کیسی بات کررہے ہیں؟ آپ کس بات کی معافی مانگ رہے ہیں؟''

''ہر بات کی۔'' فادر نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا اور اپنے سینے پر کراس کا نشان بنایا۔ اس کے جھریوں بھرے چہرے پر عجیب کیفیت تھی۔

''فادر..... پلیز مجھے شرمسار نہ کریں، آپ تو خدا کے برگزیدہ ہیں۔ بے شمار لوگوں کے لیے آپ کی زندگی ایک مثال ہے..... مذہب اور عقیدے سے قطع نظر آپ وسیع نظر رکھنے والے ایک مہربان شخص ہیں۔ اوپر والا آپ کے عقیدت مندوں کے سر پر آپ کا سایہ سلامت رکھے۔''

''زویا! تمہارے خیالات کے لیے شکریہ۔'' فادر نے آنکھیں بند کیے کیے کہا پھر ہاتھ سے اس بات کا اشارہ دیا کہ وہ اب جاسکتی ہے۔

فادر کا کندھا چھو کر وہ اٹھی۔ خدا حافظ کہہ کر چند قدم الٹے پاؤں چلی پھر باہر نکل گئی۔

☆☆☆

کڑوی کسیلی دواؤں کی وجہ سے شامیر کی طبیعت ہر وقت مکدر رہتی تھی۔ تاہم کسی وقت وہ تھوڑی سی راحت بھی محسوس کرتا تھا۔ اس وقت بھی کچھ ''ریلیف'' کی کیفیت تھی۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ برج برگ کی فضا میں ایک خوشگوار سہ پہر کی چمک تھی۔ نیلے آسمان کا ایک شفاف ٹکڑا کھڑکی میں سے دکھائی دیتا تھا۔ سفید پرندوں کی ایک چھوٹی سی قطار، دو سیکنڈ کے لیے جھلک دکھا کر اوجھل ہوگئی۔ نیچے کیاریوں میں سن فلاور..... گیندے اور گلاب کے پھول رنگ بکھیر رہے تھے اور کسی وقت مدھر ہوا کا ہاتھ انہیں جھومنے پر اکساتا تھا۔

سامنے ہی پتھر کا ایک بینچ نظر آرہا تھا۔ لمبے بالوں والا ایک ٹین ایجر لڑکا ہیڈ فون لگائے میوزک سن رہا تھا۔ غالباً کوئی رنجیدہ گانا ہی تھا۔ اس کے چہرے پر افسردگی دکھائی دیتی تھی۔ پھر اس نے جلدی سے اپنی پینٹ کی جیب ٹٹولی..... اور سیل فون نکال لیا۔ کسی کی کال آئی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ اس کے کتابی چہرے پر خوشی اور مسرت کی یلغار سی ہوگئی۔ اس نے فون کو دو تین بوسے دیے۔ شاید اس کی کوئی گرل فرینڈ ہی تھی۔ وہ باتیں کرتا ہوا اٹھا اور دوسری طرف چلا گیا.....

شامیر، بستر پر نیم دراز سوچنے لگا۔ کبھی کبھی کوئی ای میل، کوئی فون کال، یا پھر پوسٹ مین کی دستک انسان کے لیے کس قدر جاں فزا ثابت ہوتی ہے..... اس کا دھیان بے ساختہ چار برس پہلے کے شب وروز کی طرف چلا گیا۔ ایک ایسی ہی دستک اس کے لیے بجی تو ہوئی تھی۔ یہ خوشی اور امید کی دستک تھی جو لاہور میں ان کے گھر پر ہوئی تھی۔ زویا کی ہمراز دوست جین، زویا کی حالت سے غمزدہ ہوکر شامیر کو ڈھونڈتی ہوئی لاہور اس کے گھر پہنچی تھی۔ بدقسمتی سے وہ گھر پر نہیں تھا۔ اگر تب جین کے آنے کی اطلاع اس تک پہنچ جاتی تو شاید حالات وہ نہ ہوتے جو آج تھے۔ شاید بہت پہلے اس کی اور زویا کی دوریاں ختم ہوگئی ہوتیں۔ شاید وہ اپنی مراد پاچکا ہوتا۔ شاید..... شاید۔ ایسے بہت سے حسرت ناک ''شاید'' ہر انسان کی زندگی میں موجود ہوتے ہیں۔ اگر

اس وقت اموخالہ کے دل میں رحم آجاتا اور وہ جین کا رابطہ اس سے کرادیتیں تو شاید.....

ہاں پھر وہی شاید۔

اموخالہ کی اس ''سخت دلی'' نے امید کی وہ کرن اندھیروں میں غرق کردی تھی جو چار سال پہلے اس داستان کو ایک حسین موڑ دے سکتی تھی۔ اب وہ حسین موڑ رہا تھا، نہ وہ اموخالہ اور نہ وہ فارہ۔ وہ دونوں اپنے ہی ایجاد کیے ہوئے عذاب میں گرفتار ہو چکی تھیں۔ یہاں شامیر اپنی اذیتوں کے گھیرے میں تھا۔

شامیر نے دروازے کی جانب دیکھا اور یکبارگی دل شدت سے دھڑک اٹھا۔ حولیہ اندر آرہی تھی۔ آج زویا کی طرح وہ بھی حجاب میں تھی۔ اس نے اسپتال کا ''ملاقاتیوں والا گاؤن'' پہن رکھا تھا۔ رسمی کلمات کے بعد وہ اس کے قریب رکھی نشست پر بیٹھ گئی۔ آج پہلی بار شامیر نے حولیہ کے چہرے پر اپنے لیے اپنایت اور ہمدردی کے تاثرات دیکھے۔

''شکر ہے، تم میں سے کسی کی شکل تو نظر آئی۔'' شامیر نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔ ''زویا پھر کیوں نہیں آئی؟''

''فون پر زویا اور میں یہاں کے میڈیکل اسٹاف سے مسلسل رابطے میں رہی ہیں۔ تمہاری خیریت پوچھتی رہی ہیں۔''

''بس فون پر ہی؟''

''شامیر! ویری سوری۔ میں نے کل ہی چکر لگانا تھا مگر پھر زویا کو کسی ضروری کام سے ڈاؤن ٹاؤن جانا پڑ گیا۔ راستے میں اسے پتا چلا کہ فادر جوناتھن کو اٹیک ہوا ہے اور وہ اسپتال میں ہیں۔ مجبوراً وہ وہاں چلی گئی۔''

دونوں میں کچھ دیر تک فادر کی صحت کے بارے میں گفتگو ہوئی پھر شامیر نے زویا اور عینی کے بارے میں پوچھا۔ حولیہ بولی۔ ''زویا بھی کل ضرور آئے گی۔ وہ چار پانچ روز سے آنا چاہ رہی ہے مگر کسی حد تک نمرسی کا خوف ہی تھا جو ہمیں بار بار ہوٹل سے نکلنے سے روک رہا تھا..... خیر اب نمرسی تو اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے۔ ایسے شخص کے جانے پر تو خدا کا شکر ہی کرنا چاہیے۔''

نرس آئی اور شامیر کے سلامت بازو پر لگے کینولا میں ایک انجکشن دے کر چلی گئی۔

حولیہ، شامیر کی حالت سے پریشان تو تھی مگر اس نے پرخلوص انداز میں شامیر سے امید افزا گفتگو کی۔ وہ اپنے سابقہ رویے پر بھی بے حد شرمندہ تھی۔ اس شرمندگی کے نتیجے میں اس کی آنکھوں میں مسلسل آنسو جھلملاتے رہے..... ملاقات کا وقت محدود تھا، کچھ دیر بیٹھ کر وہ چلی گئی۔

اگلے روز کا انتظار شامیر نے بے حد شدت سے کیا۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہ دس بارہ گھنٹے نہیں، دس بارہ مہینے ہیں۔ پچھلی بار زویا جب تک اس کے پاس رہی تھی، وہ اپنی ہر تکلیف بھول گیا تھا۔ اب بھی اسے یہی امید تھی۔ اس کی نگاہ بار بار بے ساختہ، وال کلاک کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ بالآخر وہ آگئی۔ وہ لیونا برگ کی ایک بڑی چمکیلی سہ پہر تھی۔ آج شامیر کی طبیعت بھی قدرے بہتر تھی۔ یا شاید یہ زویا کا انتظار ہی تھا جس نے تکلیف کی طرف سے اس کا دھیان ہٹا دیا تھا۔ وہ ہلکے رنگ کے مشرقی لباس شلوار قمیص میں تھی۔ اندر آنے کے بعد وہ حجاب کو ایک دوپٹے کی طرح اپنے سر پر اوڑھ لیتی تھی۔

''زیادہ دیر تو نہیں ہوئی؟'' وہ وال کلاک کو دیکھ کر بولی۔

''دیر تو یقیناً ہوگئی ہے۔'' اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''لیکن جب آنے والا آجائے تو شکوے بھول ہی جاتے ہیں۔''

''بس یہاں کی فارمیلٹیز میں دیر ہو جاتی ہے۔ ورنہ میں تو ایک بجے ہوٹل سے نکل آئی تھی۔''

دونوں نے تھوڑی دیر تک نمرسی کی موت کے بارے میں بات کی۔ نمرسی اور اس کی سفاکی کے بارے میں اب زویا اور شامیر کے درمیان کوئی پردہ نہیں رہ گیا تھا۔ فادر جوناتھن کے گھر قیام کے دوران میں ہی شامیر نے زویا کو بتا دیا تھا کہ وہ حولیہ پر ہونے والے ستم سے آگاہ ہو چکا ہے۔ زویا کی زندگی پر منڈلانے والا ایک اور بدکردار اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا اور یہ شامیر کے لیے بہت اطمینان بخش تھا۔ لیکن وہ انجام کو کیسے پہنچا، اصل میں اس کے پیچھے کس کا کردار تھا؟ یہ ان دونوں کے لیے راز تھا اور راز ہی رہنا تھا۔ وہ لڑکی جس کا نام خشامہ تھا، اب ایک الگ دنیا کی باسی تھی۔

زویا نے کہا۔ ''میں نے آج بھی سینئر ڈاکٹر تھامسن رے سے بات کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ علاج اچھے طریقے سے آگے بڑھ رہا ہے۔ جب انفیکشن رک جائے گا اور زخم مندمل ہونا شروع ہو جائیں گے تو پھر جسم کی اسکن گرافٹنگ کے بارے میں سوچا جائے گا۔ شکر ہے کہ تمہارا چہرہ محفوظ رہا ہے۔ انشاء اللہ پلاسٹک سرجری صرف جسم کے لیے ہوگی اور جب یہ ہو جائے گی تو باڈی بالکل پہلے کی طرح ہو جائے گی۔''

''لیکن یہ کام زیادہ جلدی بھی نہیں ہونا چاہیے۔'' شامیر نے دبی دبی سی مسکان کے ساتھ کہا۔

''کیا مطلب؟''

''لگتا ہے کہ تم نے تو مجھے چار ہفتوں میں کھڑا کر دینے کا پروگرام بنالیا ہے۔ ایسا ہوگیا تو پھر تو میں چلا جاؤں گا واپس۔ ایسی تسلی تشفی والی نایاب باتیں مجھ سے کون کرے گا؟''

جب بھی شامیر کوئی ایسی معنی خیز بات کرتا تھا، زویا موضوع بدل دیتی تھی۔ شاید وہ کسی ایسے رخ پر جانا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اب بھی اس نے شامیر کا تکیہ درست کرتے ہوئے بات بدلی۔ ''ماما سے پھر تو بات نہیں ہوئی؟''

''نہیں۔''

''تمہیں بات کرنی بھی نہیں چاہیے شومیر! بات تو انہیں کرنی چاہیے..... بلکہ انہیں معافی مانگنی چاہیے تھی تم سے۔ حولیہ نے مجھے بتایا ہے، ایسن میں انہوں نے تم سے بہت برا سلوک کیا۔'' زویا کی آواز کرب میں ڈوب گئی۔

''میں وہ سب بھول چکا ہوں زویا! ویسے بھی وہ بڑی ہیں۔ وہ جو بھی کہہ لیں، ان کا حق بنتا ہے۔''

''لیکن..... انہوں نے جو بھی کہا، جو بھی سوچا وہ سب کا سب غلط تھا شومیر! ایک عمر رسیدہ تعصب نے انہیں اندھا بہرا کر چھوڑا ہے۔ وہ یہی سمجھتی رہیں کہ حولیہ پر ستم ڈھانے اور انہیں زخمی کرنے والا فعل پاکستانی سہراب درانی نے انجام دیا ہے۔ حالانکہ یہ سراسر نمرسی کی سفاکی تھی اور نمرسی جرمن تھا۔ میری زندگی کو مسلسل عذاب بنانے والا بھی کوئی اور نہیں ان کا چہیتا ہم قوم رابرٹ ہی تھا۔ بچہ نہ ہونے کے سبب حولیہ کو اپنی زندگی سے دور کرنے والا بھی ایک جرمن ہی ہے اور پھر جن لوگوں نے مجھے اور میری بچی کو کئی روز میرے ہی گھر میں یرغمال بنایا، وہ کون تھے؟ وہ بھی ایشیائی نہیں تھے، نہ ہی مسلمان تھے۔ وہ یہاں کے مہذب جرمن ہی تھے، ہاں مہذب جرمن اور مہذب سفید فام جو چرچ میں لگنے والی آگ کے موقع پر قطار اندر قطار کھڑے تھے اور بے بس نظر آرہے تھے۔ اندر میری بہن اور خود میری ماں موت کے دہانے پر تھیں۔ تہذیب تو انسانیت اور قربانی سکھاتی ہے۔ اس وقت انسانیت اور قربانی کسی جرمن میں نہیں غیر جرمن میں نظر آئی۔ تم نے اپنی جان شدید خطرے میں ڈالی اور ان دونوں کو بھڑکتے شعلوں سے نکالا لیکن وہ میری ماما ہیں، میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ ان سب باتوں کو سمجھنے کے باوجود بھی نہیں سمجھیں گی۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنا ان کو اپنی قوم سے غداری کی طرح لگے گا۔''

''زویا! میرے خیال میں ان کے رویے کے پیچھے ان کی ازدواجی زندگی کا بھی کچھ عمل دخل رہا ہے۔'' شامیر نے نحیف آواز میں کہا۔

''شومیر! اگر میرے مرحوم والد میں کچھ خامیاں تھیں تو ان میں وہ اکیلے قصوروار نہیں تھے۔ یہ تالی دونوں ہاتھوں کے ساتھ بجتی رہی ہے مگر اس کا یہ مطلب کیسے ہوگیا کہ کسی ایک فرد کی وجہ سے ایک پورے خطے یا اس خطے میں بسنے والے لوگوں کو ہی ملعون و مطعون کر دیا جائے۔''

''میں تمہاری اس بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں زویا۔ ہر قوم اور خطے میں اچھے برے لوگ ہوتے ہیں۔ کیا مجھے جرمنی میں اچھے دوست نہیں ملے؟ جین، ٹام، مارگریٹ یہ سب جرمن ہی تو ہیں..... اور پھر نومسلم مسز حامدہ جن کی آنکھوں میں، میں نے ہر کسی کے لیے بے لوث محبت کی جوت جلتے دیکھی ہے۔''

پیتمالوجسٹ کی آمد پر زویا کو باہر جانا پڑا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر تھامسن رے کی عنایت سے وہ پھر اندر آنے اور تسلی سے شامیر کے پاس بیٹھنے میں کامیاب ہوگئی۔ کھڑکیوں سے باہر پھولوں کے رنگ تھے اور ایک خوشبودار ہوا تھی جو

ساشا
زندگی کے نشیب و فراز کی ایک عجیب داستان، کبھی
پرخطر جزیروں، دائروں میں قید تو کبھی بغاوتوں کے جنگل میں
بھٹکے ہوئے راہی کے مانند، سنسنی خیز حالات سے نبرد آزما.....
ایک نئے انداز، نئے رنگ، نئے ڈھنگ میں.....
عشق کے دشوار گزار مرحلے..... حسن کے قافلے.....
جذبات کا تلاطم..... دریاؤں کی روانی..... سمندر کے
طوفانوں اور بھنور میں لپٹی خوبصورت داستان.....
بہت جلد
سسپنس کے صفحات پر جلد ہی پڑھیں گے

صرف محسوس کی جاسکتی تھی۔

شامیر نے کہا۔ ''زویا! ایک سوال عرصے سے ایک کانٹے کی طرح میرے دل میں چبھا ہوا ہے اور شاید ہمیشہ چبھا رہے گا۔ کیا تم مجھے اس سوال کا جواب دے کر اس اذیت سے نکال سکو گی؟''

زویا کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ ''کیسا سوال؟'' اس نے ذرا جھجک کر کہا۔

''ناراض تو نہیں ہو گی؟''

اس نے اپنا نچلا ہونٹ ہولے سے دانتوں میں دبایا اور نفی میں سر ہلایا۔

''زویا! کیا میرے یہاں سے جانے کے بعد تم واقعی اپنے مسائل میں گم ہو کر رہ گئی تھیں؟ کیا تم نے کبھی مجھے یاد نہیں کیا؟''

وہ شامیر کو دیکھے بغیر بولی۔ ''کیا، میں خاموش رہنے کا حق استعمال کر سکتی ہوں؟''

''یہ حق تو تم بہت عرصے سے استعمال کر رہی ہو۔'' اس نے کہا اور ٹھنڈی سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ جب وہ آنکھیں بند کرلے گا تو آنکھوں میں بند دو موتی باہر لڑھک آئیں گے۔ وہ شرمندہ ہو گیا مگر اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔

ان دو آنسوؤں نے زویا کے دل پر عجیب سا اثر کیا۔ جیسے پانی سے لبالب بھری ہوئی ایک گھاگر کو ٹھوکر لگ جائے۔ وہ کتنی ہی دیر تک کچھ بولنے کی کوشش کرتی رہی مگر سمجھ نہیں پائی کہ کیا کہے؟ شامیر بھی اسی طرح آنکھیں بند کیے چت لیٹا رہا۔ اس کے زخم زخم جسم کے خیال سے زویا کا دل بھر آیا۔

''ناراض ہو گئے ہو؟'' اس نے ہمت کر کے پوچھا۔

''یہ حق تو نہیں ہے مجھے۔''

''اچھا..... پوچھیں جناب۔''

زویا کے اس طرح مخاطب کرنے پر شامیر کے چہرے پر عجیب سی رونق امڈ آئی۔ جسمانی تکلیف کہیں دور پس منظر میں چلی گئی تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

''کبھی یاد کیا مجھ کو؟''

زویا کے ہونٹ بے ساختہ لرزے مگر وہ کچھ بول نہیں سکی۔ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ اچھے دنوں میں جب کوئی چاہت کی بات کرنا ہوتی تھی، وہ اس کی پشت کی طرف جا کر اسے اپنی بانہوں میں لے لیتی تھی اور اس کے کان میں دلنشین سرگوشی کرتی تھی۔ آج بھی شاید وہ یہی جھجک محسوس کر رہی تھی۔

شامیر نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ''چلو..... میں اس طرف دیکھ لیتا ہوں، اب جو جی میں آئے کہہ دو۔''

شامیر کا بایاں ہاتھ زویا کے گھٹنے کے بالکل پاس تھا۔ اس نے اسے تھاما اور اپنی شہادت کی انگلی سے بڑی نرمی کے ساتھ اس کی ہتھیلی پر yes کے حروف لکھے۔ اس نے شامیر کے سوال کا جواب اثبات میں دیا تھا یعنی وہ اسے یاد کرتی رہی ہے۔

اپنی ہتھیلی پر حروف کا لمس محسوس کر کے شامیر کے پورے جسم میں سنسنی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔ اسے لگا کہ ایک سخت برف تھی جو پگھل رہی ہے۔ اس نے مڑ کر زویا کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ گلاب ہو رہا تھا۔ ان لمحوں میں ایک نہایت دھیمی سی جھجک آمیز شوخی اسے زویا کی جھکی ہوئی پلکوں پر دکھائی دی۔

''کتنا یاد کیا؟'' اس نے پوچھا اور منہ پھر دوسری طرف پھیر لیا۔

''بہت زیادہ.....'' زویا نے پھر انگلی سے اس کی ہتھیلی پر لکھا۔

''کتنا زیادہ؟''

''بہت ہی زیادہ۔ ہر پل.....''

''تو پھر، میرا دل اتنا کیوں دکھایا..... کیوں کہا کہ اب سب کچھ بدل چکا ہے؟ کیوں مجھے لیونا برگ سے بھگانے کے لیے اتنی سرد مہری دکھائی؟'' وہ منہ پھیرے پھیرے بولا۔

''..... SORRY'' اس نے شامیر کی ہتھیلی پر لکھا۔ کتنا مختصر مگر جامع جواب تھا۔

شامیر نے منہ پھیر کر اس کی طرف دیکھا۔ زویا کی آنکھوں میں گہرے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے..... کسی بھی وقت آنسوؤں کی موسلا دھار بارش ہو سکتی تھی اور پھر ایسا ہی ہوا۔ وہ اچانک رونے لگی۔ اس نے اپنا چہرہ کریم کلر کے اسکارف میں چھپا لیا تھا۔ شامیر کو فقط اس کی پیشانی نظر آ رہی تھی جس پر رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ اس کے آنسو بے آواز تھے۔ پندرہ بیس سیکنڈ اسی طرح گزر گئے۔

''پلیز زویا! ایسا مت کرو۔'' اس نے کہا۔

وہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔ شاید لابی میں بیٹھ کر اس نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کیا تھا۔

پانچ دس منٹ بعد وہ واپس آئی تو اس کا چہرہ اوس میں دھلے سرخ و سپید پھول کی طرح تھا۔ اسے دوبارہ اپنے

پاس دیکھ کر شامیر کی پنڈلیوں کی طرف سے اٹھنے والی درد کی شدید لہریں ماند پڑ گئیں۔

اس کا دل چاہا کہ وہ ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر زویا کو گلے سے لگا لے لیکن کیسے؟ وہ تو اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا تھا۔

''زویا! تم نے آج میرے لیے مشکلیں پیدا کر دی ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''اسپتال میں سب سے زیادہ ڈر تو موت کا ہی ہوتا ہے مگر مجھے بالکل ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ ہاں، اب لگ رہا ہے۔''

''پلیز شومیر! ایسی باتیں مت کرو۔ تم نے چند روز میں بالکل ٹھیک ہو جانا ہے۔''

''اب تو شاید ہونا ہی پڑے گا۔ گہری تاریکیوں میں کچھ روشنی سی نظر آنے لگی ہے۔''

''آپ صحافی ہو کر کبھی کبھی ادیبوں والے لفظ استعمال کرتے ہیں۔''

''اچھے لفظ استعمال کرنے میں تو تم بھی کسی سے پیچھے نہیں ہو زویا..... اور ابھی تم نے جو لفظ استعمال کیا ہے، وہ میری زندگی کا یادگار ترین لفظ بن گیا ہے۔ اس کے اندر چھپی ہوئی خوبصورتی اور محبت کو میں زندگی بھر فراموش نہ کر سکوں گا۔''

''کون سا لفظ؟''

''جو تم نے میری ہتھیلی پر آخر میں لکھا۔'' وہ آنکھیں بند کیے کیے بولا۔

''وہ تو میں بہت دفعہ لکھ سکتی ہوں۔'' وہ پلکیں جھکا کر بولی۔

عجب جذب کے عالم میں اس نے شامیر کا ہاتھ تھام لیا اور اس کی ہتھیلی پر اپنی شہادت کی انگلی سے پھر sorry لکھ دیا۔

شامیر نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ ادویات کا اثر شاید ختم ہو رہا تھا۔ پاؤں کے ناخنوں سے لے کر ہنسلی کی ہڈیوں تک درد کی شدید لہریں اٹھنا شروع ہو گئی تھیں مگر زویا کی موجودگی میں یہ لہریں تکلیف نہیں دے رہی تھیں۔ وہ آنکھیں بند کیے کیے، ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ ''کچھ اور بھی لکھنا چاہو تو لکھ دو۔''

''اور کچھ نہیں۔'' وہ بھرائی ہوئی سی آواز میں بولی۔

''کچھ نہ کچھ تو ہو گا۔ لکھ دو۔ کہتے ہیں کہ آج کا کام کل پر نہیں چھوڑنا چاہیے۔''

اس کے چہرے پر پھر سرخی پھیل گئی۔ اس نے نچلا ہونٹ ہولے سے دانتوں میں دبایا۔ کن انکھیوں سے شامیر کی طرف دیکھا۔ اس نے آنکھیں بدستور بند کر رکھی تھیں۔ اس نے ہتھیلی پر لکھ دیا SORRY اور نیچے لکھا STILL LOVE YOU۔

اس کی پلکوں پر پھر دو موتی آن اٹکے تھے۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''بس اب چلتی ہوں۔'' وہ نظر چرا کر بولی۔ آنکھوں میں بادل پھر گہرے ہو گئے تھے۔

اس سے پہلے کہ شامیر اسے روکنے کے لیے کچھ کہتا، ایک مقامی بچی ایک لیڈی ڈاکٹر کی انگلی پکڑے ہوئے اندر آئی۔ پانچ چھ سالہ بچی کے ہاتھ میں سرخ گلاب کی ایک کلی تھی۔ اس نے یہ کلی شامیر کے سرہانے رکھی اور جرمن میں شکریے کے کچھ کلمات ادا کیے۔

ڈاکٹر نے انگلش میں ترجمہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ان سب 120 بچوں کی طرف سے جو لیونا برگ کے اسکولوں سے آئے ہیں اور آپ کی عیادت کے لیے یہاں پہنچے ہیں۔ یہ سب بچے آپ کے لیے دعا گو ہیں۔''

''میں اس تعریف کے قابل نہیں ہوں۔ بہر حال ان معصوم ہستیوں کا بہت شکریہ۔'' شامیر نے کہا۔

چند فقروں کے تبادلے کے بعد بچی اور ڈاکٹر واپس چلے گئے۔ شامیر نے چونک کر دیکھا۔

زویا بھی جا چکی تھی۔ شامیر کی ہتھیلی پر جیسے نایاب قیمتی موتی رکھے ہوئے تھے۔ یہ چار لفظ نہیں، چار موتی ہی تھے۔ ''سوری..... اسٹل لو یو.....'' اس نے مٹھی بند کر لی۔ جیسے اسے اندیشہ ہو کہ یہ موتی گر جائیں گے یا کوئی ان کو دیکھ لے گا۔ انبساط کی لہریں اس کی ہتھیلی کے اندر سے اٹھ رہی تھیں اور پورے جسم میں پھیل رہی تھیں۔ یہ لہریں اس بے پناہ تکلیف پر حاوی تھیں جو اس کے روئیں روئیں میں بسی ہوئی تھی..... کچھ وقت کے لیے کم ہو جاتی تھی مگر پھر پلٹ آتی تھی۔

یہی وقت تھا جب سینئر ڈاکٹر تھامسن رے اپنے آفس میں ایک جونیئر ڈاکٹر کے ساتھ موجود تھے۔ وہ شامیر کی تازہ میڈیکل رپورٹس دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں تشویش ابھر رہی تھی۔ کافی ساری جلد کاٹی جا چکی تھی پھر بھی انفیکشن رک نہیں پا رہا تھا۔ سینے اور پیٹ پر آگ کے اثرات بہت زیادہ تھے۔ اندرونی عضلات، خاص طور سے جگر بھی متاثر ہوا تھا۔ کوئی کرشمہ ہی مریض کو بحالی کی طرف لا سکتا تھا۔ ڈاکٹر تھامسن رے روزانہ ہی آگ سے متاثرہ بیسیوں مریضوں کو دیکھتے تھے..... مگر اس پاکستانی مریض کے لیے

وہ اپنے اندر ایک خاص قسم کی ہمدردی اور تشویش پاتے تھے۔ اس نے جو کچھ کیا تھا، بہت کم لوگ کر پاتے تھے۔

☆☆☆

زویا اب تقریباً روزانہ ہی اسپتال آرہی تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ دیر اس کے پاس رہنے کی کوشش کرتی۔ تیز دواؤں کے زیر اثر شامیر پر کسی وقت غنودگی بھی طاری ہوتی لیکن وہ زویا کی باتیں سنتا رہتا اور حسبِ حال جواب بھی دیتا۔ وہ اس کا بایاں ہاتھ اپنے نرم ہاتھ میں تھام لیتی۔ کسی وقت اس کی ہتھیلی پر انگلی سے لکھ دیتی LOVE YOU وہ غنودگی میں بھی ہوتا تو اس کے چہرے پر ایک روشنی سی پھیل جاتی۔

ایک روز وہ آئی تو شامیر کی طبیعت نسبتاً بہتر تھی۔ زویا نے اپنے ہاتھ سے اسے تھوڑا سا جوس پلایا۔ ''بستر کی ٹیک تھوڑی سی اونچی کردوں؟'' زویا نے پوچھا۔

''ہاں۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

اس نے ٹیک اونچی کردی۔ وہ محویت سے اسے دیکھنے لگا۔

''کیا دیکھ رہے ہو شومیر؟''

''دیکھ نہیں رہا، سوچ رہا ہوں..... یہ زیادتی کیوں کر رہی ہو میرے ساتھ؟''

''کون سی؟'' وہ حیران ہو کر بولی۔

''یہی انگلش بولنے والی۔ تمہاری اس گلابی اردو کو میں ترس گیا ہوں۔''

وہ پھیکے انداز میں مسکرائی۔ ''تو..... ٹھیک ہے۔ اردو ہی سہی لیکن کسی غلط لفظ پر تو تم کو میرا مذاق نا ہیں اڑانا ہوگیں گا۔''

''تمہیں لگتا ہے کہ میں مذاق اڑانے کے قابل ہوں؟''

''کیا مطلب؟''

''مذاق اڑاؤں گا، مگر ٹھیک ہونے کے بعد۔ جی چاہتا ہے کہ ہم وہ سب کچھ دہرائیں جو چار سال پہلے کے اس جولائی میں ہوا تھا اور جس کا ہر ہر منظر میرے ذہن پر نقش ہے۔''

''بس..... فی الحال آپ اپنا سارا توجہ اپنی تندرستی پر دیں۔'' (وہ اب اکثر اسے 'آپ' کہہ کر بھی بلاتی تھی)

''جی چاہتا ہے زویا کہ وقت پلٹ آئے۔ ہم پھر اسی جگہ 21 نمبر ٹرین کے آخری اسٹاپ پر جا کھڑے ہوں۔ اس بار جب تم مجھے چھوڑ کر جاؤ تو..... میری آواز میرے گلے میں نہ پھنس جائے۔ میں تمہیں پکار سکوں..... بلکہ کتنا اچھا ہو کہ تم جاؤ ہی نہ۔''

وہ بس ایک ''ہوں'' کر کے رہ گئی۔ آنکھوں میں گہرا کرب کروٹیں لے رہا تھا۔

''یہ انا ہمارے آڑے کیوں آجاتی ہے زویا۔ ہم ایک دوسرے کو پکار کیوں نہیں سکتے؟ کیوں واپس نہیں بلا سکتے؟''

''انا اور شاید کچھ دنیا کا ڈر بھی..... شاید اسی کو تقدیر کا نام دیا جاتا ہے۔ ہم تقدیر سے نا ہیں لڑ سکتے اور نہ وقت کو واپس بلا سکتے ہیں۔ ہاں، آگے کے لیے سوچنا ہمارے بس میں ہوتا ہے۔''

''لیکن ہم تو فرض کر رہے ہیں نا.....'' وہ ذرا کراہ کر بولا۔ ''اگر وقت چار سال پیچھے چلا جائے..... تو کیا ہو..... ذرا تصور کرو..... تم مجھ سے ناراض ہو کر اپنے فون بند کر چکی ہو۔ میں بھی اپنی انا کا اسیر ہو کر پاکستان واپس جا چکا ہوں..... ہم ایک دوسرے کے لیے تڑپ رہے ہیں، مگر ایک دوسرے کی طرف سے پہل کا انتظار کر رہے ہیں..... بس فرض کرو..... اونلی امیجی نیشن۔''

وہ اپنی ٹھوڑی اپنی ہتھیلی پر ٹکا کر کسی گہری سوچ میں کھو گئی پھر کھوئے کھوئے آہنگ میں بولی۔ ''اگر ایسا ہو جائے تو آپ کیا کریں گے؟''

وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔ ''میں اپنی ضد کو پاش پاش کردوں گا۔ تمہیں فون کروں گا۔ ایک بار نہیں، کئی بار..... شاید درجنوں بار..... تمہیں عاجز کر ڈالوں گا۔ تمہیں تمہارے خول سے نکلنے پر مجبور کردوں گا۔ اپنے سارے تحفظات ایک طرف رکھ دوں گا۔ زویا! جب محبت ہے تو پھر تحفظات کیسے؟ سبک سری اور توہین کا خیال کیسا؟ محبت تو نام ہی اپنی ہستی کو کسی دوسرے کے لیے فنا کر دینے کا ہے۔ اس میں دوسرے کی پہل کا انتظار کیوں کیا جائے؟ کیوں نہ سر جھکا کر محبت کو سربلند کر دیا جائے۔''

زویا کے گلابی ہونٹوں پر بے ساختہ ایک موہوم سی مسکراہٹ کھیلی۔ ''اس لیے ہام کہتا کہ آپ جرنلسٹ ہو مگر ادیب بھی لگتے ہو۔''

''اچھا، اب تم بتاؤ کہ تم کیا کرتیں؟''

وہ ایک بار پھر گمشدہ موڈ میں چلی گئی۔ ہاتھ پر اپنی ٹھوڑی ٹکائے ٹکائے بولی۔ ''ہام، آپ کو بالکل فون نا ہیں کرتا..... ہام شاید 21 نمبر ٹرین کے اسٹاپ پر ہی معاملے کو بگڑنے سے بچا لیتا۔ ہام کی سمجھ میں آج تک نا ہیں آیا کہ

اس ڈن وہ سب کیا ہوا؟''

شامیر نے عجب دکھی انداز میں زویا کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''زویا..... کیا یہ سلسلے وہیں سے جڑ سکیں گے جہاں سے ٹوٹے تھے؟''

اس سے پہلے کہ زویا جواب میں کچھ کہتی، دو تین ڈاکٹرز کا ایک پینل، میڈیکل اسٹاف کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ وہ لوگ سیدھے شامیر کے بیڈ کی طرف ہی آئے۔ زویا سے کہا گیا کہ وہ باہر چلی جائے، مریض کا معائنہ ہونا ہے۔

شامیر کا ہاتھ دبا کر زویا باہر چلی گئی۔ ڈاکٹروں نے اسے گھیر لیا۔ ان میں مہربان چہرے والے سینئر ڈاکٹر تھامسن بھی شامل تھے۔ شامیر کے زخموں کا معائنہ کیا گیا۔ وائٹل سائنز دیکھے گئے، خون کے نمونے لیے گئے۔ ڈاکٹرز آپس میں بہ زبان جرمن گفتگو کر رہے تھے، تاہم اِکا دُکا الفاظ شامیر کے پلے بھی پڑ جاتے تھے۔ مثلاً..... انفیکشن..... خون کی کمی..... رگوں میں پانی کی زیادتی..... وغیرہ وغیرہ۔ گردوں کی ایک رپورٹ پر بھی خصوصی توجہ دی جا رہی تھی۔

ڈاکٹرز کے جانے کے دس پندرہ منٹ بعد زویا پھر آ گئی۔ اسے دیکھ کر شامیر کی آنکھوں میں روشنی سی امڈ آئی تھی۔

وہ اس کے قریب بیٹھ کر بولی۔ ''شومیر! آپ تو بہت مشہور ہو گئے۔ تین چار میگزین اور نیوز پیپرز میں آپ کا تصویر پرنٹ ہوا۔ اب بھی اسپتال سے باہر بہت سا لوگ ہے جو آپ کا خیریت ڈریافت کرتا..... آپ سے ملنا مانگتا..... لیونا برگ کے چرچ میں سنڈے کو آپ کے لیے خاص دعا ہوئیں گا۔''

''ان سب لوگوں کا بہت شکریہ زویا..... اور سب سے بڑھ کر تمہارا۔ یہ تم ہی ہو جو مجھے اس تکلیف سے لڑنے کی طاقت دے رہی ہو۔''

اس نے بے حد اپنایت سے شامیر کا ہاتھ دبایا..... ''پلیز شومیر! بس جلدی سے اچھے ہو جائیں۔'' اس نے کہا اور ایک آنسو شامیر کے ہاتھ پر گرا پھر وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور خدا حافظ کہہ کر مڑ گئی۔

''کل جلدی آنا زویا۔'' وہ التجا آمیز لہجے میں بولا۔

وہ جاتے جاتے مڑی، اس کی آنکھوں کے کٹوروں میں اشک جمع ہو چکے تھے۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور باہر نکل گئی۔

☆☆☆

سنڈے کے روز شامیر بہت تکلیف محسوس کر رہا تھا اور جب وہ زیادہ تکلیف محسوس کرتا تھا، اسے زویا کی کمی بھی شدت سے محسوس ہوتی تھی۔ سہ پہر تین بجے تک کا وقت اس نے کلاک کو دیکھ دیکھ کر گزارا..... زویا تو نہیں آئی، اس کا فون آ گیا۔ وہ کسی وجہ سے آج نہیں آ سکتی تھی۔ شامیر کے سینے سے ایک نہایت ٹھنڈی اور طویل سانس خارج ہوئی۔ اب پھر چوبیس گھنٹے کا انتظار تھا۔ اسے لگا کہ وہ پاکستان سے ہزاروں میل دور یہاں بالکل اکیلا ہے۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ خالہ ثمینہ اپنی مفلوج بیٹی کو لے کر پاکستان واپس جا چکی ہیں..... اور اگر وہ یہاں بھی ہوتیں تو اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ کبھی اس کی تھیں ہی نہیں، وہ تو بس ایک ضرورت اور ایک ضد تھی جس نے اسے ان کا پیارا بھانجا بنا رکھا تھا..... ہاں، وہ اکیلا ہی تھا۔ اس دنیا میں کوئی نہیں تھا جسے وہ حقیقی معنوں میں اپنا کہہ سکتا۔ اس نے دکھی دل کے ساتھ سوچا، چلو اچھا ہی ہے..... اگر اسے واقعی مرنا ہی پڑ گیا تو کوئی رونے پیٹنے والا تو نہیں ہوگا لیکن پھر اس کا دھیان زویا کی طرف چلا گیا..... نہیں، کم از کم ایک تو ہے، جو روئے گا اور شاید بری طرح روئے گا۔ پتا نہیں کیوں اس کے رونے کا خیال کر کے اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ زندہ رہے۔ وہ اپنی اس تکلیف کو ایک یادگار مزاحمت پیش کرے۔

میڈیکل اسٹاف کے لوگ آئے۔ انہوں نے مسکراتے لہجے میں کچھ کہا اور شامیر کے بیڈ کو دھکیلتے ہوئے دوسری طرف لے گئے۔ وہ یہی سمجھا کہ شاید اسے روٹین کے کسی ٹیسٹ کے لیے لے جایا جا رہا ہے مگر ایک دیوار گیر کھڑکی کے قریب بیڈ روک دیا گیا۔ کھڑکی کے پردے ہٹائے گئے۔ شیشوں کی دوسری جانب کا منظر دیکھ کر شامیر دنگ رہ گیا..... یہاں ایک سرسبز لان میں قطار اندر قطار بے شمار لوگ موجود تھے۔ ان میں بچے، جوان، بوڑھے ہر عمر کے مرد و زن شامل تھے۔ ٹی وی کے رپورٹرز اور کیمرامین بھی تھے۔ ان کے چہروں پر شامیر کے لیے تعریف و تحسین تھی اور بہت سے ایسے تھے جن کے ہاتھوں میں گلدستے تھے۔ شامیر بہت تکلیف محسوس کر رہا تھا لیکن ان مناظر نے اس کا دھیان کچھ دیر کے لیے بٹا دیا۔ اسے لگا کہ کچھ دیر پہلے وہ جو کچھ سوچ رہا تھا، وہ عبث تھا۔ وہ اکیلا تو تھا مگر بالکل بھی اکیلا نہیں تھا۔ اس دیارِ غیر میں بہت سے لوگ ایسے تھے جو اس کے لیے دل میں جگہ رکھتے تھے اور اس کے لیے دعا گو تھے۔ اس کے دل میں آیا کاش زویا کی ماما بھی یہاں موجود ہوتیں اور دیکھ سکتیں کہ ہر مسلمان ان کا شوہر راشد احمد نہیں ہوتا..... اور دیکھ سکتیں کہ برصغیر میں ہی رہنے والے ایک پاکستانی نے کس طرح ان کے اہلِ خانہ اور ان کے ہم

وطنوں کے دل میں جگہ بنائی ہے۔

یہی وقت تھا، جب اسپتال کے ایک کمرے میں ڈاکٹرز کا ایک بورڈ شامیر کے کیس کو ڈسکس کر رہا تھا۔ سینئر ڈاکٹر تھامسن نے کہا۔ ''جسم آکسیجن کو پوری طرح جذب نہیں کر پا رہا۔ گردوں کا فعل بھی متاثر ہو رہا ہے۔ یہی صورت حال رہی تو دو تین روز میں سانس کی دشواریاں بھی پیش آسکتی ہیں۔''

ایک دوسرے جرمن ڈاکٹر نے کہا۔ ''اصل مسئلہ تو انفیکشن ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ مریض کو برلن یا فرینکفرٹ میں شفٹ کر دیا جائے؟''

ڈاکٹر تھامسن کے علاوہ ایک اور ڈاکٹر نے بھی مایوسی سے سر ہلایا۔ ڈاکٹر تھامسن نے کہا۔ ''میری رائے میں تو اس اسٹیج پر سفر مزید پیچیدگی پیدا کر دے گا۔ ہمیں کم از کم دو تین روز بعد مزید دیکھنا پڑے گا۔'' پھر انہوں نے اپنے اسسٹنٹ کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''لواحقین میں قریبی کون ہے؟''

''سر! بس وہی پاکستانی نژاد لڑکی زویا ہے۔''

''تو ٹھیک ہے، اسے کال کرو۔''

''میں نے آپ کے کہنے پر کر دی تھی سر۔ وہ آنے ہی والی ہوگی۔''

ابھی ڈاکٹرز کی ڈسکشن جاری تھی کہ زویا بھی حجاب لیے اور شولڈر بیگ لٹکائے پہنچ گئی۔ وہ پریشان تھی۔ سائڈ روم میں ڈاکٹر تھامسن نے اس سے اکیلے میں بات کی۔

''مسٹر شامیر آپ کے کیا لگتے ہیں؟''

''وہ میرے ہم کار تھے۔ ہم ڈبل اے چینل پر اکٹھے کام کرتے رہے ہیں۔ ان کے علاج کے سارے معاملات یہاں میں ہی دیکھ رہی ہوں۔ پاکستان سے چینل کے مالک عظمت سلطان صاحب تعاون کر رہے ہیں۔''

ڈاکٹر تھامسن نے ایک توقف کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مسٹر شامیر کی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے لیکن امید پر دنیا قائم ہے۔ ہم پوری کوشش کر رہے ہیں۔'' وہ سر جھکا کر شامیر کی رپورٹس کو دیکھتے رہے، تب بولے۔ ''دیکھو مس زویا! یہ جو ہماری جلد یعنی کھال ہوتی ہے، یہ ایک طرح کا قدرتی غلاف ہے جو ہمارے جسم کو ہر طرح کے انفیکشن سے محفوظ رکھتا ہے۔ جب یہ جلد جل جاتی ہے تو جسم ایک دم غیر محفوظ ہو جاتا ہے۔ ہر طرح کے بیکٹیریاز اس پر حملہ کر سکتے ہیں۔ اس تھرڈ ڈگری برننگ میں کچھ اسی طرح کی سچویشن ہے۔ فی الحال ہم مسٹر شامیر کو برلن یا ویانا میں منتقل بھی نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے دو تین روز انتظار کرنا پڑے گا۔''

زویا خاموشی سے سنتی رہی۔ اس کا رنگ برف کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ سینئر ڈاکٹر تھامسن نے شفقت سے اس کا کندھا تھپکا۔ ''آپ ہمت سے کام لیں اور دعا کریں۔''

زویا رو دی۔ ''اس نے ہمارے لیے خود کو ختم کر لیا ڈاکٹر۔ وہ کہاں سے آیا اور کہاں پہنچ کر ہمارے لیے زندگی کی ڈھال بن گیا.....''

ڈاکٹر تھامسن طویل سانس لے کر بولے۔ ''اس کی قربانی واقعی قابلِ ذکر ہے۔ لوگ اس طرح اپنی جان اس وقت خطرے میں ڈالتے ہیں جب ان کا کوئی بہت قریبی موت کے خطرے میں ہوتا ہے یا پھر کوئی بے حد جذباتی رشتہ۔''

زویا روتے ہوئے ملتجی لہجے میں بولی۔ ''ڈاکٹر! آپ سے میری ایک درخواست ہے۔ میں جانتی ہوں اسپتال کے رولز سخت ہیں لیکن آپ میرے لیے پلیز تھوڑی سی گنجائش پیدا کریں۔ میں زیادہ سے زیادہ دیر شامیر کے پاس رکنا چاہتی ہوں۔ آپ نے دیکھا ہی ہوگا۔ وہ میری موجودگی میں سکون محسوس کرتے ہیں۔''

ڈاکٹر نے اپنی گھنی بھویں اٹھا کر معاملہ فہم نظروں سے زویا کو دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔

قریباً دس منٹ بعد زویا، شامیر کے پاس موجود تھی۔ اس کو دو تین ڈرپس لگی ہوئی تھیں۔ آکسیجن ماسک بھی تھا لیکن لگایا نہیں گیا تھا۔ اس کے وجیہہ چہرے پر نقاہت اور تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ غیر متوقع طور پر زویا کو سامنے دیکھ کر وہ جیسے کھل اٹھا۔

''ارے..... یہ کرشمہ کیسے ہو گیا؟ تم نے تو کہا تھا کہ آج نہیں آسکو گی۔''

وہ مسکرائی۔ ''پھر سوچا کہ کہیں آپ ناراض نہ ہو جاؤ۔ آپ کی ناراضگی..... بہت بھگتی ہے میں نے۔''

''اور میں نے بھی۔''

زویا نے حسبِ معمول اس کا ہاتھ تھام لیا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے اسے جوس پلانا چاہا مگر اس نے فقط ایک سپ لے کر سر نفی میں ہلا دیا۔ وہ مختلف موڈ میں تھا۔ تکلیف کے آثار چہرے پر نہیں آنے دے رہا تھا مگر ضبط بھی آسان نہیں تھا۔

زویا کا ہاتھ ہولے سے دبا کر بولا۔ ''موت کیسی ہوتی ہے زویا؟''

''آپ ایسے بے ڈھنگے سوال کریں گے تو میں اٹھ کر

چلی جاؤں گی۔''

''بھئی، یہ بے ڈھنگا سوال نہیں۔ موت وحیات پر غور کرنا تو دانشوروں کا وتیرہ ہے..... آنکھیں بند کرتا ہوں تو لگتا ہے کہ موت ایک اندھیرے کی طرح ہوتی ہے۔ جب ہم زندگی سے بہت تنگ ہوتے ہیں تو دھیرے دھیرے اس اندھیرے میں اترنے سے زیادہ ڈر نہیں لگتا لیکن جب زندگی میں تمہارے جیسی کوئی روشن کرن موجود ہو تو پھر ڈر لگنے بھی لگتا ہے۔''

''اگر ایسی بات ہے تو پھر آپ کو خوب ڈرنا چاہیے اور ایسا کوئی خیال بھی دل میں نہیں لانا چاہیے۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں، آپ بہت جلد اچھے ہونے جا رہے ہیں۔ میں نے آپ کو اچھا کر کے چھوڑنا ہے۔''

''اور خیر سے مجھے اچھا کرنے کے لیے تم کیا کرو گی؟''

وہ خوش نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ''اگر میں مغلیہ دور کی کوئی شہزادی ہوتی تو آپ کے بستر کے گرد چکر کاٹتی اور اپنی جان آپ کے جسم میں ڈال دیتی۔ میں شہزادی تو نہیں ہوں مگر جان تو میں پھر بھی ڈال دوں گی۔ آپ کے پاس رہ کر، آپ کا حوصلہ بڑھا کر..... اور اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد دن رات آپ کی خدمت کر کے۔'' اس نے شامیر کے چھوڑے ہوئے جوس میں سے ایک ''سپ'' لیا اور دل گداز نظروں سے اسے دیکھا۔

اسی دوران میں شامیر کے دائیں پہلو میں درد کی شدید ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ زویا پاس نہ ہوتی تو شاید یہ سب کچھ ناقابلِ برداشت ہوتا لیکن اس کی موجودگی ایک ایسے تریاق کی طرح تھی جو ہر زہر کی تلخی کم کر دیتا تھا اور کبھی کبھی ناپید بھی۔

اس نے زویا کا نرم ہاتھ دبایا اور کھوئے کھوئے آہنگ میں بولا۔ ''زویا! مجھ سے ایک وعدہ کرو۔''

''کیا شومیر؟''

''وعدہ کرو کہ..... آخر تک میرا ہاتھ ایسے ہی تھامے رکھو گی۔''

''آ..... آخر تک؟ کیا مطلب؟''

اس نے بات بدلی۔ ''جب تک ٹھیک نہیں ہو جاتا..... اسی طرح میرے پاس بیٹھی رہو گی..... میری ہتھیلی پر کچھ لکھتی رہو گی۔ بولو کرو گی نا؟''

''شومیر! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟'' وہ رو دینے کے قریب تھی۔

وہ مسکرا دیا۔ ''ایسی باتیں اس لیے کر رہا ہوں کہ تم پھر انگلش بول رہی ہو۔ جب تم ''اردو'' بولو گی تو میرا موڈ بھی اچھا ہو جائے گا۔''

''شومیر! پلیز، آپ ایسا دکھ ڈبونے والا باتیں کیوں کرتا؟'' اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

یہ دھوپ چھاؤں کا منظر وہ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ وہ اردو بھی بول رہی تھی اور دکھی بھی تھی۔

اتنے میں شامیر کو سانس لینے میں دشواری محسوس ہونے لگی۔ ڈیوٹی ڈاکٹرز نے ماسٹر مانیٹر پر یہ کیفیت دیکھ لی۔ ایک ڈاکٹر اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ فوراً موقع پر پہنچ گیا۔ زویا پھر باہر چلی گئی۔

شامیر کو انجکشن لگائے گئے۔ اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ تکلیف کی شدت دب گئی۔ جیسے شعلوں پر ریت ڈال دی جائے اور انگارے اندر ہی اندر سلگ رہے ہوں۔ کچھ بھولی بسری آوازیں اس کی سماعت میں گونجنے لگیں۔ ان آوازوں کا تعلق چار سال پہلے کے خوبصورت شب و روز سے تھا۔

''میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ پیار کروں گی اور کسی پاکستانی یا انڈین وغیرہ سے تو بالکل بھی نہیں۔''

''زویا! تم پورے پندرہ منٹ لیٹ ہوئی ہو۔''

''بالکل غلط شومیر! پندرہ نا ہیں بارہ منٹ۔ جو ٹائم توم سے دور گزرتا اس کے ہر ہر سیکنڈ کا حساب رکھتی ہوں۔''

''اگر کبھی مجھ سے بچھڑنا پڑا زویا تو کیا کرو گی؟''

''بچھڑنے والا صفحہ تو مجھے اپنی زندگی کی کتاب میں کہیں نظر ہی نہیں آتا.....'' آوازیں گونجتی رہیں۔

☆☆☆

زویا، حولیہ، جین، افشاں اس کی والدہ اور انکل اختر..... سینئر ڈاکٹر تھامسن کے روم میں ان کے سامنے بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر انہیں بتا رہا تھا کہ شامیر کی حالت سنبھل نہیں سکی۔ اگلے چوبیس گھنٹے اس کے لیے بڑے مشکل ہیں۔ ان سب کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

جب سب اٹھ کر باہر چلے گئے تو زویا پھر بھی کھڑی رہی۔ ڈاکٹر تھامسن بے حد سنجیدہ تھے اور سوالیہ نظروں سے زویا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ زویا نے خود کو بمشکل بولنے کے لیے تیار کیا اور کہا۔ ''ڈاکٹر! چوبیس مشکل گھنٹوں سے آپ کا کیا مطلب ہے؟''

انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''تم اس سے پیار کرتی ہو؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور دو آنسو رخساروں پر لڑھک گئے۔

''اس کے پاس اب زیادہ وقت نہیں ہے۔'' انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

الفاظ دہکے تیروں کی طرح زویا کے دل میں ترازو ہو گئے۔ اس نے اپنے ہونٹ بے حد مضبوطی سے بھینچ لیے۔ اسے لگا کہ اسے دیوار کا سہارا لینا پڑے گا مگر پتا نہیں وہ کیسے کھڑی رہی۔

ڈاکٹر تھامسن باہر جانے کے لیے مڑ گئے مگر دروازے کے پاس جا کر پھر رک گئے۔ زویا کے قریب آ کر بولے۔ ''سوختہ زخمی کے لیے آخری وقت بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ہم ٹرنکولائزرز تو دیتے ہیں مگر اس کی ایک LIMIT ہوتی ہے۔ برین کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ تمہاری موجودگی اسے بہت سکون دیتی ہے۔''

زویا کو وہ الفاظ یاد آئے جو شامیر نے تین دن پہلے کہے تھے..... ''زویا..... آخر تک..... میرا ہاتھ تھامے رکھنا..... میرے پاس رہنا۔''

وہ سسک اٹھی، پھر ہاتھ جوڑ کر ڈاکٹر تھامسن سے مخاطب ہوئی۔ ''ڈاکٹر! ایک التجا ہے آپ سے..... اگر ہو سکے تو اسے مان لیجیے گا۔''

''کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''مم..... میں..... آخر تک ان کے پاس رہنا چاہتی ہوں..... کتنا بھی بُرا وقت ہو، میں وہاں رکنا چاہتی ہوں۔''

ڈاکٹر تھامسن کے چہرے پر الجھن کے آثار نظر آئے۔ وہ کچھ دیر تک سوچتے رہے، پھر زویا کی حالت دیکھی اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ باہر آ کر لابی میں آن بیٹھی۔ اس نے کمان کی طرح خم کھا کر اپنی پیشانی گھٹنوں پر رکھی اور چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ وہ کھل کر رونا چاہتی تھی مگر یہ جگہ ایسی نہیں تھی۔ مریضوں کے کئی لواحقین یہاں موجود تھے اور پھر وہ بھی تھے جن کا تعلق شامیر سے قریبی تھا۔ افشاں، اس کے والدین، اس کے باس عظمت سلطان، جورات کی فلائٹ سے یہاں پہنچے تھے۔

وہ خاموشی سے آنسو بہاتی رہی..... پکارتی رہی..... لوٹ آؤ شومیر..... واپس آ جاؤ..... تم جو کہو گے میں ویسا ہی کروں گی..... تم جو کہو گے۔

☆☆☆

شامیر آئی سی یو میں تھا اور وینٹی لیٹر پر تھا۔ تکلیف بے انتہا تھی۔ پین کلرز کی ''ریت'' بھی درد کی اس نیلی آگ کو پوری طرح دبا نہیں پاتی تھی۔ پورے کا پورا جسم اذیت کے شکنجے میں تھا۔ اس کا ذہن تاریکی اور اجالے کے درمیان بھٹک رہا تھا۔

کچھ تاریک سائے دھیرے دھیرے اس کی طرف سرک رہے تھے۔ کیا وہ موت کی طرف بڑھ رہا ہے؟ اس نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے سوال کیا۔

وہ کہاں تھی؟ اس نے تو وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کے پاس رہے گی۔ وہی تو تھی جو اس کے ہر سفر کو آسان بنا سکتی تھی۔ اس نے بس اسی کو چاہا تھا اور پھر اس کے بعد اور کسی کو نہیں چاہ سکا تھا۔ اب ان لمحوں میں اسے اس کے پاس ہونا چاہیے تھا، بالکل قریب۔ اس کی موجودگی ان گھپ اندھیروں میں اسے ایک ایسی روشنی سے نوازتی تھی جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے دھندلائی ہوئی نگاہوں سے خالی کرسی کی طرف دیکھا..... شاید اسے نہیں آنا تھا۔ شاید اسے اب باہر ہی روک دیا جانا تھا۔ تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔ ساری رگوں میں جیسے آگ بھر گئی تھی۔ وہ چلّانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے ہونٹ مضبوطی سے بھینچ لیے۔

وہ اپنے راستے خود چنتی ہے
اور وہ ہمیشہ مشکل راستے چنتی ہے
اسے صحرا میں سایہ پسند نہیں
اسے برفوں میں الاؤ کی حرارت نہیں چاہیے

درد بیکراں ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بلند آواز میں کہنا چاہتا تھا۔ مجھے ایک اور انجکشن دو ڈاکٹر۔ اب یہ برداشت نہیں ہوتا۔

دریائے مائنز کے کنارے ایک چمکیلی دوپہر میں مغنی اپنا نغمہ الاپتا جا رہا تھا۔

اسے برفوں میں الاؤ کی حرارت نہیں چاہیے
وہ انہونیوں کی متلاشی
وہ بے نشاں منزلوں کی راہی
وہ محبت ہے..... میرے یار و محبت ہے

شامیر کے گرد میڈیکل ایڈ دینے والی مشینیں تھیں..... مانیٹرز تھے، ڈرپس کی سفید نالیاں تھیں۔ اسے تاریک سمندروں میں جیسے کسی زہریلے آکٹوپس نے جکڑ رکھا تھا..... اور اس کی مددگار کہاں تھی؟ وہ کہاں تھی جو اس کا ہر سفر آسان بنا سکتی تھی؟

ڈاکٹروں کی سرگوشیاں اس کے کانوں میں دور افتادہ آوازوں کی طرح تھیں۔ تاریکی گہری ہو رہی تھی، تب اچانک اس نے اپنے ہاتھ پر کسی کا لمس محسوس کیا..... اس نے بڑی مشکل سے گردن پھیری اور دھندلائی ہوئی نظر سے

دیکھا۔ وہ آگئی تھی۔ وہ اس کے پاس بیٹھی تھی۔ اس کا بایاں ہاتھ اس کے کول ہاتھ میں تھا اور کہتے ہیں کہ بایاں ہاتھ دل کے بہت قریب ہوتا ہے۔ اس ہاتھ سے اٹھنے والی لہریں سیدھی اس کے دل تک پہنچ رہی تھیں۔

جو تکلیف نیم بے ہوشی اور بے ہوشی بھی کم نہیں کر پا رہی تھیں، وہ کم ہوگئی۔ اس نے آنکھیں پوری کھول کر اسے دیکھنا چاہا..... ہاں، وہی تھی۔ اس نے گہری سانس لے کر آنکھیں بند کرلیں..... اور اس نے وعدہ لیا تھا کہ وہ آخر تک ہاتھ نہیں چھوڑے گی۔

.....زویا جب پہنچی اور اس نے شامیر کا ہاتھ تھاما تو وہ غشی کی سی کیفیت میں تھا مگر اس نے اس کی آمد کو محسوس کیا اور اس کے لمس کو بھی۔ وہ آنسوؤں کا ایک دریا سینے میں چھپائے اس کے قریب بیٹھی رہی۔ جو کچھ ہونے والا تھا وہ نوشتۂ دیوار تھا، شامیر کی بند پلکوں پر لکھا تھا اور ڈاکٹرز کے چہروں پر بھی۔

اسے لگا کہ زویا کی گرفت میں شامیر نے اپنے ہاتھ کو حرکت دی ہے۔ اسے کھولا ہے جیسے وہ ایک دستِ سوالی ہو۔ وہ اندر ہی اندر سسک اٹھی۔ اس نے اپنی انگشت شہادت سے اس کی ہتھیلی پر لکھا LOVE YOU۔

پھر وہ وقفے وقفے سے اس لفظ کو لکھتی چلی گئی۔ اسے لگا کہ اس عمل نے نیم بے ہوش شامیر کو سکون دیا ہے۔ اس کی اذیت کے لیے کسی تیر بہ ہدف نسخے کا سا کام کیا ہے۔ وہ بے تکان بیٹھی رہی، اس کی انگلیوں کو ہولے ہولے دباتی رہی اور اس کی ہتھیلی پر اپنا اعترافِ محبت درج کرتی رہی۔

رات تک وہ اپنی جگہ سے ہلی اور نہ اس نے کچھ کھایا پیا۔ افشاں، انکل اختر، عظمت سلطان اور دیگر عزیزوں نے اسے اس کی جگہ سے ہٹانے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہیں ہٹی۔ اس نے کسی سے وعدہ کیا تھا..... کسی کے پاس رہنے کا عہد کیا تھا..... وہ ایک عمر تک روٹھا رہا تھا۔ اب وہ مانا تھا تو وہ اسے کیسے روٹھنے دیتی۔ کسی ایسے بچے کی طرح جسے سبق یاد نہ کرنے پر دہرائی کی سزا دے دی گئی ہو، وہ اپنی آنکھوں میں اشک لیے..... اس کی ہتھیلی پر لو یو..... لو یو لکھتی رہی..... اور یہ کوئی وہم نہیں تھا، نہ ہی بصری دھوکا تھا..... زویا کا یہ عمل شدید تکلیف کے عالم میں اسے راحت پہنچا رہا تھا..... اور یہ کیفیت صرف زویا ہی نہیں، ڈاکٹرز بھی دیکھ رہے تھے۔ شامیر جس صورتِ حال سے دوچار تھا، ایسی صورتِ حال میں مریضوں کی تکلیف بے پناہ ہوجاتی ہے، مگر برین کے متاثر ہونے کے ڈر سے انہیں مکمل بے ہوش بھی نہیں کیا جاتا۔ ڈاکٹرز جانتے تھے کہ شامیر بھی تکلیف میں ہوگا مگر جب سے یہ لڑکی اس کے قریب آکر بیٹھی تھی، اس کے چہرے کی کیفیت بدل گئی تھی۔

جب تک سانس ہوتی ہے، تب تک آس ہوتی ہے۔ امید تو آخر تک قائم رہتی ہے۔ نظامِ قدرت اپنے لگے بندھے اصولوں پر چلتا ہے۔ معجزوں کا آپشن خدائے بزرگ وبرتر نے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ وہ کب اسے استعمال کرتا ہے، کب نہیں..... یہ اسی کی صوابدید پر ہے۔ یہ آپشن شامیر کے لیے حرکت میں نہیں آنے والا تھا۔ رات بارہ بجے کے بعد اس کے وائٹل سائنز نے خطرے کی نشاندہی شروع کردی۔ اس کا تنفس بری طرح بگڑ رہا تھا۔

'کیا رخصت کا وقت قریب آرہا ہے؟' زویا نے بے پناہ کرب سے سوچا۔

ایسا ہی تھا..... وہ جارہا تھا اور اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہورہا تھا، اسی کی وجہ سے تھا۔ وہی انا کی دیوار جسے وہ بھی ڈھا نہ سکی تھی۔ 21 نمبر ٹرین کے آخری اسٹاپ پر وہ اس کے پیچھے بھی آیا تھا۔ زویا نے اس کے لرزاں قدموں کی چاپ بھی محسوس کی تھی لیکن رکی نہیں تھی..... اور اب..... وہ نہیں رک رہا تھا۔

''لو یو..... لو یو'' تو وہ پہلے بھی لکھتی رہی تھی۔ اب اس نے تیسرا لفظ بھی لکھنا شروع کردیا۔ ''سوری..... لو یو۔''

اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اپنی انگلی کی غیر محسوس حرکت سے وہ جو پیغام شامیر تک پہنچا رہی ہے، وہ اس تک پہنچ رہا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کسی جاں بلب مریض کا چہرہ لگتا ہی نہیں تھا۔ وہاں اذیت کے المناک کھچاؤ کے بجائے، سکون اور آسودگی کی نرماہٹ دکھائی دینے لگی تھی۔ وہ بیٹھی رہی، اس کی انگلیوں کو ہولے ہولے دباتی رہی..... آنسو گراتی رہی اور لکھتی رہی..... ''سوری..... لو یو''۔ ڈاکٹرز اور میڈیکل اسٹاف اپنا کام کرتے رہے، وہ اپنا کام کرتی رہی۔

رات ایک بجے کے لگ بھگ سینئر ڈاکٹر تھامسن نے ایک گوشے میں کھڑے ہوکر پاکستانی مریض کو دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اب بیس پچیس منٹ کا مہمان ہے۔ اس برن یونٹ میں اس نے ایسی کنڈیشن میں موت کا شکار ہونے والے سیکڑوں ہی مریض دیکھے تھے لیکن ایسا نہیں دیکھا تھا۔ وہ بڑے سکون میں تھا۔ آسودگی کی چمک سی تھی اس کی پیشانی پر۔ وہ جیسے دن بھر کی تھکن کے بعد، بڑے اطمینان سے سارے کاموں سے فارغ ہوکر سونے کی تیاری کررہا تھا۔ اس کے قریب بیٹھی ہوئی دلکش لیکن بہت سوگوار لڑکی

نے اس کا بایاں ہاتھ تھام رکھا تھا اور قرب و جوار سے بالکل بے خبر ہو کر اس کی ہتھیلی پر اپنی انگلی کو حرکت دیتی جا رہی تھی۔ پتا نہیں کہ وہ کچھ لکھ رہی تھی یا یہ ویسے ہی اس کی عادت تھی۔

لیونا برگ کے اس اسپتال میں آئی سی یو کے اندر رات ایک بج کر چالیس منٹ پر شامیر نے اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔ اسپتال سے باہر موجود اس کے سیکڑوں مداح آنسوؤں میں ڈوب گئے۔

وہ اپنے راستے خود چنتی ہے
اور وہ ہمیشہ مشکل راستے چنتی ہے

☆☆☆

شامیر چلا گیا۔ ایک نکتہ داں صحافی، ایک ایثار پیشہ شخص..... وہ بے شمار لوگوں کو سوگوار چھوڑ گیا۔ اگلے روز بیٹھے بیٹھے زویا کو نجانے کیوں لگا کہ وہ بیوہ ہو گئی ہے۔ اس نے بندے اتار پھینکے، گلے میں چمکنے والی سونے کی چین توڑ کر ایک طرف ڈال دی۔ بینگلز اپنی کلائیوں سے علیحدہ کر دیے۔ وہ ایک بار پھر تنہائی میں پھوٹ پھوٹ کر روئی۔

شامیر کی میت پاکستان کس کے پاس جاتی؟ وہ وہاں سے آیا تو اپنی پیاری اموخالہ کے ساتھ تھا مگر اصل میں اکیلا ہی آیا تھا۔ اموخالہ اپنی نیم دیوانی مفلوج بیٹی کے ساتھ پاکستان واپس جا چکی تھیں مگر پتا نہیں کہ کس جگہ تھیں۔ انکل اختر اور عظمت سلطان اس کے جسد خاکی کو اسٹریٹ پولیٹن لے جانا چاہتے تھے مگر لیونا برگ اور گردونواح میں شامیر کے اتنے مداح تھے کہ اس کی تدفین کا فیصلہ لیونا برگ میں ہی ہوا۔ دریائے ایلم ناؤ سے کچھ ہی فاصلے پر ایک مسلم قبرستان اس کی آخری آرام گاہ قرار پایا۔ اس کی میت کے اوپر پاکستانی پرچم ڈالا گیا تھا۔ زویا نہیں جان سکی کہ پرچم والا آئیڈیا کس کا تھا؟ شامیر کی آخری رسومات میں غیر متوقع طور پر بہت زیادہ لوگ شریک ہوئے..... ایک سیلاب سا امڈ آیا۔

تیسرے روز زویا کو اسپتال سے ایک فون کال موصول ہوئی۔ یہ کال ایک انچارج نرس کی طرف سے تھی۔ وہ اکثر شامیر کے اردگرد نظر آیا کرتی تھی۔ وہ زویا سے ملنا چاہتی تھی۔ دوپہر کے وقت ان دونوں کی ملاقات ایک قریبی ترک ریستوران میں ہوئی۔ جرمن نرس بھی شامیر کے مداحوں میں شامل تھی۔ اس نے زویا کو ایک چھوٹا سا بند لفافہ دیا اور کہا۔ ''یہ آنجہانی محترم شامیر کی طرف سے ہے۔ انہوں نے اپنی ڈیتھ سے تین دن قبل مجھے دیا تھا اور مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ اگر انہیں کچھ ہو جائے تو میں اسے رازداری سے آپ تک پہنچا دوں۔''

بند لفافہ زویا نے اپنے شولڈر بیگ میں رکھ لیا۔ انچارج نرس ہی کی زبانی اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ پاکستانی پرچم والی بات بھی شامیر نے خود ہی کہی تھی۔ یہ غالباً اس تعصب کا جواب تھا جو زویا کی ماما جیسے کچھ لوگ پاکستانیوں سے رکھتے تھے۔

نرس کے جانے کے بعد زویا نے ریستوران میں ہی بیٹھ کر لفافہ کھولا۔ اس میں ایک آرٹیفیشل موتی تھا۔ یہ مقدر کا وہی موتی تھا جو ان دونوں کو پری کے روپ والی لڑکی نے فرینکفرٹ میں دیا تھا۔ وہ شامیر نے آخر تک سنبھالے رکھا تھا۔ ساتھ میں ایک چھوٹا سا خط بھی تھا۔ یہ شامیر نے یقیناً اپنے بائیں ہاتھ سے ذرا دشواری کے ساتھ لکھا تھا۔ اس نے کہا تھا۔

''مجھے خوشی ہے کہ اب تمہارے اردگرد کوئی بڑا خطرہ موجود نہیں ہے (ویسے بھی اب تم جرمنی چھوڑ جانا چاہتی ہو) مجھے لگتا ہے کہ میں چلا جاؤں گا۔ میرے جانے کا سوگ زیادہ دیر نہ منانا۔ ٹھہرے پانی خراب ہو جاتے ہیں، زندگی کی روانی برقرار رہنی چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے حصے کے غم تمہیں ملے ہیں تو تمہارے حصے کی خوشیاں بھی ضرور ملیں گی۔ تم شادی کر لینا۔ مجھے بھروسا ہے کہ کوئی نہ کوئی تمہاری زندگی میں ایسا ضرور آئے گا... جو تمہارے سارے دکھوں کا مداوا کر دے گا۔

زویا! ہم دونوں نے تو اپنی قسمت کا لکھا پا لیا، مگر ہم جیسے جو آئندہ آنے والے ہیں، ان کے لیے دل سے ایک دعا نکلتی ہے۔ سوچتا ہوں، کتنا اچھا ہو کہ 21 نمبر ٹرین کے آخری اسٹاپ جیسا اسٹاپ دنیا میں کہیں بھی نہ ہو اور اگر ہو تو وہاں پتھر کے بینچ والے اس گوشے میں، جدائیوں کی گفتگو نہ ہو..... اور اگر گفتگو ہو ہی جائے اور کوئی زویا کسی شامیر سے روٹھ کر چلی بھی جائے تو پھر ان دونوں کے درمیان انا کی دیوار حائل نہ ہو..... ہو سکے تو تم بھی ایسے ہی سوچنا..... ایسے ہی دعا کرنا۔

تمہاری خوشیوں کے لیے دعا گو..... تمہارا ''شومیر.....''

زویا نے خط دوبارہ شولڈر بیگ میں رکھ لیا اور کھڑکیوں سے باہر دریائے ایلم ناؤ کی طرف دیکھنے لگی..... ایلم ناؤ جس کی دوسری جانب شامیر سفیدے اور بلوط کے پیڑوں کے نیچے سو رہا تھا۔ وہ ہولے ہولے چل دی، ایک بار پھر اس سے ملنے کے لیے۔ وہ بالکل سفید لباس میں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جو موسم اس کے دل پر چھایا ہوا ہے، وہ بہت..... بہت طویل ہے۔

(ختم شد)